

دکن بزم

گھر کے ہر فرد کے لئے
کراچی

ماہنامہ
پاکینہ

ستمبر 2017

نگرانِ اعلیٰ
معراج رسول

Pakistani Point

Ek Dabta Apnon Sey

رفعت معراج اور شیریں حیدر کے ناول کی نئی اقساط

پاکینہ

ایران اعلیٰ : معراج رسول

مدیرہ اعلیٰ : عذرار رسول

مدیرہ : نزہت اصغر

معاون : آمنہ حماد

اشتہارات : محمد شہزاد خان



رکن آل پاکستان پریس سوسائٹی

رابطہ : شعبہ اشتہارات

شہزاد خان 0333-2256789



نمبر
دلہن

ت فی پرچا (پاکستان) 60 روپے

حد فی پرچا (سعودی عرب) 12 ریال یا مساوی متحدہ عرب امارات

رسالہ (اندرون ملک) 800 روپے جلد 45 شمارہ 06 ستمبر 2017ء

سرورق ماڈل: ماہم

فوٹو گرافی: ایم کاشف

اداریہ

مجھے کچھ بتانا

مدیرہ 15

سلسلے وار ناول

رفعت سراج 22

شیریں حیدر 118

منی ناول

سیمار ضاردا 152

ناولٹ

میرزا دھوپ کا تم ہی چھاؤں سحرش فاطمہ 60

سعدیہ رئیس 185

مکمل ناول

عالیہ حرا 214

افسانے

نگہت اعظمی 47

سوال

خصوصی مضامین

ہم بتائیں کیا 57 بہالہ احمد

حاصل زندگی 85 حنادیہ احمد

تومیر الفیج ہے 91 فرحت انصاری

نہیں آج خواہش 103 فرح طاہر

بین اور پٹی 109 اُم ثمامہ

بگ کنگناؤں کی زندگی 141 دانیہ آفرین

دھواں آجوں کی زندگی 145 نگہت غفار

کون کون 171 ثریا فرخ

چھٹی جو دھند 175 المیس جبار

چھٹی 199 شمع تفسیر

بگ گھر گھونڈا 203 فوزیہ احسان رانا

الشاہ اور آری کا نور 18 ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی

ذکیہ آپا کے حقیقت ملاقات 20 نزہت اصغر

پہلی 247 اختر شجاعت

وہ آج کے زمانہ میں 252 نزہت اصغر

ہر روز 263 شائستہ زریں

شادی کی مبارک 269 قاری پھنیں

آیا ہے پلاوا 275 انجم مشیر



مستقل عنوانات

پاکیزہ بہنیں 295	خوش آئینہ	ادارہ 16	دین کی باتیں
پاکیزہ بہنیں 297	بزمِ پاکیزہ	ادارہ 277	گوشہ نظریاتی
مہ جیس 299	حسن نگار کے لیے	مدیرہ 278	بہنوں کی محفل
ادارہ 300	روحانی شوق	عظمیٰ آفاق سعید 289	پاکیزہ ڈائری
302	ہومیو پیتھ	صغریٰ زیدی 293	میں اکثر گنہگار ہوں
		ادارہ 294	منہ غیبی دلچ



صرف نام تجویز کرنے پر جیتیں CC-1300 کار

ان تیتوں سے کسی ایک پر  کا نشان لگائیں۔ یا خود تجویز کریں۔

FRUITY JUICE



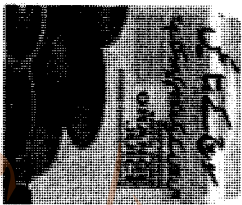
دوسرا انعام موٹر سائیکل
تیسرا انعام LCD سونی

SKY JUICE

اس جوس کے پیکٹ کا نام تجویز کریں

KING JUICE

اور جیتیں بے شمار انعامات



نام _____

--	--	--	--	--	--	--	--	--	--	--	--	--	--	--	--	--	--	--	--

شناختی کارڈ نمبر

فون نمبر _____

ایڈریس _____

یا نام خود تجویز کریں _____

اور بھیجیں ایریا BOX P.O 167 گوجرانوالہ

مجھے کچھ کہنا ہے.....!

قارئین عزیز السلام علیکم.....!

☆ تمام امت مسلمہ اور بالخصوص اہل وطن کو عید الاضحیٰ کی مبارک باد..... ساتھ ہی ساتھ ہم ان خوش قسمت عازمین کو دلی مبارک باد پیش کرتے ہیں جنہوں نے اس سال حج کا مقدس فریضہ انجام دیا۔ اللہ پاک ان کی اس عبادت کو قبول فرمائے، الہی آمین! حج بلاشبہ ایک روح پرور اجتماعی عبادت ہے۔ ہر مسلمان کی یہی آرزو، یہی تمنا ہوتی ہے کہ وہ اپنی زندگی میں ایک بار تو ضرور اللہ پاک کے عظیم الشان گھر اور رسول پاک حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روضہ اقدس کی زیارت کر لے اور جسے یہ نصیب ہو جائے تو وہ اپنا شمار خوش قسمت ترین بندوں میں کیوں نہ کرے۔ اور عبادت تو نام ہی مکمل آبادگی و تسلیم و رضا کا ہے۔ بے شک دین اسلام میں جبر نہیں سو جو بھی اس فریضہ کی انجام دہی کی طرف مائل ہوتا ہے وہ اپنی رضا و رغبت اور مکمل سپردگی سے حاضری دیتا ہے۔ ہر سال حاجیوں کی تعداد میں تو الحمد للہ اضافہ ہوتا جاتا ہے مگر دوسری طرف مسلمانوں کی اخلاقی و روحانی زبوں حالی بھی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔

حج مسلمانوں کے اتحاد اور حسن تقابہم کا بہترین ذریعہ ہے۔ ہمارا رب یہ نہیں چاہتا کہ مسلمان دنیا کے کوئے کوئے سے صرف ”بدنی طور“ پر مکہ کرمہ میں جمع ہو جائیں۔ دراصل حج کے وجہ سے پروردگار عالم کا یہ مقصد تھا کہ امت مسلمہ ایک دوسرے کے قریب ایک ہی مرکز پر آسکے، ایک دوسرے سے ملاقات کرے یوں ان کے باہمی روابط مضبوط و مستحکم ہوں جو اسلام کی سر بلندی کا باعث ہوں..... امت مسلمہ کے روح پرور اجتماع کا یہ نظارہ بلاشبہ بڑا ایمان افروز ہوتا ہے، جب تمام عازمین حج میدان عرفات میں جلال کبریائی کے زیر اثر پُر آشک آنکھوں کے ساتھ استغفار و مناجات کے ذریعے مصروف عبادت ہوتے ہیں۔

پروردگار عالم کے حضور دعا ہے کہ ہم سب کو حج مبرور عطا ہو! آمین!

☆ قارئین! ماہ متبر اس اعتبار سے سب سے اہم ہے کہ اس ماہ یوم وفات بانی پاکستان حضرت قائد اعظم محمد علی جناحؒ اور یوم دفاع پاکستان بھرپور نوعی جذبے سے منایا جاتا ہے۔ ہم ہر سال تجدید عہد و وفا کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ افواج پاکستان کو خراج تحسین بھی پیش کرتے ہیں کہ جن کے جوان اس سرزمین کے چنے، پختے کی حفاظت پر مستعدی سے مامور ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری ارض پاک کو دشمن کی میلی نظر سے محفوظ رکھے، آمین۔

مدیرہ

نزہت اصغر

دیکھ کی باتیں

پس شیطان نے ان دونوں کو وسوسہ دیا، تاکہ ان دونوں کے ستر جو ایک دوسرے سے پوشیدہ تھے وہ ظاہر کر دے۔ اور یہ کہا کہ تمہارے پروردگار نے تم کو اس درخت سے نہیں منع کیا مگر (صرف) اس لیے کہ تم دونوں کہیں فرشتے نہ بن جاؤ، یا ہمیشہ رہنے والوں میں سے نہ ہو جاؤ۔ (۲۰) اور اس نے ان دونوں کے سامنے قسم کھائی کہ میں ضرور تم دونوں کے خیر خواہ ہوں میں سے ہوں۔ (۲۱) پس اس نے دھوکے سے ان دونوں کو ڈانوں ڈول کر دیا۔ پھر جب ان دونوں نے اس درخت (کے پھل) کو چکھا (تو) ان دونوں کے ستر کھل گئے، اور وہ دونوں جنت کے پتوں سے اپنے آپ کو ڈھانپنے لگے۔ اور ان کے پروردگار نے ان دونوں کو آواز دی۔ کیا میں نے تم دونوں کو اس درخت سے منع نہیں کیا تھا اور میں نے تم دونوں سے یہ نہ کہا تھا کہ یقیناً شیطان تم دونوں کا کھلا دشمن ہے۔ (۲۲) دونوں بولے اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا۔ اور تو ہمیں اگر نہ ڈھانکے گا اور ہم پر رحم نہ کرے گا۔ البتہ ہم گھانا اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔ (۲۳) (خدا نے) فرمایا اتر جاؤ تم ایک دوسرے کے دشمن رہو گے۔ اور تمہارے لیے ایک وقت معین تک زمین میں ٹھہرنے کی جگہ اور فائدہ اٹھانا ہے۔ (۲۴) فرمایا اس میں تم زندگی بسر کرو گے اور اسی میں تم مرو گے اور اسی میں سے (زندہ کر کے) نکالے جاؤ گے۔ (۲۵) اے اولاد آدم! یقیناً ہم نے تمہارے لیے لباس نازل کیا جو تمہارے ستروں کو چھپاتا ہے اور زینت (بھی) ہے اور پرہیزگاری کا لباس، وہ سب سے اچھا ہے۔ یہ (لباس) کا نازل ہونا اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے تاکہ وہ (لوگ) نصیحت حاصل کریں۔ (۲۶) اے اولاد آدم! تمہیں شیطان فتنہ میں نہ ڈال دے، جس طرح کہ اس نے تمہارے ماں، باپ کو جنت سے نکالا، ان دونوں سے ان کا لباس اتر دیا، تاکہ ان دونوں کے ستر ظاہر کر دے۔ یقیناً وہ اور اس کا گروہ تمہیں اس طرح دیکھ رہا ہے، کہ تم اس کو نہیں دیکھتے ہو۔ بے شک ہم نے شیطان کو ان لوگوں کا سرپرست قرار دیا ہے۔ جو ایمان نہیں لاتے (۲۷) اور جب وہ کوئی بے حیائی کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ داداؤں کو اسی (طریق) پر پایا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہی حکم دیا ہے، کہہ دو یقیناً اللہ تعالیٰ بے حیادوں کا حکم نہیں دیا کرتا۔ کیا تم اللہ تعالیٰ کے خلاف ایسی بات کہتے ہو جو تم نہیں جانتے۔ (۲۸) (اے رسول!) کہہ دو کہ میرے پروردگار نے مجھے انصاف کا حکم دیا ہے۔ اور (یہ) کہ ہر نماز کے وقت اپنے چہرے (قبلہ کی طرف) سیدھے کر لیا کرو، اور دین کو اسی کے لیے خالص سمجھ کر اس سے مدعا مانگو جس طرح اس نے تمہیں پیدا کیا تھا۔ اسی طرح اس کے حضور میں پلٹ کر جاؤ گے۔ (۲۹) ایک گروہ کو اس نے ہدایت کی، اور ایک گروہ ہے کہ ان پر گمراہی ثابت ہوگئی۔ بے شک انہوں نے خدا کو چھوڑ کر شیطانوں کو سرپرست بنالیا ہے، ممکن یہ کرتے ہیں کہ وہ ہدایت یافتہ ہیں۔ (۳۰)



آنحضرت ﷺ کے اسمائے گرامی

اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ سَيِّدِ الْبَشَرِ

افضل الانبياء ختمی مرتبت، سید المرسلین رسول اکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صفاتی اسمائے مبارکہ میں سے ایک نام سیدنا حج بھی ہے جس کے معنی و مفہوم نجات والے اور نجات کا باعث کے ہیں۔

1۔ القرآن: (۱) ترجمہ: اور ان پر سے وہ بوجھ اور طوق جو ان کے سر پر گلے میں تھے اتارتے ہیں۔ (سورہ اعراف، آیت ۱۵۷)

(۲) ترجمہ: اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فرمانبرداری کرے گا تو بے شک بڑی مراد پائے گا۔ (سورہ احزاب، آیت ۷۱)

2۔ الحدیث: (۱) حضرت جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میرا حال اور میری امت کا حال اس شخص کی مثل ہے جس نے آگ روشن کی، پس ٹڈیاں اور پروانے اس میں گرنے لگے اور وہ ان کو آگ سے ہٹاتا تھا، سنو! میں تمہاری کمر سے پکڑ کر آگ سے بچانے والا ہوں اور تم میرے ہاتھ سے چھوئے ہو اور آگ میں گرنا چاہتے ہو۔ (مسلم)

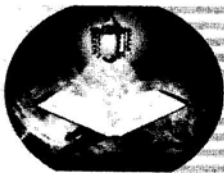
(۲) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ہر ایک نبی کے لیے ایک، ایک دعا تھی۔ وہ دعا مانگتے ہیں اور دعا قبول ہوتی رہی۔ میں نے اپنی دعا کو اپنی امت کی شفاعت کی خاطر اور قیامت تک کے لیے محفوظ کر رکھا ہے۔ (بخاری)

3۔ الموائیہ: (۱) ایسے وقت میں کہ جب انسانیت پر نزاع کا عالم طاری تھا دنیا اپنے تمام ساز و سامان سمیت ہلاکت کے مہیب و عمیق غار میں گرنے والی تھی۔ عین اس وقت اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وحی و رسالت کے ساتھ مبعوث فرمایا کہ اس جاں بلب انسانیت کو نئی زندگی بخشیں اور لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لائیں۔ (مولانا ابوالحسن علی ندویؒ)

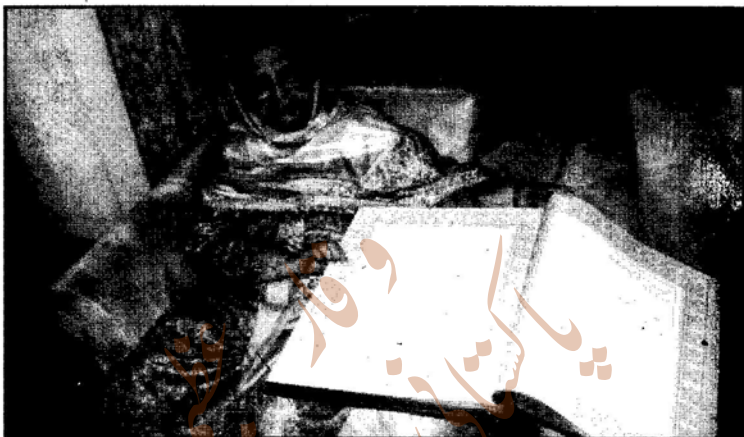
(۲) اسلام کے ذریعے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دس سال کے اندر ہی عربوں کی شدید ترین نفرتوں، انتقامی جذبات، لاقانونیت، عورتوں کی ذلت، سود خوری، شراب خوری اور انسانی قربانیوں سے نجات دلائی۔ پھر اسی مذہب کے ذریعے آسمان کی اس بادشاہت کو انہوں نے عملی طور پر اس زمین پر قائم کر دیا جس کی بشارت بڑے ذوق و شوق سے جناب حج نے دی تھی۔ (گمین)

4۔ الفضائل: اگر کسی عورت کا خاوند اس پر بہت ظلم کرتا ہو تو وہ عورت نماز عشا کے بعد ترائو سے مرتبہ یہ اسم پاک "سیدنا حج" پڑھ لیا کرے اکیس یوم تک بلا تاخیر اس پر عمل کرنے سے اس کا خاوند اس پر سختی نہیں کرے گا اور راہ راست پر آجائے گا۔

قیمہ حیات کی کتاب انوار اسمائے نبوی ﷺ سے اقتباس



اللہ اور اس کا نور



قرآن پاک سے عشق کی پرنور داستان ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کے قلم سے

باب ہشتم

(99) حضرت داؤد کے پاس مقدمہ، ایک کے پاس 99 دنیاں تھیں۔ (سورہ ص (38) آیت 23)
(100) زنا کار عورت اور زنا کار مرد تو ان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو..... (سورہ نور (24) آیت 2)

(200) اگر تم میں سے میں آدمی ثابت قدم ہوں تو دو سو کافروں پر غالب ہوں گے۔ (سورہ انفال (8) آیت 65)

(309) اصحاب کہف اپنے غار میں 309 سال رہے۔ (سورہ کہف (18) آیت 22)
(1000) اللہ تعالیٰ کا ایک دن ہمارے 1000 سال کے برابر ہے۔ (سورہ حج (22) آیت 47) ایک دن ایک ہزار سال (سورہ سجدہ (32) آیت 5)
(2000) اگر 1000 ثابت قدم ہوں تو

قرآن کریم میں حساب کا علم

(30) تکلیف سے اس کو جتا اور اس کا پیٹ میں رہنا اور دودھ کا چھڑانا تیس ماہ میں ہوتا ہے۔
(40) یہاں تک کہ جب خوب جوان ہوتا اور چالیس برس کو پہنچ جاتا ہے۔ (سورہ احقاف، (46) آیت 15)
(50) نوح اپنی قوم میں پچاس برس کم ہزار برس رہے۔ (سورہ نحموت (29) آیت 14)
(60) ظہار کا کفارہ 60 روزے لگانا رکھنا یا 60 محتاجوں کو کھانا کھلانا (سورہ مجادلہ (58) آیت 4)
(70) پھر ان کو زنجیر میں جکڑو جس کی پیمائش ستر گز ہو۔ (سورہ حاقہ (69) آیت 32)
(80) مومن عورت پر بدکاری کا الزام لگانے کی سزا اسی کوڑے۔ (سورہ نور (24) آیت 24)

2000 پر بھاری ہوں گے۔ (سورہ انفال (8) آیت 66)

(3000) تین ہزار فرشتے۔ (سورہ آل عمران (3) آیت 124)

(5000) پانچ ہزار فرشتے۔ (سورہ آل عمران (3) آیت 125)

(50,000) عذاب اس روز ہوگا جس کی مقدار پچاس ہزار برس ہوگی۔ (سورہ معارج (70) آیت 4)

(100,000) حضرت یونسؑ ہم نے ان کو لاکھ یا اس سے بھی زیادہ لوگوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔ (سورہ صافات (37) آیت 147)

جمع، تفریق، ضرب اور تقسیم کی مثال۔ ابتدائی کتنی سیکھنے کے بعد ضروری ہے کہ ان کی جمع، تفریق، ضرب اور تقسیم بھی سیکھی جائے۔ ایک بار آپ یہ طریقہ سیکھ لیں تو بانی حساب خود ہی آجاتا ہے جسے یقیناً سیکھنا پڑتا ہے۔ قرآن حکیم میں یہ چاروں طریقے استعمال ہوتے ہیں، جنہیں میں حوالے کے ساتھ پیش کر رہی ہوں۔

جمع: اس کی دو مثالیں ملتی ہیں۔ مثال نمبر 1۔

”اور ہم نے موسیٰ سے تیس رات کی میعاد مقرر کی اور دس راتیں اور ملا کر اسے پورا (چلے) کر دیا تو چالیس رات کی مدت پوری ہوگئی۔“ (سورہ اعراف (7) آیت 142)

مثال نمبر 2:

”جس کو قربانی نہ ملے وہ تین روزے ایام حج میں رکھے اور سات جب واپس ہو، یہ پورے دس ہوئے۔“ (سورہ بقرہ (2) آیت 196)

تفریق: اس کی صرف ایک مثال بیان ہوئی ہے۔

”حضرت نوحؑ اپنی قوم میں پچاس برس کم ہزار برس رہے۔“ (سورہ عنکبوت (29) آیت 14)

حضرت نوحؑ کی عمر معلوم کرنے کے لیے آپ

کو ہزار سے پچاس نفی کرنا ہوں گے۔ ضرب میں اس کی کئی مثالیں موجود ہیں۔

(1) ”اگر تم زکوٰۃ دیتے ہو اور اس سے اللہ کی رضا چاہتے ہو تو یہی لوگ اپنی دولت کو دو چند، سہ چند کرنے والے ہیں۔“ (سورہ روم 30 آیت 39)

(2) ”دگنا، چوگنا سو دمت کھاؤ۔“ (آل عمران 3 آیت 130)

(3) ”اگر نبی کی بیویاں اچھا عمل کریں گی تو... دگنا ثواب ملے گا اور اگر برائے عمل کریں گی تو انہیں دگنی سزا ملے گی۔“ (سورہ احزاب (33) آیات 31, 30)

(4) ”جو نیک کام کرے گا اسے دس گنا ثواب ملے گا۔“ (سورہ الانعام (6) آیت 160)

مثالیں اور بھی ہیں۔ تقسیم: تقسیم کا عمل اور طریقہ ترکے کے سلسلے میں بتایا گیا ہے اور ہر فرد کا حصہ مقرر کر دیا گیا ہے۔

(1) مرنے والے کی ایک لڑکی ہے تو اسے ترکہ کا دو تہائی ملے گا۔ 2/3

(2) مرنے والے کا ایک لڑکا ہے تو اسے ترکہ کا نصف ملے گا۔ 1/2

(3) ماں، باپ، دونوں کا حصہ چھٹا ہوگا (ماں کا بھی اور باپ کا بھی) 1/6 + 1/6

(4) بیوی کا حصہ 1/8

(5) شوہر کا حصہ 1/4

یہ تمام اور کچھ مزید تفصیل سورہ نساء (4) میں مل جائے گی۔ وہاں سے پڑھی جاسکتی ہے۔

طاق اور جفت:

سورہ فجر (89) کی قسم 1۔ اور دس راتوں کی قسم 2۔ اور جفت اور طاق کی 3۔

امید ہے آپ کو یہ تحقیق پسند آئی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو نیک اور سیدھے راستے پر چلنے اور قرآن کے رموز سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

(جاری ہے)

ذکیہ آپا سے سرعقیدت کلمات

نہایت اصغر

آمد کا سن کروہ بہت نہال ہوئیں اور بڑی گرجوٹی سے ہماری منتظر رہیں۔ ان کے یہ جملے کہ آپ لوگ ضرور آئیں مجھے بہت خوشی ہوگی۔ ہمارے لیے بہت قیمتی ہیں۔ انہوں نے ہمیں صبح گیارہ ساڑھے گیارہ بجے کا وقت دیا۔ عذرا صاحبہ چونکہ خاص طور پر عیادت کے لیے جانے کے لیے مریض اور ان کے گھر والوں کا آرام اور سہولت کو ضرور مد نظر رکھتی ہیں اسی لیے ذکیہ آپا سے مناسب وقت اور دن کا پوچھ لیا تھا۔ ذکیہ آپا کا گھر چونکہ عذرا صاحبہ کے گھر کے نزدیک ہی ہے اس لیے وہ حسب عادت مقررہ وقت پر پہنچ گئیں۔ ہم دفتر سے ہو کر ذکیہ آپا کے لیے رسالوں کا تحفہ لے کر پہنچے تو بہت اپنائیت بھرے ماحول میں بے حد خوب صورت باتیں ہو رہی تھیں۔ ذکیہ آپا قرآن پاک کی کتابت کے حوالے سے بہت پر لطف تجربات کے بیان کے ساتھ حیرت انگیز انکشافات بھی کر رہی تھیں اور ہم ان کی گفتگو کے سحر میں ڈوبتے چلے گئے۔ بناوٹ سے پاک سادہ سے ماحول میں ذکیہ آپا کی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور نہایت تابعدار بہو بسمہ آصف بھی شریک گفتگو تھیں پھر انہوں نے کچھ ہی دیر میں پُر تکلف جانے والے دناشتے کا اہتمام کیا۔ بسمہ ایک تعلیم یافتہ اور مہذب گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں مگر ان کے انداز میں اس قدر سادگی اور متانت ہے کہ کیا بتائیں۔ گفتگو میں ملاحظہ و نرمی اور ان کے لیے ذکیہ آپا کے محبت اور شفقت بھرے جملے سن کر بہت اچھا لگ رہا تھا۔ یعنی وہ اپنی ماں جیسی ساس کی دست راست ہیں۔ اس سے بڑھ کر اور کیا کہیں۔ اپنے چاہنے والوں کے لیے ذکیہ آپا نے خاص پیغام دیا ہے کہ ”میں کوئی بچہ نہیں ہوں بزرگ نہیں ہوں، ایک عام انسان ہوں میرے اللہ نے مجھے اس قابل کیا۔“ ہم نے انہیں آپ سب بہنوں کا سلام، پیغام اور دعا میں بھی پہنچائیں اور کئی بہنوں نے ان سے دعا کے لیے کہا تھا تو ان سب کے لیے ذکیہ آپا کا کہنا

عزیز قارئین! ماہنامہ پاکیزہ کے حوالے سے بہت سی شخصیات سے ملاقات کا موقع ملا، جن میں ظاہر ہے قارئین اور راسخ زو سرفہرست ہیں ہی، اس کے علاوہ ادب و صحافت کے شعبوں سے تعلق رکھنے والے دیگر افراد بھی شامل ہیں مگر کچھ شخصیات سے ملنا کسی نہ کسی خوشگوار حوالے سے یاد رہ جاتا ہے اور دل چاہتا ہے کہ بار بار ان کی صحبت میں اٹھا بیٹھا جائے اور خوب باتیں کی جائیں۔ ایسی ہی ایک نہایت قابل احترام اور معتبر ہستی ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کی ہے جن سے ماہنامہ دلکش کے اجرا کے زمانے میں بحیثیت ناول نگار اور افسانہ نگار تعارف ہوا۔ پھر ہم نے دلکش کے لیے ذکیہ آپا کا مفصل انٹرویو بھی کیا تھا جس میں انہوں نے اپنی پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے تحقیق کے دوران کے بہت سے حیرت انگیز واقعات بھی بتائے تھے اور پھر انہوں نے قرآن پاک کی کتابت کے بارے میں بھی کئی انوکھے تجربات اور مشاہدات کا بطور خاص ذکر کیا تھا۔

آپ سب پاکیزہ بہنیں اکثر ویڈیو ٹیلی فون و خطوط کے ذریعے ذکیہ بلگرامی سے ملنے اور بات کرنے کی خواہش کا اظہار کرتی ہیں کہ ہمیں ان سے دعا کروانی ہے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے ذکیہ آپا نے ایک طویل اور تکلیف دہ بیماری جھیلی مگر اللہ کی مدد سے نہایت جلد اور برداشت کے ساتھ انہوں نے جو کڑا وقت گزارا اس میں بلاشبہ ان کے بچوں، عزیز و اقارب، رشتے داروں کی دعاؤں کے ساتھ، ساتھ ان کے چاہنے والوں کی دعائیں بھی شامل رہیں۔ ذکیہ آپا نے آپ سب کو بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھا ہوا ہے۔

پچھلے کئی دنوں سے عذرا رسول صاحبہ اور میں ذکیہ آپا کی مزاج پرسی کو جانا چاہ رہے تھے اگرچہ ان سے زیادہ دیر بیٹھا نہیں جاتا اور نہ ہی زیادہ بات کی جاتی ہے مگر ہماری



تھا کہ بندہ اپنے لیے خود دعا کرے۔ ان کی باتوں کا مفہوم تھا کہ الحمد للہ ہم سب مسلمان ہیں، اپنے اعمال و کردار پر غور کریں کہ کیا چیزیں دعا کی قبولیت کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ قرآن پاک کے احکامات سمجھ کر ہر شخص فلاح پاسکتا ہے۔ قرآن پاک کا حق یہ نہیں کہ اسے اونچی جگہ پر خوب صورت جزدان میں سجا کر رکھ دیا جائے بلکہ اس میں جو کچھ ہے اسے سمجھیں۔ بے شک آیات قرآنی شفا ہیں تو پھر کیوں انسان بھٹکتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کسی بھی حاجت کے لیے پاک

ڈاکٹر ذکیہ بگرامی سے عذر رسول صاحب دزہت اسمعز کا اظہار عقیدت

اور سننے کا لطف آجاتا ہے۔ غرضیکہ طبیعت بہت ہی خوش ہوئی اور ایمان کی تازگی کا سفر احساس ہوا اور اسی احساس سے ہم اپنے قارئین کو بھی روشناس کرانا چاہ رہے تھے بھی چند سطریں لکھ ڈالیں۔ ہمارے خیال میں ذکیہ آپا کے مذاحوں کی کافی تسکین ہوگئی ہوگی۔

صاف ہو کر نفل نماز حاجت کی نیت سے پڑھیں اور اللہ کے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صدمے میں اپنے لیے خود دعا کریں۔ ایک جہرات تک کسی ایک حاجت کے لیے قرآن پاک ختم کریں، اگر قرآن باترجمہ پڑھیں تو کیا ہی بات ہے۔ جہاں تک دوسروں کے لیے دعا کی بات ہے تو بندہ مومن تو پہلے اپنے بھائی کے لیے دعا کرتا ہے پھر اپنے لیے۔ اپنے مرحومین کی دعائے مغفرت بھی دراصل اپنے لیے ہی نیکی مکتا ہے۔

باتیں تو بہت ہوئیں کہ پتا ہی نہیں چلا کہ ایک گھنٹا کیسے گزر گیا۔ ذکیہ آپا بے حد خوش تھیں کہ مجھ سے پندرہ منٹ بیٹھا نہیں جاتا کہاں میں اتنی دیر بیٹھ گئی۔ کسی نشست، محفل میں ذکر الہی ہو اور ایمان افروز گفتگو ہو تو دنیاوی تکلیف ہتھیا دور ہو جاتی ہے۔

عذر صاحبہ، ذکیہ آپا سے قرآن پاک کی کتابت کے حوالے سے مسلسل گفتگو کرتی رہیں۔ زندگی کے دیگر تجربوں اور مشاہدات پر بھی بات ہوئی۔ کہتے ہیں کہ دماغی انج ایک جیسی ہو جسے مینٹل اپروچ کہتے ہیں اور بولنے والے اور سامع میں ایک ذہنی ہم آہنگی ہو تو گفتگو کرنے

اللہ پاک ذکیہ آپا صاحبہ کو صحت و سلامتی سے رکھے اور وہ ایسے ہی ہمیں اپنے ایمان افروز خیالات سے نوازی رہیں۔ آخر میں ذکیہ آپا نے ہمیں اپنے کتابت شدہ اٹھارہویں قرآن پاک کے نسخے کی زیارت بھی کروائی۔ ہماری تو آنکھیں خیرہ تھیں، اتنی خوب صورت کتابت اور جلد بندی.....! سبحان اللہ۔ ہنوا! آپ سب دعا کریں کہ ذکیہ آپا اپنا انیسواں قرآن پاک بھی جلد شروع کر دیں۔ بہت خوب صورت باتوں، تجربوں اور واقعات کا خزانہ لے کر ہم نے ان سے اجازت چاہی کہ وقت ظہر قریب تھا۔ بلاشبہ یہ زندگی کی ایک یادگار نشست تھی۔ اللہ پاک ہم سب کو کامل ایمان کی طاقت اور توفیق عمل مقبول عطا فرمائے، (الہی آمین)۔

☆☆☆

..... یہ کہاں بچیں کہ دل ہے

رفعت سراج

بنی اسرائیل کا سونے کا بچھڑا آج ڈالر، پونڈ، یورو، درہم و دینار کی شکل اختیار کر چکا ہے۔
 دل جذبات کا استعارہ ہے مگر اب وہ دل کہاں ...
 سونے کے بچھڑے میں دل بھی سونے کا ہے ...
 دل کو رو بجاتا ہے، جگر کو پیٹا جاتا ہے ...
 کبھی ناقدروں کے حوالے کر دیا جاتا ہے، یاریاں ٹوٹ جاتی ہیں۔
 الزام تراشیوں کا ایک طوفان بد تمیزی برپا ہو جاتا ہے۔
 دل سے دل کو راہ بھی ہوتی ہے ...
 آج کا انسان یہ راہ سٹیلائٹ کے ذریعے search کرنے کی کوشش کرتا ہے۔
 دل اور سونے کا بچھڑا ...
 عبادات، معاملات ...
 جنتِ گم گشتہ کے بے دخل باسیوں کی ازلی کہانی ...

رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لبو کہ پھر نہ تھتا
 غم اگر چہ جاں گسل ہے یہ کہاں بچیں کہ دل ہے
 جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا
 غم کی عشق گر نہ ہوتا، غم روزگار ہوتا
 نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

قطع 14

ماہین تیزی سے آگے بڑھی اور سفینہ کو گلے سے لگایا اور اس کے رخسار پر بوسہ دیا۔
 ”سوری..... سفینہ..... شاید میں نے تمہیں ہرٹ کیا ہے..... مگر میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا..... شاید
 میں کچھ غلط سمجھی“ ماہین کے انداز میں، معصومیت اور شرمندگی کا ملا جلا تاثر تھا۔
 سفینہ جس انداز میں واش روم میں گئی تھی، ماہین کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اپنے آنسو چھپانے کی کوشش میں
 وہاں سے گئی ہے۔

وہ ایک شدید قسم کے احساس جرم میں مبتلا ہو کر بڑی بے چینی سے سفینہ کے باہر آنے کا انتظار کر رہی تھی۔
 اور جب وہ باہر آئی تو اس کی آنکھیں چٹکی کھار ہی تھیں کہ وہ بہت روکی ہے۔ ماہین نے بے ساختگی سے گلے
 لگا کر سوری تو کہہ دیا تھا مگر وہ ایک ہنر تیر میں غوطہ زن تھی کہ آخر سفینہ کی یہ کیفیت کیونکر ہوئی؟ بات مذاق سے ہو



ااااااں تک کیوں پہنچی؟

”اس اوکے.....“ سفینہ نے بہت آہستگی سے ماہین کے بازوؤں کا حلقہ توڑا اور اس کی طرف دیکھے بغیر بیڈ کی طرف بڑھ گئی۔ ماہین اپنی جگہ مجسمے کی طرح استادہ تھی..... درحقیقت اسے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی۔ سفینہ بیڈ پر دیواری کی طرف کروٹ کیے لیٹ چکی تھی۔ ماہین کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ پلٹ کر اس کی طرف دیکھے..... حالانکہ دل چاہ رہا تھا کہ سفینہ کے پیچھے پڑ جائے اور رونے کی وجہ پوچھے۔ چند لمحات عالم سکوت میں رہنے کے بعد وہ سوچ بچ بورڈ کی طرف بڑھی اور تیز روشنیاں مغل کر دیں..... اب کمرے میں ہلکی سی روشنی تھی وہ بھی باہر سے کھڑکی کے راستے چھن کر آرہی تھی۔

☆☆☆

تاجور کی حیرت انتہا پر تھی..... زارا ابلانے پر بھی ڈانٹنگ میں نہیں آئی تھی۔ کجایہ سارا دون مہمانوں کی آمد پر بے پایاں خوشی کا اظہار کرتی نظر آتی تھی۔ پھر آہستہ، آہستہ حیرت پر غصہ غالب آنے لگا تھا یہ تو اعلیٰ درجے کی بداخلاقی اور بدتمیزی تھی۔ چاہے برائے نام کھانا کھاتی مگر مہمانوں کے ساتھ تو بیٹھنا چاہیے تھا۔ ”وہ بے بی کا کیا نام ہے؟“ لیڈی صوفیہ اپنے ذہن پر زور ڈالنے لگیں۔

”جی..... زارا.....“ میرا خیال ہے شاید اس کی کوئی دوست آگئی ہے..... اس کو کچنی دے رہی ہے۔“ تاجور نے گویا خون کا گھونٹ پیتے ہوئے بات بنانے کی کوشش کی تھی۔ ساتھ ہی اندیشہ مند تھیں کہ کہیں آج بھی نہ جائے۔ سارے ڈنر کا مزہ گزر کر اسے رکھ دیا تھا لیڈی صوفیہ کی خادما میں کھانا کھانے میں ان کی مدد کر رہی تھیں۔ سوپ تو ان کی خادمہ نے اپنے ہاتھوں سے پلایا تھا۔ وہ بھی بس تین چار سوچ اس کے بعد انہوں نے مزید پینے سے انکار کر دیا تھا۔

اتنے پر تکلف اور پہلی بار گھر میں آنے والے انتہائی اہم مہمان اور وہ تنہا ان کی خاطر مدارات کر رہی تھیں۔ پرنس نے سلا سے اشارت کیا۔ تاجور کے بے حد اصرار پر تھوڑا سا گنا پلٹ میں لے کر آدھے پھلکے سے کھایا تھا۔ انواع و اقسام کے کھانے تھے۔ مگر لگتا تھا یہ سب نوکروں کے لیے لپکایا گیا ہے۔ تینوں نے اتنی احتیاط سے ڈنر کیا تھا گویا کم کھانے کے مقابلے میں حصہ لے رہے ہوں۔ سوپ میں لیڈی صوفیہ نے دو سوچ پڈنگ لی تھی، پرنس نے ایک گرم گرم گلاب جامن اور ذرا سی قلف آکس کریم لی تھی۔

ڈنر کے دوران خاصی خاموشی رہی تاجور کی کم گوئی کی وجہ ان کا دبا ہوا غصہ تھا..... جو وہ زارا پر نکالنے کے لیے بے تاب تھیں۔

پرنس کی احتیاط کی وجہ سفینہ تھی، لیڈی صاحبہ نے ہر طرح کا تکلف بالائے طاق رکھ کر یوں رشتے کی بات کی تھی گویا مدت سے ان کے درمیان اس ٹاپک پر بات ہوتی چلی آرہی ہو۔

”جانتا نہیں مجھے کیوں محسوس ہو رہا ہے کہ آپ دونوں کو کھانا پسند نہیں آیا۔ کچھ بھی نہیں لیا آپ نے..... سب ایسے ہی رکھا ہے۔“ تاجور کہے بغیر نہیں رہ سکیں۔

”ارے بھئی کیا مطلب ہے..... آج کے بعد آپ ہمیں کھانے پر نہیں بلائیں گی؟“ لیڈی صوفیہ نے اپنی چمکدار شہتی آنکھیں تاجور کے چہرے پر جمائیں، آنکھوں میں بڑی معصومانہ شرارت جھلک رہی تھی۔

”ہم سے امید بھری باتیں کرنا تاجور..... بچوں کی طرح بہلانے کی کوشش نہ کرنا۔“ وہ مزید گویا ہوئیں..... اعتماد، یقین، امید، لہجہ حسین رنگوں کی بہار کا احساس دے رہا تھا جس میں کمال اپنائیت کی شیرینی و حلاوت تھی۔



پرنس کو دادی پر ٹوٹ کر پیار آنے لگا..... درحقیقت آج کی نشست میں تو بات ہی اس کی ہونی چاہیے۔ جو غیر موجود ہونے کے باوجود چاروں اور براہمن تھی۔
”یہ سب تو نصیب کے کھیل ہیں لیڈی صوفیہ..... اگر آسان پر طے ہو گیا ہے تو زمین پر celebrate بھی ہوگا۔“

”انشاء اللہ.....“ لیڈی صوفیہ نے تاجور کا جملہ مکمل ہوتے ہی برجستہ انشاء اللہ کہا..... انداز ایسا تھا جیسے پچہ ماں کو دیکھ کر ہنس رہا ہے.....

تاجور نے یہی بات خاص طور پر ٹوٹ کی تھی کہ لیڈی صوفیہ اور پرنس کی ظاہری آرائش میں بہت اہتمام تھا مگر گفتگو میں سادگی اور معصومیت تھی۔ ذرہ برابر تصنع کی رقت نہیں تھی۔

حالانکہ دونوں اپنے ظاہر سے کھلا دھوکا دیتے تھے۔ ملبوسات، لوازمات، خوشبو یاات..... سب کچھ درجہ اول کا کر دیکھنے والے پر رعب و ہیبت طاری ہو جائے۔ صرف ایک نگاہ کے بعد دھاک بیٹھ جائے لیکن جب بات کریں تو انداز ایسا جیسے دریا فطرت کے طے شدہ راستے پر بہتا ہے..... بے حد فطری، بے ساختہ، سادہ اور متحیر کر دینے والی معصومیت.....

تاجور مدتوں سے ایک مخصوص سماجی دائرے میں متحرک تھیں..... لیکن اپنی بچیوں کی معصومیت کے تجربے سے

گزرنے کے بعد آج پہلی بار اندازہ ہوا تھا کہ فطرت جب بے ساختگی سے اپنا اظہار کرتی ہے تو کسی بھی عمر میں معصومیت کا مظاہرہ دیکھا جاسکتا ہے۔

وہ دل کی گہرائیوں سے اپنے مہمانوں کی قدرا افزائی کر رہی تھیں۔ بیٹی کی ماں ہونے کے ناتے حد درجہ محتاط ضرورتیں مگر پرنس کو انہوں نے بہت اپنا، اپنا سامحوس کیا تھا۔ اعتماد، سادگی اور معصومیت کے علاوہ کوئی اور خیال آکر نہیں دیا تھا۔

پرنس نے جوں مرد کو تو کوئی بھی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا..... ان کی بیٹی کے لیے تو باقاعدہ پیام دیا گیا تھا..... اتنے بڑے شہر میں اچانک ہی امتیاز سے سرفراز ہو گئی تھیں۔

"formalities میں ٹائم ضائع نہیں ہونا چاہیے۔ وقت سے زیادہ قیمتی کچھ نہیں..... اب یہ دیکھیے ninety years کی ہو رہی ہوں..... جب دنیا سے رخصت ہونے کا وقت آئے گا تو فرشتے ایک سیکنڈ پہلے میں لٹیں دیں گے۔"

اہل بات کے اختتام پر لیڈی صوفیہ نے چھوٹا سا تہقیر لگانے کی کوشش کی مگر اچھو لگ گیا..... خادمہ نے جلدی پائی کا گلاس اٹھا کر پیش کیا۔

پرنس جو لیڈی صوفیہ کی باتوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا بہت مسرور نظر آ رہا تھا، لیڈی صوفیہ کی کھانسی سے فکر نہ ہو کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔
دو گھنٹہ پانی پی کر وہ تارل ہو گئیں۔

"are you ok grand mom?" پرنس نے جیڑ دھکیل کر تیزی سے لیڈی صوفیہ کے قریب آکر سوال کیا۔ انہوں نے نم آنکھوں سے پرنس کی طرف دیکھا۔

"do't bother darling" (پریشان مت ہو بیٹا) تاجور اپنائیت کا فطری مظاہرہ دیکھ کر مبہوت ہو گئیں..... اور لطف اندوز ہوئیں، ڈنر کے بعد وہ ڈرائنگ روم میں کافی ٹیبل کے ارد گرد آکر بیٹھ گئے۔ اب لیڈی صوفیہ کی خادما میں ڈنر کر رہی تھیں۔

تاجور کا ذہن گھوم پھر کر زارا میں جا اٹکا تھا۔ آج جو حرکت زارا نے کی تھی، ان کے حساب سے وہ معاف کرنے کے قابل نہیں تھی۔

کافی پینے کے دس منٹ بعد لیڈی صوفیہ اور پرنس اپنے گھر کے لیے روانہ ہو گئے تھے..... پرنس نے ایک نگاہ لاشعوری طور پر ہی سہی زارا کی تلاش میں ضرور دوڑائی تھی۔ والہانہ استقبال کرنے والی لڑکی اچانک کہاں غائب ہو گئی تھی۔

☆☆☆

"my dreams, my wishes" پرنس کسی کا بھی ہو..... سفینہ کو فرق نہیں پڑتا مگر مجھے پڑتا ہے۔" اسے مسلسل ایک کڑھن لاحق ہو چکی تھی۔ زارا ڈارک گرے جم، جم کر تاشب خوابی کا لبادہ پہن کر اپنے دُکھتے سر میں تیل کا مساج کر رہی تھی کہ دروازے پر کسی نے زوردار انداز میں دستک دی۔ وہ اپنے دھیان سے چونک پڑی تھی۔

اس نے اپنے تیل سے چمکتی پتیلیوں کی طرف دیکھا۔ دروازہ مقفل تھا۔ کون کہنے سے بات نہیں بننا تھی، اٹھ کر کھولنا تھا۔ وہ بادل نا خواستہ اپنی جگہ سے اٹھی اور دروازے کی طرف بڑھی۔ منتشر و مایوس ذہن میں ابھی کسی نئے خیال و اندیشے نے جگہ نہیں بنائی تھی۔ تاجور کے رُوبل کی طرف تو اس کا دھیان بھی نہیں گیا تھا ابھی تو وہ حسرتوں کا

ماتم کرنے سے بھی فارغ نہیں ہوئی تھی۔

دروازہ کھولا اور کوفت بھری نگاہیں اٹھا کر سامنے دیکھا۔ تاثرات سرعت سے تبدیل ہو گئے۔ تاجور کڑے تیور سے اس کی طرف گھور رہی تھیں۔

زارا کو ان کی نگاہیں پڑھنے میں دیر نہیں لگی فوراً اپنی کارگزاری ذہن میں گھوم گئی۔

”یہ کیا بدخیزی ہے؟ کہاں توکل سے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا، کہاں ایک دم سے غائب ہو گئیں..... گیسٹ کیا سوچ رہے ہوں گے۔ وجہ بتانا ہوگی..... اس سے زیادہ مجھ سے برداشت نہیں ہوگا۔“ تاجور ایک دم پھٹ پڑی تھیں۔

”اماں..... پتا نہیں اچانک میرے سر میں شدید درد شروع ہو گیا۔ یہ دیکھیں میں oiling کر رہی ہوں۔“ اس نے ثبوت کے طور پر اپنے سر کی طرف اشارہ بھی کیا اور ہاتھ پھیلا کر بھی دکھا دیے۔

تاجور نے چونک کر گہری نظر سے اس کے چہرے پر نگاہ کی۔

”دوا لے لیتیں..... کم از کم مجھے بتانی تو سہی تم..... جتنی دیر گیسٹ رہے میرا خون کھولتا رہا..... اگر تم ان کے سامنے نہ آئی ہو تیں تب بھی برا نہیں لگتا، ان کے ساتھ بیٹھیں..... باتیں کیں اور اچانک غائب ہو گئیں۔ میں لیڈی صوفیہ کے پاس سے اٹھ کر تمہارے پاس نہیں آ سکتی تھی۔ اس لیے کہ مجھے تم سے ہمیشہ کسی حماقت ہی کی توقع رہی ہے، میں نے سوچا پتا نہیں کیا بات ہے..... میرا موڈ خراب ہو گیا تو تمہانوں کو فیس کرنا مشکل لگے گا۔ ذرا سا سر میں درد تھا۔ تم نے سارا ماحول خراب کر دیا۔ لیڈی صاحبہ نے کئی مرتبہ تمہارا پوچھا۔“ تاجور سر درد کا سن کر قدرے دھیمی ضرور پڑ گئی تھیں مگر لہجہ ہنوز یکساں تھا۔

”اماں..... سر میں درد ہو تو مسکرایا نہیں جاتا..... اور منہ لٹکا کر تمہانوں کے سامنے بیٹھنا اچھا نہیں لگتا۔“ زارا نے بولتے ہوئے رخ موڑ لیا۔ طبیعت بوجھل تھی تاجور سے سوال جواب مزید بوجھ بڑھا رہے تھے تاہم پھر بھی اس نے بڑے تحمل سے ماں کو جواب دیا۔

”اب اور آج وہ ہمارے لیے وہ بہت خاص ہو چکے ہیں۔ انہوں نے پہلی ملاقات میں ہی سفینہ کو پروپوز کر دیا ہے۔ پروپوزل اتنا اچھا ہے کہ اس پر غور کرنا پڑے گا۔ سفینہ سے بات کرنا پڑے گی۔ اس لیے اب تم یہ بات اپنے ذہن میں بٹھاؤ کہ وہ جب بھی ہمارے گھر آئیں گے انہیں اسپیشل انٹرٹین کرنا ہے۔“ تاجور نے تاکید کے لہجے میں انگلی اٹھا کر کہا۔

اور وہی قصہ انجانے میں چھیڑ بیٹھی تھیں جس کی وجہ سے زارا کے اعصاب مل کر رہ گئے تھے۔

نہ صرف یہ کہ وہ لیڈی صوفیہ صاحبہ اور پرنس کی اہمیت کا احساس دلاری تھیں! اپنی سوچ بھی مختل کر رہی تھیں..... زارا نے کھڑے، کھڑے اندازہ نہیں کیا بلکہ یقین کر لیا کہ تاجور دل و جان سے اس پروپوزل کو قبول کرنے کے لیے تیار ہیں، وہ اندر سے بوسیدہ کاغذ کی طرح خمیر ہو کر رہ گئی۔

تاجور اس کے رخ پھیرنے کو اپنے غصے کا دھڑل سمجھ رہی تھیں۔ درحقیقت وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں کہ وہ..... بے خبری میں اسے الٹی چھری سے ذبح کر رہی ہیں۔

اس کی بیان کردہ وضاحت کے بعد مزید لعن طعن کرنا انہیں خود بھی اچھا نہیں لگا فوراً ہی دروازے سے واپس پلٹ گئی تھیں۔ ان کے جاتے ہی زارا نے دروازہ دوبارہ بند کر کے مقفل کر دیا۔

”سنا ہے لوگ برباد بھی ہوتے ہیں..... مگر اس طرح کھڑے، کھڑے کون برباد ہوتا ہے۔“ اس کی ذہنی کیفیت اس بچے کی طرح تھی جو بازار میں ماں کو پکڑ، پکڑ کر بھیج رہا ہو اور پسندیدہ کھلونے کی طرف اشارہ کر رہا ہو..... کہ یہی لینا ہے اور وہ کھلونا ماں کی دسترس سے باہر ہو..... تمام تر ضد، ہنگامے کے باوجود کھلونا ملنے کے

☆☆☆

لیڈی صاحبہ اول تو تقریبات میں جانے سے ہی گریز کرتی تھیں۔ کبھی جانا پڑ جاتا تھا تو گھر پہنچتے، پہنچتے اتنی غڑھال ہو جاتی تھیں کہ خادما میں انہیں تمام کمر سیدھا بیڈروم کا رخ کرتی تھیں۔ تا توانی کے باعث اشارے سے پرس کو شب بخیر کہتی تھیں۔ انہیں سونے سے پہلے کچھ میڈیسن بھی لینا ہوتی تھیں اس لحاظ سے بھی وقت کا ادراک کرنا ہوتا تھا۔ گزشتہ دس، پندرہ سال میں کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ کسی ڈنر کی واپسی کے بعد دونوں دادی، پوتا کچھ دیر کے لیے ساتھ بیٹھے ہوں۔

اعصابی کمزوری اس درجہ پر پہنچ چکی تھی کہ جب تھکاوٹ ہر مصلحت سے ماورا ہو جاتی ہے اور اپنی جان ہی کی فکر پڑ جاتی ہے۔

البتہ پرس کے احساسات بہت لطیف و خوشگوار تھے..... سامنے بڑے روشن امکانات تھے۔ وہ اندازوں سے کھیل رہا تھا۔

تا جو رسفینہ کو بتائیں گی..... وہ شاید حیران ہو کر سننے کی، اس کے بارے میں مختلف انداز سے سوچے گی۔ اور جب وہ اس کے بارے میں سوچے گی تو اسے ہٹا چل جائے گا..... وہ سونے سے پہلے اپنے دل کی طرف متوجہ ہوگا..... اس کا دل اسے بالکل درست اطلاع دے گا۔ دھڑکنیں یا تو طریقہ گیت چھڑائیں گی یا سٹ کر سٹکر کر خدشہ ظاہر کریں گی..... وہ گھر میں چلتے پھرتے سفینہ کے خیالات موصول کر لے گا اس کی طاقتور گہری خاموشی، خیالات کی ترسیل کو کافی ہوتی تھی اسے متعلقہ فرد یا شخص سے دو بدو گفتگو کی خواہش نہیں رہتی تھی۔ مراقبہ کی مشق کرتے ہوئے ایک طویل عرصہ ہو گیا تھا اور وہ اس انکشاف سے گزر چکا تھا کہ خاموشی بہت مؤثر کلام ہوتی ہے۔

اس کے دل کی کیفیات اسے یقین دلارہی تھیں کہ ابھی ماں، بیٹی کا رابطہ نہیں ہوا۔ اس نے لان میں سفید مرمری سنگی نشست پر بیٹھ کر تا جو ر کی طرف توجہ کی دل کی کیفیت میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوا..... ایک جامد سا خاموس ہوا..... ”شاید وہ گریڈ نام کی طرح تھک کر سو چکی ہیں۔“ اس کا ذہن سفینہ کی طرف متوجہ ہوا..... اسے طبیعت میں بوجھ محسوس ہوا یوں جیسے کسی نے محبوب کا خط جنکے سے تھما کر کہا ہو کہ اس نامے میں بڑی مجبوریوں کی وضاحتیں ہیں..... پڑھنے سے پہلے ہی جدائی کا ماتم ہو..... تحقیق کے سفر میں کبھی ندی چڑھ جاتی ہے۔ کبھی پاؤں میں مہندی لگ جاتی ہے۔

☆☆☆

انسان کی نفسیات کی کچھ بنیادی خصوصیات ہیں..... پرانے زمانے میں صدری علوم (سینہ در سینہ چلنے والے علوم) کے ذریعے ایک بات واضح کی گئی اور اسے محاورے کی صورت میں بیان کیا گیا کہ آگ اور پھونس اکٹھے نہیں رہ سکتے۔

فطرت نے ہر شے کو درخون میں تخلیق کیا اور دونوں رخوں کو باہمی کشش کے قانون کا پابند کر دیا۔ پھر اس کے لیے بھی قوانین وضع کیے..... اخلاقیات کا شعور اور فطری پابندیوں کے فضائل و فوائد سے آشنائی دی۔ پرس مردانہ وجاہت، بہترین اخلاقیات جس میں عورت کی عزت کرنا، ممبر و برداشت، نعمتوں کی کثرت کے باوجود سادگی و مصومیت، انسانی ہمدردی، اپنی ذات سے فائدہ پہنچانے کی دلی آمادگی..... روحانی مسرت سے چمکتی آنکھیں..... جس طرف دیکھتا تھا مہبت کر دیتا تھا۔

یہ کہاں بچیں کہ دل ہے

زارا جیسی لڑکیاں جو خواہش و نفس سے مغلوب رہتی ہیں۔ وہ جنس مخالف کی بر قوت کشش کے سامنے چاروں شانے جت ہو جاتی ہیں۔ اور اپنی اس مغلوبیت کو عشق و محبت کا نام دیتی ہیں۔ درحقیقت وہ اپنی ذات کا ایمان داری سے محاسبہ کرنے کے لائق بھی نہیں ہوتی ہیں۔

نفس کے حیوانی تقاضوں کو عشق و محبت کے اعلیٰ صفاتی ناموں سے موسوم کر کے اپنی پھری ہوئی خواہشات کو جائز ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ نفس حیوانی جنت سے بے دخلی کا باعث بنا اور قیامت تک کے لیے نفس و روح کی کشمکش کا آغاز ہو گیا۔

خیال کی اڑان کو روکنا ایسا ہی ہے جیسے اڑتے ہوئے پرندے کے پر باندھنا..... بکر سماجی رویے جگہ، جگہ پر باندھنے کی کوشش سے باز نہیں آتے۔ خواہش مٹتی ہے، نہ خیال کو جکڑا جاسکتا ہے۔

عمود و نمائش کی جلالت و بے قراری انا، حسد، خود پرستی، خود غرضی یہ روح کی وہ بیماریاں ہیں جو مرتبے میں نتیجے میں کینسر سے کسی بھی طرح کم نہیں۔ بیماری و صحت کا فرق ایسے ہی ہے جیسے روشنی و اندھیرے کا فرق..... ان روحانی بیماریوں کے ہوتے کسی خیر کی توقع کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی دیوانے کو عتقان حکومت تھا دینا۔

ان روحانی بیماریوں کے ہوتے ذہانت کبھی فراست میں تبدیل نہیں ہو سکتی۔ ذہانت تو شیطان کو بھی عطا کی گئی۔ فراست مژدب روح کا طرہ امتیاز و شوکت ہے۔ روحانی بیماریوں کی وجہ سے انسانوں کا جم غفیر کسکتی ہوئی زندگی گزار رہا ہے۔ ہر دوسرا انسان تقدیر کا گلہ کرتا نظر آتا ہے۔

روحانی بیماریوں کی وجہ سے انسان اپنے دماغ کا سب سے قیمتی اور بہترین حصہ استعمال کرنے سے قاصر رہتا ہے اور اسی وجہ سے فطرت کی پُر خلوص رہنمائی سے محروم رہتا ہے..... شیطانی ذہانت کو استعمال کرتے ہوئے فخر

یکتارا

آسان سے ٹوٹے ایک تارے کی روداد جس نے محبت میں خود کو فنا کر ڈالا..... آخری صفحات پر **عبدالرب بھٹی** کے قلم کی پرواز

شام شب

ڈاکٹر ساجد امجد کے قلم سے تاریخ

کے خاموش اور گمشدہ لمحات کا دلنریب احاطہ

باغی

ایک نڈر اور بے باک انسان کے کارناموں کا اگلا پڑاؤ..... سازشوں کی گرہیں کھولتی ایک خوبصورت داستان

وقت

دھیرے دھیرے گزرنے والے لمحات میں طوفان کی آہٹ..... **حسام بٹ** کے خیالات کی روای

اکتوبر 2017ء کا خوبصورت شمارہ ایک نظر میں

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

سینسٹریل

مزید

خلو طوطی محفل

محفل شہر و سخن

اور

لک مشرق حیات کی جستجو

تنویر ریاض۔ ثمر عباس۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید
منظر امام اور اسما قادری کی خوبصورت کہانیاں

اس کی جگہ

۱۰۱۰۱ رعونت و احساس برتری کے خوفناک بوجھ سے بوجھل رہتا ہے، انتشار کی سیاست کھیلتا ہے۔ غلط
۱۰۱۰۱ پھر بچ کر ہیرے کا منافع چاہتا ہے۔

۱۰۱۰۱ اراکند ذہن کے ساتھ صرف اور صرف اپنی خواہشات کی طرف متوجہ رہتی تھی۔ اسے آج کے بعد صرف اور
۱۰۱۰۱ صرف سوچنا تھا کہ پرنس کو ہر صورت اس کا ہونا چاہیے۔ اگر یہ ممکن نہیں تو سفینہ کے ساتھ بھی نظر نہیں آتا
۱۰۱۰۱ اس نے اپنے طور پر پرنس کے گھر جانے کا فیصلہ کر لیا۔

۱۰۱۰۱ بوڑھی دادی سے دوستی کر کے وہ اس گھر میں جب مرضی جاسکتی تھی اور انہیں یقین دلا سکتی تھی کہ وہ سفینہ سے
۱۰۱۰۱ اٹھ درجہ بہتر ہے۔

☆☆☆

تاجور نے آفس پہنچ کر پرنسکون لمحات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سب سے پہلے سفینہ کو فون ملایا۔ حالانکہ گمان
غالب تھا کہ وہ کلاس لے رہی ہوگی..... مگر دل چل رہا تھا کہ بیٹی کو وہ خبر پہنچائیں جس نے رات سے انہیں خوشگوار
حیرت میں مبتلا کیا ہوا تھا۔

اور اس وقت پھر خوشگواریت کا سامنا تھا، سفینہ نے کال وصول کر لی تھی۔

”السلام علیکم اماں.....“ اس کی مترنم آواز ساعت سے ٹکرائی لہجہ جھٹاٹھا۔

”وعلیکم السلام بیٹا.....“ بونی ایک دم خیال آیا اور میں نے جہیں ڈائل کر دیا اور فون ملاتے ہی پہلا خیال آیا کہ
اس وقت تو تم کلاس میں ہوگی..... کیا کلاس چھوڑ کر باہر آئی ہو.....؟“ بیٹی کی آواز نے احساسات سبک کر دیے۔

”پہلا پیر ہی ختم ہوا ہے اماں..... ابھی بریک ہے۔ خیریت ہے نا، آج تو آپ نے صبح، صبح فون کیا؟“
سفینہ کے لہجے میں تجسس نمایاں تھا۔

”اللہ کا شکر ہے۔ رات لیڈی صاحبہ اور پرنس کے ساتھ ملاقات بہت اچھی لگی..... آج کے زمانے میں تو
دونوں دادی، پوتا..... عجوبہ ہی ہیں.....“ وہ دھیرے سے ہنسی۔

”جی.....؟“ سفینہ کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں..... کوئی منفی خیال تو نہیں آیا کیونکہ تاجور بہت خوشگوار
موڈ میں بات کر رہی تھیں..... مگر لفظ ”عجوبہ“ نے مغالطے میں ڈال دیا۔ وہ متحیر ہی تھی۔

”اتنے سادہ اور معصوم یقین نہیں آرہا کہ یہ اسی دنیا کے باسی ہیں، صاف..... سیدھی باتیں کرتے
ہیں..... میری حیرت کی انتہا نہیں ہے..... ابھی تک حیران ہوں کہ لیڈی صوفیہ نے تمام تکلفات ایک طرف کرتے

ہوئے پرنس کے لیے تمہیں پروپوز کر دیا۔“ سیل فون سفینہ کے ہاتھ سے پھسلنے پھسلنے بچ گیا..... وہ گنگ رہ گئی کوئی
برجستہ بے ساختہ لفظ بھی منہ سے نہیں نکل سکا۔

”ہیلو، ہیلو..... سفینہ میری آواز آرہی ہے؟“ تاجور اس کی خاموشی پر چونک کر ہیلو، ہیلو کرنے لگیں گمان ہوا
کہ شاید رابطہ منقطع ہو گیا ہے۔

”جی اماں..... سن رہی ہوں۔“ یہ مشکل یہ چند الفاظ ادا ہوئے۔

”ہاں تو میں تمہیں بتا رہی تھی کہ وہ لوگ تمہیں پروپوز کر چکے ہیں۔ اب تم ویک اینڈ پر آ جاؤ تو آرام سے بیٹھ کر
ڈسکس کرتے ہیں۔ میں آج ہی تمہاری کراچی کے لیے سیٹ کفرم کرا دیتی ہوں۔“

تاجور کے لہجے سے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بہت خوش اور مطمئن ہیں۔

سفینہ کا سکتہ ضرور ٹوٹا تھا مگر ذہن سیلاب کے پانی کی طرح ادھر ادھر دوڑ رہا تھا..... حیرت نے فوری رد عمل کی
صلاحیت سلب کی ہوئی تھی۔

یہ کہاں ہیں کہ دل ہے

”ہیلو..... سفینہ.....“ وہ پھر رابطہ ٹوٹنے کے خیال سے اندیشہ مند ہوئیں۔
 ”جی اماں سن رہی ہوں.....“ سفینہ نے گویا حلق میں پھنسی گھٹھلی نیچے اتاری۔
 ”بس..... اب تم بھی کلاس لینے چلی جاؤ گی اور میرا سٹم بھی آن ہو چکا ہے..... کئی میلہ آئی ہوئی ہیں بعد میں تم سے بات کروں گی۔“ تاجور نے لیپ ٹاپ کی اسکرین پر نظر جما کر اب ذرا بد لے ہوئے لہجے میں بات کی۔
 ”فرانٹل مہی نے ذہن کا رخ موڑ دیا تھا۔
 ”اوکے اماں.....“ سفینہ نے روبوٹ کے انداز میں کہا تھا۔ درحقیقت خلاف توقع خبر کے بعد انسانی دماغ کا فطری نظام وقتی طور پر معطل ہو جاتا ہے۔

☆☆☆

ماہین، سفینہ کو تلاش کرتی ہوئی بالآخر لائبریری پہنچ گئی۔ کیونکہ وہ تمام جگہیں جہاں سفینہ کی موجودگی کا امکان ہو سکتا تھا وہ دیکھ چکی تھی۔

لائبریری میں زیادہ رش نہیں تھا، دو تین ٹیبل پر کچھ اسٹوڈنٹس بیٹھے نظر آئے مگر ان میں بھی سفینہ نہیں تھی۔ ایک پریشانی کی کیفیت نے اسے اب اپنے حصار میں لے لیا..... رات کو اس کا بدلہ ہوا روپیہ، اترا ہوا چہرہ اور سرد لہجہ دیکھنے کے بعد اسے ایک پل چین نہیں تھا۔ صبح کی آفریقہ میں اسے سفینہ سے دوپل سکون سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔ کلاس میں بھی نشست آگے پیچھے ملتی تھی۔ سیریز ختم ہونے کے بعد وہ جانے کیسے آگے بھاگ کر نکل گئی تھی۔ ماہین کو خواہ مخواہ محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اس سے خفا ہے۔ بے چینی کی وجہ یہی احساس تھا۔
 پھر یک دم اس کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں..... سفینہ کتاب تلاش کرتی نظر آگئی۔ ماہین گویا چھلانگیں مارتی اس تک پہنچ گئی۔

”ناراض ہو؟“ اس نے اسٹوڈنٹس کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔
 ”کس خوشی میں.....؟“ سفینہ کی فطری مسکراہٹ نے ماہین کو ایک زور کا جھٹکا لگایا۔ وہ اپنے سادہ اور خوش اخلاق لہجے میں بہت آہستہ سے پوچھ رہی تھی۔
 ”صبح سے لفٹ ہی نہیں کرا رہی ہو..... میں سمجھی.....“
 ”اچھا سمجھا کرو..... برا سوچنے سے کچھ نہیں ملتا.....“ سفینہ نے شوخ انداز میں سرگوشی کی تو ماہین کو مارے حیرت کے جیسے چکر آنے لگے۔

”تم خیریت سے تو ہوتاں.....؟“ ماہین بدقت گویا ہوئی تھی۔

”لائبریری میں کھڑی ہوئی ہوں..... غور سے دیکھو..... یہ کلیک نہیں ہے۔“ سفینہ مطلوبہ کتاب لے کر لائبریرین کی طرف بڑھ گئی جو بڑے کڑے تیور کے ساتھ دونوں کو گھور رہی تھی غالباً وہ بے دھیانی میں شاید کچھ اونچا بول رہی تھیں۔ سفینہ اس کی نظروں سے قدرے گڑبڑ گئی۔ جبکہ ماہین نے ڈھٹائی سے نظروں کا رخ موڑ لیا تھا۔ اور بڑی پھرتی سے باہر نکل گئی۔ اور باہر نکل کر ایک طرف کھڑی ہو کر سفینہ کے باہر نکلنے کا انتظار کرنے لگی۔
 سفینہ کو باہر آنے میں چند منٹ لگ گئے تھے۔ وہ بھی بڑی عجلت کے انداز میں باہر آئی تھی، اسے یقین تھا کہ ماہین انتظار کر رہی ہوگی۔ ماہین کے قریب سے سیدھی گزری تو ماہین کو شرارت سوچھی۔

”ہاؤ.....“ اس نے سفینہ کو جیسے ڈرانے کے بجائے چونکا یا۔

سفینہ نے اپنے پہلو میں دیکھا اور ماہین کی طرف دیکھ کر مسکرا دی۔

”یہ بچوں والی حرکتیں چھوڑ..... آخر کب بڑی ہوگی؟“ اس نے کتاب ماہین کے کندھے پر رکھ کر دباؤ

۱۱۔ ”بہتین کیں۔

”مجھے نہیں بننا تم جیسا..... ہم ”کنٹراسٹ“ میں ایسے ہی ٹھیک ہیں... بوڑھی روح.....“ اس نے بھی سفینہ کے
میں ہلکی کاٹ کر بدلہ لے لیا۔

”اُف.....!“ سفینہ نے بازو سہلایا۔

”تھینک گاڈ..... تمہارا موڈ تو ٹھیک ہوا..... اب تمہاری فوٹو پہلے والی ہے۔“ سفینہ کی حسین دلفریب مسکراہٹ
نے جیسے مایہن کو ہلکا ہلکا کر دیا تھا۔

”میرے موڈ کو کیا ہوا تھا..... میں تو ٹھیک تھی..... بس تم یونہی اندازے لگاتی رہا کرو..... فضول لڑکی.....“
سفینہ نے خوشگوار موڈ میں چھیڑ چھاڑ کی تو مایہن کو یقین آ گیا کہ اس کے اپنے خیالات واقعی مفروضوں پر مبنی
تھے۔ سفینہ کو کوئی مسئلہ نہیں، دونوں وسیع احاطے سے گزر کر کاریڈور کی طرف بڑھ رہی تھیں۔
سفینہ نے کن انکھیوں سے مایہن کی طرف دیکھا۔

”مایہن کو دھکا کا خیر سناؤں یا ابھی رہنے دوں.....!“ وہ متذبذب ہو کر سوچ رہی تھی۔ حالانکہ خیر ایسی تھی جو
ہمیشہ ہم جولی کے ساتھ سب سے پہلے بانٹی جاتی ہے۔

مگر خطرہ یہ تھا کہ مایہن مفروضوں پر اتنا تنگ کرتی تھی خبر ملنے کے بعد تو اس نے ناطقہ بند کر دینا تھا۔
اور پھر ابھی بات نامکمل تھی..... تا جو تو اسے کراچی بلارہی تھیں..... آنے سائے بیٹھ کر نہ جانے کیا باتیں ہوتا
تھیں..... وہ فون پر تو اسی طرح ظاہر کر رہی تھیں گویا اب جو بات بھی ہے وہ فون پر نہیں سائے بیٹھ کر ہی ہوگی۔

”اللہ جانے وہ کیا بات ہے..... جو اماں فون پر کر کے ایک side نہیں ہونا چاہ رہیں۔“
”افوہ..... اب کیا ہوا.....؟ کہاں پہنچی ہوئی ہو؟“ موڈ پر مڑتے ہوئے مایہن نے ٹھوکا دیا..... جیسے اس کی
خاموشی سے چڑکنی ہو۔

”ہیڈ شروع ہونے والا ہے۔ کوئی خاص تیاری نہیں مجھے تو ٹینشن شروع ہوگئی ہے۔“
”کنٹاشوق ہے تمہیں ٹینس رہنے کا..... شکر ہے خدا کا..... ٹینشن، مال میں ٹینس سیل ہوتی ورنہ تم تو فوراً خرید کر
لے آتیں۔“ مایہن نے مصنوعی غصے سے گھورا۔

”تمہیں بخاری صاحب کا پتا ہے ناں..... کیسے کامپلی میٹس پاس کر دیتے ہیں۔ آسرا ہی نہیں کرتے۔“
”ہر روز کسی نہ کسی کی باری آ جاتی ہے۔ تم اکیلی نہیں ہو.....“ مایہن نے بے پروائی سے کندھے اچکائے۔
”تم تو ایک نمبر کی ڈھیٹ ہو.....“ سفینہ نے مایہن کا بازو پکڑ کر زور سے ہلایا۔ سائے سر بخاری کلاس میں
جاتے دکھائی دیے۔ ساری شوخیاں دھری کی دھری رہ گئیں۔ دونوں نے جیسے دوڑ لگائی تھی۔ کیا باتیں کر رہی تھیں
کچھ یاد نہیں رہا۔

☆☆☆

اسٹوڈیو میں بہت مدھرم سیتی کا سحر طاری تھا۔
وہ بلائینڈر جو صبح کے نو خیز اجالے کا استقبال کرنے کے لیے سیٹ دیے جاتے تھے آج پھیلے ہوئے تھے۔
پنس قیمتی، پُر شکوہ آرام دہ کرسی پر دھیرے، دھیرے ہلکورے لے رہا تھا۔ ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ کھیل
رہی تھی۔

اس کی توجہ سفینہ کے دل پر تھی..... اور اپنے دل کی دھڑکنوں کو دوسری طرف کے خوشگوار احساسات سے مطلع
کیا..... وہ اس وقت روحانی مسرت سے دوچار تھا..... رات والا بو جھل پن طبیعت پر نہیں تھا۔

یہ کہاں بچیں کہ دل ہے

انسانی احساسات بھی کیا کرامات دکھاتے ہیں..... مایوس، ناامید، انسان کوئی غیر متوقع خوش خبری سن کر لکھوں میں بچھی کیفیات سے نکل جاتا ہے۔

اور بعض اوقات خوشی کی انتہا پر حادثات پیش آتے ہیں..... اور کیفیت میں تبدیلی واقع ہو جاتی ہے جو اکثر طویل عرصے تک قائم رہتی ہے۔

وہ تو کچھ ضروری کام نپٹائے اسٹوڈیو میں داخل ہوا تھا کہ اندر داخل ہوتے ہی یوں محسوس ہوا جیسے کوئی وزن اٹھایا ہوا تھا جو وہ اسٹوڈیو کے دروازے سے باہر رکھ کر اندر داخل ہوا تھا۔

بس یونہی..... بغیر کسی خیال پر مرکوز ہوئے اسے اپنی روح بے حد ہلکی پھلکی محسوس ہوئی۔ وہ اپنی کیفیت پر چونکا نہیں بس پر مسرت احساس سے بھل اٹھا تھا..... گنگنائے کوئی جاہا..... اور دل سے سفینہ کے تصور میں ڈوب جانے کو جی چاہا..... اس نے نصرت فتح علی کی آواز میں گایا ہوا بلے شاہ کا کلام منتخب کیا۔

تازہ پھول روزانہ اسٹوڈیو میں کرشل کے گلدانوں میں سجادیے جاتے تھے۔ جب وہ اسٹوڈیو میں داخل ہوتا تو ایک دلنواز سحر انگیز خوشبو اس کے استقبال کو موجود ہوتی تھی۔

جے تو رب نون منانا

پہلوں یارنوں منا

رب من چاندے

یارنوں منانا اوکھالے

(اگر تو رب کو منانا چاہتا ہے تو پہلے محبوب کو منا، رب مان جاتا ہے لیکن روٹھے محبوب کو منانا بہت مشکل ہے۔) پتا نہیں کیوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ خفا ہے، کوئی شکایت ہے..... مگر چانک سے محسوس ہوا کہ وہ کچھ سوچ رہی ہے اس کا حال اچھا ہے۔ خوش ہے، خوشی کی انتہا پر بے یقینی کی کیفیت بھی بھرپور قوت سے حملہ آور ہوتی ہے۔

”یونہی کہیں میرا دل مجھے دھوکا تو نہیں دے رہا؟“

عین اسی لمحے لیڈی صوفیہ کی نازک، کمزور مگر مترنم آواز ساعت سے نگرانی۔

"when you do things from your soul, you feel a river moving in you and you feel joy." (جب کچھ بھی آپ اپنی روح کی ملل آبادگی کے ساتھ کرتے ہیں تو اپنے اندر ایک دریا کو بہتا ہوا محسوس کرتے ہیں..... مسرت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ جلال الدین رومی) "what a poetry

"what a fantasy" رومی کا حسین خیال بانٹنے کے بعد وہ اب بے ساختگی سے شاعری کی تعریف کر رہی تھیں۔

پرس صرف سنبھلائی نہیں پھرتی سے اٹھ کھڑا بھی ہو گیا۔

”آپ کس وقت آئیں گے مجھے پتا ہی نہیں چلا.....“ وہ لیڈی صوفیہ کو بے ساختگی سے اپنے مضبوط بازو کے

حصار میں لپیٹے ہوئے بہت پیار سے گویا ہوا۔

”میوزک کی وجہ سے شاید تمہیں ڈور کھلنے کا پتا نہیں چلا“ وہ بھی محبت سے لبریز شیریں لہجے میں گویا ہوئیں۔ ”تم مسکرا رہے تھے..... اور میں اللہ کی حسین مصوری سے لطف اندوز ہو رہی تھی..... اپنے خیال میں کھوئے بہت اچھے

لگ رہے تھے۔ اور مجھے ایک دم سے رومی یاد آ گیا۔ روحانی مسرت ایک خزانہ ہے..... الحمد للہ کہ تمہیں میسر آیا..... ویسے تو جب تم پر نظر پڑتی ہے ماشاء اللہ لا قوۃ الا باللہ کہنا بھی نہیں بھولتی..... اکثر لوگوں کو میں ولا قوۃ الا باللہ کہتے سنتی

ہوں مگر سورہ کہف میں ایسے ہی ہے۔ ہماری سوسائٹی میں لوگ کتنی گھسپ کرتے ہیں..... اور اس الہامی کتاب کو وقت نہیں دیتے..... اس لیے مسلم اتنا suffer کر رہا ہے۔“ وہ اپنے مخصوص انداز میں بہتی ہوئی اس کنارے

سے اس کنارے پہنچ گئیں۔

”میں نے کبھی آپ کا کوئی آرڈر آؤاؤاؤ نہیں کیا گریڈ مام.....“

”میں نے تمہیں کبھی آرڈر دیا ہی نہیں.....“ لیڈی صوفیہ نے پرنس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر پیشانی پر پیار بھرا بوسہ ثبت کیا۔

”ہم جن سے محبت کرتے ہیں، وہ ہم پر حکومت کرتے ہیں..... اور ہم خود انہیں اجازت دیتے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ دھیرے سے نہیں۔

”سفینہ کو یاد کر رہے تھے۔ بہت اچھی مصروفیت مل گئی ہے تمہیں۔“ لیڈی صوفیہ نے گہرے راز دار دوست کے انداز میں پوتے سے چھیڑ چھاڑ کی۔

”نہیں بس..... ایسے ہی.....“ پرنس نے شریر انداز میں نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر کوئی بہانہ بنانے کی کوشش کی۔

”چلو گریڈ مام سے کبھی کبھی جھوٹ بولنے میں کوئی حرج نہیں..... مگر اپنے آپ سے جھوٹ کبھی نہ بولنا..... کیونکہ..... یہ جھوٹ ایک وائرل ہے..... وہ بائی بیماری ہے۔ جو حیرت انگیز طور پر آنے والی تسلیوں تک سے روحانی مسرت چھین لیتی ہے..... جو موجود ہے اسے آنے والوں کا خیال کرنا چاہیے۔“ بولتے، بولتے انداز خود دکھائی میں تبدیل ہو گیا۔

”زندگی کھیل نہیں..... بہت بھاری دتے داری ہے..... اگر جو کوئی سمجھے.....“ وہ زیادہ دیر کھڑی رہنے کی متحمل نہیں ہو سکتی تھیں۔ نظر کا زاویہ بدلا پرنس کو خود بخود دھتکا چل گیا کہ وہ بیٹھنا چاہتی ہیں۔ اس نے فوراً کرسی ہٹچ کر ان کے قریب کی اور بہت پیار سے تھام کر بٹھا دیا۔ چھڑی قریب ہی دیوار سے ٹکادی۔ میوزک بند کر دیا۔

”پرنس.....“ لیڈی صوفیہ کی خوابیدہ سی آواز نے ماحول میں ارتعاش سا پیدا کیا۔

”میں گریڈ مام.....“

”honestly ہم لاتعداد انسانوں میں سے بہت blessed لوگ ہیں..... ہم نے سچی، خالص، محبتوں کو بھی انجوائے کیا ہے ورنہ محبت کے نام پر اس دنیا میں پاکیزہ دلوں کی بہت بے حرمتی کی جاتی ہے۔ محبت ایک اعزاز ہے۔ اسے مزار کا لنگر بنا کر رکھ دیا ہے۔ کبھی مفادات کو محبت کا نام دیا جاتا ہے کبھی مصلحتوں کو، کبھی مجبور یوں کو، میں خالص، دیانندار محبت کے ذائقے سے آشنا ہوں..... اسی لیے تمہارے گریڈ فادر سے خود کو کبھی دور محسوس نہیں کرتی۔ oh my God آسمان جیٹ پلین سے ایسے پٹ گیا تھا..... جیسے ساری دنیا کے چین کوٹے اسکاٹ لینڈ میں آگئے ہوں..... کانوں کے پردے پھٹنے لگتے تھے۔“ لیڈی صوفیہ نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔

”شکر ہے تم نے انسانیت کو کند چھری سے ذبح ہوتے نہیں دیکھا۔ موت کی آخری پچھلی..... یقیناً اس کی آنکھوں کے سامنے آخری تصویر میری ہوگی۔“ پرنس دبے پاؤں آگے بڑھا اور بٹن پش کر کے خادمہ کو طلب کیا۔ لیڈی صوفیہ کی آنکھیں بند تھیں۔ پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔

اسٹوڈیو میں بغیر اجازت اندر آنا منع تھا۔ صرف گھر کی معافی کرنے والا اسٹاف ایک مخصوص ٹائم میں اپنا کام کرتا تھا۔

C.C کیمرے کرانا کاتین کے فرائض انجام دیتے تھے۔ ہاؤس منیجر گھر میں ہونے والی تمام حرکات و سکنات سے باخبر رہتا تھا۔ رات کو سونے سے پہلے دن کے تمام معاملات سو فٹ وائر میں محفوظ کر دیتا تھا پرانے وقتوں کی طرح روزنامہ لکھنے کی نہ ضرورت تھی نہ مجبوری..... آج کے ترقی یافتہ دور میں یوں بھی ذہن، ہوشیار، کامیاب شخص وہی گردانا جاتا ہے جو وقت اور پیسے کی قدر (value) کو محفوظ کرنا جانتا ہے۔ خادمہ آگئی تھی اس کے ہاتھ میں چھوٹا

پہ کہاں بچیں کہ دل ہے

سابھت دلکش فیروزی شیشے کا گلاس تھا جس میں تازہ رس تھا۔

پرنس نے بہت پھرتی سے گلاس خادمہ کے ہاتھ سے لے کر لیڈی صوفیہ کے ہونٹوں سے لگا دیا تھا۔
بظاہر معاملہ تشویش ناک نظر آتا تھا۔ درحقیقت وہ اس وقت صرف اور صرف اپنے محبوب شوہر سے ہمکلام تھیں۔
سفینہ پس منظر میں جا چکی تھی۔

انہوں نے جوس کا صرف ایک گھونٹ پیا..... اور گلاس پرے کر دیا..... خادمہ نے مہکتا ہوا شوہر پیپر پیک سے کھینچا اور پیشانی سے پسینہ جذب کرنے لگی۔

☆☆☆

”ماما..... کیا کہہ رہی ہیں؟“

”ریلی.....؟“ مایین کی آواز میں خوشی کی بھرپور کھنک نمایاں تھی۔

”ارے، سفینہ نے تم سے ذکر نہیں کیا؟“ افزیہ کو پہلے حیرت ہوئی پھر سوچا شاید تاجور کی ابھی بیٹی سے بات ہی نہ ہوئی ہو۔

”تاجور کو میں نے خود فون کیا تھا صبح، صبح..... اصل میں شرمندگی بھی بہت تھی کہ ہم ڈنر میں شریک نہ ہو سکے..... خیر..... تاجور نے بتایا کہ رات کمال ہی ہو گیا..... لیڈی صوفیہ نے بغیر کسی فارمیٹنی کے دو چار باتیں کرنے کے بعد اپنے آنے کا مقصد بتا دیا کہ وہ سفینہ کو پروپوز کرنے آئی ہیں۔“
”اوہ نو..... ماما..... کہیں خوشی سے میں مر رہی نہ جاؤں۔“ مایین کی درحقیقت حیرت و خوشی سے حالت غیر ہو رہی تھی۔

”بے وقوف کیا تم سفینہ سے زیادہ خوش ہو کر دکھاؤ گی..... کوئی مقابلہ ہو رہا ہے.....؟ ایک تو یہ لڑکیاں بس ایووشل ہو جاتی ہیں۔“ افزیہ کو بیٹی کے منہ سے نکلنے والے کلمات غیر مرتب و انتہائی محسوس ہوئے تھے۔
دوستوں کی خوشی پر سب خوشی کا اظہار کرتے ہیں..... مگر اس طرح کے الفاظ تو من چاہی خوشی پا کر اس کے منہ سے نکلے ہیں جو بے چینی سے کسی مخصوص خوش خبری کا انتظار کر رہا ہوتا ہے۔

افزیہ نے مایین کی جذباتیت و بے ساختگی کو اس کی کم عمری و کم عقلی سے تعبیر کرتے ہوئے نظر انداز کر دیا۔
”اچھا ماما..... آپ سے بعد میں بات کرتی ہوں۔ اس وقت میرے پیٹ میں شدید درد ہو رہا ہے۔“ یہ کہہ کر مایین نے اپنی طرف سے رابطہ منقطع کر دیا تھا۔ درحقیقت مارے خوشی کے اس کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔
”یہ مجھ رہے۔“ وہ سوچ رہی تھی۔ اب اسے سفینہ کی کھوج لاحق ہو چکی تھی۔

☆☆☆

سفینہ لاشعوری طور پر مایین سے چھپتی پھرتی تھی۔ اس وجہ سے نہیں کہ اسے فرشتوں سے ہٹا چل چکا ہوگا۔ بلکہ اس وجہ سے کہ وہ اس کا چہرہ بڑھنے میں ملکہ رہتی تھی۔

وہ خود کو نادل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس خوش خبری کو بڑے ظرف سے ہضم کرنا چاہ رہی تھی۔
خود کو ہر پہلو سے یقین دلانا چاہ رہی تھی کہ یہ گہری نیند میں دیکھا جانے والا خواب نہیں، ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ یہ خوش خبری باوثوق ذرائع سے اس تک پہنچی ہے۔ خوشگوار تصورات کے درمیان کئی بار زارا کارف ایچجے حائل ۱۱۔ مگر مسرت کی لہر میں اتنی طاقت و تھیں کہ اس تصور رانی خاکے کو اٹھا کر بیچ دیتی تھیں۔

البتہ اسے ایک دلنواز انکشاف کا سامنا ضرور تھا۔ کیا وہ واقعی پرنس کی محبت میں گرفتار ہو چکی تھی..... اب تک تو اس لی اتنا یہ باور کرائی رہی کہ اس نے پرنس کی جادو بھری نگاہ میں اپنے لیے چاہت کی دمک دیکھی تھی..... اس وجہ

سے وہ اکثر اس کے خیالات پر حاوی ہو جاتا تھا ورنہ یہ محبت و محبت اس کے بس کی بات نہیں۔ وہ بہت عملی سوچ کی حامل ثابت ہوتی چلی آ رہی ہے۔ خیالات میں کھوئے رہتا اس کے نزدیک قیمتی اور کارآمد وقت ضائع کر دینے کے مترادف تھا۔

ابھی چھوٹی سی عمر میں سب کچھ کیسے احاطہ علم میں آ جاتا..... کہ فطرت آپ کے رویوں، معلومات اور موڈ کی پابند نہیں ہوتی۔ فطرت ازل سے اپنے طے شدہ قانون کے مطابق عمل کرتی ہے۔ جس طرح دریا کو تخلیق کرنے کے بعد اسے بہنے کا راستہ بتا دیا تھا۔

اسی طرح فطرت اپنا اظہار کرتی ہے..... اور کوئی مصنوعی رکاوٹ اسے اظہار سے نہیں روک سکتی۔ انسان کا شرف اس کا دل ہے دماغ نہیں..... دماغ تو حیوانی کے پاس بھی ہوتا ہے تب ہی وہ جینے کے اہتمام کرتی ہے۔ ناموافق حالات کے لیے اپنی خوراک ذخیرہ کرتی ہے، جان کا خطرہ بھانپ کر راستہ تبدیل کر لیتی ہے۔ انسان کو دل دیا گیا..... ہر دل میں پورا کائناتی پروگرام محفوظ ہے۔ اور یہ سارا کائناتی نظام محبت کی قوت سے متحرک ہے۔

جب محبت فطری انداز میں مظاہرہ کرتی ہے تو دل بے خبر نہیں رہتا..... رہ ہی نہیں سکتا۔ کسی کے چاہنے کی خبر اسے دل سے ہی ملتی..... مگر دماغ نے دل کی بات ہنسی میں اڑائی تھی کہ تم تو کھیلنے کے لیے چاند بھی مانگتے ہو..... تمہاری خواہشات، الامان، الحفیظ..... سفینہ محبت کے جذبات میں اس طرح بھیگ رہی تھی کہ اپنے ہی خیالات سے خوفزدہ ہو رہی تھی..... جیسے وہ کسی جرم کی مرتکب ہو رہی ہو..... اس نے کبھی ایسی زندگی کا تصور نہیں کیا جس میں وہ سارے ضروری کام چھوڑ کر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھی رہے۔

مگر اس وقت عجیب بے بسی کی کیفیت تھی..... جیسے کوئی دور بیٹھ کر ریوٹ سے اسے کنٹرول کر رہا تھا۔ وہ اپنے ارادے کے زور پر کچھ بھی نہیں کر پار ہی تھی۔

☆☆☆

ساحل..... آؤٹ ڈور پلانز کے ساتھ سائٹ سے واپس آفس آیا تو اسے اطلاع ملی میم تاجور نے اسے طلب کیا ہے۔

ٹریفک جام کے تصور سے ہی وہ تھک کر چور ہو گیا.....
”یہ کیا بات ہوئی جب اس آفس میں اسے اس کا کام بتا دیا ہے تو پھر دوڑیں کیوں لگوا رہی ہیں؟“ اندر ہی اندر وہ جل بھن کر رہ گیا۔

”نامم بتایا ہے، کب تک پہنچتا ہے؟“ اس نے ریسپشن پر ڈیوٹی دینے والے نو عمر نوجوان سے دریافت کیا۔
”مسٹر میم ادھر ہی ہیں..... وہ لغاری صاحب کے آفس میں آپ کا ویٹ کر رہی ہیں۔“
”اوہ مائی گاڈ.....“ ساحل تو جیسے گہری غیند سے ہڑبڑا کر جاگا..... اور اپنے ٹل لگژری آفس کی طرف دوڑ لگائی تاکہ پہلے اپنے حلیے کا جائزہ لے۔

”بس... bosses کو بھی ہر وقت اپنی importance بتانے کی پڑی رہتی ہے۔ ٹک کر اپنی چیز پر بیٹھیں..... ہمیں بھی چین، سکون سے کام کرنے دیں اتنے مسکرتگیر یہاں بھی بٹھائے ہوئے ہیں، وہ کان بھرنے کی ڈیوٹی میں کبھی کوتاہی نہیں کر سکتے..... ہوں..... دس، دس ہزار کے نوکر..... یہی کام کر سکتے ہیں.....“ حقارت آمیز خیال نے چہرہ لگا دیا۔

”یار کوئی معمولی سی خواہش بھی پوری نہیں ہو سکتی..... اتنی دھول مٹی اڑاتا یہاں پہنچا تھا..... سوچا تھا کہ نیم گرم

اسراف کی ممانعت

اسلام میں اسراف اور فضول خرچی منع ہے، کیونکہ اسلام اعتدال کی تعلیم دیتا ہے۔ ایک طرف تو اسلام نے بخل، سنجوسی اور دل کی تنگی کو منع کیا ہے اور دوسری طرف اسراف اور فضول خرچی سے بھی روکا ہے۔

مسلمانوں کو ہر صورت میں اعتدال اور میانہ روی اپنانے کی تاکید کی گئی ہے۔ قرآن مجید میں اسراف اور فضول خرچی کو شیطانی عمل اور فضول خرچی کرنے والوں کو شیطان کا بھائی قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”اور اسراف و بے جا خرچ کرنے سے بچو۔ بلاشبہ بے جا خرچ کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے پروردگار کا بڑا ہی ناشکر ہے۔“ (سورہ بنی اسرائیل: آیت نمبر 26، 27)

خرچ کرنے کے بارے میں اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ انسان اپنی ذات اور اپنے اہل و عیال کی جائز ضروریات مناسب طریقے سے پوری کرے۔ غریب رشتے داروں، یتیموں، مسکینوں اور حاجت مند مسافروں پر اپنا مال خرچ کرے۔ اپنی دولت سے ان محروم لوگوں کا حق ادا کرے جو اپنی بنیادی ضروریات بھی پوری کرنے کے قابل نہیں ہوتے، اور یہ لوگ خودداری اور شرم و حیا کی وجہ سے امیر و کبیر اور دولت مند لوگوں سے سوال بھی نہیں کر سکتے۔ ہمیں ایسے لوگوں کی ہر حال میں اور ہر ممکن طریقے سے مدد کرنی چاہیے۔

مرسلہ: جبین نیاز، ملتان

پانی کا شاور لوں گا۔ امپورٹڈ جیل کے جھاگ سے لطف اندوز ہوں گا۔ اور جیٹ جھپٹوں گا..... پتا نہیں کتنے کتنے سر پر سوار رہیں گی۔ تھوڑے پیسے جمع ہو جائیں، میں تو اپنا بزنس شروع کر دوں گا..... لعنت بھیج دوں گا اس غلامی کی زندگی پر۔“

اس نے کوٹ اتار کر اسٹینڈر پر لٹکایا..... ٹائی کی گرہ ڈھیلی کی اور چیئر کے بجائے لیڈر کے سیاہ صوفے پر ڈھیر ہو گیا..... مگر اگلے ہی لمحے انٹرکام کی ٹھنٹی نے اٹھا کر کھڑا کر دیا..... دوسری طرف آپریٹر یاد دہانی کر رہی تھی کہ میم تا جوں اس wait کر رہی ہیں۔

”یار سانس تو لینے دو..... آرہا ہوں۔“ اوسط درجے کی زندگی پر سمجھوتا کرنے والوں کی ایک خصوصیت بہت نمایاں ہے۔ کھانا وقت پر کھاتے ہیں، نمک، مرچ کی کمی بیشی پر بڑی تفصیل سے بات چیت بھی کرتے ہیں۔ عموماً ان کی پلٹیں کھانے کے بعد بھی اتنی صاف نظر آتی ہیں کہ کام چوری یوری یا نوکریٹھو پچھر سے پونچھ کر دوبارہ استعمال کے قابل بنا سکتے ہیں۔

اور پیٹ کے نام پر بڑے، بڑے بزنس جمانے والے چائے، بسکٹ، ڈسپرین کے ساتھ ادھر ادھر بھاگتے ہیں..... نظر آرہے ہوتے ہیں۔

اکثر بچ پر میٹنگ بھی نمٹا دیتے ہیں، ہاتھ میں نوالہ، نظر آئی فون پر یا سامنے بیٹھے شخص پر سیدھے کان سے ابیں والے کی بات اٹنے کان سے بائیں ہاتھ والے کے پوائنٹس بھی لیے جارہے ہوتے ہیں۔

ماتہ ہی اس کے بعد والی میٹنگ پر بھی توجہ..... اب آزاد زندگی گزارنے کا عادی..... بہت اچھا سا کھانا

کھانے کا شوقین گزشتہ طرز زندگی سے آٹا فانا کیسے چھٹکارا پاسکتا تھا۔ قدم قدم پر لگتا تھا لوگ اس کے دشمن ہیں..... سکون سے بیٹھنے نہیں دیتے۔ سیلف میڈ لوگوں کی سوچ دونوں قسم کے گروہ سے مختلف ہوتی ہے۔ صفر سے آغاز کرنے والوں کی براہ راست منزل پر نگاہ ہوتی ہے، ان کی فطرت میں ایک قابل ستائش صبر کا عنصر واضح ہوتا ہے۔ گفتگو نپلی تلی اور مختاط ہوتی ہے۔ آہستہ، آہستہ منزل کی طرف بڑھتے ہوئے قدم، قدم پر اپنی انا کو بھی فراموش کرنا پڑتا ہے۔ پُر امید ہوتے ہیں، قوت برداشت کمال ہوتی ہے..... اس بات پر یقین کامل رکھتے ہیں کہ پہاڑ کی چوٹی تک پہنچنے کے لیے دھیرے، دھیرے قدم اٹھانا پڑتا ہے۔ ایک جست میں چوٹی تک پہنچنے کا خیال اتنا ہی غیر فطری ہے جیسے آگ سے پیش کے بجائے ٹھنڈک کی توقع کرنا۔

وہ تو اس ملک کے ان نوجوانوں میں سے ایک تھا جو short cut میں اپنی توانائیاں کھاتے رہتے ہیں اور ضائع بھی کرتے رہتے ہیں۔ اس لیے جلدی تھک جاتا تھا..... اور تھکاوٹ کی وجہ سے چڑچڑاپن بھی حاوی ہو جاتا تھا۔ رئیسوں سے حسد، اعصابی دباؤ کی وجہ سے سینے میں پلنے والا کینڈنڈ حال کر دیتا تھا۔ انسان کا اصول خدمت اور آرزوئیں محبت سے سرشار ہوں تو روح طاقتور اور توانا ہوتی ہے اور منفی جذبات کو پوری قوت سے مسٹر و کرتی رہتی ہے۔

اس نے اپنی قوت ارادی کو متحرک کیا..... گہری، گہری سانسیں لیں۔ تاجور کے سامنے جانے کے لیے ذہن بنانا شروع کر دیا۔
جو ہاتھ آچکا تھا اسے محفوظ کرنے کی تنگ و دو تو بہر حال کرنا تھی۔ یہ الگ بات کہ (شارٹ کٹ) مختصر ترین راستے سے منزل تک پہنچنے کی خواہش اپنی جگہ تھی۔

☆☆☆

”اماں پوچھیں گی تمہیں اس طرح نہ اٹھا کر پرنس کے ہاں جانے کی کیا ضرورت تھی تو کہہ دوں گی کہ میں نے loose کیا تھا اس لیے گٹلی ٹپل ہو رہا تھا۔ چین ہی نہیں آ رہا تھا..... ہائے اماں غلطی ہو گئی تھی ناں.....“ زارا نے آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے خود کو ہی آنکھ ماری..... اس وقت وہ بہت احتیاط سے چہرے پر سیرم لگا رہی تھی..... چہرہ دمک رہا تھا۔

چھوٹی سی عمر میں بڑی، بڑی تمنائیں..... فطری امر ہے، انسان تو ازن کھونے لگتا ہے۔ سائنس تو یہ بھی ثابت کر چکی ہے کہ دودھ پیتے بچوں میں بھی حسد کے جراثیم پائے جاتے ہیں۔ پنکھوڑوں میں لیٹ کر رد عمل دے رہے ہوتے ہیں۔

نامعلوم کتنی حسینائیں پرنس کا تصور کر کے ٹھنڈی آہیں بھرتی ہوں گی۔ مگر وہ صرف یہی کر سکتی تھیں کیونکہ ان کے پاس ”سفینہ“ نام کی کوئی سیریز نہیں تھی..... اس نے تو سفینہ کوچ ”سفینہ“ ہی بنالیا تھا۔ جس پر سوار ہو کر سرکش موجوں کا مقابلہ کر کے کنارے لگنے کا عزم میم کر لیا تھا۔ بے بی پنک ٹرک کا بے وزن سے روشنی لباس کا انتخاب کیا تھا۔

پرنس کی دادی سے دوستی کرنے کے لیے ضروری تھا کہ اس کی لگ کی پرنس سے کم نہ ہو۔ وہ بہت پُر امید تھی۔ سفینہ کو تو وہ شروع سے ہی سیدی اور بے وقوف گردانتی تھی۔ بچپن میں چھوٹی موٹی چوریاں پکڑی جاتی تھیں تو سفینہ ہی چھٹی تھی وہ صاف بچ نکلتی..... اس وجہ سے بھی وہ بہت پُر اعتماد رہتی تھی..... ویسے بھی اصول فطرت ہے۔ مکر کرنے والوں کو قدرت تمام تر کیسیں آزمانے کی کھلی چھٹی دیتی ہے اس لیے کہ آخر کار ایک دن یہ ساری ترکیبیں ان پر ہی الٹ پڑنا ہوتی ہیں۔

قدرت ان کی نیت و ارادے کے حساب سے کامیا بیاں دیتی چلی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے یقین کامل ہو جاتا ہے کہ ایک عالم ان کی ذہانت کے سامنے ڈھیر ہے۔ معصوم اور سادہ مزاج لوگوں کو مشکل حالات میں شبی مدد

یہ کہاں بیٹھیں کہ دل ہے

نہ رہ لیتی ہے کیونکہ وہ فطرت سے تصادم کا راستہ اختیار نہیں کرتے.....

درحقیقت پرنس سے کم تو اس کا آئیڈیل ہی نہیں تھا۔ شکل بھی بہت پیاری اور بھولی بھالی تھی۔

سفینہ کے نقوش میں جھکھائیں تھا اور اس کا چہرہ گول اور بھرا، بھرا تھا۔ سفینہ کو دیکھ کر نازک سی باری ڈول کا تصور بنتا تھا اور وہ پرانے زمانے کی وکٹورین گزریا جیسی لگتی تھی..... بھرے، بھرے، بھرے، بھرے ہونٹ، موٹی، موٹی بھاری پتھوں والی روشن و کشادہ آنکھیں جو مسکارے کے استعمال کے بعد مزید کشادہ محسوس ہوتی تھیں۔ سفینہ کی گردن بہت نمایاں تھی، اس کی بھرے، بھرے جسم کی وجہ سے دہلی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ قد و قامت میں دونوں تقریباً برابر تھیں۔

امید اور کامیابی کا زعم اس کے چہرے کو ایک انوکھی دمک دے رہا تھا..... میچنگ سینڈل نکالتے ہوئے یونہی ایک اندیشے نے ناگ کے پھن کی طرح سراٹھایا۔
”وہ لوگ تو سفینہ کو پروپوز کر چکے ہیں..... اب اماں نے تو بس جواب دینا ہے۔ اگر وہ ناکام ہوگئی.....؟“ اسے اپنے ہی خیال سے سخت کوفت و اچھن ہوئی۔

انڈین ڈراموں کی رسیا کے ذہن کے پردے پر ایک کے بعد ایک ڈراما چلنے لگا۔

”پھر میں سفینہ سے صاف کہہ دوں گی..... کہ تم درمیان سے ہٹ جاؤ۔ ورنہ میں خودکشی کر لوں گی۔ سفینہ ویسے ہی ڈرپوک اور نرم دل ہے۔ ڈر جائے گی۔ پرنس کو روز خواب میں دیکھتی ہوں..... my God وہ سفینہ کا ہو جائے گا۔ oh no..... سفینہ کی وجہ سے ہمیشہ میری انسٹل ہوتی ہے مجھے ڈی گرڈ کیا جاتا ہے۔ سفینہ کو میرٹ سرٹیفیکٹس ملے ہیں، ہونہ اس میں بہت پوٹنشل ہے..... بہت جلد وہ ملک کی پرنس ٹائیگونیڈز میں count ہوگی..... اگر وہ سفینہ کو روپوز نہ کرتے تو شاید مجھے اتنی زیادہ پوٹنشل بھی نہ ملتی جب تک جھک کر مر نہ جاؤں..... ہار تو نہیں مانوں گی.....“ وہ لڑکھڑانے کے بعد سنبھلنے لگی۔

☆☆☆

کمال ہو گیا تھا..... اس نے صرف پچاس منٹ میں سفینہ کی تصویر مکمل کی تھی۔ زرد جالی کے دوپٹے سے آدھا چھپا ہوا چہرہ..... مونالیزا جیسی پراسرار مسکراہٹ..... ہونٹوں پر کم آنکھوں میں زیادہ تھی۔ اس نے جی بھر کر تصویر دیکھی..... مختلف زاویوں سے دیکھی۔

”جب یہ تصویر دیکھو تو مجھے پتا ہے تم کیا کہو گی.....“ وہ سفینہ کی تصویر سے باتیں کر رہا تھا۔ ”میں اس وقت تمہاری کیفیات کے ساتھ، ساتھ بہہ رہا ہوں تب ہی تو اتنی جاندار تصویر تخلیق ہوگئی۔ میں ابھی سے تمہاری طرف سے تصویر کے نیچے ہی تمہاری فیکٹو لکھ دیتا ہوں۔“ اس نے آٹمی گلابی مارکر اٹھا کر تصویر کے نیچے شعر لکھ دیا۔

حُسنِ صد رنگ میں اک سادہ سی تمنا بھی تو تھی

جائیے آپ سے تصویر بنائی نہ گئی

شعر کے آخر میں اس نے کونے میں from safeena لکھ دیا۔ اور اپنے مخصوص انداز میں ہنس دیا۔

”جب اسے یہ تصویر دوں گا اور وہ دیکھے گی تو وہ کتنا انجوائے کرے گی۔“ وہ آنے والے خوش کن لمحات کا تصور کرتے ہوئے نہال تھا۔

”سفینہ میں خدا تو نہیں کہ تمہارے خیال پڑھ سکوں..... مگر سیکڑوں میل کی دوری سے بھی تمہاری کیفیات محسوس کر سکتا ہوں۔ ان کیفیات نے ہی تو مجھے پوری قوت سے یقین دلایا کہ مجاز سے حقیقت کا سفر شروع ہو گیا

ہے..... وارداتِ عشق وقوع پزیر ہو چکی۔“ معا پرئس کی کیفیات تبدیل ہو گئیں وہ کھڑے، کھڑے بت کی طرح ساکت ہو گیا۔ مراقبے کی حالت تھی..... خیال کسی ایک نکتے پر مرکوز ہو گیا تھا۔
روحانی مسرت ادب کمال پر تھی۔

☆☆☆

”پکڑی گئیں.....“ ماہین نے پیچھے سے آکر سفینہ کو بری طرح دبوچ لیا۔ سفینہ جواپنی دھن میں مگن دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہو رہی تھی، اچانک حملے سے قدرے لڑکھڑا گئی۔
”کیا ہو گیا ہے؟ کبھی تو سیریس ہو جایا کرو.....“ وہ خود کو ماہین کی گرفت سے آزاد کراتے ہوئے مصنوعی برہمی کا اظہار کر رہی تھی۔

”سیریس کی بچی..... اندر چلو..... ذرا تمہاری ٹھیک سے خبر لیتی ہوں۔“ اس نے سفینہ کو اندر کی طرف دھکیلا اور دونوں ہاتھ استعمال کیے جیسے بند گاڑی کو دھکا لگا رہی ہو پھر خود بھی اندر داخل ہوئی اور دروازہ بند کر دیا۔
”ہونہ..... یعنی ہمیں بے وقوف بنانا ہی تھیں۔ حالانکہ ہماری شکل پر لکھا ہے کہ کسی کو کوشش و محنت کرنے کی ضرورت نہیں۔ جس دن عقل بٹ رہی تھی ہم جنت میں فرشتے کے کندھوں پر چڑھ کر پائن اپیل توڑ رہے تھے۔ وہ تو پائن اپیل کھانے کے بعد پتا چلا کہ ہماری absent لگ گئی..... افسوس تو بہت ہوا پھر دل کو تسلی دی..... ہم اکیلے نہیں ہیں۔ کچھ لوگ باغ میں سن باتھ لے رہے تھے وہ بھی رہ گئے۔ جہاں تک مجھے یاد آ رہا ہے اچھے خاصے لوگ تھے۔“

ایک تو طبیعت باغ و بہار تھی پھر ماہین کے مزاج پر جتنہ جملے..... سفینہ ہنس نہ سکی کر لوٹ پوٹ ہو گئی۔ جانے کتنے عرصے بعد وہ اتنا ٹھل کر رہی تھی۔ ہنستے، ہنستے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
”for your kind information جنت میں دھوپ نہیں نور ہوتا ہے۔ فضول بکواس کرنے سے پہلے proper ہوم ورک کر لیا کرو۔“ سفینہ نے دوپٹے سے اپنی آنکھیں رگڑ لیں۔

”اچھا زیادہ گھماؤ کی ضرورت نہیں..... پہلے تو یہ بتاؤ اتنی اچھو رنٹ نیوز مجھ سے شیئر کیوں نہیں..... اب میں پورے ایک ویک کے لیے تم سے ناراض ہونے والی ہوں۔“ ماہین نے اسے بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑا لیا۔
”نیوز..... کیسی نیوز..... کون سی نیوز.....؟“ سفینہ نے چندرا کر معصوم شکل بنا کر ماہین کی طرف دیکھا۔

”ارے تم پرئس ڈیپاننا بننے جا رہی ہو..... مجھے مٹی نے سب بتا دیا ہے۔“ ماہین نے کھورا۔
”اللہ نہ کرے..... کیوں مجھے پرئس ڈیپاننا بنانا ہی ہو..... سوائے تاج و دولت اور دو بچوں کے اسے کیا ملا.....
قابلِ رحم زندگی..... حسرت ناک موت.....“ سفینہ نے یہ کہہ کر ایک دھب بھی جڑ دیا۔

آج تو اس کے انداز ہی بدلے ہوئے تھے..... ہر بات پر بھر پور رد و عمل ظاہر کر رہی تھی۔
”اچھا تو تمہیں آنٹی نے بتا دیا۔ ظاہر ہے ان سے تو کچھ چھپایا نہیں جاسکتا۔ لیڈی صائبہ تو انکل آنٹی کو بہت importance دیتی ہیں۔ فیملی فرینڈ ہیں۔“

”قوم سے خطاب کرنے کی ضرورت نہیں..... سیدھے، سیدھے بتاؤ تم نے یہ خبر مجھ سے کیوں چھپائی؟“
”چھپائی نہیں..... موقع نہیں ملا..... میں فرسٹ پیریڈ کے بعد باہر آئی تو اماں کا فون آیا..... اور انہوں نے بتایا کہ ایسا کچھ ہوا ہے.....“ اب سفینہ نے قدرے سنجیدگی سے اپنی طرف سے صفائی پیش کی۔
”لیکن لاہور بری میں تو تم مجھے ملی تھیں۔“

”تو وہاں تم سے“ یہ والی“ باتیں کرتی.....؟“ سفینہ نے یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کچھ تو عقل سے کام لے لیا کرو۔

یہ کہاں بیٹیں کہ دل ہے

”مگر ہم تو باہر بھی آگئے تھے.....“ ماہین نے کسی مجھے ہوئے اسنکر کی طرح الفاظ دبوچ کر سوال داغ دیا۔
 ”کلاس شروع ہونے والی تھی یا ر.....“ سفینہ نے اس کے بازو میں چٹکی کاٹی۔
 ”اُف..... دیکھنے میں کتنا چھوٹا ہے.....“ اس نے سفینہ کی طرف غور سے دیکھا۔ بازو بھی سہلا رہی تھی۔
 ”کیا.....؟“ سفینہ حیران ہوئی۔

”تمہارا پیٹ..... اتنی بڑی خبر چھپائے پھر رہی تھیں..... پیٹ میں ہلکا سا بھی درد نہیں ہوا۔“
 ”میرے پیٹ کو عادت ہے..... اس لیے کبھی درد نہیں ہوتا۔“ سفینہ نے شوخی سے جواب دیا۔
 ”مائی گاڈ! یعنی تم مجھ سے بہت کچھ چھپاتی ہو..... دوست کس لیے ہوتا ہے بھئی؟“ اس نے دانت پیسے۔
 ”ظاہری بات ہے اتنی بڑی خوش خبری ہے بلکہ bang ہے سکون سے سناٹی..... تم کون سا کہیں فلائی کر رہی تھیں۔“ سفینہ نے اب بہت اپنائیت سے ماہین کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر گال سے لگایا۔
 ”خوش خبری.....؟ ہوں..... جب پرنس کی بات کرتی تھی تو تم کیسے پوز دیتی تھیں، وہ تمہارے دل میں رہتا ہے۔ تمہاری آنکھیں انظار کرتی تھیں لیکن تم..... مجھ سے جھوٹ بولتی تھیں خود کو دھوکا دیتی تھیں، ہے ناں.....؟“
 ماہین نے مصنوعی خفگی کا تاثر دیتے ہوئے کہا۔

”یہ بات نہیں ہے ماہین..... تم دوست ہو اور دوست اسے کہتے ہیں جس پر اعتماد کرتے ہیں۔ دراصل میں کچھ دنوں سے بہت زیادہ کنفیوزڈ اور ڈپریمڈ تھی..... سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ تم سے شیر کر کے مجھے حاصل کیا ہوگا خود تو پریشان تھی..... تمہیں بھی ڈسٹرب کر دیتی۔“ سفینہ اب سنجیدگی سے بات کرنے لگی۔ ماہین حیران و پریشان اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”تم کیوں ڈپریمڈ تھیں؟“ وہ جیسے رونے کو ہو گئی۔ اس کی دوست پریشان تھی اور وہ اس کو تنگ کر رہی تھی..... معصوم سا احساسِ جرم دل کی کسی لہر کے ساتھ لہلہا کر اٹھا۔
 ”بس تھی کوئی وجہ..... خراب وجہ خود بخود ختم ہو گئی..... پرنس کبھی اس لڑکی کو پروپوز نہیں کر سکتے جس کے لیے وہ ذہنی اور دلی طور پر تیار نہیں ہوں..... کون ہے جو انہیں مجبور کرے گا۔ ان کی گریڈ ماہ تو ان پر جان دیتی ہیں..... بہت ڈینٹ ہیں..... وہ پرنس کی خوشی کے لیے سب کچھ کر سکتی ہیں۔“
 ”اچھا..... بس تم نے تو اب ساری زندگی ان کی تعریف کرنی ہے..... مگر میں ابھی تک ایک ہی جگہ پھنسی ہوئی ہوں۔“ ماہین الجھن بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔
 ”کہ.....؟“ سفینہ نے مختصر ترین استفسار کیا۔

”وہ وجہ کیا تھی؟ جو اب نہیں ہے۔ میری awareness کے لیے ہی بتاؤ۔“ ماہین نے بہت غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ آنکھیں پڑھ رہی تھی۔

سفینہ نے فوراً نظریں جھکا لیں۔ جیسے اسے بولنے میں دقت پیش آرہی ہو۔
 ”بتاؤ ناں سفینہ.....“ ماہین مصر ہوئی۔

”میں نے اسٹوڈیو میں زارا کا رِف اُچھ دیکھا تھا۔ It was very shocking کیونکہ پرنس کی آنکھوں نے تو مجھے وہ پیغام دیا تھا جس نے مجھے اپنے آپ سے بے خبر کر دیا تھا۔ ان کو تو سب دیکھتے ہیں..... خاص بات تب ہے جب وہ کسی کو دیکھیں..... سچ میں شروع میں تو میں اسے صرف اپنی خوش فہمی ہی سمجھ رہی تھی۔“ سفینہ بول رہی تھی
 ماہین ایک ٹک بس اسے دیکھے جارہی تھی۔

”اور تم نے فرض کر لیا کہ زارا اور پرنس کا کوئی چکر چل رہا ہے۔ what,s a nonsense سفینہ..... زارا

کا نہیں ابھی طرح پتا ہے۔ وہ تو اتنی بے وقوف ہے کہ سب کچھ اس کی شکل پر ٹاپ ہو جاتا ہے۔ پرنس اس کو لفٹ کرانا تو وہ تمہارے کان کھا جاتی۔“

”تو یہ تم تو بالکل اماں جیسی اردو بولتی ہو.....“ سفینہ ہلکی پھلکی ہو کر مسکرائی۔

”ارے کہاں..... ہم تو جی بھر کر اردو کی انسلٹ کرتے ہیں..... ستیا ناس ہو گیا ہے اس زبان کا..... روسن کی وجہ سے تو کفن دفن کی نوبت آگئی ہے..... تم دیکھنا ابھی اس زبان کا مزید برا حال ہونے جا رہا ہے۔ اب تو اردو میں انگش کے علاوہ ڈھیر ساری چپاؤ..... چاؤ..... شوگ شک..... تام چام بھی سننے کو ملے گی.....“ مایین نے جس برجستگی کا مظاہرہ کیا تھا سفینہ کو ایسی ضبط کرنا مشکل ہو گئی۔

”تمہاری وجہ سے میری لائف میں کتنی روتی ہے۔“ سفینہ نے مایین کو اپنے بازوؤں کے گھیرے میں قید کر لیا..... روحانی مسرت پل، پل مظاہرے کو بے تاب تھی..... چھپائے نہ چھپتی تھی.....

”بس اب تو کوئی اور روئیں لگانے آ پہنچا ہے۔“ مایین نے اس کی ٹھوڑی چھو کر چھیڑا۔

”خیر جو ہوا..... ہو چکا..... لیکن اس ساری suffering میں تمہیں ایک بات کا یقین مل گیا..... کتم پرنس کی محبت میں گودو گدو تک ڈوب چکی ہو۔“ مایین اب سفینہ کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔ جذباتیت کا بھونچال ٹھم چکا تھا..... دوست کی عظیم الشان خوش خبری نے اس کے انگ، انگ..... میں بھی مسرت کا احساس بھردیا تھا۔

”لیکن سفینہ، زارا کا اس پر پرنس کیوں بنائے گا؟ رفس اس کے تھا۔ اس لیے زارا سے کچھ مل رہا ہوگا۔“

”ہاں..... اب تو میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔“ سفینہ کی شادو آباد آنکھوں میں چاہے جانے کے اعزاز بنے نشہ سا بھردیا تھا۔

☆☆☆

”مجھ سے ملنے آئی ہے؟ لیکن..... سیکریٹری نے تو مجھے نہیں بتایا..... مجھے بھی یاد نہیں آ رہا کہ میں نے کسی کو ملاقات کے لیے وقت دیا ہو.....“ لیڈی صوفیہ اپنی شکن آلود پیشانی کو مسلتے ہوئے یادداشت پر زور ڈالنے لگیں۔

”میم ان کو کیا جواب دینا چاہیے۔ وہ wait کر رہی ہیں۔“ انجیلانے مؤدبانہ دریافت کیا۔

”انجیلا کیا ہو گیا ہے تمہیں..... یہ وہ..... ان..... ان کر رہی ہو اس کا کوئی sweet name بھی ہوگا.....“ بڑھاپے کے کزور اعصاب تھے۔ لیڈی صوفیہ جھنجھلا رہی تھیں۔

”میم..... مرس زارا..... یہ نام بولتی ہیں وہ۔“ انجیلانے بڑے ادب سے جواب دیا۔

”زارا..... I do,nt know؟“ لیڈی صوفیہ کی یادداشت نے ساتھ چھوڑ دیا۔ ”سیکریٹری سے کہو گیسٹ سے تمام particulars حاصل کر لے۔ میں اس طرح کسی سے ملاقات نہیں کرتی۔ میں اس طرح منہ اٹھا کر کبھی کسی سے نہیں ملتی..... مجھے تیار ہونے میں خاصا ٹائم لگتا ہے۔“

”اوکے..... میم..... میں سیکریٹری کو آپ کی انٹرکشنز پہنچا دیتی ہوں۔“ انجیلا سر جھکا کر بیڈروم سے باہر چلی گئی۔

”زارا..... who is؟ مجھ سے کیوں ملنا چاہتی ہے؟ اوہ..... شاید کسی این جی او کی ورکر ہو سکتی ہے۔ ڈوینیشن لینے آئی ہوگی۔“ اپنا سا اندازہ لگا کر لیڈی صوفیہ نے بہر حال اپنے اس ذہنی خلفشار سے تو جان چھڑالی تھی۔

(جاری ہے)

سوالج

نگہت اعظمی



پیر کی صبح ہمیشہ کی طرح بوجھل اور اکتاہٹ سے
 بھری ہوئی تھی۔ اس پرستم یہ ہوا کہ آنکھ بھی دیر سے
 کھلی۔ پھر گاڑی نے اسٹارٹ ہونے میں غرے
 دکھائے۔ گاڑی کو راضی کر کے سڑک پر لائی تو تھوڑے
 فاصلے کے بعد ہی ٹریفک جام ملا۔ راستے میں ایک
 چھوٹے سے ایکسیڈنٹ کا بھی نظارہ ہو گیا۔ لوگوں کی
 کالم گلوچ سن کر بھی طبیعت بحال نہ ہو سکی۔ بالآخر ان
 تمام دل شکن مسائل سے نبرد آزما ہو کر جیسے ہی آفس

میں قدم رکھا..... میرے جوئیر آفیسر بابر صاحب نے ملک الموت کی طرح نازل ہو کر یہ ہولناک خبر سنائی۔
 ”میم، کرٹل باجوہ نے آپ کی پریزنٹیشن دیکھنی ہے اس کے لیے تمام آفیسرز کو نو بجے کانفرنس روم میں حاضر ہونے کے آرڈر زدے دیے گئے ہیں۔“

مجھے یہ پریزنٹیشن جمعہ کو دینی تھی مگر کرٹل صاحب کی مصروفیت کی وجہ سے یہ ملتوی ہوگئی۔ میرا خیال تھا اب دوبارہ جمعے کو ہی میری باری آئے گی۔ لیکن مجھے کیا پتا تھا کہ بغیر اطلاع کے مجھ پر یہ آفت ناگہانی ٹوٹ پڑے گی۔ پونے نو بج رہے تھے۔ میرے پاس صرف پندرہ منٹ تھے۔ میں نے خونخوار نظروں سے بابر صاحب کو دیکھا۔ ان کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ اس خبر کو سنتے ہی میرے اندر کہیں کڑھن اور جلن پیدا ہو رہی ہوگی۔ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ ابھی تک میری پریزنٹیشن مکمل نہیں ہوئی، میں نے لاجول پڑھ کر ان کی طرف دیکھا اور بظاہر مسکراتے ہوئے لیپ ٹاپ آن کیا۔

”نو پرابلم، میری پریزنٹیشن بالکل تیار ہے۔ میں نے کل ساری رات جاگ کر تیار کر لی تھی۔“ بابر صاحب کی خوشی کو خاک میں ملانے کے لیے میں نے جھوٹ کا سہارا لیا اور میرے اس جھوٹ نے ان کی آنکھوں کی چمک کو ماند کر دیا۔

میں نے u s b لگا کر آخری مرتبہ پوری پریزنٹیشن کو چیک کیا۔ کچھ تبدیلیاں کیں یہاں تک کہ اوپر سے آرڈر آگئے کہ سب آفیسرز کانفرنس روم میں جمع ہو چکے ہیں۔ بس میرا انتظار ہے۔

میں نے لیپ ٹاپ بند کیا اور اسے بابر صاحب کے حوالے کر کے کانفرنس روم کی راہ لی۔ سارے آفیسرز آپہنچے تھے۔ صرف کمانڈنٹ کرٹل باجوہ کے آنے کی دیر تھی۔ چند لمحوں بعد وہ بھی داخل ہو گئے۔ ان کے داخل ہوتے ہی ہم سب اپنی، اپنی جگہوں پر کھڑے ہو گئے پھر ان کے بیٹھے ہی ہم سب نے اپنی نشستیں سنبھال لیں۔

آغاز تلاوت قرآن پاک سے ہوا۔ اسکرین پر سورہ اخلاص کی تلاوت کی گئی۔ اس کا ترجمہ پڑھا گیا۔ پھر میں نے کرٹل باجوہ کی اجازت سے پریزنٹیشن کا آغاز کیلئے presentation ہماری لیبارٹری کی ایک مشین کے سلسلے میں تھی جو تقریباً ستر لاکھ کی تھی اور جیسے ہم خریدنا چاہتے تھے۔

اسکرین پر اس مشین کی ساری تفصیلات مع تصاویر کے دکھائی جا رہی تھیں۔ آدھے گھنٹے کی پریزنٹیشن کے بعد سوالات کا آغاز ہوا۔ درمیان میں چائے اور بسکٹ بھی سروس کیے گئے۔

پریزنٹیشن بہت اچھی رہی، آخر میں کرٹل باجوہ نے حسبِ عادت دو چار تعریفی جملے بھی کہے اور میں ساتھی آفیسرز کی مبارک باد سمیٹ کر کانفرنس روم سے باہر آ گئی۔

آفس میں آتے ہی میں نے روٹین کی ڈاک چیک کی جواب طلب لیٹرز کے جواب تیار تھے، ان کی غلطیوں کی تصحیح کر کے انہیں آگے بھیج دیا۔ جن لیٹرز میں جواب طلب کوئی بات نہیں تھی۔ ان پر ریمارکس لکھ کر انہیں آگے بڑھا دیا۔

ان کاموں سے فارغ ہو کر بابر صاحب کی شکایت پر لیبارٹری کے دو افراد کو بلوایا۔ ان کی سستی اور بغیر بتائے چھٹی کرنے پر ان کی ڈانٹ ڈپٹ کی۔ ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ فون کی بیل بجی۔ میں نے کال ریسیو کی دوسری طرف میجر کمال تھے۔ انہیں ایک ایکٹریشن کی ضرورت تھی، ان کے گھر میں بجلی کا کوئی مسئلہ ہو گیا تھا۔ لیبارٹری کے علاوہ میرے پاس دو اور سیکشن بھی تھے جن میں زیادہ ٹرائیکٹریشن، پلمبرز اور کلرک ہوتے تھے۔ ان کی درخواست پر میں نے ایکٹریشن ٹار کو میجر کمال کے گھر روانہ کیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر سکون کی سانس بھی نہ لینے پائی تھی کہ سائرہ کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ بہت غمزور اور پریشان نظر آ رہی تھی اسے دیکھتے ہی میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔

سوال

آپ اس وقت تیس ہزار دے دیں تو میں اگلے مہینے واپس کر دوں گی۔“ ایسے وعدے وہ نہ جانے پہلے کتنی دفعہ کر چکی تھی لیکن اس نے ایک دفعہ بھی میری دی ہوئی رقم واپس نہیں کی تھی۔

”میم آپ کسی سے لے کر دے دیں۔ ڈاکٹر کہہ رہے ہیں کہ آپ کو فوری ٹریٹ منٹ کی ضرورت ہے، ميم میں آپ کو بتا نہیں سکتی مجھے کتنی تکلیف ہے، میں رات کو سو بھی نہیں سکتی۔“ اس نے اس طرح التجا کی کہ میرا دل پھر موم ہو گیا۔ لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اسے جب بھی پیسے لینے ہوتے وہ اسی طرح جذباتی طور پر مجھے بلک میل کرتی اور نہ چاہتے ہوئے بھی میں اسے کچھ نہ کچھ دینے پر مجبور ہو جاتی۔ اس کی شہرت کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی۔ آفس کے لوگ اس کے بارے میں بڑی عجیب و غریب باتیں کیا کرتے تھے۔

”میم آپ نہیں جانتیں یہ بہت چالاک ہے، اپنی بیماری کا بہانہ بنا کر لوگوں سے رقمیں وصولی ہے۔“

”ایسے تو نہ کہیں..... یہ تو شکل سے ہی بیمار لگتی ہے۔“

”میم آپ اس سے رپورٹس منگوائیں آپ کو سب پتا چل جائے گا۔“ اور لوگوں کے کہنے پر میں نے کئی دفعہ اس سے رپورٹس لانے کے لیے کہا۔ لیکن ہر دفعہ وہ کوئی ایسا بہانہ بناتی کہ میں خاموش ہو جاتی۔ وہ میرے بالکل سامنے بیٹھی امید اور ناامیدی کی کیفیت میں میری طرف دیکھ رہی تھی..... میں نہ چاہتے ہوئے بھی اسے دیکھنے پر مجبور تھی۔

”ہو سکتا ہے لوگ ٹھیک ہی کہتے ہوں۔ یہ جھوٹ بولتی ہو، فراڈ کرتی ہو، دھوکے سے لوگوں سے رقمیں وصولی ہو..... لیکن اگر لوگوں کا کہا ہوا جھوٹ ہوا اور یہ سچی ہوئی؟“ میں خوف سے کاٹنے لگی، کینسر کا عفریت مجھے اپنے سامنے بڑھتا ہوا دکھائی دینے لگا۔

”اچھا دیکھو میں کوشش کروں گی..... مگر میں دس ہزار سے زیادہ نہیں دے سکوں گی۔“ میں نے احسان کا کوڑا اس پر برسا کر خود کو آنے والے خطرے سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی۔

”السلام علیکم..... کیسی ہو؟“ میں نے بظاہر انتہائی خوش اخلاقی سے خیر مقدم کیا۔

”میم طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ اس کی آواز سے نقاہت برس رہی تھی۔

”ہمت کرو..... تم تو بہت بہادر ہو۔ اس بیماری سے لڑنے کے لیے تو بہت ہمت پیدا کرنی پڑتی ہے۔“ میں نے اسے دلاسا دیا۔

”ہمت تو بہت کرتی ہوں لیکن اس بیماری کا مقابلہ آسان نہیں اس میں ہمت کے ساتھ، ساتھ پیسوں کی بھی بہت ضرورت ہوتی ہے۔“

”یہ تو ہے۔“ میں اندر ہی اندر کانپ کر رہ گئی، مجھے معلوم تھا اب وہ مجھ سے پیسے مانگے گی۔ وہ ہر تیسرے، چوتھے مہینے میرے پاس آتی اور ٹیسٹ اور دواؤں کے لیے اچھی خاصی رقم لے جایا کرتی تھی۔

”ڈاکٹر نے ایم آر آئی کا مشورہ دیا ہے اس کے لیے میں ہزار چاہیے ہیں، کچھ انجیکشن بھی لگنے ہیں۔“ بالآخر اس نے اپنے آنے کا مقصد بتا ہی دیا۔

”اوہ.....“ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کیونکہ میری عادت تھی میں ”نہ“ نہیں کر سکتی تھی اور دینا میں چاہ نہیں رہی تھی۔

”ڈاکٹر نے کہا ہے جلد از جلد یہ ٹیسٹ کروالیں ورنہ یہ پھیل کر جگر تک پہنچ جائے گا۔“ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں اور ہونٹ کپکپا رہے تھے۔

”کتنے پیسے چاہئیں؟“ میرا دل پسینے لگا۔

”سارا خرچ تو پچاس ہزار کا ہے، میں ہزار میں نے اپنے ماموں سے لے لیے ہیں آپ تیس ہزار کا بندوبست کر دیں تو.....“ اس کے چہرے پر اتنی شرمندگی تھی کہ میں اس سے نظریں نہ ملا سکی۔

”تیس ہزار.....“ میرا چوڑیاں ہنوانے کا خواب دھندلانے لگا۔ پہلے ہی پیسے کم پڑ رہے تھے اگر تیس ہزار اور نکل جاتے تو پھر اس خواہش کو اگلی کمیٹی تک ملتوی کرنا پڑتا۔

”میم اگلے مہینے میری کمیٹی نکلنے والی ہے اگر

”چلیں ٹھیک ہے..... مجھے باقی پیسوں کے لیے
’ی اور کے پاس جانا پڑے گا۔“ وہ بے حد تھکے اور
’سردہ لہجے میں یہ جملہ کہہ کر آفس سے نکل گئی۔
”ہونہہ اس کا تو ہمیشہ یہی طریقہ رہا ہے۔ آخر
میں کہاں تک اس کی مدد کروں، میرے بھی تو ہزاروں
اخراجات ہیں، میرے پاس کون سے خزانے ہیں جس
میں سے میں اسے دیتی رہوں۔“ اس کے لہجے نے
مجھے اندر سے زخمی کر دیا تھا اور میں اپنے زخموں پر اپنے
ہی الفاظ کے مرہم رکھ رہی تھی۔

☆☆☆

میرے چار بھائی تھے، بڑے دو بھائیوں کے
بچے مجھ سے عمر میں تھوڑے ہی چھوٹے ہیں اور دو
چھوٹے بھائیوں کی شادیاں اس وقت ہوئیں جب میں
میٹرک میں تھی۔ چاروں بھائی مجھے بہت چاہتے تھے،
میں بھی ان سے بے تحاشا محبت کرتی تھی۔ ایف ایس
سی میں میری بورڈ میں پانچویں پوزیشن تھی۔ جس کی
وجہ سے مجھے اسکالرشپ پر Nust میں ایڈمیشن مل
گیا۔ میں نے بڑی اعزازی GP کے ساتھ الیکٹریکل
انجینئرنگ میں گریجویشن کیا۔ پھر ایم ایس کرنے کے
بعد فوج جوائن کر لی۔ مجھے چھ ماہ کی ٹریننگ کے بعد
کپٹن کا عہدہ مل گیا۔ اور ایک سال بعد ہی میری
شادی ایک میجر سے ہو گئی۔ ہم دونوں کی پوسٹنگ
کراچی ہو گئی تھی۔ جہاں ہمیں آفس کے قریب ہی بہت
خوب صورت گھر لگایا گیا تھا۔ اس گھر کو ہم دونوں نے مل
کر خوب سجا کر رکھا تھا۔ میری دو بچیاں تھیں، ہم دونوں
کی تنخواہ ملا کر تقریباً لاکھ سے اوپر تھی لیکن میرے میاں
اپنے گھر میں سب سے بڑے تھے اور سب سے لائق
تھے۔ اس لیے ماں، باپ کی ساری امیدیں انہی سے
وابستہ تھیں۔ ان کی تین بیٹنیں شادی، شدہ تھیں اور تین
بہنوں کی شادیاں ہوئی تھیں۔ اس لیے میرے میاں کو
اپنی آدمی تنخواہ گھر بھینتی پڑتی۔ ہم بڑا بھینچ تان کر
اخراجات پورے کرتے تھے۔ لوگوں کو ہمارے
اندرونی مسائل کا علم نہیں تھا۔ وہ ہماری ظاہری چمک

دک دیکھ کر ہم سے مرعوب رہتے۔
میں فطرتاً بہت رحم دل اور خدا ترس تھی۔ اسی لیے
جب سے مجھے سائرہ کی بیماری کا پتا چلا تھا میں دل کھول
کر اس کی مدد کرتی تھی۔

میری سائرہ سے ملاقات آفس جوائن کرنے
کے دوسرے دن ہی ہو گئی تھی۔ میرا یونٹ کے کمانڈنٹ
سے انٹرویو تھا۔ میں نے ان کے کمرے میں داخل ہو کر
انہیں سیلوٹ کیا۔ انہوں نے جواب دے کر مجھے
سامنے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ابھی میرے انٹرویو کا
آغاز نہیں ہوا تھا کہ آفس کا دروازہ کھول کر ایک بہت
اسارٹ اور خوب صورت سی لڑکی کمرے میں داخل
ہوئی۔

”سر سکندر کا فون آیا ہے اس کی طبیعت خراب
ہے، وہ آج آفس نہیں آئے گا۔ اس نے اپنے دوست
کو بھیجا ہے، وہ پاسپورٹ آفس میں کام کرتا ہے، سردہ
آپ سے ملنا چاہتا ہے۔“
”ٹھیک ہے آپ اسے بٹھائیں، میں دس منٹ
بعد کال کرتا ہوں۔“

”جی سر.....“ اس نے انتہائی تابعداری سے
جواب دیا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

”مجھے آپ کو دیکھ کر بہت خوشی ہو رہی ہے کہ اب
ہماری بیٹیاں بھی ہر فیلڈ میں آگے بڑھ رہی
ہیں.....“ ان کا انداز بہت مشفقانہ تھا میرا مورال بہت
اونچا ہو گیا۔ انہوں نے پندرہ بیس منٹ تک میرا انٹرویو
لیا۔ اور میں انتہائی خوش، خوش کمرے سے نکلی تو ساتھ
والے چھوٹے سے کمرے میں وہ فون پر کسی سے بات
کر رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ تعظیماً کھڑی ہو گئی۔

”میم آپ بیٹھیں.....“ وہ فون رکھ کر مجھ سے
مخاطب ہوئی..... میرے پاس فی الحال کوئی کام نہیں
تھا۔ میں اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

”میرا نام سائرہ ہے اور میں کرنل صاحب کی
بی بی ہوں۔“

”آپ یہاں کب سے جا کر رہی ہیں؟“

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ



ماہِ ستمبر کے

شمارے کی دل

فریب کہانیاں

اولین صفحات

جیکا کے ساحلوں میں سیاحت
کے شوقین اور حبرم کے متوالوں کا سنگین
ملاپ۔ تجسس سے بھرپور ایڈنچر

انکارے

دشمنوں کے شکنجے میں آہنی اعصاب کے مالک چیمپئن
کا امتحان۔ محبت اور جنگ کی فضا میں آگے بڑھتا
ظاہر جاوید مغل کے یادگار سلسلے کی ایک اور کڑی

آوارہ گرد

چلچلیاتی دھوپ میں ہرم ایک نئی مصیبت
سے برسرِ پرکار نوجوان کی سرگزشت.....
عبدالرب بھٹی کی سلسلے وار کہانی

سرورق کے رنگ

روبینہ رشید اور سید شکیل کاظمی
کی سرورق پر سنسنی خیز کہانیاں

ان کے علاوہ

منظرِ امام، تنویر، باض، سلیم، انور،
امرشد بیگ، جمال دستی، تمکین مرزا
اور عکس فاطمہ کی طبع زاد ترجمہ کہانیاں

چینی تکتہ چینی

آپ کے تھرے... مشورے... نکلتیں...
شکایتیں... اور نئی دلچسپ باتیں... کھائیں

میں نے اخلاقا پوچھا۔

”میں مجھے تو دس سال ہو گئے ہیں۔“

”دس سال.....“ میں حیران رہ گئی۔ وہ خاصی کم

مر لگ رہی تھی۔

”آپ تو بہت بیک لگ رہی ہیں.....“ میں نے

فوراً ہی اس کے سامنے دل کی بات کہہ دی۔

”میں میں میرڈ ہوں اور میری چار بیٹیاں

ہیں۔“ اس نے مزید میری حیرت میں اضافہ کیا۔

”واقعی.....! مجھے یقین نہیں آ رہا۔“

”اکثر لوگوں کو یقین نہیں آتا۔ لیکن یہ حقیقت

ہے۔“ وہ دھیمے سے مسکرا کر بولی اور اس کی مسکراہٹ

نے اس کے چہرے پر روشنی بکھیر دی۔

”میں آپ کو کسی بھی مدد کی ضرورت ہو، مجھے

بتا دیجئے گا۔ میں ہر وقت حاضر ہوں۔“ تھوڑی دیر اور

اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد میں اٹھنے لگی تو بڑی محبت

سے مجھ سے ہاتھ ملا کر کہا۔ میرے دل میں اس کا پہلا

تاثر بہت خوشگوار احساسات سے مزین تھا۔

شروع، شروع کے دنوں میں مجھے گھر کو سیٹ

کرنے کے لیے اس کی مدد کی ضرورت پڑی تو اس نے

بغیر حیل و حجت کے میرا ساتھ دیا۔ آفس کے لوگوں کے

ساتھ اس کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ مجھے جب بھی

کسی پلیمبر، الیکٹریشن، جمدار یا کارپینٹر کی ضرورت

ہوتی۔ میں اس سے کہہ دیتی۔ وہ کسی سینئر افسر سے کہلوا

کر فوراً بھجوا دیتی۔ اس طرح مجھے جب بھی کمانڈنٹ

سے بات کرنی ہوتی وہ فوراً مجھے نمبر ملوا دیتی۔ وہ جتنی

اساتذہ اور خوب صورت تھی اس کا بات کرنے کا انداز

بھی اتنا ہی خوب صورت تھا۔ مجھے اس سے بات کرنا

اچھا لگتا تھا۔ تھوڑے دنوں بعد مجھے آفس میں کمرائل

گیا۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھنے لگی تو وہ اکثر دن

میں ایک آدھ بار ضرور چکر لگاتی، بھی وہ اکیلی آتی اور

کبھی پونٹ کی دوسری لڑکیوں کے ساتھ..... وہ عام طور

پر کسی کی برائی نہیں کرتی تھی۔ لیکن آفس کی دوسری

لڑکیاں اس کی غیر موجودگی میں اس کے خلاف بہت

گہری دوستی تھی۔ لہجہ بھی چاروں ساتھ کرتی تھیں۔ شاپنگ پر بھی مل کر ہی جاتی تھیں۔ میرے پاس بھی چاروں اٹھتی تھیں لیکن آج ساڑھ چھٹی پر تھی، وہ نہیں آئی تھی اس لیے تینوں کو اس کے خلاف بولنے کا موقع مل گیا تھا۔

”ایسا کیا کر دیا اس بچاری نے.....؟ وہ تو صبح سے رات تک کولہو کے بیل کی طرح کام کرتی ہے۔“ میں نے کمزور سے لہجے میں اس کی طرف داری کی کیونکہ اس قسم کی چٹپٹی باتیں سننے میں مجھے بھی مزہ آتا تھا۔

”ہاں..... واقعی کام تو وہ بہت کرتی ہے.....؟“ شازیہ نے معنی خیز انداز میں مسکرا کر کہا۔

”کیا مطلب.....؟“ میں نے مزید کر دیا۔

”چھوڑو ناں کیوں خواہ مخواہ کسی کی غیبت کر کے اپنی زبان کو تاناک کر رہی ہو۔“ عارفہ بظاہر تو شازیہ کو منع کر رہی تھی لیکن انداز اس نے والا تھا۔

”یہ غیبت نہیں ہے، وہ جو کرتی ہے سب کو پتا ہے۔“ شازیہ نے فوراً اپنے گناہ کا عذر پیش کیا۔

”کیا وہ خود بتاتی ہے؟“ مجھے حیرانی ہوئی۔

”میم آپ بہت سادہ ہیں۔“ عارفہ کا انداز تمسخرانہ تھا۔

”وہ بھلا کیوں بتانے لگی اور ایسی باتیں کون بتاتا ہے۔ لیکن ایسی باتیں بھلا کہیں چھپ سکتی ہیں۔“ عظمیٰ نے انتہائی کیشیلے لہجے میں کہا۔ اس کا رنگ گہرا سانولا تھا۔ وہ بے حد دہلی پٹی تھی اس کی عمر چالیس کے قریب ہو چکی تھی اور وہ ابھی تک کنواری تھی۔ اسے تمام خوب صورت لڑکیاں بدچلن نظر آتی تھیں۔

”میم آپ کو پتا ہے ساڑھ کی کتنی تنخواہ ہے.....“ شازیہ نے بات کو آگے بڑھایا..... میں ان سب کی آفیسر تھی۔ یہ آفس کی سیاست کا حصہ تھا کہ جو بھی فرد پاس کی نظروں میں اچھا ہو..... اسے ضرور برائیاں کرنا ہے چونکہ وہ سب جانتی تھیں کہ میں ساڑھ کو پسند کرتی ہوں اس لیے وقتاً فوقتاً اس کی غیر موجودگی میں وہ اپنا فرض ادا کرتی تھیں۔ اس وقت بھی وہ اپنے فرض

پائیں کرتی تھیں۔ جس پر یقین کرنے کو میرا دل نہیں چاہتا مگر پھر بھی تھوڑا بہت یقین کر ہی لیتی تھی۔ وہ طلاق یافتہ تھی۔ لوگ تو نہ جانے کیا کچھ کہتے تھے لیکن اس نے مجھے یہ بتایا تھا کہ اس کے شوہر نے اسے صرف اس لیے طلاق دی تھی کہ اس نے مسلسل چار بیٹیاں پیدا کی تھیں۔ اور وہ کوئی بیٹا نہ پیدا کر سکی اور چوٹی بیٹی کی دفعہ کچھ ایسی جھجک پیدا ہو گئی کہ وہ آئندہ ماں بننے کے قابل نہیں رہی اور یہ اتنا بڑا جرم تھا کہ جس پر اسے کسی طور معافی نہیں مل سکتی تھی لہذا اس کے شوہر نے اسے بچیوں سمیت واپس اس کے باپ کے گھر بھجو دیا اور خود اپنی کزن سے شادی کر لی جو اس کی محبت میں ابھی تک کنواری بیٹی تھی۔ جب وہ بچیوں کو لے کر اپنے باپ کے گھر آئی تو وہاں بھی دو بیٹیں شادی کے انتظار میں بیٹھی تھیں لیکن اس کے باوجود اس کے ماں، باپ نے بڑی خوش دلی سے اسے اپنے گھر میں جگہ دی۔

سنا تھا وہ آفس کے بعد کسی ڈاکٹر کے کلینک پر بھی کام کرتی تھی۔ وہاں سے گھر آتے، آتے رات کے دس بج جاتے لیکن اس کا کمال یہ تھا کہ اتنی محنت اور مشقت کے باوجود وہ ہمیشہ ہنستی مسکراتی رہتی۔

☆☆☆

”میم کچھ نہ پوچھیں۔ ساڑھ نے تو سارے محکمے کو بدنام کیا ہوا ہے۔“ جیسے کا دن تھا۔ مرد حضرات نماز کے لیے گئے ہوئے تھے۔ ساڑھ ڈیپارٹمنٹ میں سناٹا چھایا ہوا تھا تو وہ تینوں ہنستی کھلکھلائی میرے آفس میں داخل ہوئیں اور آتے ہی رسمی گفتگو کے بعد ساڑھ کے خلاف باتیں کرنے لگیں۔ حالانکہ جمعے کا دن تھا اور میں کم از کم اس دن کسی کی غیبت سنا نہیں چاہ رہی تھی لیکن اس گناہ میں ایسی کشش ہے کہ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا رید میں شریک ہو گئی۔

وہ تینوں میرے ہی ڈیپارٹمنٹ میں کام کرتی تھیں۔ لیکن تینوں کے سیکشن الگ، الگ تھے۔ عارفہ لیبارٹری میں لیپ اسٹنٹ تھی۔ شازیہ ملکر تھی جبکہ عظمیٰ ٹیلی فون آپریٹر تھی۔ بظاہر ان تینوں کی ساڑھ سے بہت

”میم آپ تو ابھی نئی آئی ہیں آپ کو پتا ہی نہیں.....“ اور پھر وہ تینوں میرے اور قریب آئیں اور چند لمحوں بعد مجھے احساس ہوا جیسے فضا میں چھوٹے بڑے کئی سانپوں کی سرسراہٹیں گونج رہی ہوں۔

☆☆☆

اس دن کے بعد سے میں خاصی محتاط ہو گئی۔ جبکہ سائرہ اسی طرح خوش اخلاقی سے مجھ سے ملتی پھر کچھ دنوں بعد میں نے سنا وہ دینی جارہی ہے..... میں پھر... بدگمانیوں کا شکار ہو گئی۔ اور پھر چند دنوں بعد اس نے خود میرے پاس آ کر اس خبر کی تصدیق کر دی۔

”میم میری کزن دینی میں رہتی ہے، میرا اس کے ساتھ بونٹیک کھولنے کا ارادہ ہے۔“

”دینی میں بونٹیک.....؟“ میں سخت حیران تھی۔
”ابھی تو میں نے پچاس سوٹ تیار کروائے ہیں..... اگر کام چلی نکلا تو پھر..... مزید تیار کراؤں گی۔“
”مگر اس کے لیے تو بہت پیسوں کی ضرورت ہوگی۔“ میں اس سے شاید جیلس ہو رہی تھی۔

”ابھی تو میری کزن نے مجھے پیسے بھجوائے ہیں..... بس میم دعا کریں۔ اللہ اس کام میں برکت دے۔ آپ تو جانتی ہیں آج کل کتنی مہنگائی ہے، بچیاں بھی بڑی ہو رہی ہیں، ان کی تعلیم پھر ان کی شادیاں..... سمجھ میں نہیں آتا کیا ہوگا۔“ وہ بہت زیادہ پریشان اور فکر مند لگ رہی تھی۔

”اچھا میم اب میں چلتی ہوں، آپ میرے لیے دعا کرتی رہیے گا۔“ وہ اپنے سارے پلان بتا کر کھڑی ہو گئی اور چلتے ہوئے ہاتھ ملا کر رخصت ہوئی تو میں نے اطمینان کی سانس لی۔

پتا نہیں کیا درست تھا اور کیا غلط..... میں فیصلہ نہیں کر پار ہی تھی۔ صبح اور غلط کا فیصلہ کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ جب آنکھوں پر شک کے پردے پڑے ہوں اور چاروں طرف بدگمانیوں کے سانپ لہرا رہے ہوں..... زندگی کا چلن اتنا سادہ نہیں..... کبھی جو ہوتا ہے وہ نظر نہیں آتا اور کبھی جو نظر آتا ہے وہ ہوتا نہیں ہے۔

کی انجام دہی میں تن دہی سے جتنی ہوتی تھیں۔
”میرا خیال ہے پندرہ بیس ہزار تو ضروری ہوگی۔“ میں نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

”اس کی تنخواہ بیس ہزار ہے۔ شام کو پارٹ ٹائم نوکری سے آٹھ ہزار ملتے ہیں یہ بھی اس نے خود بتایا ہے۔ اب آپ خود سوچیں آج کل اٹھائیس ہزار میں کیا ہوتا ہے جبکہ اس کی چار بیٹیاں ہیں، باپ ریٹائر ہیں، بھائی ہے نہیں..... پھر چاروں بچیاں پڑھ رہی ہیں تو وہ کس طرح اتنے ٹھاٹھ باٹ سے رہتی ہے۔“ شازیہ نے فوراً حساب کتاب کر کے اس کی پوزیشن کو مشکوک کر دیا۔

”اس کی بہنیں بھی تو جاب کرتی ہیں۔“
”میم..... بہنیں بھی ایسی ہی ہیں..... ایک بہن بیوٹی پارلر میں جاب کرتی ہے۔ دوسری کسی شپنگ کمپنی میں receptionist ہے اور تیسری بہن کسی سرکاری ادارے میں کلرک ہے۔“ عارفہ نے مزید تفصیل بتائی۔

”لیکن اسے دیکھ کر تو لگتا ہے جیسے اس کا تعلق اچھی خوشحال فیملی سے ہے۔ ڈرینک تو بہت اچھی کرتی ہے۔“ میں نے حقیقت بیان کی۔

”ڈرینک کیا۔ آپ اس کی جیولری دیکھیں..... میک اپ دیکھیں جو face wash کرتی ہے، وہ آپ بھی نہیں کرتی ہوں گی۔“ شازیہ کا لہجہ بہت زہر یلا تھا۔ وہ آج نہ جانے کیا ثابت کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

”جیسی تو..... دنیا ایسے ہی تو باتیں نہیں بناتی..... اور شوہر نے ایسے ہی تو طلاق نہیں دی ہوگی۔“ اس نے مزید جملہ کہہ کر اپنے زخموں پر مرہم رکھا۔

”ظاہر ہے، گھر بسانا آسان نہیں ہے، اپنے آپ کو ختم کرنا پڑتا ہے۔ تب ہی گھر آباد ہوتے ہیں۔“ عارفہ جو ہمیشہ اپنے شوہر کی زیادتیوں کی شکایت کرتی تھی۔ فخریہ لہجے میں بولی۔ اور یہ جملہ سنتے ہی عظمیٰ کے چہرے کی تاریکی کچھ اور گہری ہو گئی۔

”دعا کریں، اللہ پاک شفا دے اتنی اچھی لڑکی ہے،
بچپن کا ساتھ ہے، اللہ اس کی بچیوں پر رحم کرے۔“

☆☆☆

دو دن بعد اس کا آپریشن ہو گیا اور کامیاب ہوا۔
آفس کی طرف سے اسے خاصا قرضہ ملا۔ اور لوگوں
نے بھی پیسے جمع کر کے اس کی مدد کی۔
وہ صحت یاب ہو کر آفس آئی تو بالکل بدلی ہوئی
تھی۔ چہرے پر بشارت نہ آنکھوں میں چمک اسے
دیکھ کر خوف سا آتا تھا۔ چند مہینوں میں وہ ہڈیوں کا
ڈھانچا بن گئی تھی۔

☆☆☆

اس نے دوبارہ آفس جو ان کر لیا تھا۔ آفس کی
طرف سے اس کو خاصی مراعات ملی ہوئی تھیں۔ اس کا
علاج جاری تھا۔ ریڈیو تھراپی ہو رہی تھی اور وہ بھی کسی
پرائیویٹ اسپتال میں جس کے لیے اسے اکثر پیسوں
کی ضرورت رہتی۔ اب اس کا آئے دن کا یہ معمول بن
گیا تھا وہ آفس کے لوگوں سے کسی نہ کسی ٹیمٹ یاد دلا
کے لیے پیسے مانگا کرتی۔

اس کی بیماری کو پانچ سال ہو گئے تھے۔ شروع،
شروع میں لوگوں نے دل کھول کر مدد کی۔ پھر آہستہ،
آہستہ سب نے ہاتھ کھینچنے شروع کر دیے کوئی کب تک
کسی کا ساتھ دے سکتا ہے۔ پھر سب ہی سرکاری ملازم
تھے، نہ جانے کتنے جتن سے زندگی کی گاڑی گھسیٹ
رہے تھے سب کا یہی حال تھا کہ سر چھپائیں تو بدن کھلتا
ہے۔ سب کی چادریں چھوٹی تھیں اور اب تو یہ حال
ہو گیا تھا کہ لوگ اس کی صورت دیکھتے ہی بہانے سے
کھسک جاتے تھے۔

میں بھی کسی حد تک انہی لوگوں میں شامل تھی۔
میری بھی یہی کوشش ہوتی کہ جب وہ میرے پاس
آتی، میں بھی بہانہ بنا کر آفس سے چلی جاتی یا اپنے
آپ کو کام میں مصروف ظاہر کرتی تاکہ وہ اکتا کر چلی
جائے لیکن وہ بھی ایک نمبر کی ڈھیت تھی۔ گھٹنا، گھٹنا بھر
خاموش بیٹھی رہتی۔ بالآخر مجبور ہو کر میں اس کی مانگی

سارہ چھٹی لے کر دینی چلی گئی اور ہم سب
رنگ کی کھیل میں پھر سے اپنے، اپنے حصے کا پارٹ
الز نے لگے۔ وہ نہیں تھی تو اس کا ذکر بھی کم ہو گیا۔
مجھے دوسرے ڈیپارٹمنٹ میں بھیج دیا گیا۔ ان تینوں
ہا آنا بھی کم ہو گیا۔ یہاں کام بھی زیادہ تھا۔ اس لیے
اندھل ہاتھوں کے لیے وقت ہی نہیں ہوتا۔ اب بھی
امصار ہی میرے ذہن میں اس کا خیال آتا۔

پھر ایک دن میں نے سنا کہ وہ واپس آ گئی۔ ان
لوگوں میں چھٹیوں پر تھی۔ میں واپس آفس آئی تو پتا چلا
کہ وہ بہت بیمار ہے۔ اتنی زیادہ کہ پہچانی نہیں جانی۔
پھر کہانیاں بننے لگیں۔ عجب و غریب کہانیاں، بے
حیاتی اور بے شرمی کے تاروں سے مٹی ہوئی رنگ برنگی،
چمکے دار کہانیاں، تنہا عورت، طلاق یافتہ، چار
بچیاں..... صبح سے شام تک کام کرنے والی، ویل
ڈریسڈ، خوب صورت، دینی کا چکر..... بیماری، کہیں
کوئی جھول نہیں تھا۔ مضبوط پلاٹ..... ہر رنگ، ہر
انداز جو کہانی کو رنگین بنا دے.....

☆☆☆

”میم سارہ بہت بیمار ہے.....“ چھٹیوں کے
بعد میں نے آفس جو ان کیا تو لوگوں سے ملتے جلتے
خیریت دریافت کرتے ہوئے کسی نے مجھے اس کے
بارے میں بتایا۔

”اوہ، یہ تو بہت برا ہوا۔“ مجھے خاصا دکھ ہوا۔
”وہ دینی سے آنے کے بعد ایک ہی دفعہ آفس
آئی تھی۔ بہت کمزور ہو گئی ہے رنگ تو بالکل سیاہ ہو گیا
ہے۔“ آفد صاحب جو ہمارے آفس میں ہیڈ کلرک
تھے۔ انہوں نے بڑی دلسوزی سے یہ خبر سنا کی۔

”اللہ خیر کرے..... ایسا کیا ہو گیا.....؟“ میرا دل
دھک، دھک کرنے لگا۔

”سنا ہے شاید کینسر ہو گیا ہے، پرسوں آپریشن
ہوگا۔“

”کینسر.....“ الفاظ میرے لبوں تک آتے،
آتے دم توڑ گئے۔ مجھ سے کچھ نہ بولا گیا۔

مال ہوتے ہیں۔ ہر دفعہ پوسٹنگ کے وقت ہم دونوں کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ ساتھ رہنے والوں کو چھوڑنے کا دکھ، نئی جگہ اور آنے والے مسائل کا خوف اور میں تو عورت ہونے کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی حساس تھی اور ابھی مجھے فوج کو جو اس کیے ہوئے بہت زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ فوجی ٹریننگ کے بعد یہ میری پہلی پوسٹنگ تھی۔ میرا دل پانی، پانی ہو رہا تھا۔ اور پارٹی کے دوران ہی مجھے خبر ملی کہ صبح کو سائرہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ دل غم سے مزید بو بھل ہو گیا۔

پارٹی بہت شاندار رہی سب نے حسب معمول میری بہت تعریفیں کیں۔ آفس کی طرف سے بہت قیمتی تحائف بھی ملے لیکن ان میں سے کوئی چیز بھی میری افسردگی کو دور نہ کر سکی۔ ساری رات مجھے نیند نہیں آئی۔ میں مسلسل سائرہ کے بارے میں سوچتی رہی۔ چند لمحے کے لیے آنکھیں بند ہوتیں تو بھی اس کا چہرہ نظروں میں پھر تارہتا۔

☆☆☆

صبح ہوتے ہی ضروری کام نمٹا کر میں اپنے میاں کے ہمراہ اس کے گھر پہنچی۔ اس کا گھر اور اس کی بچپن کو دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔ گھر بہت صاف ستھرا اور سیلتے سے سجا ہوا تھا۔ بیٹیاں بھی بہت اچھے لباس میں تھیں۔ گھر میں رشتے دار خواتین جمع تھیں۔ سب نے حیرانی سے مجھے دیکھا، میں ان سب کے لیے اجنبی تھی۔

”میرا نام انم ہے، میں سائرہ کے آفس سے آئی ہوں۔“ میں نے ایک خاتون سے اپنا تعارف کر رہا۔ ”اوہ..... آپ کیپٹن انم ہیں۔ آئیے تشریف لائیے۔“ خاتون کے ساتھ بیٹھی اس کی بڑی بیٹی مریم نے فوراً مجھے پہچان لیا۔ میں نے اسے گلے سے لگا کر دلاسا دیا۔

”سائرہ کی والدہ کہاں ہیں؟“ میں نے باقی بیٹیوں اور اس کی بہنوں سے مل کر اس کی والدہ کے بارے میں پوچھا۔

”نانا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، وہ اپنے کمرے

ہوئی رقم سے آدمی یا چوتھائی رقم دینے کا وعدہ کر لیتی۔ میں نے اس دفعہ کیٹی سے دو چوڑیاں بنانے کا سوچا تھا لیکن اس کی منت ساجت کے بعد میں پھر مجبور ہو گئی۔ دوسرے ہی دن میں نے پورے تیس ہزار اس کے حوالے کر دیے۔ رقم دیکھتے ہی اس کے چہرے پر جو چمک اور رونمائی پیدا ہوئی اس نے میری چوڑیاں نہ بننے کے ملال کو تھوڑا کم کر دیا۔

☆☆☆

دو دن بعد ہی میری پوسٹنگ کے آرڈر آ گئے۔ ہماری خوش قسمتی تھی کہ مجھے اور میرے میاں کو ایک شہر میں پانچ سال اکٹھے رہنے کا موقع مل گیا۔ اور یہ موقع ہمیں کیسے ملا تھا۔ اس کے پیچھے ایک طویل کہانی ہے۔ یہ تو ہم ہی جانتے ہیں کہ ہم نے کتنی بھاگ دوڑ کی تھی اور کن، کن لوگوں سے سفارشیں کروائی تھیں۔ کیسے، کیسے بہانے تراشے تھے لیکن اس دفعہ ہماری کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکی۔ میرے بھائی کے سر کے کزن جرنیل تھے۔ ان تک سے سفارش کروائی۔ لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا اور ہمیں رخت سفر باندھنا ہی پڑا۔ میری پوسٹنگ پنڈی ہوئی تھی اور میرے شوہر کی کوشش..... ہم دونوں کو بے شمار مسائل کا سامنا تھا۔ اسی دوران مجھے اڑتی، اڑتی خبر ملی کہ سائرہ کی طبیعت بہت خراب ہے اور اب وہ اسپتال میں ایڈمٹ ہے۔

☆☆☆

مجھے پنڈی جا کر رپورٹ کرنی تھی۔ میری اتوار کی فلائٹ تھی۔ دو دن پہلے آفس میں فیملی ویل تھی۔ میرا دل بہت اداس ہو رہا تھا۔ پانچ سال ایک جگہ کام کرتے، کرتے صرف لوگوں سے ہی نہیں اس جگہ سے بھی انسیت ہو جاتی ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں فوجیوں کے دل بہت سخت ہوتے ہیں، ان پر کسی بات کا اثر نہیں ہوتا۔ ان کے دل شاید محبت اور انسیت کے جذبوں سے نا آشنا ہوتے ہیں جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ فوجی بھی عام انسانوں کی طرح دل رکھتے ہیں اور ان کے دل بھی جذبات اور احساسات سے مالا

میں ہیں۔“

”کیا میں ان سے مل سکتی ہوں؟“

”جی..... ضرور..... وہ تو خود آپ سے ملنا چاہتی ہیں آپ نے جس طرح امی کا ان کی بیماری میں ساتھ دیا۔ اس کے لیے وہ اور ہم سب آپ کے بہت شکر گزار ہیں۔“ سائرہ کی بیٹی کے اس طرح سب کے سامنے کہنے پر میں خوشی اور شرمندگی کی عجیب سی کیفیت کا شکار ہو گئی۔ وہ مجھے لیے ہوئے اپنی نانی کے پاس آئی، انہیں دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہوا غم اور دکھوں سے ان کا خوب صورت چہرہ کلمایا ہوا تھا۔

”بہت افسوس ہوا، اللہ تعالیٰ آپ کو صبر دے۔“

میں نے ان کا ہاتھ تھام کر ان سے تعزیت کی۔

”تم نے جو کچھ کیا، خدا تمہیں اس کا اجر دے۔ تم نے میری بیٹی کا بڑا ساتھ دیا۔ خدا تمہیں ہمیشہ خوش و خرم رکھے۔ وہ تمہاری بڑی تعریف کرتی تھی۔“ ان کے جملوں نے میرے اندر گھٹیا سی خوشی پیدا کر دی۔ میری انابابت اپنی چھب دکھلانے لگا۔

”آپ مجھے شرمندہ نہ کریں جو کچھ میں نے کیا وہ تو میرا فرض تھا۔“

”میرا..... فرض.....“ اس لفظ نے مجھے میری ہی نظروں میں شرمندہ کر دیا..... کیا واقعی..... جو کچھ میں نے اس کے ساتھ کیا تھا فرض سمجھ کر کیا تھا۔ اگر واقعی فرض سمجھ کر کرتی تو کیا اسے گھنٹوں اپنے سامنے بٹھائے رکھتی؟ اسے دینے کے لیے بے شمار بہانے بناتی؟ اس سے بار، بار اپنے آفس کے چکر لگواتی؟ اسے پیسے دے کر اپنی انانکی آب یاری کرتی؟

”میرے مرنے کے دن تھے اور وہ چلی گئی۔“ وہ میرا ہاتھ تھام کر سسکنے لگیں۔ میں آہستہ، آہستہ ان کا ہاتھ ہسکنے لگی۔

کوئی بتائے اب میں کیا کروں گی۔ کیسے اس کی بچیوں کو پڑھاؤں گی۔ اسے کتنا شوق تھا کہ اس کی بچیاں پڑھ لکھ کر باعزت زندگی گزاریں۔ وہ تو ان بچیوں کی خاطر صبح سے رات گئے تک کام کرتی تھی۔

تین، تین جگہ نوکریاں کرتی، لوگوں کی باتیں سنتی اب جب سے بیمار ہوئی تھی اتنی محنت نہیں کر سکتی پھر بھی بچیوں کی ہر ضرورت پوری کرتی۔ اپنا علاج سرکاری اسپتالوں میں کراتی تھی۔ اور بچیوں کو پرائیویٹ کالجوں میں پڑھا رہی تھی۔ وہ صدیے اور غم کی کیفیت میں نہ جانے کتنے راز افشا..... کر رہی تھیں۔

”واقعی دنیا ٹھیک کہتی تھی.....“ میری اس سے ہمدردی غصے میں بدلنے لگی۔

”چند دن پہلے مریم کا یونیورسٹی میں داخلہ ہونا تھا۔ پچاس ہزار چاہیے تھے۔ پتا نہیں اس نے کس سے لیے اور جس دن اس نے فیس جمع کرائی اس سے اگلے دن ہی شدید بیمار ہو کر اسپتال میں داخل ہو گئی۔“

”اوہ..... تو اصل کہانی یہ تھی۔“ میں حیرت زدہ تھی۔

”اس کا مطلب ہے کہ وہ بیماری کا بہانہ بنا کر لوگوں سے پیسے وصولی تھی۔ جیسی وہ کسی کو اپنی رپورٹس نہیں دکھاتی تھی کہ سب کو حقیقت پتا چل جائے گی۔ آج مجھے پتا چلا لوگ ٹھیک کہتے تھے۔ وہ جھوٹ بولتی تھی، لوگوں کو فریب دیتی تھی، وہ غلط تھی، اس نے جو کچھ کیا سب غلط تھا۔ میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گی۔ اس نے مجھے کتنا بے وقوف بنایا..... بیماری کے بہانے کتنے ہزاروں روپے مجھ سے تھھیلے۔ یہ تو سراسر بلیک میلنگ تھی۔ اس نے مجھے دھوکا دیا۔ میرے ساتھ فراڈ کیا۔“ غم و غصے سے میرے اندر شعلے بھڑکنے لگے۔

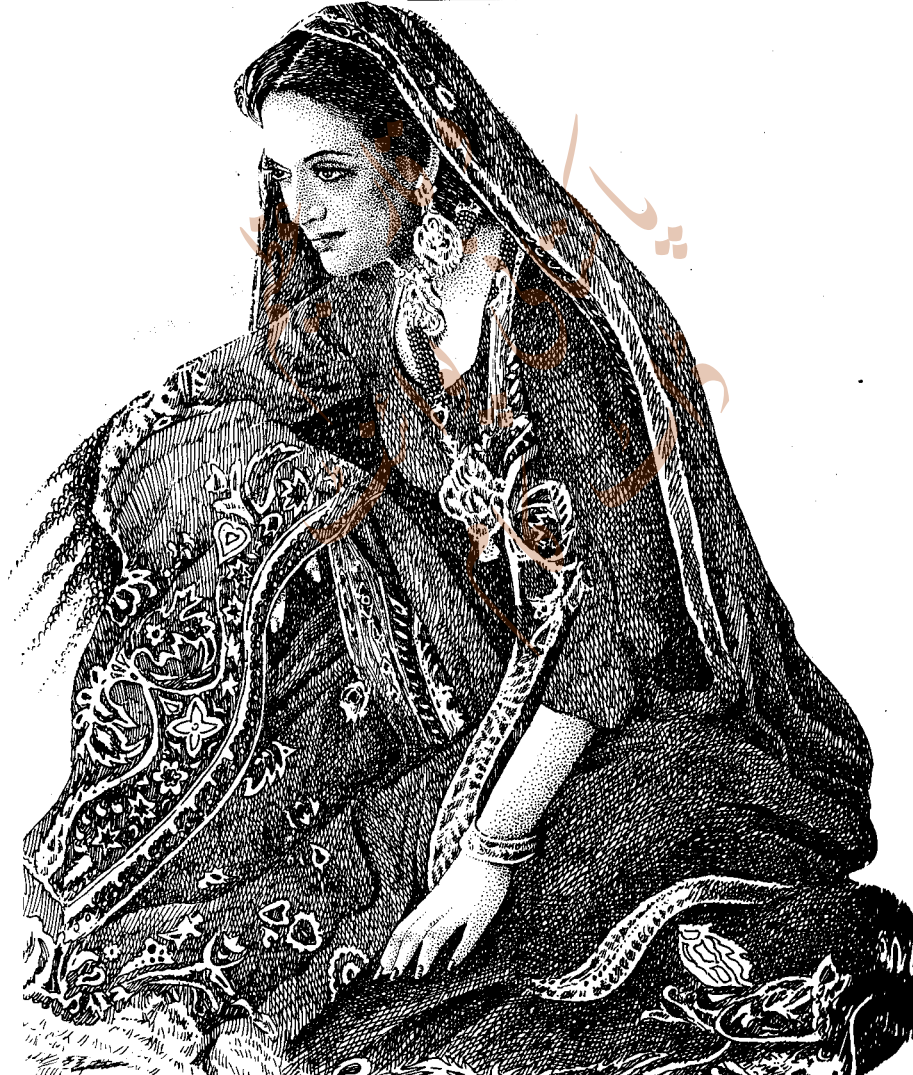
”اس نے ایسا کیوں کیا؟ کیا تھا اگر وہ صحیح راستہ اختیار کرتی۔ سچ بولتی۔ لوگوں کو سچ بتا کر بچیوں کی تعلیم کے لیے پیسے مانگتی۔ کیا اگر وہ سچ بولتی تو لوگ اسے پیسے نہ دیتے؟ جس طرح وہ اپنے علاج کے لیے پیسے مانگتی تھی۔ بچیوں کی تعلیم کے لیے نہیں مانگ سکتی تھی؟ کیا مجھ سے مانگتی تو میں اسے نہ دیتی.....؟“ سب سے پہلے میں نے اپنے آپ سے ہی سوال کیا؟

اور پھر تھوڑی دیر بعد ہی میرے اندر کی بھڑکتی ہوئی آگ شعلہ بن گئی کیونکہ میرے سوال کا جواب نفی میں تھا۔

اسٹج پر آنکھوں کو خیرہ کرتی روشنیوں میں جگمگ کرتی پیاری سی دلہن، اس کے گرد اس کی کزنز اور سہیلیوں کا ہجوم..... ہال میں موجود تمام میزیں مہمانوں سے پُر، خوب صورت لباس، میک اپ، زیورات اور خوشبوئیں..... خواتین کے نہ ختم ہونے والے قصے، تہرے، نوجوان لڑکیوں کی گپ شپ، غرض وہی ایک روایتی سا شادی بیاہ کا ماحول..... جس کا حصہ آج میں بھی تھی... بلکہ زبردستی بنا دی گئی تھی۔

مہم بتلا سکیں کیا

ہال احمد



میں ٹھہری انڈر ویٹ دھان پان سی..... بھلا میرا ان سے کیا مقابلہ.....؟ سو فی الحال سچ حاصل کرنے کی تمنا کو دل میں ہی دبا کر اب میں نے ڈشز کی طرف رخ کیا۔ ایک قدم کسی طرح آگے بڑھائی تو دو قدم پیچھے دھکیل دی جانی۔ بڑی مشکلوں سے دولڑکیوں کے درمیان ایک جھروکا نظر آیا اور اس جھروکے سے قورے کی ڈش کا کھڑا..... جسے دیکھتے ہی میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور گھس گئی اس جھروکے میں..... قورمہ ڈالنے کا معرکہ سر ہوا تو اب نان اٹھانے کا مرحلہ درپیش ہوا۔ پلیٹیں ہاتھ میں تھامے میں کچھ دیر کھڑی رہی کہ شاید کوئی جھروکا یہاں بھی نظر آجائے۔ آہستہ، آہستہ

سرکتے ہوئے میں آگے بڑھتی جا رہی تھی اب میرے اور نان کی ڈش کے بیچ صرف ایک رکاوٹ، مطلب ایک خاتون رہ گئی تھی۔ اچانک مجھے ایک خیال آیا کہ یہ ”رکاوٹ“ خود دھڑا دھڑا نان اٹھائے چلی جا رہی ہے کیوں نہ اسے ہی کہہ دوں کہ دو نان میرے لیے بھی اٹھا لو۔ سو وقت ضائع کیے بغیر میں نے اپنا کندھا ان کے کندھے سے ملا کر اور اپنا منہ ان کے کان میں گھسیڑ کر بڑی عاجزی سے درخواست کی۔

”باجی! دو نان مجھے بھی پکڑا دیں پلیز.....“ کہ ایک بچہ ان کے کندھے سے لگا تھا تو دوسرا ان کا پلو پکڑے رہی، ریں کر رہا تھا۔ اپنی طرف سے تو میں نے بڑی رعایت برتی تھی کہ آنٹی کے بجائے باجی کہہ کر رکھار کیونکہ میں خود تو ابھی کالج کے دوسرے سال میں تھی۔ مگر انہیں یہ رعایت ایک آنکھ نہ بھائی۔ مجھے نان پکڑانا تو دور کی بات انہوں نے اپنے اٹھائے نان بھی واپس ڈش میں پٹخے اور بڑے جلال سے میری طرف پلیٹیں۔

”یہ باجی کیسے بولا؟“ کم از کم تمہاری باجی تو نہیں ہوں میں۔ ذرا خود کو دیکھو، بڑی مچھلن بن رہی ہو، کسے خبر ایک کلاس میں کتنے سال لگائے ہوں۔“ اس وقت ان کے تیوروں سے گھبرا کر میں یہ کہنا بھول گئی کہ ”دو ایجادیں“ تو آپ کے ساتھ اس وقت مجھے نظر

ہوا کچھ یوں کہ ہمارے پرانے محلے دار جواب کسی دوسرے علاقے میں شفٹ ہو چکے تھے۔ ان کی اکلوتی بیٹی کی شادی خانہ آبادی کا دعوتی کارڈ ہمیں بھی موصول ہوا۔ ابا تو خیر اب شادی وادی ٹائپ کی کسی محفل میں جانے سے گریز ہی کرتے تھے۔ اماں بھی اپنے گھٹنوں کے درد کی وجہ سے شادی میں جانے سے اچانک انکاری ہو گئیں۔ ہاں مگر پرانے تعلقات نبھانے کی غرض سے بھابی اور مجھے خاص تاکید کی کہ تم دونوں شادی میں ضرور جاؤ گی اور ہماری نمائندگی کرو گی۔ میں نے اپنے ٹیٹ کی تیاری کے خوب بہانے کرنے کی کوشش کی مگر بھابی بھی اماں کی ہمنوا ہو گئیں۔ اصل میں وہ خود بھی اکیلی نہیں جانا چاہتی تھیں سو کمپنی کی غرض سے میرا ان کے ساتھ جانا بہت ضروری تھا۔ یوں آج میں بھابی کے ساتھ اس خوب صورت ماحول کا حصہ بنی ہوئی تھی۔

بھابی کو تو ان کی ایک پرانی کلاس فیلو لگیں سو وہ تو ان کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گئیں اور میں دل ہی دل میں بیچ و تاب کھاتی معصوم سی شکل بنائے بیٹھی تھی۔ اتنے میں کھانا کھانے کا اعلان ہو گیا۔ سب مہمان خواتین کے چہروں پر خوشی اور اطمینان کی جھلک میں نے اپنی نشست پر بیٹھے، بیٹھے محسوس کی۔ بھوک تو خیر مجھے بھی لگی ہوئی تھی مگر میں خواتین کے جم غفیر میں غوطہ لگانے کی ہمت نہیں کر پارہی تھی مگر..... بھلا ہو ہماری بھابی صاحبہ کا..... اپنی کھپٹی کے ساتھ باتوں میں اتنی مصروف کہ کھانا لینے کے لیے بھی نہیں بلیں، وہیں سے مجھے حکم جاری ہوا کہ ان کے لیے بھی پلیٹ بنا کر لے آؤں۔ لوجی اب تو ہمت کرنا ہی تھی۔ چارو تا چار مرے مرے قدموں سے کھانے کی ٹیبل تک گئی۔ بڑی مشکل سے دو پلیٹیں حاصل کیں جو اس وقت مجھے کسی تھنے سے کم نہیں لگ رہی تھیں۔ سچ کسی بھی طرح میرے ہاتھ نہیں لگ رہے تھے۔ حالانکہ پلاؤ کی خوشبو مجھے تمام رے تروانے پر مجبور کر رہی تھی۔ مگر خواتین تو بہ، توبہ..... دھکم پیل کی ماہر معلوم ہو رہی تھیں۔ اور

بیٹی کی رخصتی پر

ایک ماں کی دعا

تو جہاں رہے وہاں پیار ہو
تیرے ہر قدم پہ بہار ہو
تری آنکھوں میں کبھی نمی نہ ہو
کسی شے کی تجھے کمی نہ ہو
تجھے جو لگے وہ نظر نہ ہو
کسی دکھ کو تیری خبر نہ ہو
تیری راہ میں قوس قزح رہے
تجھ سے راضی رب کی رضا رہے
خوش تیرے پاؤں کی دھول ہو
دعا یہ میری بس قبول ہو

از: فصیحہ آصف خان، ملتان

آ رہی ہیں کسے خبر کتنے بچے مزید آپ نے گھر میں
پھپھائے ہوں۔ جبکہ وہ بلا لکان بولے جارہی تھیں۔
”دیکھو ذرا چھوٹا بننے کا کیسا شوق ہے لوگوں کو۔
بھئی پہلے دیکھ تو لو..... جسے باجی کہہ رہی ہو وہ تمہاری
باجی ہے بھی یا نہیں۔“

”جی، جی غلطی ہو گئی، بس سوری یا..... میرا
مطلب ہے سوری..... صرف سوری..... قسم سے۔“
مشکل سے ان سے جان چھڑا کر وہاں سے مڑی تو کسی
نے ازراہ ہمدردی دو نان میرے ہاتھ میں تھما دیے۔
جنہیں دبوچ کر میں تو وہاں سے لٹے قدموں دوڑی۔
بھابی کو کھانا دیا اور اپنا لے کر کھیا نیلی کی طرح
اپنی سیٹ پر آ بیٹھی۔ ”حد ہو گئی بھئی۔“ دو نوالے لے کر
ہی میرے دماغ کی تکی روشن ہونے لگی تو غصہ بھی آنے
لگا۔ اتنے میں میری ساتھ والی خالی سیٹ پر ایک لڑکی
آ کر بیٹھی۔ کھانا کھاتے کھاتے یونہی ادھر ادھر کی باتیں
بھی شروع ہو گئیں۔ اور باتوں ہی باتوں میں یہ بات
بھی معلوم ہو گئی کہ موصوفہ کا نام فریہ ہے۔ میں تو کافی
خوش کہ بھابی کو باتوں سے فرصت نہیں تھی تو مجھے بھی
بولنے کے لیے ایک ساتھی مل گیا تھا۔ اچانک کھانا
کھاتے ہوئے وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑی ہوئی اور
کہنے لگی۔

”میں ذرا کولڈ ڈرنک لے آؤں۔ بڑی جلدی
ختم ہو جاتی ہیں۔“ میں نے موقع غنیمت جانا اور مصوم
سی فرمائش داغ دی۔

”فریہ! تم میرے لیے بھی کولڈ ڈرنک لے
آؤ گی پلیز.....؟“ مجھے اس کی درست عمر کا تو اندازہ تو
نہیں ہوا تھا۔ اور پھر شائستگی اور تیز سے کسی کو باجی شامی
بولنے کا مزہ تو میں خوب چکھ چکی تھی سو اس کے معاملے
میں نے اپنے تئیں بہت احتیاط برتی۔ اور اپنا نیت و
بے تکلفی سے آپ جناب کا تکلف بھلا کر سیدھا نام
لینے پر ہی اتر آئی۔ بجائے اس کہ کہ وہ اس عزت پر
اترائی مگر اس کے تو چہرے کے تاثرات ہی یک لکھت
تبدیل ہو گئے۔

”کچھ تو تمیز سے کام لو تم کس طرح آرام سے
میرا نام لے رہی ہو اور تم، تم کر کے بات کر رہی ہو؟
زیادہ سے زیادہ بھی ہوئی تو ایف اے، بی اے کی
اسٹوڈنٹ ہو گئی تم..... اور میں چار سال پہلے ایم اے
بھی کر چکی ہوں۔ سمجھیں تم؟ ہم عمر نہیں ہوں میں
تمہاری، کمال ہے کوئی تمیز ہی نہیں ہے تمہیں۔“ ان
کے چلانے سے کئی لوگ متوجہ ہو چکے تھے۔ اور میرا وہ
حال کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں..... مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہی
تھی کہ مجھ سے قورے کی دفعہ غلطی ہوئی تھی یا کولڈ
ڈرنک کی دفعہ..... بھابی مجھ سے بار بار پوچھ رہی تھیں
کہ ہوا کیا ہے؟ اور میرے ذہن میں ایک ہی جملہ آ رہا
تھا کہ کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا؟“ اسی اثنا میں کسی
نے میرے ہاتھ میں ٹھنڈی ٹھار کولڈ ڈرنک تھما دی۔
یہ غالباً نہیں بلکہ یقیناً وہی ”ہمدرد ددگار“ تھیں
جنہوں نے نان میرے ہاتھ میں تھمائے تھے۔

میرٹی دھوپ کی تم ہی چھاؤں

سحر شفا طے



”جی امی، کہیں کیا بات ہے؟“ وہ تیاری میں عجلت دکھانے لگا۔

”اب تمہاری شادی ہو جانی چاہیے، میں ویسے تو اور لڑکیاں بھی دیکھ رہی ہوں پر جب گھر میں ہی ایک

آذر اپنے کمرے میں تیار ہو رہا تھا بھی نعیمہ اس کے پاس چلی آئیں۔

”مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔“ آذر گھڑی باندھتے ہوئے انہیں دیکھنے لگا۔



”اے! ہو تو بھلا باہر کیوں دیکھیں؟“ نعیہ کی بات پر
”کہہ دینی پہنا ہی جیسے بھول گیا۔“

”میں کچھ سمجھا نہیں ای۔“ کندھے اچکاتے
”آئے آؤرنے جیسے لاعلمی کا اظہار کیا۔“

”ہاں..... بھئی میں معظمہ کی بات کر رہی ہوں اتنا
بھی نہیں سمجھے؟“ وہ سامنے رکھی چیز پر اطمینان سے آکر
بیٹھ گئیں جس سے آؤر کو لگا کہ کہیں وہ کسی بات نہ کرنے
لگ جائیں۔

”مجھے بہت کام ہیں۔ ابھی میں جا رہا ہوں۔“
”میری بات کا جواب تو دو پہلے۔“ نعیہ نے
سنجیدگی سے کہا۔

”ای! کیا اچھا لگ گیا ہے آپ کو، آپ کی حسین و
جلیل بھتیجی میں؟“ اس نے حسین لفظ کو ذرا کھینچ کر کہا تھا۔
”بری بات ہے جیسی بھی ہے ناں بہت سوں سے
اچھی ہے، سلیقہ والی ہے، پڑھی لکھی ہے۔ ڈاکٹر بننے
جاری ہے، گھر داری میں بھی آگے آگے ہے اور کیا
چاہیے۔“ نعیہ اچھے سے جان گئی تھیں آؤر، معظمہ پر کس
بات کی وجہ سے طنز کر رہا تھا۔

”مجھ سے پوچھ رہی ہیں تو آپ میرا جواب سمجھ گئی
ہوں گی۔“ اتنا کہہ کر وہ رکائیں، اٹھاپ ٹاپ کا بیگ
اٹھایا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

”یار میں کیا کروں؟ تم خود بتاؤ میں کیسے لوں؟
آتے جاتے وقت بھائی ساتھ ہوتے ہیں، ان کا بس
چلے تو کلاس روم تک چھوڑ آئیں۔“ میشل کسی سے فون
پہ بات کر رہی تھی کہ آؤر کو اس کے کمرے کے ادھ کھلے
دروازے سے آواز آئی۔

”کون ہے فون پر؟“ آؤرنے اندر آکر پوچھا۔
”جج، جی بھائی وہ رمشا..... رمشا ہے فون پہ.....“
میشل اچانک آؤر کی آواز سن کر چونکی اور گھبراتے ہوئے
جواب دیا۔

آؤرنے فون اس سے چھینا اور اپنے کان سے لگایا
دوسری طرف سے لڑکی کی ہیلو، ہیلو کی آواز پہ اس نے
گھبرائی ہوئی میشل کو دیکھا اور فون اسے تھماتے ہوئے

لبے، لبے ڈگ بھرتا ہوا چلا گیا۔
میشل نے ایک لمبی سانس خارج کی اور پھر سے
فون پر بات کرنے لگی۔

”شکر ہے تم نے فون عامر سے لے لیا تھا ورنہ
میری صحیح والی درگت بن جاتی تھی۔“ میشل نے رمشا کو
بتا کر فون منقطع کر دیا۔

”اس گھر میں میری تو کوئی سنتا ہی نہیں ہے،
احساس نام کی چیز نہیں کسی کو..... اور تم.....“ نعیہ، میشل
کے کمرے میں بیڑ پاتی ہوئی آئیں۔

”میں..... میں کیا؟“ میشل نے انگلی سے اپنی
طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”سارا دن اس موبائل سے کھیلتی رہتی ہو، یہ نہیں
کہ دو گھڑی کو ماں باپ کے پاس بھی آکر بیٹھ جاؤ۔“
”ای! آپ لوگوں کے ساتھ ہی تو ہوتی ہوں بھئی
کیا ہو گیا ہے۔“ میشل ان کی بات پہ تھوڑا اونچی آواز
میں بولی۔

”ہاں تو تب بھی احسان ہی کرتی ہو ساتھ بیٹھ
کر..... تک، تک تو تب بھی لگی رہتی ہے۔“
میشل سمجھ گئی کہ توپ کارخ آج اس پر اور اس کے
موبائل پر ہے۔

”اچھا آرام سے بیٹھیں، یہاں کیا کھڑی، کھڑی
ہی مجھے کھڑی کھڑی سنا کر عمارہ ثابت کرتا ہے؟“ میشل
کو مسکراتا ہوا۔

”چلیں آئیں بیٹھیں یہاں..... تحمل سے بتائیں
کیا بات ہے اتنا غصہ کیوں ہیں؟“
نعیہ بیٹھ تو گئیں لیکن منہ پھیر لیا تھا۔

”اوہو امی اب بتائیں مجھے میں سن رہی ہوں۔“
”تمہارے چاچا کی بیٹی معظمہ بھی تو تمہارے
ساتھ ہی پڑھتی ہے ناں۔“ نعیہ نے میشل کے کندھے پر
ہاتھ رکھا۔

”ہاں تو؟“ میشل نے حیرانی سے دیکھا۔
”وہ بھی تو گھر کے کام کرتی ہے پڑھائی کے ساتھ ساتھ۔“
اس بات سے میشل کو چڑھتی کہ نعیہ، معظمہ کو زیادہ

بھائیوں میں پیار تھا تو دونوں کی بیویوں نے بھی رشتے کو برقرار رکھا ایک دوسرے کے ساتھ حسن سلوک سے
 نعیمہ کے ہاں پہلی اولاد پٹنا ہوئی جس کا نام جویریہ نے آڈر رکھا پر اس کی اپنی گود سونی ہی رہی، وہ آڈر سے لاڈ پیار کرتی رہتی پھر چھ سالوں بعد جب نعیمہ کے ہاں میٹھل ہوئی تب جویریہ کے ہاں معظمہ ہوئی دونوں بچیوں میں ایک مہینے کا فرق تھا تو ساتھ ساتھ رنگت میں بھی رہا میٹھل ایسی گوری تو معظمہ اس کے مقابلے میں گہرا گندمی رنگ لیے ہوئے تھی وقت کا دھارا تیزی سے بہتا جا رہا تھا معظمہ کے بعد اس کی چھوٹی بہن بھی ہوئی منال نام اس کی چچی نعیمہ نے ہی رکھا۔

چونکہ نعیمہ اور جویریہ کا آپس میں اتنا لگاؤ تھا کہ جویریہ دل میں ہی سوچے بیٹھی تھی کہ آڈر اور معظمہ کا رشتہ ابھی سے ٹکا کر دیں پر اس کی رنگت کی وجہ سے وہ چپ ہی رہیں لیکن نعیمہ معظمہ کو بہت پیار کرتیں اسے میٹھل جیسا ہی رکھا اور گھر کی چھوٹی تو منال تھی، وہ سب کی جیتی ہی رہی۔
 جہاں میٹھل کو نعیمہ نے اتنے ناز خڑے سے رکھا وہیں جویریہ نے معظمہ کی پرورش میں بھی کسر نہ چھوڑی، اسے گھر کا کام بھی سکھائے جس بنا پر نعیمہ کا بھی دل کرتا تھا کہ میٹھل بھی سیکھے لیکن اس کی عادت میں یہ چیزیں نہیں تھیں۔ وہ اپنے منفرد مزاج کی وجہ سے کسی کام کو ہاتھ بھی نہیں لگاتی تھی۔

یہ گھر اگر چہ روایتی لڑائی جھگڑوں سے پاک گھر تھا البتہ بچوں میں ٹوک جھوک چلتی رہتی جن سے ماں باپ لطف اندوز ہوتے کیونکہ رونق تو بہر حال ان بچوں کے دم سے ہی تھی گھر میں۔

☆☆☆

”تم سارا وقت موبائل پہ ہی لگی رہتی ہو، کبھی تو مجھے حیرانی ہوتی ہے، تم بڑھتی کب ہوگی؟“
 اگلے دن یہ دونوں کزنز ایک ساتھ بیٹھی کسی اسائنمنٹ کا کام کر رہی تھیں کہ میٹھل کو فون پر حد درجہ مصروف دیکھ معظمہ نے کہا۔
 ”تمہیں کیا پتا، کتنا مزہ آتا ہے سب سے بات

ترجیح دیتی تھیں۔

”امی اس کی مرضی وہ جو چاہے کرتی پھرے مجھے یہ سب نہیں کرنا آپ میرا اس کلو سے موازنہ نہ کیا کریں۔“ میٹھل آرام سے معظمہ کو برا بھلا کہہ جاتی تھی۔
 ”بری بات، تم دونوں بھائی بہن کو پتا نہیں اس بیچاری سے کیا مسئلہ ہے۔“ ماں کی بات پر وہ بڑبڑاتی رہ گئی۔
 ”اور تمہارے کیا اتنے سارے دوست ہیں جو ہر وقت موبائل پر لگی رہتی ہو؟ معظمہ کے بھی تو ہوں گے وہ تو نہیں اتنا موبائل پکڑتی۔“

”آف امی، سب کے دوست ہوتے ہیں اور میرا اور معظمہ کا تو گروپ ہی ایک ہے، ہم تو ہر وقت ساتھ رہتے ہیں۔“ میٹھل نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
 ”اور اب اگر اسے شوق نہیں تو مجھے کیوں روک ٹوک کر رہی ہیں؟ ہر کسی کی اپنی مرضی ہوتی ہے، اس کو جو اچھا لگتا ہے وہ کرتی ہے، مجھے یہ سب اچھا لگتا ہے میں یہ کر رہی ہوں آپ بلا وجہ ہر بات میں مجھے معظمہ جیسا بنانے کی کوشش نہ کیا کریں۔“ میٹھل نے چڑ کر جواب دیا۔
 ”مجھے کیا، میں تو تمہیں سمجھانے کے لیے ہی بولی ہوں، آخر کون تو دونوں اسی گھر کی بچیاں ہو اور اتنا فرق؟“
 ”آپ پھر شروع ہو گئیں۔“

”اچھا، اچھا میں تو بس ایسے ہی چلو میں جاری ہوں اور تم بھی اس موئے موبائل کی جان چھوڑ کر کچھ کام کر لو، مگن میں جا کر چائے ہی چڑھا دو میرے لیے۔“ نعیمہ نے جاتے، جاتے تنبیہ کی۔
 میٹھل کا فون بجنے لگا۔

”آف ایک تو اسے فون کرنے کا بہت شوق ہے۔“
 یہ کہہ کر اس نے نام دیکھ کر آنے والی کال کاٹ دی اور ترج کرنے میں مصروف ہوئی۔

☆☆☆

شیراز اور انس دونوں جڑواں بھائی تھے لیکن کہیں سے بھی جڑواں نہیں لگتے تھے پڑھائی میں ایک آگے تھا تو دوسرا کام چلاؤ وقت گزرتا رہا، ان کی زندگی میں نعیمہ اور جویریہ آئیں دونوں دیوانیاں کم بہنیں زیادہ لگتیں۔ ...

”نہیں ہوتا مجھے کوئی فریش، وریش یونیورسٹی میں آپ کی لاڈو معظمہ سرکھاتی ہے اور گھراؤ تو آپ لوگ۔“ میشل کا تیکھا مزاج نعیمہ کو بالکل نہیں بھایا۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ فریش ہی ہونے کو کہا تھا، کھانا سکون سے کھاؤ گی تو اچھا رہتا..... مرضی ہے تمہاری۔“ نعیمہ نے کندھے اچکائے۔

”اور تمہیں اب معظمہ سے کیا مسئلہ ہو گیا ہے؟ وہ بیچاری تو.....!“

”بیچاری! ہاں بڑی بیچاری ہے اس سے تو برداشت ہی نہیں ہوتا کہ لوگ میری تعریف کریں یا مجھ سے دوستی کریں میرے آگے پیچھے پھریں..... جلتی ہے وہ۔“ میشل اتراتے ہوئے بولی۔

”پاکل تو نہیں ہو گی ہو، وہ کیوں جلے گی..... پیاری بیٹی ہے تمہارے جیسی نہیں۔“ نعیمہ کھانا کھاتی میشل کے بالوں پہ ہاتھ پھیرنے لگیں۔

”صحیح کہا آپ نے میری طرح وہ خوب صورت بالکل بھی نہیں..... نہیں ہے وہ میرے جیسی۔“ میشل نے ہنسا شروع کر دیا۔

”جب چاہ کھانا کھاؤ اور فضول نہ بولا کرو۔“ ”بھئی، بھئی تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں آپ کی بیٹی ہوں ہی نہیں، کہیں بدل تو نہیں لیا تھا ہسپتال میں؟ یا جان بوجھ کر تو معظمہ کو نہیں بدل لیا کہ ہائے میری بیٹی اتنی سوتنی ہے جو یہ چاچی کی کیوں ہو تو بدل لیا ہوگا، ہے ناں؟“ میشل نے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے کہا۔

”تو یہ کتنی فضول سوچ ہے تمہاری؟ تم میڈیکل کالج ہی جانی ہونا یا کسی ڈرامے والے کالج میں؟“

”ارے امی..... سچ بتا رہی ہوں مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے۔“ میشل مزے سے ماں کو دیکھ رہی تھی جو کانوں کی لو کو ہاتھ لگاتے تو یہ، تو یہ کر رہی تھیں۔

”بس بھی کریں، آپ کی باتوں سے ہی پیٹ بھر گیا ہے میرا۔“ کرسی کھسکا کر وہ اٹھ گئی۔

”اب کہاں جا رہی ہو کھانا تو کھاؤ؟“ نعیمہ سر پکڑ کر رہ گئیں۔

انے میں، ہر وقت ریلے میں رہنے سے..... تم تو ہو بی بدمی روح۔“ میشل نے معظمہ کو جواب دیا۔

”یہ تو اچھی بات ہے کہ سب سے بات چیت ہو لیکن ہر وقت کر، کر کے بیزار نہیں ہو جاتیں؟“

”بیزار؟ وہ کیوں؟ اب ایک ہی بندے سے تو بات نہیں کرتی ناں میں، اتنے سارے تو میرے چاہنے والے ہیں مس معظمہ انس.....!“ میشل نے دونوں ہاتھ کے انگوٹھوں سے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے گویا اتراتے ہوئے کہا۔

”چلو بس، بس.....! جیسے تم کوئی حور پری ہونا کہیں کی شہزادی میشل شیراز۔“ معظمہ نے منہ چڑاتے ہوئے کہا۔

”چلو تم تو بس..... تم تو حسین ہی نہیں ہو، تم کیا جانو مجھ پہ کتنے لوگ مرتے ہیں۔ تمہیں کیا پتا تم پر تو بس ترس ہی کھایا جا سکتا ہے رنگ نہ روپ چہ چہ.....! میشل نے اس کی گندی مائل رنگت کا مذاق اڑایا۔

میشل جانتی تھی معظمہ کی یہ دھکتی رگ ہے، اس لیے میشل نے بول دیا اور یہ حقیقت تھی کہ میشل بہت کوری تھی اور معظمہ اس کے مقابل میں سانولی..... لیکن پڑھائی اور گھرداری میں وہ میشل سے آگے تھی۔

”چلو یہ بھی اچھا ہے، نہ میں کسی کی نظر میں ہوں گی نہ میرے پیچھے کوئی کتے کی طرح لگا رہے گا۔“ معظمہ نے میشل کو اس کے ہی انداز میں جواب دیا اور کشائیں سمیٹ کر وہاں سے چلی گئی۔

چھٹی کے وقت مجبوراً ہی ہسی دونوں ساتھ گھر کے لیے نکلیں۔ ایک دوسرے سے بات تو دور دیکھنا تک گوارا نہیں کیا۔

☆☆☆

”امی جلدی کریں بہت بھوک لگ رہی ہے۔“ میشل گھراتے ہی کھانے کا شور مچانا شروع ہو گئی۔

”پہلے فریش تو ہو لو..... تم دونوں بمائی بہن کالس چلے تو آسمان سر پہ ہی اٹھا لو.....“ نعیمہ نے کھانا لگانا شروع کر دیا۔

ہیں بس تھک گئی تھی اس لیے شاید آپ کو ایسا لگا اور کچھ نہیں۔“ معظّمہ نے ماں کے گلے میں ہاتھیں ڈالیں۔

”سچ کہہ رہی ہوں ناں؟“ انہوں نے معظّمہ کی ٹھوڑی پہ ہاتھ رکھا۔

”ہاں بابا، آپ بھی ناں بس۔“ اس نے ماں کو گلے لگایا۔

”اچھا اب بس، بس زیادہ بڑی نہ بنو۔“ جویریہ نے اسے خود سے الگ کیا۔

”اچھا پھر کیا بنوں؟“ معظّمہ کے سوال پہ وہ مسکرا دیں۔

”میری پیاری سی گڑیا بس اور کچھ نہیں۔“ دونوں ہلکے لہکے اٹھیں۔

”سچ کہوں مجھے بہت فکر ہوتی ہے تمہاری۔“

”کیوں؟ میں کیا چھوٹی سی بچی ہوں؟“ معظّمہ نے ناک جھلا کر کہا۔

”میری جان..... میرے لیے تو تم چھوٹی سی بچی ہی رہو گی ناں۔“ معظّمہ کے ماتھے کو پیار سے چوم کر کہا۔

”اچھا بس، بس..... میں جارہی ہوں بہت تھک گئی ہوں ایک تو ہماری چھوٹی ماں بھی کم نہیں، پورا کراکھیر رکھا ہوگا اس نے۔“ معظّمہ مسکراتے ہوئے اٹھ گئی۔

☆☆☆

”میٹھل بیٹا رات ہو چکی اب باہر بھی آ جاؤ..... سارا دن کمرے میں بند رہی ہو آؤ بھی اب باہر۔“ نعیمہ نے دروازہ کھٹکھٹایا..... چابی لگانے کا بھی فائدہ نہ تھا، میٹھل نے کندھی لگا دی تھی۔

”جواب دے رہی ہوں نہ باہر آ رہی ہو، ہوا کیا ہے آخر؟“ نعیمہ کو فکر لگ گئی انہوں نے آؤ کو پکارا۔

”کیا ہو گیا ہے بھئی؟“ آؤ زچھٹلایا سا آیا۔

”میٹھل جب سے گھر آئی ہے کمرے میں بند ہے، باہر نہیں آ رہی، نہ کوئی جواب دے رہی ہے۔“ نعیمہ کی فکر مندی سی آؤ زدنس پڑا۔

”اسی کوئی جھٹھا ہوا ہوگا کسی سے غصے میں ہوگی رہنے دیں خود ہی ٹھیک ہو جائے گی۔“

”اپنے کمرے میں اور کہاں!“

میٹھل کا موڈ شدید خراب تھا۔

”میٹھو بیٹا باہر آ کر کھانا کھاؤ۔“ نعیمہ نے اس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

”میرا دل نہیں ہے، مجھے سونے دیں۔“ میٹھل نے اونچی آواز میں جواب دیا۔

”لگتا ہے کسی سے جھگڑا ہوا ہے چلو جب موڈ بحال ہو جائے گا آ جائے گی خود ہی۔“ نعیمہ نے بھی سوچا اور میٹھل کو اسی کے حال پر چھوڑ کر چلی آئیں۔

☆☆☆

معظّمہ گھر آئی تو اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کمرے میں جائے اور زور، زور سے روئے لیکن افسردہ

چہرہ لیے وہ گھر کے کام کرنے لگ گئی۔

”کیا بات ہے، اداس ہے میری گڑیا؟“ جویریہ نے معظّمہ کو دیکھا۔

”میں بتاؤں امی، میں بتاؤں؟“ منال، معظّمہ سے آٹھ سال چھوٹی تھی ہمیشہ بڑی، بہن کو تنگ کرتی۔

”تمہیں تو میں بتاتی ہوں رکو، آؤ تمہارے منہ میں لال مرچ مسالا ڈال کے رہوں گی۔“ معظّمہ نے

منال کی چوٹی پکڑی۔

”ارے! بال بچے کے نکال دو گی کیا چھوڑا ہے۔“

جویریہ نے روکا۔

”اس سے کہہ دیں امی مجھے اب تنگ کیا ناں تو اچھا نہیں ہوگا۔“ معظّمہ نے انگلی اٹھا کر خبردار کیا۔

”توبہ ہے معظّمہ، اب چپ چاپ دونوں کھانا کھاؤ اور معظّمہ تم میرے کمرے میں آ جانا کچن سمیٹ کر۔“

”جی امی۔“ معظّمہ نے ماں کی بات کا سر ہلا کر جواب دیا۔

کچھ ہی دیر میں وہ ماں کے کمرے میں تھی۔

”کیا بات ہے؟ تمہارا چہرہ بتا رہا ہے کوئی مسئلہ ہوا ہے کہیں؟ کسی نے کچھ کہہ دیا ہے؟“ جویریہ پریشانی سے

کویا ہوئیں۔

”اوہو، امی میری پیاری امی کیوں پریشان ہوتی

”نہیں کیا فکر، ماں ہوں ناں بچوں کی فکر تو
 وہ کی ناں۔“ نعیمہ کو برا لگا۔ ”معظمہ بھی تو ہے ناں، اس
 نے کبھی پریشان نہیں کیا کسی کو۔“

”آپ کا معظمہ نامہ پھر شروع ہو گیا؟“ آذر نے
 ہاتھ سر پہ مارا۔ باہر سے نعیمہ اور آذر کی آوازیں آ رہی
 تھیں اور میشل کو واقعی تب چڑھ گئی تھی معظمہ نامہ پہ.....
 ”معظمہ یہ، معظمہ وہ بس امی کو تو وہی پسند ہے کالی
 کلوٹی ہنہ۔“ میشل کالس نہیں چل رہا تھا کہ وہ باہر آئے
 اور امی کو چپ کرادے۔

رات کافی ہو جانے پہ وہ باہر آئی اور کچن کی طرف
 گئی اور نوڈلز بنانے کا سوچا۔

”اور امی کہتی ہیں معظمہ کو کھانا پکانا آتا ہے.....
 مجھے بھی تو آتا ہے ناں نوڈلز بنانا۔“ وہ اپنے سے ہی
 ہاتھیں کرنے لگ گئی اور نوڈلز بنا کر پیالے میں ڈال کر
 کمرے میں چلی گئی۔

اگلی صبح میشل ابھی اور کالج جانے کے لیے تیار
 ہونے لگی کہ اجابک دروازے پہ دستک ہوئی۔

”تم کالج جا رہی ہو؟ ابھی کچھ دیر پہلے چچی آئی
 تھیں۔ بتا رہی تھیں کہ آج تم لوگوں کی چھٹی ہے پھر کیوں
 جا رہی ہو؟“ آذر کے سوال پہ میشل نے تھوک نکلا۔

”وہ..... مجھے کچھ..... نوٹس بنانے ہیں اس لیے
 جانا ضروری ہے۔“ میشل نے جواب دیا۔

”اور اب کیا میں کالج بھی معظمہ کی مرضی سے آیا
 جایا کروں گی؟ اس کی مرضی وہ نہ جائے۔“ یہ کہہ کر اس
 نے بکس اٹھائیں اور بیگ میں رکھنے لگی۔

”ہاں ویسے کہہ تو تم ٹھیک ہی رہی ہو..... چلو میں
 تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔“ آذر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ارے نہیں، کیوں کیا ضرورت ہے اور ڈرائیور
 ہے ناں میں چلی جاؤں گی۔“ میشل نے جلدی جلدی کہا۔

”کبکی بات ہے ناں؟ چلو جب آنا ہو مجھے یا
 ڈرائیور کو فون کر دیتا۔“ آذر کی بات پہ اس نے اثبات
 میں ہلایا اور کمرے سے باہر آ گئی۔

”تم نے رات کو پھر یہ فصول چیز کھائی؟“ نعیمہ کا

اشارہ نوڈلز کی طرف تھا۔

”اف امی، اب مجھے بس یہی بنانا آتا ہے میرے
 لیے یہی کافی ہے اب پلیز مجھے لکچر نہ دینا شروع ہوں۔“
 میشل نے ناشتا کرنا شروع کیا۔

”ہاں صحیح ہے، میں ہوتی کون ہوں؟ جو جی میں
 آئے کرو..... بس خوش۔“ نعیمہ نے ہاتھ جوڑے۔

”کیا آپ چاہتی ہیں کہ میں ناشتا بھی نہ کروں؟“
 ”اچھا بابا، کرو ناشتا۔ ویسے جو یہ تو کہہ رہی تھی کہ.....“

”ہاں مجھے پتا ہے کہ آج ہماری کوئی بھی کلاس نہیں
 ہے معظمہ نہیں جا رہی لیکن مجھے جانا ہے مجھے کام ہے کچھ۔“

میشل نے ماں کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔
 ”ہم..... م..... چلو ٹھیک ہے۔“ اس نے ناشتا کیا

اور پھر کالج کے لیے نکل گئی۔
 رستے بھر اس کا موڈ خراب رہا۔ ڈرائیور کو روانہ

کرتے ہی اس نے فون نکالا اور نمبر ڈائل کیا۔
 ”ہاں سنو میں کالج کے باہر ہوں تم لوگ کہاں ہو؟“

”اچھا ٹھیک ہے، میں تھوڑا آگے جا کر کھڑی
 ہو جاتی ہوں مجھے آکر لے جاؤ۔“ یہ کہہ کر اس نے فون

بند کر دیا۔
 کچھ دیر میں ایک گاڑی آئی جس میں میشل کا پورا

گروپ موجود تھا۔
 ”کتنی دیر لگا دی یا رحد ہے۔“ میشل نے گاڑی

میں بیٹھتے ہی غصے کے انداز میں کہا۔
 ”اوپار نہ پوچھ، بہانے سے نکلے ہیں وقت تو لگنا

تھاناں۔“ علی نے جواب دیا۔
 ”ہاں میرا بھی مت پوچھو..... معظمہ کی امی نے

بتا دیا تھا کہ آج کلاس نہیں ہیں تو وہ نہیں جا رہی، میں نے
 بھی نوٹس کا بہانہ کر دیا..... پتا نہیں ہے میری کزن کیوں

ہے سدا کی دشمن۔“ میشل کا موڈ بگڑ رہا تھا۔
 ”جلتی ہو گی تم نے آخر تم اتنی خوب صورت جو

ہو۔“ عامر جو ڈرائیور کر رہا تھا اس نے سامنے کے شیشے
 سے میشل کو دیکھ کر کہا اور وہ مسکرا دی۔

”اچھا بتاؤ..... آج کا کیا پلان ہے؟“ رمشا نے

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور
اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

کراچی
سرگزشت
ماہنامہ

شمارہ ستمبر 2017ء

کی جھلکیاں

محتبی

اس شاعر کا زندگی نامہ
جس نے نبوت کا دعویٰ کر دیا تھا

روایت شکن

ان لوگوں کا تذکرہ جسہنوں نے
علم کی شمع روشن کی

لیڈی کلر

اس اداکار کی حلاوت زندگی
جوڑکیوں کا پسندیدہ تھا

پرائی کوکھ

ایسے قصے مشرق میں رونما نہیں ہوتے ہیں

اس کی عداوت

بھی بہت سی سچ بیانی، ناقت اہل
فراموش واقعات، سچے قصے

اور بھی بہت کچھ جسے آپ کو پڑھنا چاہیے۔
آپ پڑھنا چاہتے ہیں۔

اس سے پوچھا۔
”مجھے نہیں پتا بس ایسی جگہ لے جاؤ جہاں بس ہم
ہوں اور کوئی نہیں۔“

”بیٹا تمہیں جنگل میں نہ لے جائیں وہاں کوئی
نہیں ہوگا۔“ رمشا نے اسے دیکھ کر کہا جو مزے سے
آنکھیں بند کیے بیٹھی ہوئی تھی۔

”وہاں تمہارے رشتے دار بھٹک رہے ہوں گے،
مجھے نہیں جانا وہاں۔“ آنکھیں بند کیے... بی بی اس نے
مسکرا کر جواب دیا۔

”اچھا وہ صرف میرے رشتے دار ہوتے ہیں؟ بیٹا
ان کا تعلق سب سے ہی ہوتا ہے۔“

”اچھا ایسا کرتے ہیں میرے پاپا کا ایک فلیٹ ہے
وہاں چلتے ہیں جب کبھی انہیں کوئی پارٹی کرنی ہوتی ہے یا
کوئی مہمان آتا ہے وہیں چلے جاتے ہیں میرے پاس
چابی بھی ہے چلتے ہیں وہیں۔“ عامر نے بیک ویو سر سے
میشل کو دیکھا جواب بھی آنکھیں بند کیے ہوئے تھی۔

”ہاں یہ سچ ہے شام تک وہیں رکیں گے، میشل،
رمشا کوئی مسئلہ تو نہیں ہے نا؟“ علی نے پیچھے مڑ کر
دونوں سے پوچھا۔

”بھئی مجھے تو جلدی گھر جانا ہوگا بلکہ کالج سے ہی
گھر جانا ہوگا۔“ میشل نے فوراً آنکھیں کھولیں اور کہا۔

”ادہ یار میں تو کہتا ہوں آج فل ٹائم پارٹی کرتے
ہیں جلدی گھر جانے کا کیا فائدہ؟“ عامر نے میشل سے کہا۔

”نہیں نہیں بھائی ہنگامہ کروے گا سمجھا کر دناں۔“
میشل نے جھرجھری لے کر کہا۔

”اگر اتنا ہی دڑتی ہو تو پھر آئی کیوں؟“ رمشا نے
ہنکارا ابھرا۔

”اگر اتنا ہی مسئلہ ہے تو مجھے واپس کالج لے چلو،
میں نے نہیں جانا تم لوگوں کے ساتھ۔“ میشل نے بھی
اپنا منہ بسور کر کہا۔

”ادو ہاب میرا یہ مطلب بھی نہیں تھا یا میثو۔“
”تو خود بتاؤ کیا کروں؟ گھر پر ہوتی تو امی پھر سے
معظمہ کی باتیں شروع کر دیتی ہیں۔“ میشل نے ہنکارا ابھرا۔

”اچھا چلو اب موڈ نہ خراب کرو۔“ علی نے اسے باقی نظروں سے دیکھ کر کہا۔
”ٹھیک ہے۔“ گہری سانس لیتے ہوئے وہ بولی۔

☆☆☆

”معتظمہ تم سے ایک بات پوچھوں؟“ جویریہ نے بچن میں کام کرنی بنی کو پکارا۔
”جی امی کہیں.....“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔
”خوشبو تو زبردست آ رہی ہے بھی۔“ انہوں نے سوئگٹھے ہوئے کہا۔

”امی..... کیا بات ہے؟“ ہنوز مسکراتے ہوئے معتظمہ نے ماں سے پوچھا۔

”مجھے تو حیرت ہوئی ہے اور خوشی بھی، ماشاء اللہ میری بیٹی کھانا بھی اچھا پکا لیتی ہے اور ساتھ ہی پڑھائی میں بھی ہوشیار ہے۔ اور بہت جلد وہ ڈاکٹر بن جائے گی۔“

”امی..... ڈاکٹر بھی تو آپ اور بابا ہی بنانا چاہتے تھے۔ باقی کھانا پکانا تو آپ سے ہی سیکھا ہے تو کیوں اچھا نہیں پکاؤں گی؟“ بیٹی کی بات سن کر جویریہ مسکرائیں۔
”ہاں، یہ بات تو تم نے صحیح کہی، اچھا خیر میں تم سے واقعی کچھ پوچھنے آئی تھی۔“

”جی امی پوچھیں کیا بات ہے؟“ وہ سنک میں رکھے برتنوں کی جانب آئی اور ساتھ ہی ساتھ ماں سے بھی مخاطب تھی۔

”وہ اصل میں بات یہ ہے کہ..... اچھا یہ آج میٹھل کالج کیوں گئی ہے؟“ جویریہ کی بات پر معتظمہ برتن دھوتے، دھوتے رکی۔

”امی..... مجھے کیا پتا..... ہوگا اسے کوئی کام، مجھے نہیں تھا میں نہیں گئی.....“

”ہم..... م..... بات تو تمہاری صحیح ہے ضرور کوئی کام ہی ہوگا۔ خیر پتا نہیں نیسہ بھابی کہہ رہی تھیں آج کل اس کا مزاج بھی عجیب ہوتا جا رہا ہے۔“ جویریہ نے فکر مند سی کہا۔

”امی..... آپ اتنی فکر نہ کریں..... میں عجیب ہو رہی ہے یا جو بھی نہیں کیا؟“ معتظمہ کام چھوڑ کر ماں

کے پاس آئی۔

”نہیں بیٹا، ایسا نہیں کہتے تمہاری کزن ہے وہ۔“ جویریہ کی بات سن کر اس کی آنکھ بھری گئی۔

”ہاں کزن ہے تب ہی میرے ساتھ ایسا کر جاتی ہے۔“ معتظمہ نے سوچا اور تھکے قدموں سے واپس جا کر برتن دھونے لگی۔

”کچھ گڑبڑ ہے شاید ان دونوں کے بیچ۔“ جویریہ نے سوچا اور اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

”اب میں آپ کو کیسے بتاؤں، سمجھاؤں..... میٹھل میرے رنگ روپ کو لے کر مجھے کتنا سناٹی ہے۔“ بے دلی سے سوچتی ہوئی معتظمہ کام کرنے میں لگی رہی۔

☆☆☆

”آؤ بیچے، کیا میٹھل نے کوئی وقت بتایا تھا تمہیں یا ڈرائیور کو کہ کب تک لینے آئے؟“ نیسہ فکر مند سی ہو گئیں۔

”نہیں تو..... ہاں میں نے یہ کہا تھا کہ جب فارغ ہو جائے تب کال کر لے پھر ڈرائیور آجائے گا۔“

”ایسا بھی کیا تھا نوٹس بنانا کہ جب کلاسز نہیں تھیں تب ہی جانا تھا۔ کیا معتظمہ کو نوٹس نہیں بنانے تھے؟“

”اب اس میں معتظمہ کہاں سے آگئی بھی۔“

ماں کی بات سن کر آؤ بیچے۔

”وہ تو نہیں گئی ناں تو پھر میٹھل کیوں؟“

”حد کرتی ہیں آپ امی..... میٹھل اپنے طور پر پڑھ رہی ہے معتظمہ کا اپنا طور طریقہ ہوگا۔ وہ جائے جائے میٹھل اپنا پڑھنے کی یا معتظمہ کے مطابق؟“

”یہ تم دونوں آخر معتظمہ کے نام سے اتنا جھگڑا کیوں جاتے ہو؟ اور میں اس لیے کہتی ہوں کہ دونوں ایک ہی کلاس میں ہیں تو ظاہر ہے ایک جیسا ہی کام ہوگا ناں!“

نیسہ کا چہرہ دیکھ کر آؤ بیچے۔

”اچھا ناں، چلیں آپ زیادہ نہ سوچیں بلکہ میں خود ہی چلا جاتا ہوں۔“

”نہیں بس اب رہنے دو۔“

”ویسے امی اس نے کہا تو تھا کہ وہ فون کر لے گی پھر اب شاید زیادہ مصروف ہوگی آپ فون کر لیں اور

بات ختم کرنا چاہی۔

میشل اچھی۔

”کہاں جا رہی ہو؟“ رمشانے پوچھا

”ہم..... ہم..... ہاں میں ذرا گیلری میں جانا چاہ

رہی تھی۔ موسم بھی اچھا ہو رہا ہے۔“ میشل نے عامر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اچھا اچھا جاؤ، عامر بتاؤ کہاں ہے گیلری؟“ رمشانے عامر سے پوچھا۔

”چلو میں لے کر چلتا ہوں۔“ میشل نے اثبات میں سر ہلایا اور عامر کے ساتھ چل دی۔

”واہ گیلری سے سمندر کتنا پیارا دکھ رہا ہے۔“ کھلی فضا میں آتے ہی میشل نے گہری سانس لی اور سمندر کی ٹھانیں مارتی ہوئی لہروں کو دیکھا۔

”میرا بس چلے تو میں ہر وقت سمندر کو دیکھوں۔“ عامر، میشل کی اڑتی ہوئی زلفوں کو دیکھ رہا تھا۔

”میشل۔“ عامر نے اسے پکارا۔

”ہاں۔“ میشل ہنوز سمندر کو دیکھے جا رہی تھی۔

”کیا واقعی تم مجھ سے پیار کرتی ہو؟“ عامر کی بات سن کر میشل حیران ہو گئی۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟ یہ کیا سوال کر رہے ہو؟“

”کیسا سوال کیا مطلب؟ صاف پوچھ رہا ہوں، کیا تم مجھ سے پیار کرتی ہو؟“ میشل کو بانہہ سے پکڑ کر اس نے اپنی طرف کیا۔

”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ہے؟ میں، میشل شیراز تم سے پیار کروں گی؟“ میشل اس سے اپنی بانہہ چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔

”کیوں..... کیوں نہیں کر سکتیں؟ میں جب کرتا ہوں تو تم کیوں نہیں؟“ عامر نے غصے سے اسے دیکھا۔

”فضول میں بھی ایسی سوچ لانے کی ضرورت نہیں۔“ میشل نے گھورتے ہوئے کہا۔

”لیکن تم تو مجھ سے ہر وقت باتیں کرتی ہو اور اب بھی تم میرے گھر ہو۔“

”تمہارے گھر صرف میں نہیں اور لوگ بھی ہیں

پوچھ لیں اگر گھر آتا ہوا تو میں بچا جاتا ہوں ناں۔“ آذر نے اپنے طور پر تسلی دی۔

”نہیں بس مجھے تھوڑا عجیب لگ رہا ہے، گھبراہٹ کی ہو رہی ہے۔ تم فون کر کے پوچھناں تم۔“

”اچھا بابا کرتا ہوں فون۔“ آذر نے موبائل جیب سے نکالا اور میشل کا نمبر ڈائل کیا۔

”اوہ وہ تو فون ہی نہیں اٹھا رہی..... شاید لائبریری میں ہوگی وہاں سالنٹ کر دیا ہوگا ناں۔“

آذر نے اطمینان سے جواب دیا پر نعیمہ کو پھر بھی تسلی نہیں ہوئی۔

”آف یہ لڑکی بھی ناں..... اب دیکھو ایسے وقت میں معظمہ ساتھ ہوتی تو اچھا رہتا۔ میرا تو دل بیٹھا جا رہا ہے۔“ سہ پہر ہونے کو آ رہی تھی۔

”ارے امی..... اب اس میں بھی معظمہ؟ کیا ہو گیا آپ کو..... اچھا آپ آرام کریں، میں کالج ہی چلا جاتا ہوں بس۔“ آذر جھنجھلایا اور کہتا ہوا چلا گیا باہر۔

میشل جو اپنے دوستوں کے ساتھ عامر کے والد کے فلیٹ میں موجود تھی۔ اس بات سے بے فکر کہ گھر میں اس کے لیے سب کتنا پریشان ہو رہے ہوں گے۔

”اچھا میٹھیو تو بتاؤ تمہاری امی نے یہ نہیں پوچھا کہ معظمہ کیوں نہیں چل رہی؟“ رمشانے میشل کو چھیڑا۔

”بھئی ان کا بس چلے تو وہ معظمہ ہر وقت میرے ساتھ ہی چکی رہے..... ہونہر۔“ میشل کا لہجہ کڑوا ہوا۔

”ایک بات تو ہے۔ تم جتنی خوب صورت ہو معظمہ نہیں، اسے اپنے گروپ میں رکھنا بھی مجھے تو ہرگز پسند نہیں۔“ علی جو قالین پہ لیٹا ہوا تھا اچانک اٹھ بیٹھا۔

”یار یہ بھی سمجھو اس پتھاری پہ احسان ہی ہے۔ ورنہ اس کے کوئی دوست بن ہی نہ پائیں۔“ رمشانے بجائے میشل کے جواب دیا۔

”اچھا اب ہم یہاں اپنی باتیں کر لیں؟ ہر کوئی معظمہ، معظمہ کیے جا رہا ہے۔“ میشل نے گہری سانس لی۔

”اچھا ٹھیک ہے۔ چلو اب سب ریلیکس ہو جاؤ اور کچھ منگوانا ہو تو بتا دو میں دیکھتا ہوں۔“ عامر نے

اور بات کرنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ میں تم سے پیار کرنے لگ جاؤں۔“ اس کی بات سن کر عامر کو برا لگا۔
 ”ہاں واقعی سچ کہہ رہی ہو، واقعی یہ سب کر کے بھی پیار تو ٹوٹی نہ ہو جاتا ہے۔“ عامر نے اپنا لہجہ نرم کیا۔

”تم صرف میرے ایک اچھے دوست ہو اور میں تمہیں وہی سمجھتی ہوں۔“

”اچھا چلو چھوڑو..... میں نے ویسے ہی بس ایک بات کی تھی۔ خیر جانے دو..... سو رہی۔“ عامر نے ٹھنڈی سانس لی۔

”ٹھیک ہے پر اب ایسی کوئی بات نہیں ہوگی اور نام دیکھو کتنا ہو گیا ہے، یہ رشا لوگ کہاں چلے گئے ہیں؟“

”ہوں گے یہیں کہیں تم آؤ اندر چلو، کچھ کھا کر پھر کالج چھوڑ آتا ہوں۔“

عامر کی بات سن کر میشل نے سر اثبات میں ہلایا۔

آذر کالج آچکا تھا میشل کا پورا نام بتا کر لاہوری میں چیک کروایا لیکن وہاں میشل نام کی کوئی لڑکی صبح سے نہیں آئی تھی، نہ ہی کوئی آئی ڈی کارڈ موجود تھا۔

آذرفون پہ فون کر رہا تھا لیکن میشل وہ بھی ریسپو نہیں کر رہی تھی۔ وہ غصے میں فون کیے جا رہا تھا کہ اچانک اس کے سامنے ایک گاڑی رکی اور میشل اس گاڑی ہی اتری اور گاڑی آگے بڑھ گئی۔

”بھائی..... آپ۔“ میشل آذر کو اپنے سامنے دیکھ خوف زدہ ہو گئی۔

”کہاں گئی تھیں تم؟ کالج میں نہیں تھیں ناں، تم کہاں تھیں آخر اور کون تھا تمہارے ساتھ؟“

میشل چپ کھڑی آذر کو دیکھنے لگی آذر نے اس کا بازو زور سے پکڑا اور گاڑی کی طرف لاہا۔

”بھائی آرام سے.....“ میشل کی آواز سے اس کی تکلیف ہٹا لگ رہی تھی۔

”کون تھا تمہارے ساتھ اور جھوٹ بول کر تم گئی تھیں ناں گھر سے؟ اب بتاؤ بھی۔“

آذر غصے سے دیکھ رہا تھا اور میشل بازو دباری تھی۔

”میں کچھ پوچھ رہا ہوں میشل.....“
 ”وہ..... وہ..... بھائی وہ.....“ میشل کے چہرے پر گھبراہٹ واضح تھی۔

”وہ کیا میشل، بتاؤ فوراً۔“

”وہ..... وہ معطلہ کا دوست تھا۔“ میشل نے کہہ کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

”گاڑی میں بیٹھو۔“ آذر نے دروازہ کھولا میشل بیٹھ گئی اور وہ بھی ڈرائیونگ سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔

”وہ بھائی..... وہ اصل میں معطلہ نہیں آئی تو اس لیے اس کے دوست نے بلوایا تھا کچھ کام تھا معطلہ سے تو..... م..... مجھے کہا کہ میں جا کر بتا دوں میرے ساتھ رشا بھی تھی۔“ میشل نے معطلہ پہ سارا نام لگا دیا اور صفائی سے جھوٹ بولا۔

”معطلہ ایسی بھی ہو سکتی ہے؟“ آذر نے ابرو اچکاتے ہوئے سوچا اور اسٹیرنگ پہ ہاتھ مارا۔

”آئندہ تم اس کے معاملے سے دور رہی رہنا اور اب اگر جھوٹ بول کر نکلیں تو بہت برا حشر ہوگا۔“ آذر نے خود پہ قابو پاتے ہوئے میشل کو دیکھا اور اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا، میشل معصوم چہرہ بنائے بیٹھی ہوئی تھی۔

یہ لوگ گھر آچکے تھے نعرے نے سکھ کی سانس لی۔

میشل تو کمرے میں آگئی اور آذر کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ جا کر معطلہ کا گلا دبا دے۔

شام میں معطلہ، میشل کے پاس آ رہی تھی تو لاؤنج میں آذر بیٹھا ہوا ملا۔

”السلام علیکم آذر بھائی۔“ معطلہ نے سلام کیا لیکن آذر نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اس بات سے قدرے بے خبر کہ میشل، آذر کو اس کے بارے میں نہ جانے کیا، کیا کہہ بیٹھی تھی وہ اتنا انور ہونے کے باوجود میشل کے پاس گئی۔

”میشل..... کیا کر رہی ہو؟“ معطلہ اس کے کمرے میں بناد تک کے آگئی تھی۔

”اوہ..... معطلہ بی بی تشریف لائی ہیں..... اب کیا سمجھانے آئی ہیں آپ؟“ میشل نے طنزیہ انداز

جو دونوں مجھ سے یوں کر رہے ہیں اور میرا کون سا مسئلہ آگیا جو آذر بھائی نے اس طرح بات کی؟“
معظمہ کو میٹھل کاروتیہ تو برا لگتا ہی تھا اب کی بار آذر کا بھی ایسا انداز اسے سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔ وہ چپ چاپ اپنے پورشن کی طرف چلی گئی۔

☆☆☆

”مجھے تو سمجھ ہی نہیں آ رہا کیا کروں میں آذر کا۔“ نعیم نے شیراز صاحب سے کہا۔
”کیوں، کیا کہتا ہے وہ؟“ شیراز صاحب بھی بیوی کی بات پر فکر مندی سے گویا ہوئے۔
”شادی نہیں کرنی جس، جس کا نام لوں کوئی تصویر دکھاؤں کوئی نہ کوئی نقص نکال دیتا ہے، تنگ کر کے رکھ دیا ہے۔“ نعیم نے اگلیوں کی پوروں سے ماتھے کو دبایا۔
شیراز صاحب نے گہری سانس لی۔

”آج کل کے بچے ہیں ان سے بات کرنا فضول ہے اس سے پوچھ لو اسے کوئی پسند ہوگی ناں بس پھر دیکھا جائے گا۔“

”نہیں بھی کوئی پسند نہیں اسے، پتا نہیں کیا سوچ رکھا ہے اس نے تو معظمہ تک کے لیے منگ کر دیا۔“
”کیا؟ لیکن وہ تو لاکھوں میں ایک بچی ہے اور اوپر سے ہماری بیٹی جیسی ہے دونوں ساتھ پلے بڑھے پھر کیوں منگ کر دیا ہے؟“ شیراز کو حیرت ہوئی۔

”بھئی اب مجھے کیا پتا، میں کیا جواب دوں اس کا۔“ نعیم نے آذر کی کبھی ہوئی بات کو چھپالیا۔

”اچھا ابھی تو سوجاؤ اس موضوع پہ پھر بات کریں گے۔“ شیراز صاحب نے کہا تو انہوں نے لائٹ آف کر دی اور بستر پر آٹینیٹیں نیند ان کی آنکھوں سے کوسوں دور تھیں۔

☆☆☆

”ارے آذر بھائی..... آج آپ ہماری طرف کیسے آ گئے؟ بلکہ کیوں آ گئے؟“ منال نے آذر کو دیکھا تو شرارتی انداز میں آنکھ مکا کر بولی۔

میں کہا۔

”میں کیوں سمجھانے آؤں گی؟ بور ہو رہی تھی سوچا یہاں آ جاؤں۔“ اس نے اپنے آنے کا جواز بتایا۔

”اچھا..... آپ بور بھی ہوتی ہیں..... کیا بات ہے؟“ ہاتھ کے اشارے سے میٹھل نے کہا۔

”اچھا..... خیر..... آج تم کالج گئی تھیں..... خیریت تمی امی نے بتایا تھا، میں نہیں گئی تو تم کیوں گئیں؟“

”تمہیں اس سے کیا مطلب؟ میں جاؤں یا نہ جاؤں میری مرضی، تمہیں کچھ بولنے کی یا پوچھنے کی ضرورت نہیں، میں تمہارے آگے جواب دہ نہیں۔“
میٹھل نے ابرو اچکا کر معظمہ کو دیکھا اور گود میں رکھا تنکے اٹھا کر دوسری جانب پھینکا۔

”تمہارے آج کل تیور ہی بدل سے گئے ہیں، کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ تم پہلے تو ایسی نہیں تھیں یار۔“
معظمہ کو شدید حیرانی ہوئی۔

”دیکھو..... تم میری کرن ہو، وہی بن کے رہو، سوال جواب کر کے میرا سر نہ کھایا کرو۔“ میٹھل کا انداز مزید تلخ ہو گیا تھا۔ ”اور ہاں..... تم سے صرف امی ابو ہی متاثر ہو سکتے ہیں میں اور بھائی تو کبھی نہیں..... اس لیے اپنا پیہ بھول پن میرے سامنے نہ دکھایا کرو۔“

”تمہیں کیا ہو گیا میٹھل؟ ہم اچھے دوست بھی تو تھے۔“

”جب سے اس کالج میں آئے ہیں اور یہ رشتا وغیرہ.....“

”میرے دوستوں کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔“ معظمہ کا لہجہ جتنا ہلکا تھا میٹھل کا اتنا ہی سخت۔

”میشو..... ٹھیک ہے رہو انہی دوستوں کے ساتھ..... میرا سمجھنا واقعی فضول ہی ہے۔“

”تو ایسا کرو اب چلی جاؤ۔“ میٹھل نے معظمہ کی بات پر طنز پر مبنی مسکرا کر کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ وہ باہر نکلے تو آذر سامنے کھڑا تھا۔

”میری بہن سے دور رہو اور ہاں اپنے مسئلوں میں میری بہن کو گھسایا تو تمہارا حشر نشر کر دوں گا۔“ اتنا کہہ کے وہ چلا گیا۔

”کیا ہو گیا ہے دونوں کو؟ ایسی کون سی بات ہے

آئے تو واقعی برے سے بھی برا بن جاتا ہے پر اس دن اتنا غصہ کیا اور آج ٹھیک سے بات کرتا آذر اسے حیران کر رہا تھا۔

”آپ کمرے میں جائیں، وہ وہیں ہوں گی۔“
معظمہ کے کہنے پہ وہ چچی کے کمرے میں چلا گیا۔
”اور تم..... چلو میرے ساتھ کچن میں۔“ معظمہ، منال کو کان سے پکڑتی ہوئی لے گئی۔

”ارے اس کی کیا ضرورت تھی۔“ معظمہ ٹرائی دھکیلتی ماں کے کمرے میں آئی اور کباب، بسکٹ وغیرہ پیش کرنے لگی تھی آذر کہنے لگا۔

”بھی ضرورت کی کیا بات ہے، میرے بیٹے جیسے ہوتم اور اتنے دنوں بعد آئے ہو تو خاطر داری تو بنتی ہے ناں۔“ جویریہ نے معظمہ کو دیکھا اور پھر جواب دیا۔
”میں تو نعرہ بھائی سے کہتی ہوں کہ میٹھل کو کھانا پکانا سکھا دیں بھی معظمہ بھی تو پڑھائی کے ساتھ، ساتھ یہ سب کرتی ہے۔“

”جی چچی۔“ آذر چائے پیتے ہوئے صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

”امی..... بیکھ لے گی وہ بھی۔ ابھی پڑھائی تو کر لے وہ۔“ معظمہ نے نرم لہجے میں کہا۔ چائے اچھے ماحول میں پی گئی تھی۔

☆☆☆

ان دونوں کے امتحانات نزدیک تھے اور اب وہ دن رات پڑھائی میں مشغول رہتی تھیں..... کلاسز ختم ہو چکی تھیں۔

”عامر میری بات سمجھنے کی کوشش کرو..... کتنی دفعہ کہوں مجھے تم میں وہ دلچسپی نہیں ہے جو تم سمجھ رہے ہو۔ میں تم سے مل لیتی ہوں کافی ہے، وہ فون پر بات کر رہی تھی۔ اب یہ تھے تحائف میں گھر میں کیا بتاؤں گی؟ تم پاگل ہو کیا؟ بتا مجھ سے پوچھو یہ کر دیا؟ اب میں کیا جواب دوں گی؟ بس بس.....! مجھ سے فی الحال بات نہ کرنا جب تک میں نہ کہوں۔“ اور میٹھل نے فون ہی بند کر دیا۔

”ہاں منی، اصل میں تم آکر ہمارا سر نہیں کھاتی انا اس لیے میں آ گیا یہاں۔“

”توبہ، توبہ..... اس عمر میں جھوٹ نہ بولیں میں کب کھاتی ہوں آپ کا سر؟“ منال نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔
”ایک منٹ..... کیا مطلب ہے تمہارا“ اس عمر سے؟ میں کیا انکل ہوں؟“ آذر نے کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر جھک کر پوچھا۔

”ہاں اور کیا، ہم سب میں بڑے آپ ہیں تو ہو گئے ناں بڑھے۔“ زبان چڑاتے ہوئے منال نے کہا تو آذر نے صوفہ کشن اٹھایا اور مارنے لگا ہی تھا کہ منال نے چلانا شروع کر دیا۔

”آپی..... آپی..... یہ دیکھیں مجھے مار رہے ہیں..... باہر آئیں ناں جلدی سے..... ہائے اولیٰ مار دیا۔“
”بڑی ڈرامے باز ہو تم منی۔“ آذر اسے دیکھ رہا تھا۔

”آپی جی..... جلدی آئیں، یہ اب مجھے ڈانٹ بھی رہے ہیں۔“ ابھی منال اور بھی کچھ کہتی کہ آذر نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

معظمہ کمرے سے باہر نکلی آذر اسے دیکھتا ہی رہ گیا وہ ہائی پونی میں کاسنی رنگ کی شلوار قمیص میں ہینٹا بڑی کھل رہی تھی۔

”کیا ہوا ہے منال کیوں چلا..... ارے آذر بھائی آپ!“ وہ ہنسا دیکھے بول رہی تھی اچانک آذر پہ نظر پڑی تو چونک سی گئی..... آذر چپ چاپ کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔

”آذر بھائی!“ منال نے چٹکی کاٹی۔

”اوئے مار دیا تم نے تو آج۔“ آذر نے اپنا بازو سہلایا اور جیسے اپنے حواس میں لوٹا۔

”آپ یہاں حیر سے آئے ہیں؟“

”وہ..... ہاں..... چچی سے کام تھا انہوں نے بلوایا تھا..... آیا تو یہ ڈرامے باز مل گئی۔“ آذر نے منال کو گھورا۔

معظمہ جانتی تھی کہ آذر برا نہیں ہے البتہ غصے میں

اٹھا کے اس نے بیڈ پہ پھینکا اور فریٹ ہونے چلی گئی۔

☆☆☆

استحانات سے فارغ ہو کر ان دونوں کی تو جیسے عید ہو گئی تھی، پڑھائی ختم ہو چکی تھی اور ان سب نے اب اپنے کزنز کے ساتھ وقت گزارنا شروع کر دیا تھا۔

ان کا نتیجہ آچکا تھا اور اب ہاؤس جاب کے لیے اپلائی کرنا تھا..... آڈر کے لیے رشتے کی تلاش جاری تھی لیکن نیچر کے دل میں اب بھی معظمہ ہی تھی۔

”آف کتنا مزہ آرہا ہے اب ہم باقاعدہ ڈاکٹر بن گئے ہیں۔“ میشل اور معظمہ ڈاکٹر زائٹرنی اسٹاف میں موجود تھیں اور سب سے مل رہی تھیں۔

”ہاں واقعی، ایک خوشی سی ہوتی ہے جب آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں۔“ یہ نینب بھی دوسرے میڈیکل کالج کی۔

”نہیں ابھی مقصد پورا نہیں ہوا ہے ابھی ہم صرف نام کے ساتھ ڈاکٹر لگا رہے ہیں کامیابی تب ہوگی جب ایک سال بعد ہم پوری طرح سے ڈاکٹر بن جائیں گے۔“ معظمہ نے کہا اور سب نے اس کی بات کی تائید کی لیکن میشل ڈاک بھوں چڑھانے لگی۔

”بس اس کا پچھر شروع ہو گیا۔“ بیزار ی سے میشل نے کہا۔

”میرے خیال سے تو یہ محترمہ غلط نہیں..... دیکھیں ناں ابھی تو ہم مختلف شعبوں میں جائیں گے، سیکھیں گے، عمل کریں گے اس کے بعد ہم ایک شعبے کو منتخب کر کے اس میں مہارت حاصل کریں گے اور پھر صحیح وائے ڈاکٹر کہلائیں گے۔“ راحم جو ان سب کے گروپ میں الگ ایک کونے میں بیٹھا تھا آگے بڑھ کر بولا۔

”جو بھی ہے ڈاکٹر تو ہم ویسے بھی ہیں ناں بس بات ختم۔“ میشل نے کہا۔

”ہیلو بیک ڈاکٹر، کیسے ہیں سب؟“ ان کے روم میں ایک سینئر ڈاکٹر آیا تھا۔ سب نے کھڑے ہو کر اس کا خیر مقدم کیا۔

”میرا نام ڈاکٹر ابراہیم ہے میں یہاں آپ کو لٹ

موبائل ہاتھ میں لیے ادھر سے ادھر کمرے میں ملنے لگی۔

”آف اب میں کیا کروں؟ جتنا منع کروں اتنا ہی رنج کرنے میں آگے، آگے رہے گا۔“ ایک ہاتھ کرپہ اور دوسرا ہاتھ پر رکھے وہ سوچ بچار میں تھی۔

پوری رات اسی سوچ میں گزار دی۔ اگلے دن دروازے کی ہر کھٹکی پر کان دھرتی رہی۔ کون آیا کون گیا سب کی معلومات رکھنے لگی لیکن عامر کا

تھک نہیں آیا..... اس دن ان دونوں کا پہلا پرچہ تھا..... دوپہر میں جب میشل گھر آئی تو آڈر اس کے کمرے میں ہی موجود تھا۔

”بھائی..... آپ یہاں؟“ انکے ہوئے میشل نے کہا۔

”ہاں..... پرچہ کیسا ہوا؟“ آڈر نے نارٹل انداز میں پوچھا۔

”آسان تھا..... اچھا ہوا۔“ میشل بیڈ پہ آکر بیٹھ گئی تھی.....

”یہ عامر نے تمہیں پارسل کیوں بھیجا ہے؟“ آڈر نے غصے سے اسے دیکھا۔

”م..... مجھے؟ مجھے کیوں بھیجے گا؟ وہ..... وہ تو..... معظمہ کا..... دوست ہے۔“

”تو اس نے پھر تمہارے نام کیوں بھیجا ہے؟“ آڈر چلاتے ہوئے اٹھا۔

”میشل بوکھلا گئی لیکن فوراً ہی گھبراہٹ پر قابو پایا۔

”آپ نہیں جانتے..... معظمہ نے کہا ہوگا اسے تاکہ اس پر شک نہ جائے۔“ میشل پورے اعتماد سے بولی۔

”جا کر دے آؤ بلکہ میں ہی دے آتا ہوں۔“ آڈر جانے لگا تو میشل نے اس کا بازو پکڑ کر روکا۔

”ارے رہنے دیں ناں..... میں اسے دے دوں گی اور سمجھا بھی دوں گی۔“

”ٹھیک ہے..... ورنہ میں اس کو ٹھیک ٹھاک سنا بھی دیتا۔“ آڈر باہر چلا گیا تو کمرے میں میشل نے سکون کی سانس لی۔

”آف یہ لڑکا تو مجھے مروانے پہ تڑا ہوا ہے۔“ پارسل

دوں گا اس کے مطابق ہی آپ لوگ ڈیوٹیز دیں گے اور مختلف ڈاکٹرز کے پاس جائیں گے اور ہر ہفتے مجھے رپورٹ ملا کرے گی..... سمجھ گئے آپ لوگ؟“ سب نے ایک ساتھ ہاں کہا اور اپنی اپنی لسٹ لے گئے۔
”واہ بھئی ہم تو ساتھ ہیں۔“ میشل نے رمشا کو دیکھا اور خوش ہو گئی۔

”آپ کا کس ڈاکٹر کے پاس نام لکھا ہے؟“
”میرا نام لکھا ہے۔“
”جی..... ڈاکٹر اعظم کے پاس..... اور آپ؟“
”ارے میرا بھی ان کے ساتھ ہے۔“ راحم نے مسکرا کر کہا۔

”میرا بھی ہے۔“ انہی کے ساتھ انٹرنی گروپ میں سے ایک اور لڑکی نے کہا۔ ”میرا نام انیلا ہے..... چلو ساتھ چلتے ہیں۔“ تینوں مسکراتے ہوئے ساتھ چلے گئے۔
ان کے سیمیز بدلتے رہتے تھے کبھی ساتھ ہوتے کبھی الگ الگ لیکن انٹرنی روم میں یہ لوگ سب موجود ہوتے وہاں شغل لگاتے رہتے۔
”اے تمہیں پتا ہے عامر نے یہاں ٹرانسفر کروایا ہے۔“ رمشا نے میشل کو بتایا۔

”آف نہیں کر یا رباب وہ پکائے گا بہت۔“
”وہ تو تمہارا اتنا اچھا دوست تھا اور تم بھی تو اس سے..... میرا مطلب پسند وغیرہ.....“ میشل کی بات پر رمشا نے کہا تو میشل نے ہاتھ اٹھا کر بات روکی۔
”مجھے عامر میں کوئی دلچسپی نہیں، اس کی بات نہ کی جائے تو بہتر ہوگا اب۔“

یہ دونوں بات کر کے چپ ہوئے ہی تھے کہ دیکھا راحم اور معظمہ ساتھ، ہاتھ چلتے ہوئے آرہے تھے۔
”واہ بھئی نکلیا بات ہے بڑا دوستی کر لی ہے دونوں نے۔“ میشل نے طنز یہ کہا۔

”ہاں تو اچھا ہے ناں شروعات ساتھ جو ہوئی تو اب ساتھ ہی کام کر رہے ہیں، دوستی تو ہوئی تھی۔“
”راحم نے مسکرا کر جواب دیا۔
”اچھا تو ہم بھی تو ہیں، ہم سے تو دوستی کا نہیں

سوچا پورے گروپ میں یہی ملتی تھی۔“ میشل ہنسنے لگی۔
”ہاں پورے گروپ میں مجھے یہی اچھی لگی تو اسی سے دوستی کروں گا ناں۔“ راحم نے زبان چڑائی۔
”اچھی کا تو پتا نہیں پر خوب صورت تو نہیں ہے ناں۔“ میشل نے اتر کر کہا۔

”خوب سیرت تو ہے ناں۔“ راحم یہ کہہ کر آگے بڑھنے لگا۔

”معظمہ ہمیں ایک فائل پہ کام کرنا تھا ناں چلو چلتے ہیں۔“
معظمہ نے غصہ ہوتی میشل کو دیکھا اور اس کے ساتھ ہی آگے بڑھ گئی۔

”حد ہو گئی معظمہ نہ ہوئی کوئی حور پری ہو گئی۔“
میسل نے صوفے کے تھپے پہ ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔
”چھوڑو یار۔“ رمشا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”راحم سے تو میں دوستی کر کے ہی رہوں گی اب۔“ میشل نے کہا اور رمشا مسکرا دی۔
”چلو ہم بھی راؤنڈ پہ چلتے ہیں۔“ میشل نے اثبات میں سر ہلایا اور دونوں چلی گئیں۔

معظمہ کو میشل کا سب کے سامنے مذاق اڑانا بالکل پسند نہیں تھا لیکن وہ کبھی نہیں تھی، چپ رہتی اس کے بدلے دوسرے کہہ جاتے اگر وہ کہہ دیتی تو سامنے والا چپ بھی ہو سکتا تھا میشل کی فطرت میں دراصل جو عجیب چڑچڑاپن آیا تھا۔ وہ اس کی ماں کے ہر وقت معظمہ کے گن گانے سے آیا تھا۔

”تمہیں جواب دینا نہیں آتا؟“ راحم جو معظمہ کے ساتھ چل رہا تھا اچانک بولا۔
”کس بات کا جواب؟“ معظمہ نے نا سمجھی سے کہا۔

”واہ..... تمہاری کزن ہے ناں میشل! اور تم اس کی ہر بات سن لیتی ہو یہی وہ بولتی ہے اتنا۔“
”پیسے راحم آپ غصے میں بھی اچھے لگتے ہیں۔“ معظمہ نے موڈ کو نارمل کرنے کے لیے کہا تھا۔
راحم رکا تو معظمہ بھی رک گئی۔

”اوہلو، یہ اکر ہے ناں کسی اور کو جا کر دکھانا۔
ڈاکٹر بننے چلے اور نرمی سے گفتگو تو جیسے کرنی آتی ہی
نہیں۔“ وہ لڑکا بھی منہ بسورتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔
میشل کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی بھی طرح سے
راحم کو اپنی طرف کر لے۔ وہ خوب صورت تھی اس میں کوئی
شک نہیں تھا لیکن کوئی لڑکا اسے چھوڑ کر اس کی کزن کی
طرف نائل ہو جائے یہ اسے گوارا نہیں ہو رہا تھا۔

”میشل ان سے ملو یہ ہیں ہمارے نئے انٹرنی.....
ڈاکٹر عامر۔“ رمشا نے پرجوش طریقے سے عامر سے ملوایا۔
”اوہ نہ، اسے کون نہیں جانتا۔“ میشل کو جب
دلچسپی ہی نہیں تھی تو اس نے سر جھٹکا۔

”اچھی بات ہے کہ یہ تمہیں ابھی تک یاد ہے مجھ
دونوں باتیں کر دوں میں کافی لے کر آتی ہوں۔“ رمشا
انہیں چھوڑ کر چلی گئی۔

”عامر..... تم نے یہاں ٹرانسفر بھلے کر دیا ہو
لیکن مجھ سے کوئی امید وابستہ نہ کرنا۔“ میشل اٹھی اور
اس کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔

”میں صرف تمہارے لیے ہی یہاں آیا ہوں اور
تم.....“ عامر اسے دیکھنے لگا۔

”عامر پلیز..... کالج کی دوستی جو تھی وہ کالج تک
ہی تھی۔ اب یہاں آ کر تم یہ ڈرامے نہ ہی کرنا تو اچھا
ہو گا اور میں کہہ چکی ہوں ناں تو یہ بات یہیں ختم۔“
میشل جانے لگی تھی کہ عامر نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

”میشو..... چلو آج پھر سے دوستی کر لیتے ہیں۔“
میشل نے سر گھما کر اسے دیکھا۔

”تم جتنی بھی کوشش کر لو عامر اب کچھ نہیں
ہو سکتا۔“ وہ ترخ کر بولی عامر کی گرفت ڈھیلے ہو گئی تھی
میشل نے بازو چھڑا دیا اور جانے ہی لگی تھی کہ رمشا آگئی۔
”ارے باپ رے..... دیکھ کر چلا کر دوا بھی کافی
گر جاتی۔“

”رمشا اپنے دوست کو کافی پلا دوا اور میری طرف
سے معذرت کر لیتا۔“ میشل کہتی ہوئی اس کے برابر
سے گزر گئی۔

”معظمہ تم بہت اچھی ہو۔“ راحم اسے پیار بھری
کاہ سے دیکھ رہا تھا۔

”راحم!“ معظمہ نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔
”ہاں کہو۔“ راحم نے سینے پر ہاتھ باندھے اور
سرا کر کہا معظمہ مزید کنفیوز ہو گئی۔

”اچھا ابھی میرا موڈ صحیح کرنے کے لیے غصے کی
حالت میں بھی کہا کہ میں اچھا لگتا ہوں اور میں نے بس
تنا کہہ دیا کہ تم اچھی ہو، حالت دیکھو اپنی ذرا۔“
معظمہ جھینپ گئی۔

”تمہیں پتا ہے ہمیں یہاں کتنا وقت گزارنا ہے
ساتھ میں؟“ راحم نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔

”کیا میں تمہیں اچھا نہیں لگتا؟“ راحم نے اس کا
تھم تھام کر پوچھا تا جاہا معظمہ نے جھٹ ہاتھ چھڑا یا۔
”پسند ہو لیکن..... دیکھو پہلے ہم انٹرن شپ ختم

کر لیں پھر اس بارے میں کچھ سوچیں گے۔“ معظمہ
کا بہت پراعتماد لہجہ تھا۔

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ معظمہ کو میں یعنی راحم
پسند ہے، ہے ناں؟“ راحم نے اسے چھیڑا۔

”راحم! راؤنڈ پے چلیں؟“
معظمہ کی بات سن کر وہ ہنسا اور دونوں ساتھ وارڈ

میں چلے گئے۔
”بھئی بڑے چرچے ہو رہے ہیں تمہاری کزن

اور راحم کے۔“ انٹرنی گروپ میں سے ایک لڑکے نے
میشل کو بتایا۔

”اچھا تو میں کیا کروں پھر؟“ میشل کا روکھا
انداز اس انٹرنی کو مزہ دینے لگا۔

”کرو گی تم کیوں کچھ، وہ تو تمہاری کزن نے
کر دیا..... حیرت ہے تم خوب صورت ہو پھر بھی راحم

اسے پسند کرتا ہے۔“
میشل جسے معظمہ ویسے ہی پسند نہ تھی اس بات پر
توا سے آگ لگ گئی۔

”اپنے کام سے کام رکھا کرو تم سمجھ۔“ میشل
نے یہ کہا اور وہ انٹرنی کندھے اچکا گیا۔

شکرِ خدا وندی ایمانِ محکم کی دلیل

شکر کیا ہے؟ اس کی امامِ راغب اصفہانی نے بڑی عمدہ تشریح فرمائی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ ”شکر کے معنی ہیں، کسی احسان و انعام کا ادراک و تصور اور اس کا اظہار و اعتراف.....“ اس کے برعکس والی کیفیت کفر ہے۔ قرآن پاک میں فرمایا گیا۔ ”اور جو شکر کرتا ہے، اپنے بھلے کے لیے کرتا ہے اور جس نے کفر کیا تو بلاشبہ اللہ بے نیاز ہے۔“ شکر کیا ہے؟ یہ کہ انسان کو نعمت کا احساس ہو اور وہ اس کا اظہار کرے اور کفر کے معنی ہیں چھپا دینا، دبا دینا لہذا جب یہ شکر کے مقابلے میں آئے گا، اس کا مفہوم ہو گا ناشکر اپن یا کفر ان نعمت..... عقل کا وظیفہ کیا ہے؟ یہ کہ وہ اپنے محسنِ حقیقی کو پہچانے اور اس طرح اس کے شکر اور احسانِ مندی کے جذبے سے اس کا ذہن و قلب سرشار ہو جائے۔ ذرا غور کیجیے کہ جب انسان عہدِ طفولیت میں ہوتا ہے تو اس کے ذہن کی دنیا بھی اتنی محدود ہوتی ہے کہ وہ اپنے والدین ہی کے بارے میں سمجھتا ہے کہ یہی میرے رازق ہیں، یہی میرے محافظ ہیں، یہی میرا دکھ درد محسوس کرنے والے ہیں، مجھے کوئی تکلیف ہو تو اسے یہی رفع کرنے والے ہیں لہذا اس کا غیر شعوری جذبہ، تشکر اپنے والدین کی ذات پر مرکوز رہتا ہے لیکن جیسے جیسے فکر انسانی کا ارتقا ہوتا ہے اور عقل اپنی ارتقائی منزلیں طے کرتی ہے،

”رمشا یہ اسے کیا ہو گیا ہے؟“ عامر نے دونوں ہاتھ اپنی جگہز کی پاٹ میں ڈالے اور حیرت سے رمشا کو دیکھا۔

”ارے بھئی کچھ نہیں..... اور پلیز تم بھی اس سے اب یہ پسند، پیار وغیرہ کی باتیں کرنا چھوڑ دو۔ جب میٹھل کو یہ اچھا ہی نہیں لگتا تو کیوں چاہتے ہو کہ وہ تمہارے ساتھ یونہی بدتمیزی کرے؟“ رمشا آکر صوفے پہ بیٹھ گئی تھی۔

”آؤ..... کافی پیو۔“ عامر بھی اس کے ساتھ آکر بیٹھ گیا تھا۔

☆☆☆

دن گزرتے جا رہے تھے اور معظمہ اور راحم ہر وقت جیسے ساتھ، ساتھ ہوتے..... میٹھل سے یہ سب برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ دوسری طرف نعیمہ نے پھر سے آؤر کو معظمہ کے لیے راضی کرنے کی کوشش کی۔

”امی آپ کیوں اس بات کے پیچھے پڑ گئی ہیں جب میں کہہ چکا ہوں مجھے نہیں کرنی اس سے شادی۔“ ”تو کس سے کرنی ہے بتا کے جان چمڑاؤ۔“ نعیمہ بیٹے کی ہٹ دھرمی سے اکٹا چکی تھیں۔

”جس سے بھی کروانا چاہیں آپ کی مرضی!“

آؤر کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ معظمہ کی ان حرکات کا بتائے جو کبھی میٹھل نے اسے بتائی تھیں..... آؤر، معظمہ سے نفرت سی کرنے لگا تھا لیکن سب کے سامنے اظہار نہیں کرتا تھا۔

”تمہاری بھی منطق سمجھ سے باہر ہے۔ کرنی کسی سے بھی ہے تو معظمہ میں کیا حرج ہے؟ گھر کی بچی ہے، گھر میں ہی ہوگی۔“ نعیمہ نے دہمی ہوتے ہوئے کہا۔

”آپ کو میری شادی کروانی ہے یا اس کی بربادی؟“ آؤر نے بچی سے کہا۔

”یہ کس طرح بات کر رہے ہو؟“

”امی..... میں کہہ چکا ہوں بار، بار نہیں کہوں گا۔ مجھے معظمہ سے نہیں کرنی شادی باقی۔ جس سے بھی کروادیں۔“

آؤر کا دھوکہ انداز نعیمہ کی سمجھ سے باہر تھا۔

☆☆☆

”ہماری ڈیوٹیز بدلتی رہتی ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کسی ڈاکٹر کی ڈیوٹی میں میرا اور راحم کا نام شامل ہو جائے؟“ میٹھل نے رمشا کو فون کیا تھا اور دونوں اپنی ڈیوٹیز کے حوالے سے بات کر رہی تھیں۔

”ہاں نہیں یار، مجھے تو ایسے عجیب کمڑوں قسم کے

سان کا شعور پروان چڑھتا ہے اور اس کے ذہن میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ پھر انسان کو معلوم ہوتا چلا جاتا ہے کہ میں تو بہت سوں کا زیر بار احسان ہوں۔ میرا وطن ہے، میری قوم ہے، میرے اعزاء و اقربا ہیں۔ یہ سب کے سب میرے محسن ہیں، میری بھلائی کے لیے سوچتے ہیں، میں درجہ بدرجہ ان سب کا زیر بار احسان ہوں، اسی طرح دیوانہ جذبہ شکر پھیل رہا ہے پھر انسان یہاں تک سوچتا ہے کہ یہ زمین جس سے مجھے غذا حاصل ہو رہی ہے، یہ ریح جس سے سارا انتظام چل رہا ہے، فضلیں پک رہی ہیں، بارشیں ہو رہی ہیں جن سے مُردہ زمین پھر زندہ جاتی ہے تو میں ان میں سے ہر چیز کا زیر بار احسان ہوں، میری جو ضروریات پوری ہو رہی ہیں تو اس پوری انسانیت کی ایک، ایک شے میری ضروریات زندگی کی بہم رسانی میں لگی ہوئی ہے۔ اسی طرح یہ شکر پھیل کر کائنات و وسعتوں کو اپنے اندر سمو لیتا ہے۔ انفرض شکر تقاضائے فطرت ہے کہ اپنے اصل محسن و مشتم اور خالق و مالک کو پان لے۔ ان دونوں کے امتزاج سے اللہ کے شکر و امتنان کے جذبات کا چشمہ دل کی گہرائیوں سے ابلتا ہے اور اس کی حمد و ثناء کے زمرے انسان کی زبان پر جاری ہو جاتے ہیں پھر شکر خداوندی کا تقاضا ہے کہ انسان اللہ کا حق رزی ادا کرے۔

از: تحسین عباس، لاہور

کڑھٹے ہیں کہ دل کرتا ہے انہیں ماری ڈالوں۔“
”کیا۔“ رمشا نے پھر ہنسا شروع کر دیا اور میشل منہ بنا کر رہ گئی۔

☆☆☆

”وافتی، ہم نئے ڈاکٹر کو تو خوب بے عزت بھی ردیا جاتا ہے۔“
”ویسے جس طرح راحم اور تمہاری کزن معظمہ سمجھتے ہوئے ہیں اصل مزے تو ان کے ہیں۔“

”رمشا.....!“
”ہاں کہوں میشو۔“
”رمشا میں ایسا کیا کروں کہ راحم مجھ سے دوستی لے۔“ میشل نے گہری سانس لی۔

”اس کا نمبر تو ہوگا ناں تمہارے پاس اسے کال رو اور بتاؤ کہ تم اس میں دلچسپی رکھتی ہو اور کیا؟“
”اُف میں نے کتنے میسج کیے اسے بتایا بھی کہ یہ رانمبر ہے لیکن وہ جواب نہیں دیتا اور اسپتال میں سے معظمہ سے ہی فرصت نہیں ملتی..... اب میں کیا کروں یار۔“ میشل کی بے چینی اس وقت دیکھنے لائق تھی، رمشا ہنسنے لگی۔

”اچھا پھر تو تم اللہ، اللہ کرو اور کیا ہو سکتا ہے۔“
”کیا مطلب اس بات کا؟“ میشل نے پوچھا۔
”بھئی میرا مطلب کہ اب دعا ہی کر سکتے ہیں اور“
”امی دیر ہوگئی ہے۔ بائے، بائے۔“ اوچی آواز میں وہ کہتی ہوئی چلی گئی۔
”آذر کا رشتہ جو برہہ کی بہن کی سسرال میں ہوا تھا..... لڑکی خوب صورت تھی منگنی کے فنکشن کا انتظام

بھی خوب اچھا کیا ہوا تھا سب کزنز ہلا کر رہے تھے، آذر بھی خوش تھا۔

میشل نے رمشا کو بھی دعوت دی تھی۔

”یار علینہ بھابی تو بہت پیاری ہیں۔“ رمشا بولی۔

”ہاں پر مجھ سے کم۔“ میشل کو علینہ کی تعریف

بھی اچھی نہیں لگی۔

”اوہو، تمہارا بھی کسی سے مقابلہ ہے کیا؟“ رمشا

کی بات پہ وہ مسکرائی۔

”اچھا تم نے کہا تھا تم میرے کام کا حل نکالو

گی۔“ میشل نے اس کی کبھی ہوئی بات یاد دلائی۔

”اوہ ہاں..... یہاں نہیں میں اسپتال لے کر

آؤں گی وہ چیز۔“ رمشانے ہلکی آواز میں کہا۔

منگنی کی تھکاوٹ کے باوجود وہ اگلے دن اسپتال

گئی رمشا سے جو خاص ملتا تھا۔

”میشل..... یہ تو اور اسے اپنے نیچے یا کٹن میں

ڈالنا اور بند کر دینا جس پر سر رکھ کر غم سوئی ہو۔“ رمشا

نے اسے ہدایت دی اور کچھ، کچھ سمجھتے ہوئے اس نے

وہ چیز لے لی..... گھر آ کر اس نے ایک الگ سے کٹن

لیا چھوٹا سا اور اس میں وہ ڈال دیا۔

اس دن کے بعد سے وہ روزِ راحم کو میٹج کرتی پر وہ

جواب نہ دیتا دوسری طرف معظمہ کو راحم اور اچھا لگنے لگا

اس نے ماں کو راحم کے بارے میں بتا دیا تھا اور وہ خوش

ہو گئیں۔ آذر کی منگنی ہو جانے پر وہ معظمہ کے لیے

زیادہ فکر ہونے لگی تھیں۔

”راحم! میشل راؤنڈ پر تھی جب اس نے راحم کو

اکیلے دیکھا۔

”جی مس میشل کہیں۔“ راحم کے ہاتھ میں فائل

تھی اسے بند کرتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

”شکر ہے مجھے تم اکیلے تو ملے آج۔“

”کیوں..... دوسرے تو روز سلام دعا ہو ہی جاتی

ہے پھر آج اکیلے دیکھ کر کس بات کا شکر منارہی ہو؟“

راحم نے خیکے انداز میں پوچھا۔

”بھئی تو اچھے سے بھی بات کر لیا کرو۔“ میشل

نے رو ہانسی ہو کر کہا۔

”اچھا کہو کیا بات ہے؟ مجھے اور بھی کام ہیں۔“

”میں تم سے دوستی کرنا چاہتی ہوں، تم نہ میرے کسی

میٹج کا جواب دیتے ہو نہ کال اٹینڈ کرتے ہو، کیوں؟“

”میں تمہارے کسی بھی ایسے فضول سوال کا

جواب دینے کے موڈ میں نہیں ہوں میشل۔“ اس نے

خنتی سے کہا۔

”کیوں، میں اتنی بری ہوں کیا؟“ میشل کے

پوچھنے پر راحم نے حقارت سے اسے دیکھا۔

”نہیں، نہیں تم کوئی بری تھوڑی ہو برے تو ہم

ہیں جو آپ کی قدر نہیں کرتے..... مجھے پلیز اب کوئی

میٹج وغیرہ مت کرنا اور کالز بھی نہیں کرنا۔“ اس نے

باقاعدہ ہاتھ جوڑے اور وہ چلا گیا۔ وہ میشل جیسی لڑکی

کی نادانیوں پر حیران ہوتا تھا۔

میشل، معظمہ کو ہی برا بھلا کہنے لگی۔

☆☆☆

علینہ اور آذر ایک دوسرے سے بات کرتے

تھے، ملتے تھے دونوں اپنی اس منگنی سے خوش تھے ان

کے ملنے جلنے پر بھی کوئی پابندی نہیں تھی اور نہ ان دونوں

کو اعتراض تھا دوسری طرف راحم نے معظمہ کے ہاں

گھر والوں کو بھیج دیا اور ان کا رشتہ پکا ہو گیا.....

”کیا بات ہے بھئی، تمہاری کزن تو بہت تیز

نکلے۔ رشتہ ہی پکا کر دیا۔“ رمشا اور میشل روم میں

بیٹھے کچھ فائلز ڈسکس کر رہے تھے کہ رمشانے اس پر

چوٹ کی۔

”صحیح کہہ رہی ہو۔ مجھے اندازہ نہیں تھا معظمہ اتنی

کھنی ہوگی۔“

”ہلو گزلز، کیا ہو رہا ہے؟“ ایک انٹرنی نے آکر پوچھا۔

”دکھ نہیں رہا..... کام کر رہے ہیں؟“ رمشانے

جواب دیا۔

”اچھا، اچھا۔ ویسے میشل مبارک ہو، تمہاری

کزن نے تو ہمیں مٹھائی تک نہیں کھلائی اور تم نے ہمیں

بتانا بھی مناسب نہیں سمجھا؟ کیوں بھئی کیا ہم سب

”یہ کس طرح کا تعویذ تھا کہ وہ میرا ہو ہی نہ سکا۔
مجھ سے بات بھی سیدھے انداز میں نہیں کرتا۔“
”میشو، ہر چیز وقت لیتی ہے یا، ہو سکتا ہے تم
دل سے نہ کر رہی ہو۔“

”کیا مطلب تمہارا؟ میں دل سے چاہتی ہوں
کہ وہ میرا ہو جائے، مجھ سے دوستی کرے، اس لڑکی
سے دور ہو جائے اور تم یہ کہہ رہی ہو؟“ میشل نے
آنکھیں پھاڑ کر رمشا کو دیکھا۔

”اوہو اچھا ناں، ہو سکتا ہے یہ تعویذ اتنا طاقت
ور نہ ہو میں پوچھاؤں گی کچھ اور..... تم بے فکر
رہو۔“ رمشانے میشل کو تسلی دی۔

”وہ دیکھو عامر کیسے تمہیں دیکھ رہا ہے۔“
”مجھے عامر سے نفرت سی ہو گئی ہے۔“ میشل
نے اپنی جانب متوجہ عامر کو ناگواری سے دیکھا۔
”میشل کو اب بھی عامر کو اپنا کرنے کی ضد تھی۔ وہ
عامر کے پاس جاتی جب بھی وہ اکیلے ہوتا اسے منانے
کی کوشش کرتی لیکن وہ اسے کوئی لفٹ نہیں دیتا
تھا۔ عامر اس کے انداز و طو و طو لیتے نوٹ کرتا رہتا تھا۔“



علینہ اکثر گھر بھی آ جاتی تھی پر میشل اسے زیادہ
لفٹ نہیں کرتی تھی بس سلام دعا کرتی جبکہ معطرہ اور
منال کو عیینہ کے آنے کا علم ہوتا تو وہ آکر ملتیں، عیینہ کو
وہ اور اچھی لگنے لگی تھیں۔

”آذر..... یہ میشل مجھ صحیح سے بات نہیں کرتی
کیوں؟“ اس روز عیینہ نے واپسی میں جاتے ہوئے
آذر سے پوچھا۔

”ارے نہیں، تمہیں ایسا لگ رہا ہو گا یہ تو جب تم
جاتی ہو سارا وقت تمہاری بات کرتی ہے۔“

”یہ تو تم کہہ رہے ہو پر میں جو نوٹ کر رہی ہوں
وہ شاید تم نہ کر سکو خیر بہر حال۔“ عیینہ نے آذر کو جواب
دیا اور میوزک لگا دیا آواز جان بوجھ کے بڑھادی تھی۔

”علینہ اسے غلط نہ سمجھو، چھوٹی ہے لاڈلی بھی تو
ہے ناں۔“ آذر نے تھوڑی آواز کم کر کے کہا لیکن

”است نہیں؟“

”وہ کیا ہے ناں۔ جنہوں نے معنی کی ہے یہ
بات جا کر ان سے ہی کہو تو اچھا ہے۔ مجھ سے شکایت
کس بات کی؟ اور میں مبارکبادیں کیوں وصول
کردوں؟“ میشل نے تلخ لہجے میں کہا۔

”ارے تو کزن ہو آخر اس لیے پوچھا تھا۔“
”کیا ہو رہا ہے یہاں؟“ راحم روم میں آیا اور
ایب کوٹ صوفے پر رکھا اور آکر بیٹھ گیا۔

”کچھ لوگ ہیں جو آپ کی معنی کی مبارکبادیں
مجھے دے رہے ہیں۔“ میشل نے تھکے انداز میں ابرو
اچکا کر کہا۔

”اوہو، کیا نام ہے تمہارا؟ ہاں حمزہ، وہ کیا ہے
ناں جس کی معنی ہوئی ہو اسے ہی مبارک باد دو اور بلکہ
احمت لینی ہو وہ بھی بتا دو۔ لیکن مہربانی کر کے ان کو
مبارک باد نہ دو جو اس بات سے بالکل خوش نہیں۔“
راحم نے کن انکھیوں سے میشل کو دیکھا اور طنز یہ مسکرایا۔
”ارے دوست ہو تو تمہارے جیسا... بس ہم
راؤنڈ مار کر بیٹیں ملتے ہیں اور میں سب کو بلا کر لاتا ہوں
پھر تمہاری طرف سے کچھ کھانے پینے کو مل جائے تو حمزہ
آجائے گا۔“

”ہاں، ہاں ضرور۔“ بھی خوشی کی بات ہے تو اچھے سے
منا نا چاہیے ناں، کیوں میشل؟“ راحم نے میشل کو دیکھا۔
”ہاں بالکل، خوشیاں تو منانے کے لیے ہی ہوتی

ہیں۔ ٹھیک ہے راؤنڈ کے بعد سب بیٹیں ملتے ہیں۔“
میشل نے اپنی فائل اٹھائی اور رمشا کے ساتھ چلی گئی۔
ان لوگوں نے ٹل کر پارٹی کی اور دونوں کو خوب چھیڑا۔

”رمشا یہ دیکھو تمہارے تعویذ نے تو کچھ اثر ہی
نہیں کیا اور راحم مجھ سے دور ہو گیا۔“ میشل افسردہ شکل
لیے اس کے سامنے تھی اور بہت دھیرے آواز
میں بولی۔

”ارے تو کیا ہوا؟ معنی ہی تو ہوئی ہے شادی
تھوڑی جو تم ہمت ہار کے بیٹھ گئی ہو میں تمہارے لیے
کوئی اور طریقہ نکالتی ہوں۔“

علینہ منہ پھیرے بیٹھی رہی۔

”لاڈلی ہے چھوٹی بھی ہے لیکن میں اس کی ہونے والی بھالی ہوں۔ مجھے عزت تو دے کم از کم۔۔۔ میرے ساتھ بیٹھ کر بھی ایسا لگتا ہے جیسے احسان کر رہی ہوں۔“

”اوہو علینہ کیا ہو گیا ہے؟“ آذر نے چڑکھا۔
”تمہاری وہ کزن معظمہ بہت اچھی ہے، کافی سلجھی ہوئی لگتی ہے۔ میں جب، جب آتی ہوں وہ دونوں بہنیں مجھ سے ملنے آتی ہیں۔ ان سے مل کر لگتا ہے کہ ہاں میری کوئی اہمیت ہے ورنہ۔۔۔۔۔“

”اب تم بھی معظمہ کے گن گاؤ گی؟“ آذر مزید تپ گیا۔

”ہاں تو جو اچھے ہوں گے ان کی تعریف کرنے میں کیا حرج؟“

”اچھا اب کچھ دیر خاموش رہو گی؟ میں گاڑی چلا رہا ہوں۔“ آذر نے روکھے لہجے میں کہا جس پہ علینہ خاموش ہو گئی اور پورا سفر ان کے درمیان خاموش ہی رہی۔

☆☆☆

”میرا دل کرتا ہے جیسے ہم صبح کی ڈیوٹیز میں ساتھ ہوتے ہیں دیے ہی رات میں بھی ہوا کریں۔“
راحم نے معظمہ سے فون پر بات کرتے ہوئے کہا۔
”لو یعنی آپ چاہتے ہیں کہ پھر ہم راکوٹر پہ جایا ہی نہ کریں؟“ معظمہ نے راحم کو چھیڑا۔

”ویسے سوچو، ہم ہر وقت ساتھ رہیں اور رات کو بھی اُف۔۔۔۔۔ کیا رومینک ماحول ہو گا ناں۔ میں تم اور اسپتال اور وہاں پھیلی دوائیوں کی خوشبو۔“
”تو بے راحم، یہاں بھی رومینس!“

”ہاں تو اور کیا۔ ویسے ایک رات کی ڈیوٹی ساتھ کرنی چاہیے۔ کیا کہتی ہو؟ میں ڈاکٹر ابراہیم سے بات کروں؟“
”کوئی ضرورت نہیں ہے۔ دن میں مل لیتے ہیں کافی نہیں؟“

معظمہ کی بات پہ راحم ہنسا۔

”نہیں ناں، کافی نہیں ہے۔ میں تو چاہتا ہوں تم میرے ساتھ ہر وقت ہو۔“
”اچھا اب بس بھی کریں۔“ معظمہ جھینب مٹی تھی۔
”معظمہ تم مجھے پسند تو کرتی ہوں لیکن کبھی آئی لو یونہیں کہا۔ آج ذرا کہہ دو، سچ بتا رہا ہوں بہت سکون کی نیند آئے گی۔“

”راحم، مجھے یہ سب اچھا نہیں لگتا۔“
”معظمہ ہم منگیتر ہیں بھی۔۔۔۔۔ اور جب تھوڑا بہت اظہار کر چکی ہو تو اس میں حرج کیا ہے؟“
معظمہ، راحم کی بات پہ خاموش ہو گئی۔
”اچھا بابا اچھا اب نہیں کہوں گا کچھ بھی۔ چلو اب آرام کرو کل ملتے ہیں۔“

”جی۔۔۔۔۔ اچھا۔ اللہ حافظ۔“

☆☆☆

”میں تم سے پیار کرنے لگی ہوں راحم۔“ میشل نے راحم کو تنبیہ کیا۔
راحم جو ابھی معظمہ سے بات کر کے فارغ ہوا تھا کہ میشل کا سٹیج بڑھا۔

”جواب تم اچھے سے جانتی ہو اس بات کا۔۔۔۔۔ میں تمہیں سچ ہرگز نہ کرتا پر اب تمہیں سمجھ جانا چاہیے کہ میں تمہارا رشتے میں کیا لگتا ہوں۔“ پہلے راحم نے سوچا کہ جواب نہ دے لیکن پھر بیزاری سے سٹیج ٹائپ کیا اور سٹیج دیا۔
”میں تم سے واقعی پیار کرتی ہوں تبھی اظہار کر رہی ہوں۔۔۔۔۔ تم سے معظمہ نے کبھی اظہار کیا ہے؟“
میشل نے جان بوجھ کے معظمہ کا نام لیا۔

”پیار کے اظہار کے لیے لفظوں کی ضرورت نہیں پڑتی میشل۔۔۔۔۔ وہ سمجھ جاتے ہیں جو پیار کرتے ہیں۔“
راحم نے جواب بھیجا۔

”اچھا تو تم جو معظمہ سے اظہار کرتے رہتے ہو وہ کیا ہے پھر؟ تم اسے نہ بتاتے تو وہ بھی نہ جانتی۔“ یہ ایک عجیبی سی بات تھی جو میشل نے لکھ بھیجا تھا اور راحم نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

(دوسرا اور آخری حصہ اگلے ماہ)

”بس بہن کیا بتاؤں گھر کے کاموں میں کیسے دن گزر جاتا ہے پتا ہی نہیں چلتا، آج بھی جیلہ کے کہنے پر آئی تھی اُس کی بیٹی کے لیے دو تین رشتے بتائے تھے میں نے۔ اس میں سے ایک پسند آ گیا تو بس کہہ رہی تھی کہ لڑکے والوں کو کہوں کہ کسی دن آکر ان کی بیٹی کو دیکھ جائیں تاکہ بات آگے بڑھے۔“ فرخندہ بوانے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

”آؤ، آؤ فرخندہ بوا آج کیسے آتا ہوا یہاں؟“
 میدہ بیگم نے رشتے والی بوا کو دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”بس ذرا پڑوس میں گئی تھی جیلہ کی بیٹی کے رشتے لے سلسلے میں تو سوچا تم سے بھی ملتی جاؤں۔“ فرخندہ بوا ہادر اتارتے ہوئے بولیں۔
 ”اچھا کیا جو آگئیں بہت دن سے تم سے ملاقات بھی نہیں ہوئی تھی.....“ سعیدہ بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

حاصلِ زندگی

حنادہ احمد



”اچھی بات ہے، اللہ پاک تمام بچوں کا نصیب اچھا کرے..... صاعقہ بیٹا جلدی سے بوا کے لیے شربت بنا کے لاؤ.....“ سعیدہ بیگم نے بوا سے بات کرنے کے بعد بیٹی کو آواز دی۔

”تم بیٹاؤ سعیدہ صاعقہ کے لیے کیا سوچا ہے۔ خیر سے ہمارے محلے میں سب سے زیادہ تعلیم صاعقہ نے حاصل کی ہے اب کب اس کے ہاتھ پیلے کر رہی ہو؟ یہی عمر تو ہوتی ہے لڑکیوں کی شادی کی اس سے زیادہ دیر نہیں کرنی چاہیے ورنہ پھر بہت مشکل ہوتی ہے رشتے کرنے میں۔“ انہوں نے سعیدہ بیگم کو مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

”بس بوا میں تو خود چاہتی ہوں کہ اس سال صاعقہ امتحان دے کے فارغ ہو تو اس کے ہاتھ پیلے کر دوں، تم تو جانتی ہو صاعقہ کو خود بھی کتنا شوق ہے پڑھائی کا اور پر سے میری اور اللہ جنت نصیب کرے اس کے باپ کی بھی خواہش تھی کہ صاعقہ پڑھ لکھ کے کچھ بنے۔ اب خیر سے اس کا ماسٹر مکمل ہونے کو ہے تو چاہتی ہوں میں کہ اب وہ اپنے گھر کی ہو جائے۔“

”سلام بوا! یہ شربت لیں۔“ صاعقہ نے شربت بوا کو پیش کرتے ہوئے کہا۔

”جیتی رہو بیٹی کسی جا رہی ہے تمہاری کالج کی پڑھائی۔“ بوا نے شربت لیتے ہوئے پوچھا۔

”بوا کالج نہیں یونیورسٹی۔“ صاعقہ نے مسکراتے ہوئے بوا کو سمجھایا۔

”ارے ہاں۔ ہاں وہی، وہی۔“ بوا نے جھینپتے ہوئے کہا۔

بس بوا اب تین ماہ ہیں اس کے بعد امتحان ہیں، آپ کو دعا ضرور کرنی ہے۔“

”دعا کیوں نہیں کروں گی اور تم ماشاء اللہ خود اتنی لائق ہو اتنا سارا سفر تم نے اپنی محنت سے طے کیا ہے تو آگے بھی ضرور کامیاب ہوگی۔ پورے محلے میں کوئی لڑکی تم جتنا نہیں پڑھ پائی کسی نے میٹرک کیا تو کوئی کالج سے آگے نہ پڑھ سکی ہے۔ ایک تم ہی واحد لڑکی ہو محلے کی جو اتنا آگے گئی ہو دیکھنا تم ضرور کامیاب ہوگی۔“ بوا نے

خالی گلاس صاعقہ کو پکڑایا اور وہ مسکراتے ہوئے اندر چکن میں چلی گئی۔

”بوا بس اب تم میری صاعقہ کے لیے رشتہ ڈھونڈنا شروع کر دو بس اس بات کا خیال کرنا کہ لڑکا پڑھا لکھا ہو زیادہ نہ سہی لیکن کم از کم اپنی صاعقہ جتنا پڑھا تو ہوا سی محلے کا ہو یا تمہارے کسی جاننے والوں میں سے ہو کیونکہ میں بیوہ عورت کہاں معلومات کراتی پھروں گی اس لیے کوشش کرنا کہ اپنے علاقے میں سے کوئی اچھا رشتہ مل جائے۔“ سعیدہ بیگم نے فرخندہ بوا کو اپنی مجبوری بتاتے ہوئے کہا۔

”میں کوشش کرتی ہوں سعیدہ تم تو جانتی ہو اپنے محلے میں زیادہ کہاں کسی نے تعلیم حاصل کی ہے پھر بھی تم گھبراؤ نہیں، اللہ خیر کرے گا۔“ فرخندہ بوا نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

سعیدہ بیگم ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ پانچ بہنوں اور دو بھائیوں میں وہ دوسرے نمبر پر تھیں تعلیم کا شوق تھا لیکن باپ کی آمدن زیادہ نہ ہونے کی وجہ سے ان کے والدین نے انہیں پانچویں جماعت کے بعد اسکول سے ہٹوا دیا اور سعیدہ گھر میں ماں بہنوں کا ہاتھ بٹانے لگیں..... وقت گزرا اور سعیدہ نے جوانی کی دہلیز پہ قدم رکھا تو اُن کے لیے جبار احمد کا رشتہ آگیا جو آٹھ جماعتیں پاس تھے اور ایک درکشاپ پہ کام کرتے تھے۔ جبار احمد جوان تھے، مختی تھے ان کے کام کی لگن کو دیکھتے ہوئے سعیدہ بیگم کے والدین نے رشتے کے لیے ہاں کر دی اور سعیدہ بیگم بیاہ کر جبار احمد کے گھر آ گئیں جہاں اس گھر میں جبار احمد کے ماں باپ، چٹھہ جیٹھانی، ایک کنوارا دیور اور نند سب ایک ساتھ رہتے تھے..... سعیدہ بیگم نے اپنی خدمت اور اخلاق سے جلد ہی اس گھر کے کمینوں کے دلوں میں جگہ بنائی جہاں سعیدہ کو جبار جیسا محبت کرنے والا شخص ملا وہیں عزت و احترام کرنے والا سرال ملا، شادی کے دو سال بعد سعیدہ بیگم کی گود میں صاعقہ آ گئی۔ جبار احمد جو پہلے ہی سعیدہ کو چاہتے تھے بیٹی کی پیدائش کے بعد سعیدہ کا پہلے سے زیادہ خیال رکھنے لگے۔

حاصل زندگی

تعلیم دلوانے کا اپنا اور جبار کا خواب وہ کبھی نہ بھولیں گی کیونکہ وہ یہ بات بخوبی سمجھتی تھیں کہ آج اگر ان کے پاس تعلیم ہوتی تو ان کے حالات مختلف ہوتے وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتیں تو وہ صاعقہ کو اس سے بہتر زندگی فراہم کر سکتی تھیں اسی لیے انہوں نے تمہیر کر لیا تھا کہ چاہے جو بھی حالات ہوں وہ صاعقہ کو تعلیم ضرور دلوائیں گی جس کے لیے انہوں نے دن رات محنت کی اور اللہ کی مدد اور ان کی انتھک محنت کا ہی نتیجہ تھا کہ آج صاعقہ یونیورسٹی میں انکناکس میں ماسٹر ز کر رہی تھی۔ صاعقہ کو بھی ماں کی مشکلات کا اندازہ تھا اس لیے اس نے چھوٹی عمر میں ہی محلے کے بچوں کو ٹیوشن پڑھا کے ماں کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا تھا، اتنی مشکلیں کاٹنے کے بعد اب بس سعیدہ بیگم کی یہی خواہش تھی کہ ان کی بیٹی کو ایک پڑھا لکھا شریک حیات مل جائے۔

☆☆☆

”امی، امی کہاں ہیں آپ؟“ صاعقہ نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے ماں کو پکارنا شروع کیا۔
”کیا ہوا صاعقہ یہیں کچن میں تو ہوں۔“ سعیدہ

وقت کا پہلا چلتا رہا دیور، ہندی شادی اور ساس سر کی وفات کے بعد گھر کو بچ کر اپنے، اپنے حصے لے کے سب الگ ہو گئے..... جبار اور سعیدہ نے اپنی بیٹی صاعقہ کے ساتھ الگ دنیا آباد کی جہاں ان دونوں کا مقصد صاعقہ کو تعلیم دلوانا تھا اور وہ ساری خوشیاں دینی ہی جو سعیدہ اور جبار کو اپنے حالات کی وجہ سے مل سکی تھیں لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ شادی کے آٹھ سال بعد ہی جبار احمد کا ایک ایکسڈنٹ میں انتقال ہو گیا اور وہ سعیدہ بیگم اور صاعقہ کو اس بھری دنیا میں اکیلے چھوڑ کر چلے گئے۔ سعیدہ بیگم کے لیے یہ ایک بہت بڑا صدمہ تھا لیکن انہوں نے اس مشکل وقت میں ہمت سے کام لیا اور بجائے کسی پہ بوجھ بننے کے انہوں نے خود اپنی ذمہ داری اٹھانے کا فیصلہ کیا اور جو ہنران کی ماں کے پاس تھا جسے انہوں نے اپنی ماں سے سیکھ کر گھر کی

ذمہ داری میں ان کا ساتھ دیا آج وہی ہنرانیں اپنے گھر کو چلانے کے لیے استعمال کرنا بڑا یعنی کپڑوں کی سلاخی کے ہنر کو اپنا ذریعہ معاش بنایا خود مشکلیں کاٹیں لیکن صاعقہ کو اعلیٰ

ستمبر 2017ء کا دُفترِ شبہ ایک نظر میں

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

سینس ڈائجسٹ

ماہنامہ



مزید
عظیم الشان محفل
محفل شعر و سخن
اور

مرزا امجد علی شاہ گارہنگ ۱۹۹۰ء

ذرا سی بات

زندگی چھوٹے چھوٹے واقعات کے درمیان کبھی کبھی ذرا سی بات کسی کی بھینٹ بھی لے لیتی ہے۔ آخری صفحات پر

ناہید سلطانہ اختر کے قلم سے ایک پر فکر داستان

سانچہ

تاریخ اکثر چھوٹے اور بڑے طبقات کی تفریق کیے بغیر صرف بڑے اور مغرور کام کرنے والوں کو اپنے اوراق پر رقم کرتی ہے۔ تاریخی صفحات پر علی اختر کی ایک چونکا دینے والی دلنشین تحریر

باغی

مثبت اور منفی رویوں کے درمیان دلچسپ معرکہ آرائی.....
خوبصورت پیار کے رشتوں کے درمیان علم بغاوت بلند
کرنے والے رویوں کی انوکھی داستان..... ایک یادگار تحفہ

وقت

اکثر لمحات پر نگار کڑ جاتے ہیں مگر..... کچھ سوچا تیں
بھی مطلوب لوگوں کے دامن میں ڈالتے چلے
جاتے ہیں۔ حسام بیٹ کے قلم کی روانی

منظر امام، تنویر ریاض، سلیم انور، محمد الیاس، شمع عباس
اور ڈاکٹر شیر شاہ سید کی خوبصورت کہانیاں آپ کی منظر

اس کے علاوہ

بیگم نے دوپٹے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے کہا۔

”امی آج میں بہت بہت خوش ہوں۔“ صاعقہ نے ماں کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔

”اچھا مجھے بھی تو پتا چلے کہ میری بیٹی کیوں اتنی خوش ہے۔“ سعیدہ بیگم نے بیٹی کے مسکراتے چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”امی مجھے اپنی یونیورسٹی میں لیکچرار کی نوکری کی آفر ہوئی ہے ماہانہ چالیس ہزار تنخواہ امی، آج مجھے لگتا ہے ہمارے خواب پورے ہو گئے، ہمیں ہماری محنت کا پھل ملا ہے امی اور یہ سب آپ کی دعاؤں کا نتیجہ ہے یہ دیکھیے میرا اپائنٹمنٹ لیٹر.....“ صاعقہ نے ماں کو لیٹر دیتے ہوئے کہا۔

”بنیاد تو ج میں بہت خوشی کی بات ہے میں کبھی بھی ناں کہ محنت بھی رانگاں نہیں جانی، محنت کا پھل ضرور ملتا ہے اور میری بیٹی تو ہے ہی اتنی لائق اسے تو کامیاب ہونا ہی تھا۔“ سعیدہ بیگم نے نم آنکھوں سے بیٹی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”میری محنت سے زیادہ یہ آپ کی محنت اور دعاؤں کا نتیجہ ہے امی.....“ صاعقہ نے ماں کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

”اب بس یہی دعا ہے میری یارب کہ صاعقہ کا کسی اچھے پڑھے لکھے لڑکے سے رشتہ طے ہو جائے۔“ سعیدہ نے دل میں دعا کرتے ہوئے بیٹی کے ماتھے پہ پیار کیا۔

☆☆☆

”فرخندہ بوا ایک سال ہونے کو ہے اور تم نے اب تک میری صاعقہ کے لیے کوئی اچھا پڑھا لکھا لڑکا نہیں ڈھونڈا، اب تو وہ خود اپنا کمانے بھی لگی ہے۔ گھنٹہ سلیقہ مند میری بیٹی ہے۔ تمہیں اب تک کوئی اس کے لائق رشتہ نہیں ملا۔“ سعیدہ بیگم نے پریشانی سے بوا سے ذکر کیا۔

”میں کوشش کر رہی ہوں سعیدہ لیکن کیا کروں تم جانتی تو ہو کہ اپنے محلے میں کہاں زیادہ پڑھے لکھے لڑکے ہیں چند اک ہیں جو اپنی صاعقہ جتنا پڑھے ہیں باقی سب تو اس سے کم پڑھے لکھے ہیں اور ان پہ تم راضی نہیں ہو، ہاں تم کہو تو کسی اور جگہ پتا کروں لیکن ان کی ذستہ داری میں نہیں لوں گی، میرا کام صرف رشتہ بتانا ہوگا آگے تم خود معلومات اور

چھان بین کرنا۔“ فرخندہ بوانے صاف، صاف کہا۔

”اور وہ جو تم نے کہا تھا کہ بیس لڑکے پڑھے لکھے ہیں اپنے محلے کے ان کا کیا پتا؟“ سعیدہ بیگم نے غلت سے پوچھا۔

”بس کیا پتاؤں آج کل کے لڑکوں کا، ایک لڑکا کہہ رہا تھا کہ لڑکی زیادہ سے زیادہ بیس بائیس برس کی ہو جبکہ اپنی صاعقہ تو خیر سے چھبیس میں لگنے والی ہے اور

دوسرا لڑکا چاہتا ہے کہ لڑکی نوکری نہ کرے اب اگر صاعقہ نوکری چھوڑ دے تو شاید وہاں بات بن سکتی ہے اس کے علاوہ ایک اور رشتہ بھی ہے لڑکا بہت اچھا ہے اور اس کے گھر والے پڑھی لکھی ہو چاہتے ہیں لیکن لڑکا خود انٹر پاس ہے، باپ کی بیماری کی وجہ سے آگے نہ پڑھ سکا اور

باپ کے ساتھ دکان پر بیٹھ گیا اب تو خیر سے اس نے اپنی الگ دکان بھی لے لی ہے اچھا خاصا گھرانہ ہے، ہے بھی اپنے علاقے کا کوئی کی نہیں سوائے کم پڑھا لکھا ہونے کے، ایک دو اور بھی رشتے ہیں لیکن دوسرے محلے کے..... تم کہو تو وہاں بات چلاؤں کہ آگے لڑکی کو دیکھ جائیں، آگے تم خود پتا کر لینا۔“

”بوا میں اکیلی عورت کہاں پتا کرواتی پھروں گی، نہ میں کسی کو زیادہ جانتی ہوں۔“ سعیدہ کئی سیال سے یہاں رہ رہی تھیں مگر زیادہ لوگوں سے واقفیت نہ تھی۔

”اب تم سوچ لو سعیدہ تمہیں کیا کرنا ہے، ایسا نہ ہو یہ وقت بھی گزر جائے محلے میں تو ویسے ہی صاعقہ کی عمر کو لے کے باتیں بننا شروع ہو گئی ہیں۔ سب کہہ رہے ہیں کہ سعیدہ نے بیٹی کو زیادہ پڑھا لکھا غلطی کی ہے۔ اچھا چلو ایک ہفتے بعد آؤں گی جواب لینے تم تب تک اچھی طرح سرچ لینا۔“ یہ کہہ کے بوانے چادر اوڑھی اور چلتی بنی۔

سعیدہ بیگم یہ بات بخوشی جانتی تھی کہ صاعقہ نوکری چھوڑنے کو تبھی راضی نہیں ہوگی اور کہیں رشتہ کرنے کی ان کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اب تو محلے کی اکثر عورتیں بھی صاعقہ کی عمر کو لے کے باتیں بنانے لگی تھیں اور اکثر عورتوں کا کہنا تھا کہ یہ سب کچھ صاعقہ کی تعلیم کی وجہ سے ہو رہا تھا، سعیدہ نے تو صاعقہ کو تعلیم دلا کے اس کے مستقبل کو محفوظ کرنا چاہا، اسے اپنے پاؤں پہ کھڑا کرنا چاہا

مقام، یہ عہدہ سب آپ کی وجہ سے مجھے ملا ہے اور میں اتنی خود غرض نہیں ہو سکتی کہ آپ کو جب میری سب سے زیادہ ضرورت ہے، میں آپ کا ساتھ چھوڑ دوں..... میں نہ کسی دوسرے شہر جاؤں گی اور نہ ہی کسی دوسرے محلے..... مجھے آپ کے قریب ہی رہنا ہے، چاہے اس کے لیے مجھے اپنے سے کم پڑھے لکھے شخص سے ہی شادی کیوں نہ کرنی پڑ جائے ویسے بھی کم یا زیادہ تعلیم ہونے سے زیادہ ضروری ہے کہ وہ میری مشکلات کو سمجھے، اس میں میرا ساتھ دے نہ کہ اس کے پاس ڈگری تو ہو لیکن اندر سے وہ ایک پڑھا لکھا جاہل ہو پھر آپ ہی بتائیں کیا فائدہ ایسی ڈگری کا؟“

”لیکن ایک کم پڑھے لکھے شخص کے ساتھ تمہاری ذہنی مطابقت میں بھی تو بہت فرق ہوگا، سوچوں میں فرق ہوگا بیٹا۔“ سعیدہ بیگم نے پریشانی سے کہا۔

”امی میں جانتی ہوں آپ میرے لیے پریشان ہیں، آپ کو میری وجہ سے لوگوں کی باتیں سننا پڑتی ہیں، یہی محلے والے جو آپ کی بہت عزت کرتے تھے، آج آپ کو باتیں سنارہے ہیں، میری عمر میری ڈگری کو شادی نہ ہونے کی وجہ سے بڑھ رہی ہے اور یہ سب آپ کے لیے بہت تکلیف دہ ہے لیکن امی آپ ہی بتائیں یہ جو نام نہاد پڑھے لکھے ہیں جن کو صرف اپنی خواہشات، اپنی مرضی کا خیال ہے دوسرے فریق کی مرضی، اس کی مجبوری کا کوئی خیال نہیں کیا ایسے شخص کے ساتھ میری ذہنی مطابقت ہو پائے گی؟“ سعیدہ بیگم کا منہ تکتے لگیں بات تو وہ صحیح کہہ رہی تھی۔

”شادی کا مقصد تو امی ایک دوسرے کا بوجھ بانٹنا ہوتا ہے ایک دوسرے کی ذمے داریوں میں ساتھ دینا ہوتا ہے..... اگر ایک لڑکا یہ چاہ سکتا ہے کہ اس کی بیوی اس کے گھر کے کام کاج گھر کی ذمے داریوں میں شہر کا ساتھ دے اس کا ہاتھ بٹائے تو لڑکی کیوں نہیں چاہ سکتی کہ اس کا شہر بھی اس کی ذمے داریوں کو سمجھے، اس میں اس کا ساتھ دے؟ اور اگر یہ بات ایک کم پڑھا لکھا شخص سمجھ رہا ہے تو میرے نزدیک اسے زندگی کا صحیح شعور ہے۔ ویسے بھی تعلیم کا اصل مقصد تو شعور دینا ہی ہے ناں! اور امی

لیکن آج لوگ اسی تعلیم کو مورد الزام قرار دے رہے تھے۔

”اے میرے رب اب تو ہی مجھے کوئی راستہ دکھا۔“

”کیا..... کیا بات ہے امی؟ آج آپ کا فی پریشان لگ رہی ہیں۔ کھانا بھی ٹھیک سے نہیں کھایا آپ نے۔“ صاعقہ نے ماں کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

”بس بیٹا آج فرخندہ بوا آئی تھیں، وہ کہہ رہی تھیں کہ ایک رشتہ ان کی نظر میں ہے۔ لڑکا بڑھا لکھا ہے اچھے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق ہے عمر بھی مناسب ہے، تمیں کے لگ بھگ ہے لیکن اس کی خواہش ہے کہ اس کی بیوی نوکری نہ کرے بلکہ گھر میں رہے اگر تم نوکری چھوڑ دو تو صاعقہ جو ماں کی بات سن رہی تھی اس بات پر ایک دم سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”نہیں امی، بات نہیں ہو سکتی۔ آپ سب کو بتا دیں کہ میں یہ نوکری کبھی نہیں چھوڑ سکتی۔ اتنی مشکلوں سے محنت سے میں نے یہ مقام حاصل کیا ہے۔ معاشرے میں نام حاصل کیا ہے اور آپ کہہ رہی ہیں کہ میں یہ نوکری چھوڑ دوں، ایسا کبھی نہیں ہو سکتا اور آپ ہی بتائیں اگر میں نوکری چھوڑ دوں تو یہ گھر کیسے چلے گا؟ میرے اور آپ کے اخراجات کون اٹھائے گا، آپ کو کیا لگتا ہے کہ آج کل کے اس نفسا نفسی کے دور میں کون اتنا اچھا ہے جو کسی دوسرے کا بوجھ اٹھائے اور ان کی ذمے داری کو خندہ پیشانی سے بھائے۔ میں نہیں چاہتی کہ کوئی آپ کو بوجھ سمجھے یا آپ کو اپنی کسی ضرورت کے لیے پریشان ہوتا دیکھوں اور نہ ہی میں یہ دیکھ سکتی ہوں کہ اب آپ اس عمر میں کام کریں اس لیے آپ فرخندہ بوا کو صاف، صاف بتا دیں کہ جو بھی رشتہ دیکھیں ان لوگوں کو بتا دیں کہ میں نوکری کبھی نہیں چھوڑوں گی۔“ صاعقہ نے جتنی لہجہ میں کہا۔

”لیکن بیٹا! اس کے علاوہ جو رشتے ہیں وہ سب لڑکے تم سے کم پڑھے لکھے ہیں، میں کسی کم تعلیم یافتہ لڑکے سے تمہاری شادی کیسے کر دوں؟“ سعیدہ بیگم نے بیٹی کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”امی آپ کی اور اس گھر کی ذمے داری اب میری ہے اور مجھے اس کو نبھانے میں کوئی قیاحت نہیں..... یہ

تھی صاعقہ، شکر مانو کہ لڑکے والے مان گئے ورنہ آج کل کے لڑکوں کو تو کم عمر لڑکیاں چاہیے ہوتی ہیں۔“ ایک اور پڑوسن نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

”اب شادی کب کر رہی ہو؟ یہ نہ ہو کہ اس میں ایک اور سال لگا دو اور صاعقہ کی عمر.....“

اندر بیٹھی صاعقہ سب کی باتیں سن رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ حوا کی بیٹی کو اپنی ہی صنف کی جانب سے آج بھی سوالات کا، ان کی نظروں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کوئی گناہ نہ کر کے بھی وہ قصور وار سمجھی جاتی ہے۔ بھی بڑی عمر، کبھی تعلیم، کبھی نوکری کو ان کا قصور سمجھا جاتا ہے۔ جب رشتہ نہیں ہو رہا تھا تو لوگوں کے سوالات کے رشتہ کیوں نہیں ہو رہا؟ جب ہو گیا تو یہاں کیوں کیا؟ اتنی دیر سے کیوں کیا؟ کم پڑھا لکھا وغیرہ، وغیرہ۔

باہر ابھی تک تبصرے ہو رہے تھے اور صاعقہ جانتی تھی کہ اس کی ماں کس ہمت سے لوگوں کے سوالات کے جوابات دے رہی تھی۔ یہی لوگ ہیں جو نہ جینے دیتے ہیں نہ مرنے دیتے ہیں لیکن صاعقہ مطمئن تھی کہ اس نے اپنے سے کم پڑھے لکھے شخص کا انتخاب کیا ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ عادل خود پڑھنا چاہتا تھا لیکن حالات نے اسے کالج کے بعد پڑھنے کی اجازت نہیں دی۔ عادل کو صاعقہ کی نوکری کرنے پر کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ وہ تو خود ایک پڑھی لکھی بیوی کی خواہش رکھتا تھا۔ لڑکے والوں کے خلوص اور سچے ہوئے انداز نے سعیدہ بیگم اور صاعقہ کو اس رشتے کو ہاں کرنے پر مجبور کیا تھا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ حالات کا تقاضا تھا کہ اب صاعقہ کے معاملے میں مزید دیر کرتی تو یہی محلے والے جو کبھی صاعقہ کی تعریف کرتے اس کی تعلیم کو سرائے تھے کل کے اسی تعلیم کو صاعقہ کا رشتہ نہ ہوتے کی وجہ بتاتے اور سعیدہ کو اپنی بیٹی پر بھی مکمل اعتماد تھا کہ وہ اپنی تعلیم کے زور سے عادل اور اس کے گھر والوں کی زندگی میں تعلیم کا چراغ ضرور روشن کرے گی۔ اور اپنی بہترین تربیت سے نئی نسل کی پرورش کرے گی۔

اس نے ایسے بہت سے لوگوں کو بھی دیکھا ہے جن کے پاس ڈگری تو ہے لیکن زندگی کا شعور نہیں، بہت سے ہاں لکھے والدین کی اولاد کے کردار میں جھول ہوتا ہے بلکہ بہت سے بغیر تعلیم یافتہ والدین کی اولاد کو زندگی کا شعور ہوتا ہے اور اس کی سب سے بڑی مثال آپ خود ہیں۔ امی آپ نے جس طرح میری پرورش کی ہے وہ قابل رشک ہے آپ کو ہزار پڑھی لکھی عورتوں سے زیادہ زندگی کا شعور ہے، آپ کی سوچ کئی پڑھی لکھی عورتوں سے زیادہ بہتر اور مضبوط ہے، آج اس مقام پر میں آپ کی وجہ سے ہی ہوں اور یہ سب آپ نے بغیر کسی ڈگری کے کیا ہے امی اور مجھے آپ پر فخر ہے۔“ اتنا سب کہہ کے صاعقہ اندر چلی گئی اور سعیدہ کے لیے سوچ کے دروازے کھول گئی سعیدہ کو آج صبح معنوں میں تعلیم کا مقصد سمجھ آیا تھا اور وہ اب ایک فیصلہ کر کے مسکرا دیں اب بس انہیں اس فیصلے کے متعلق صبح صاعقہ سے رائے لینا تھی۔

☆☆☆☆

”مبارک ہو بہن! صاعقہ کی بات طے کر دی تم نے۔“ جیلہ کے ساتھ محلے کی چند عورتیں سعیدہ کو مبارک دینے آئی تھیں۔

”خیر مبارک ہو! آئیں بیٹھیں۔“ سعیدہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

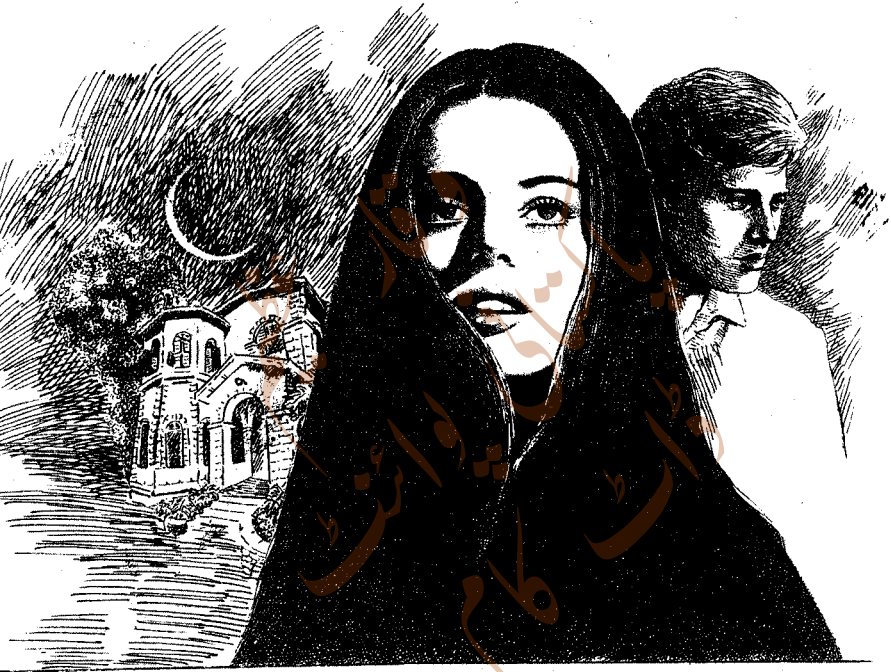
”لیکن بہن بوا فرخندہ بتا رہی تھی کہ لڑکا اپنی صاعقہ سے کم پڑھا لکھا ہے بس کالج گیا تھا اس کے بعد باپ کے ساتھ جنرل اسٹور پر بیٹھ گیا تھا۔ تم تو کہتی تھیں کہ..... تمہارا داماد صاعقہ جتنا پڑھا لکھا تو ہو تو اب کیسے یہ رشتہ کر لیا؟“ جیلہ نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔ باقی کی عورتیں بھی اثبات میں سر ہلاتی تھیں جیسے جیلہ ان کے خیالات کی بھی ترجمانی کر رہی ہو۔

”بس سمجھو کہ انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ اور ہے یا بس یوں کہہ لو کہ صاعقہ کا نصیب یہاں جزا تھا۔“ سعیدہ نے رسائی سے جواب دیا۔

”ویسے اچھا ہوا آپ ماں نے صاعقہ کا رشتہ طے کر دیا ورنہ کب تک لڑکی کو گھر بٹھا کر رکھتیں؟ ستائیس کی ہو گئی

تو میرا نصیب ہے

منزلت انصاری



وہ یونیورسٹی روٹ سے اتر کر مین روڈ عبور کر کے
ذیلی سڑک پر آ گیا تھا پھر طویل سڑک عبور کر کے بائیں
سمت مڑ گیا۔ اور اب چند ٹاپے بعد بڑے سے براؤن
آہنی گیٹ کے سامنے کھڑا تھا۔ ٹف پر کیٹیکل اور اب
دھوپ کی تمازت نے اسے خاصا تھکا ڈالا تھا۔ اس نے
چند ٹاپے ٹھہر کر اپنے بال سیٹ کیے اور گیٹ پر لگی
اطلاعی کھنٹی بجائی۔

”حارث بھیا آگئے عینی۔“ اندر سے فوراً زہنی

لی پہلے ہی جمع نما آواز برآمد ہوئی۔ وہ عینی کو اطلاع دے کر فوراً گیٹ کی طرف لپکی۔ حارث کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”السلام علیکم بھیا۔“ حسب توقع سامنے زینی تھی۔ اس نے اپنی مخصوص مسکراہٹ سمیت اسے اندر داخل ہونے کا راستہ دیا۔

”علیکم السلام ماسی!“ وہ اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگاتا اندر داخل ہو گیا۔ بنی سنوری عینیہ اس کے سامنے تھی وہ ڈارک بلوکلر پر سفید کڑھائی کے سوٹ میں ہم رنگ آویزے پہنے بے حد پیاری لگ رہی تھی اس کی دودھیاء رنگت مزید پھل گئی تھی۔ اس کے گورے گالوں پر گلابیاں کھلی ہوئی تھیں۔ حارث کی شوخ نظریں اس پر جم کر رہ گئیں۔ زینیہ لفظ ماسی پر بد مزہ ہو کر رہ گئی۔ حارث اسے اسی نام سے چھیڑتا تھا اور وہ ہر بار چپ بھی جاتی۔ حارث اس کی اس حالت سے خوب حظ لیتا۔

”ماسی سے بنا کر رکھیے گا۔ ہو سکتا ہے اسی میں آپ کا بھلا ہو۔“ وہ زینیہ سے پانچ سال بڑا تھا ان دونوں میں بے حد بے تکلفی تھی۔ زینیہ نے شوخی بھری ذومعنی بات کی تو وہ جواباً کڑبڑا کر نظریں پھیر گیا۔

”مما، حارث بھیا آگئے ہیں، وہ عینیہ کو وردہ کے ہاں چھوڑ دیں گے۔“ عینیہ کو اپنی فرینڈ کے نتیجے کی برتھ ڈے میں جانا تھا۔ تیار ہو کر بابا کا انتظار کر رہی تھی۔ بابا نے آفس سے جلدی آنے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ لیٹ ہو رہی تھی اور بابا کے انتظار میں ٹہل رہی تھی کہ حارث آ گیا۔ وہ بے حد تھکا ہوا تھا۔ اس پل اگر اسے مماء بھائی یا ہانیہ میں سے کوئی کام کا کہتا تو وہ فوراً انکار کر دیتا مگر اب دل کا معاملہ تھا اس کی تھکن لحوں میں اڑنچھو ہو گئی۔ اس نے ممنونیت سے زینیہ کو دیکھا جس کی نگاہوں میں مسلسل شوخی ناچ رہی تھی جبکہ عینیہ جی بھر کر بد مزہ ہوئی تھی۔ اسے اپنا یہ فرسٹ کزن زہر لگتا تھا۔ حارث اپنی ڈیشنگ پرسنٹی کی وجہ سے لڑکیوں میں سے بے حد مقبول تھا۔ وہ جہاں جاتا لڑکیاں اس کے گرد منڈلانے لگتیں اور وہ راجا اندر بنا لڑکیوں سے مکمل مل

جاتا۔ عینیہ کو اس کی یہی عادت زہر لگتی تھی۔ اسے حارث کے اس چھپھورے پن سے چڑھتی۔ عینیہ نے غصیلی نگاہوں سے بہن کو دیکھا جو اسے نظر انداز کیے کچن میں مصروف ماں سے مخاطب تھی۔

”مما، بابا آتے ہوں گے۔“ وہ ماں کے کچھ کہنے سے پہلے ہی بول اٹھی۔

”تم اتنی دیر سے میرا سر کھائے جا رہی تھیں اب حارث کے ساتھ چلی جاؤ۔“ وہ مماء سے بابا کا پوچھ، پوچھ کر ان کا ناک میں دم کر چکی تھی پر اس نے حارث کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تو انہیں اس پر شدید تاؤ آ گیا وہ اسے لتاڑ کر دوبارہ کچن میں چلی گئیں۔

”اچھا.....“ وہ مرے، مرے لہجے میں کہتی زینیہ اور حارث کو شعلہ بارنگاہوں سے گھورتی آگے بڑھ گئی،

حارث گاڑی باہر نکالنے لگا۔ زینیہ نے بہن سے نگاہ بچا کر اسے وکٹری کا نشان بنایا۔ وہ دہلی مسکراہٹ سے ہنس دیا۔

عینیہ جلتی جھتی فرنٹ سیٹ پر آن بیٹھی تھی۔ حارث کی ساری تھکاوٹ محبت کی خوشبو میں ڈھل گئی تھی۔

☆☆☆

”یعنی پلینز..... مجھے یہ ٹاپک سمجھا دو۔“ زینیہ کے انخول ایگزامز قریب تھے۔ وہ کافی دیر سے یکمشری کا نیو میٹرکیکل سولو کرنے کی کوشش کر رہی تھی مگر اس سے صحیح حل نہیں نکل رہا تھا۔ بابا کی شدید خواہش تھی کہ ان کی دونوں بیٹیاں ڈاکٹر بنیں۔ عینیہ کا میڈیکل میں ایڈمیشن کچھ مارکس سے رہ گیا تھا۔ اب زینیہ بابا کی خواہش پوری کرنے کے لیے سخت محنت کر رہی تھی۔ وہ انٹر پارٹ ٹو کی اسٹوڈنٹ تھی۔ اس نے پین نوٹ بک پر پختہ ہوئے زچ ہو کر اسے مخاطب کیا۔

”تم جاؤ جا کر اپنے حارث بھیا سے سمجھو۔“ عینیہ کو اس پر سخت تاؤ تھا جو اتنے روز گزرنے کے بعد بھی ختم نہیں ہوا تھا۔ ان دونوں میں بات چیت ہوتی تھی مگر وہ اس پر اپنی فحاشی جتانے کا کوئی موقع نہیں جانے دیتی تھی۔

”حارث بھیا۔“ وہ بھی اسی کی بہن تھی اس نے

زیبہ بے ساختہ کلکھلا دی۔

☆☆☆

”حارث.....“ وہ ڈیپارٹمنٹ سے نکل کر پارکنگ ایریا میں داخل ہو رہا تھا۔ جب اس کے پیچھے دیکھ کر سوائی آواز ابھری وہ طویل سانس بھرتا نہ چاہتے ہوئے بھی رگ گیا۔

”آج میرا روٹ مس ہو گیا ہے، مجھے گھر ڈراپ کر دو۔“ حارث بھی کبھار گاڑی پر یونیورسٹی آ جاتا تھا۔ آج بابا اور چچا آفس لیٹ گئے تھے۔ وہ یونیورسٹی کے لیے نکلنے لگا تو اس نے بابا سے گاڑی مانگ لی تھی۔

جائیدہ اس کے ہم قدم ہو گئی۔ اس کی اور جائیدہ کی ملاقات جلد دوستی میں ڈھل گئی تھی۔ وہ حسب عادت ہر خوب صورت لڑکی سے جلدی دوستی کر لیتا تھا۔ جائیدہ ڈیپارٹمنٹ میں صبح سے زیادہ خوب صورت تھی۔ کئی لڑکے اس کے لیے نرپتے تھے مگر اس نے حارث سے دوستی کی تھی۔ حارث نے تو دوستی برائے دوستی کی تھی جبکہ جائیدہ خاصا سیریس ہو چکی تھی وہ دوستی کی حدود سے کچھ آگے نکل آئی تھی۔

حارث نے جب کچھ غلط محسوس کیا تو اس نے رفتہ رفتہ راہیں بدلنا شروع کیں مگر وہ اس کے گلے کی ہڈی بن گئی تھی جسے نہ وہ نکل سکتا تھا اور نہ ہی اگل سکتا تھا۔ وہ مارے مروت کے دوستی نبھائے جا رہا تھا۔ اس نے جائیدہ کو صاف الفاظ میں دونوں کے رشتے کے متعلق باور کروادیا تھا مگر وہ بھی اپنے نام کی ایک تھی یا شاید اسے اپنے حسن پر ناز و یقین تھا کہ حارث ایک نہ ایک دن ضرور اس کی طرف ملتفت ہوگا۔

”جائیدہ پلیز..... ہم صرف اچھے دوست ہیں۔“ وہ حارث کی سنگت کے بہانے ڈھونڈتی اسے حارث سے محبت ہو گئی تھی اور وہ اسے پانا چاہتی تھی، اس نے دانستہ روٹ مس کیا تھا حارث نے زنج ہوتے ہوئے اسے نرمی سے دو بارہ باور کرایا۔

”آئی نو حارث.....“ وہ جواباً ذومعنی شونی سے مسکراتی تھی، اس نے اپنے ریشمی بالوں پر نکلے گل سائز

بہن کی خفگی کو خاطر میں لائے بنا منہ سخن میں اترتی سیرھیوں کی طرف کر کے بآواز بلند حارث کو پکارا تھا۔

”کیا ہوا زینی؟“ وہ تو جیسے ہر لمحہ نیچے سے اپنے نام کی پکار کا منتظر رہتا تھا۔ دل محبوب کی دید کا کوئی لمحہ گمنوائے پر تیار نہیں تھا۔ وہ بوتل کے جن کی طرح فوراً بالکلونی میں آ لٹا۔

”بھیا مجھے آپ سے ایک سوال سمجھنا ہے۔“ زیبہ نے تابعداری کا شاندار مظاہرہ کرتے ہوئے فوراً اپنا مسئلہ بیان کیا۔

”جسٹ اے منٹ۔“ وہ چٹکی بجاتا پیچھے ہٹا اور اگلے لمحے سیرھیوں پر قدموں کی آہٹ ہوئی عینیہ کے سر پر لگی اور تلووں پر چبھی، وہ پاؤں پیٹتے ہوئے اندر چلی گئی۔ حارث نیچے آیا تو وہ دشمن جاں غائب تھی۔ وہ سرد آہ کھینچتا اشارتاً زیبہ سے اس کے متعلق پوچھتا زیبہ کے قریب آ بیٹھا۔ اس نے آنکھ کے اشارے سے کمرے کی سمت اشارہ کیا۔

زیبہ نے اس کے سامنے بک رکھی تھی۔ حارث بی فارمیسی کے بعد کیمسٹری میں ایم فل کر رہا تھا۔ اس نے فارماسیوٹکس کے بجائے کیمسٹری کو ترجیح دی تھی چونکہ ایم فل (کیمسٹری) میں خاصا اسکوپ تھا اسی لیے اسے اپنا فیوچر برائٹ نظر آ رہا تھا۔ وہ بے حد ذہین و محنتی تھی، اس نے فارمیسی میں شاندار مارکس لیے تھے اور وہ اب ایم فل میں بھی کافی محنت کر رہا تھا۔ حارث نے نوٹ بک لے کر نیو میریکل سمجھانا شروع کیا۔

”آہ..... تمہاری بہن میرے ہاتھوں ضائع ہوگی۔“ اس نے نیو میریکل سمجھا کر جواب چیک کیا تو وہ غلط تھا۔ دراصل اس کے حواسوں پر اس وقت عینیہ سوار تھی۔ اس نے مصنوعی غصے سے دانت کچکچائے تھے۔ ”پھر ہو گئی آپ دونوں کی شادی۔“ وہ بے تکلفی سے شونی پہ مائل تھی۔

”آہ سسٹر..... تم نے سیدھا دل پر ہاتھ مارا ہے۔“ وہ شونی سے دل پر ہاتھ رکھے نیچے ڈھے گیا۔

انہوں پر لکاتے ہوئے محبت بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ چڑ گیا تھا۔

”پلیز جاشیہ..... میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔“ اس نے پہلے جتنی بھی لڑکیوں سے دوستی کی تھی ان میں سے کوئی بھی اس حد تک انوالونہ ہوئی تھی سو اسے کبھی کوئی پرابلم بھی نہیں ہوئی۔ وہ اپنی کزن عینیہ سے محبت کرتا تھا اور اسی سے شادی بھی کرنا چاہتا تھا جبکہ جاشیہ اس سے امیدیں وابستہ کیے بیٹھی تھی وہ اسے کسی دھوکے یا خوش فہمی میں نہیں رکھنا چاہتا تھا۔

”مجھ میں کس چیز کی کمی ہے حارث.....“ وہ پہلی بار بولتی ہوئی تھی، اس کے ہر انداز میں التجا تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ حارث کو کسی بھی قیمت پر منالے..... اس کے قدم ڈھیلے پڑ گئے۔

”تم بے حد اچھی لڑکی ہو جاشیہ..... تمہیں کوئی بھی بہترین لڑکا مل جائے گا۔“ حارث نرمی و بے بسی سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ بندگلی میں کھڑا تھا۔ اسے آگے کوئی رستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ جاشیہ سے دوستی اسے اس نہیں آئی تھی۔ اسے پہلی بار اپنی ”غلطی“ کا شدت سے احساس ہوا تھا۔

”وہ بہترین لڑکا تم کیوں نہیں ہو سکتے ہو حارث۔“ جاشیہ ٹپ کر دیکھی ہوئی۔ وہ محبت کی پُر خار وادی میں اتنا آگے بڑھ چکی تھی کہ اسے واپسی کا سفر جان لیوا لگ رہا تھا۔

”میں اپنی کزن سے محبت کرتا ہوں جاشیہ۔“ اس کے لہجے میں نا کردہ احساس گناہ جاگ اٹھا تھا۔ جاشیہ نے کرب سے آنکھیں موند لیں۔ کتنا جاں گسل لمحہ ہوتا ہے محبوب کے منہ سے اس کے محبوب کا ذکر سننا۔ وقت جیسے تھم کر رہ جاتا ہے۔ جاشیہ ساکت رہ گئی۔ اس کی پکلوں پر آنسو چھلنے لگے۔ محبت نے اسے مشکل دور اسے پر لا بچا تھا۔

☆☆☆

”یار آج کل تم اور جاشیہ زیادہ تراسٹے رہتے ہو۔“ وہ تیمور کے ساتھ لائبریری میں تھا۔ وہ دونوں

نولس تیار کرنے کے لیے ریفرنس بک ڈھونڈ رہے تھے۔ آخر کار انہیں تھوڑی تنگ دودو کے بعد مطلوبہ کتاب مل گئی۔ وہ اسے ایڈو کروا کر باہر نکلا تو تیمور نے گفتگو چھیڑ دی۔

”وہ مجھ سے محبت کرتی ہے مگر میں اس سے شادی نہیں کر سکتا۔ مجھے عینیہ سے محبت ہے۔“ اس نے لا چاری سے اپنے دوست تیمور کے سامنے اپنا مسئلہ بیان کیا۔ وہ حارث کی عادت سے واقف تھا۔ مگر اسے اس کی یہ عادت پسند نہ تھی۔ صنف مخالف میں کشش محسوس کرنا فطری بات ہے۔ مگر تفریح لینا بالکل نامناسب ہے۔

”جاشیہ بہت اچھی لڑکی ہے حارث.....“ تیمور کو جاشیہ اچھی لگتی تھی۔ اسے حقیقتاً جاشیہ سے ہمدردی محسوس ہوتی تھی اس کا دل دکھ رہا تھا۔

”تیمور میں لڑکیوں سے دوستی ضرور کرتا ہوں مگر میں فکری نہیں ہوں یار..... مجھے اس کے جذبات کا جیسے ہی علم ہوا میں نے اس سے دور ہو جانا چاہا، میں اسے دھوکا نہیں دینا چاہتا ہوں۔“ حارث فطرتاً اچھی طبیعت کا مالک تھا۔ اس کا مقصد کسی کو ہرٹ کرنا نہیں تھا۔ اس نے دوست سے حائل دل بیان کیا۔ وہ حقیقتاً جاشیہ کے لیے فکر مند تھا۔ تیمور کے چہرے پر نظر کرنا جال پھیل گیا۔

☆☆☆

”ہانیہ..... ارے ہانی کدھر ہو تم۔“ ہانیہ اور عینیہ دونوں کلاس فیلوز تھیں۔ موسم خاصا خوشگوار ہو رہا تھا۔ وہ اسٹڈی سے اکتائی تو اوپر چلی آئی تاکہ وہ ڈرائیولیکس ہو سکے۔ پھر وہ اسے پکارتی کمرے میں آئی مگر وہ خالی تھا۔ وہ پلٹی تو سامنے سے آتے حارث سے ٹکرائی۔

”سوری حارث بھیا۔“ چونکہ غلطی اسی کی تھی اس نے فوراً معذرت کرنی۔ اس کی خوبی تھی کہ وہ ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرنے کے بجائے فوراً اپنی غلطی مان لیتی تھی۔ حارث دنوں ہاتھ سینے پر باندھے اسے شوخی سے تنکے لگا۔ وہ فیروز کی کمرے کے پرنٹ سوٹ میں ملبوس

تو میرا نصیب ہے

نے اس کی اداس آنکھوں میں جھانکا۔ آنکھوں کی چمک ماند پڑ چکی تھی وہ لمحہ بھر کو شیشا گئی اسے تیور سے یہ توقع ہرگز نہیں تھی۔

”جی.....!“ وہ شیشا کر پیچھے ہٹی تھی۔ اسے کلاس میں کافی لڑکے پسند کرتے تھے اور اس سے دوستی کے خواہاں تھے مگر اس نے صرف حارث کو چاہا تھا اور اس سے محبت میں ناکامی کے بعد خود پر سخت خول چڑھا لیا تھا۔ تاکہ کوئی اس کے قریب نہ آئے۔ محبت خیرات میں ملنے والی چیز نہیں ہے۔ ورنہ وہ اپنا سب کچھ دان کر کے محبت پالیتی۔ اس نے محبت میں زخم کھایا تھا وہ دوبارہ کوئی دکھ نہیں جھیلنا چاہتی تھی۔

”جاشیہ پلزز..... مجھے غلط نہیں سمجھیے گا۔“ تیور نے نرمی سے اسے مخاطب کیا۔ وہ اس کی حارث سے دوستی کے متعلق جانتی تھی وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اسے شک بھری نظروں سے دیکھے۔ حارث نے بھی اسے دھوکا تو نہیں دیا تھا، محبت کسی کو مجبور کر کے نہیں کروائی جاسکتی ہے۔ اسی لیے نہ تو تیور، جاشیہ کے لیے کچھ کر سکتا تھا اور نہ ہی وہ اپنے دل میں موجود کسی کی چاہت دبا پایا۔

”تیور میں لیٹ ہو رہی ہوں۔“ جاشیہ خود کو سنبھال کر نرمی سے کہتی آگے بڑھ گئی تھی۔ وہ وہیں کھڑا اس کا نقش پانکتا رہا۔

☆☆☆

”واٹ ماما..... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“ بڑے ابو نے حارث کے لیے عینیہ کا رشتہ مانگا تھا۔ بابا نے بھائی سے سوچنے کا وقت مانگا تھا۔ وہ دراصل بیٹی کی رائے لینا چاہتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے رسما مہلت مانگی تھی۔ ماما اور بابا کو حارث بے حد پسند تھا۔ وہ گھر کا لڑکا اور دیکھا بھلا تھا۔ انہیں اس کے متعلق چھان چھنک بھی نہ کرنا پڑتی۔ اسے مشہور میڈیکل کمپنی میں آفر ہوئی تھی وہ جاب کے لیے سیریس تھا۔ وہ حسب معمول ماما کو دودھ دینے آئی کہ انہیں دوا کھانی ہوتی ہے تو ماما نے اسے بٹھالیا۔ وہ ان کی بات سن کر بے ساختہ تڑپ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے چہرے پر ناکواری پھیلی تھی۔

لانے ریشی بالوں کی سیدھی مانگ نکالے معصومیت بھری سادگی میں غضب ڈھا رہی تھی۔

”حارث۔“ وہ اس کی راہ میں حائل تھا۔ وہ جھنجھلا گئی۔

”جی جان حارث۔“ اس نے شوخی سے سرگوشی کی تو وہ تمللا کر رہ گئی۔ حارث کی نظریں ہمیشہ اس کا سامنا ہوتے ہی جگمگانے لگتیں۔ وہ اس کی آنکھوں کی بڑھتی چمک فوراً محسوس کر لیتی۔ وہ بلاشبہ کسی بھی لڑکی کا نصیب بننا تو وہ خود پر نازاں ہوتی..... لیکن اسے حارث سے چڑھتی۔ وہ لڑکیوں سے دوستی کرنے کی عادت کی بنا پر اسے اک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ وہ ہر بار اس کا سامنا ہونے پر غصہ کرتی۔ وہ اس کی کزن بھی اسے لگتا جیسے وہ اسے بھی دوسری لڑکیوں کی طرح ٹریٹ کرتا ہے بلکہ اسے تو زہیہ اور اس کی بے تکلفی بھی ایک آنکھ نہ بھاتی۔

”بد تمیز کہیں کے۔“ وہ غصے سے اس کی بات پر بڑبڑاتی اس کے پیر پر زور سے پیر مار کر چلی گئی۔ وہ تکلیف سے پاؤں پکڑ کر بلبلاتا اچھل کود کرنے لگا۔

☆☆☆

”جاشیہ..... مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔“ تیور کے بلانے پر وہ چونکی تھی۔ حارث کے انکار کے بعد وہ کافی بدل گئی تھی۔ وہ نہ تو کلاس کی کسی ایکٹیویٹی میں حصہ لیتی اور نہ ہی کسی کلاس فیلو سے بات کرتی۔ وہ جیسے خود سے بھی روٹھ گئی تھی اس نے اپنی دنیا خود تک محدود کر لی تھی۔ وہ سارا وقت چپ چاپ اپنے کام سے کام رکھتی اور حارث کا سامنا کرنے سے حتی الوسع اجتناب کرتی۔ وہ لاسٹ پریڈ اینڈنگ کے کلاس روم سے نکل کر پارکنگ کی طرف بڑھ رہی تھی کہ اسے تیور نے بیچ راہ میں روک لیا تھا۔

”جی کیسیہ.....“ وہ ٹھہر کر نرمی سے تیور سے مخاطب ہوئی۔ اس کی جھیل سی آنکھوں میں بے نام اداسی ٹھہری تھی۔ تیور کا دل دکھ سے بھر گیا۔

”جاشیہ..... اچھو نیکی مجھے تم اچھی لگتی ہو۔“ تیور

”بیٹا کیا تمہیں کوئی اور پسند ہے؟“ بابا دونوں بیٹیوں کے اچھے دوست تھے انہوں نے دوستانہ انداز میں عینہ سے استفسار کیا۔ انہیں عینہ کے ناگوار انداز سے دکھ ہوا تھا، وہ تو خود کو ایک بیٹی کے فرض سے سبکدوش تصور کر کے ہلکا چھلکا محسوس کر رہے تھے۔

”نو بابا..... مگر حارث نہیں۔“ وہ بے اختیار رو دی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

”بیٹا تمہاری ناپسندیدگی کی کیا وجہ ہے؟“ ماما بھی پریشان ہو گئی تھیں۔ انہوں نے نری سے وجہ پوچھی۔ ان کے گمان میں بھی نہ تھا کہ عینہ، حارث کو ناپسند کرتی ہوگی۔ وہ اس کا سامنا ہونے پر اکثر نارمل رہتی تھی۔ ان کے لہجے میں تاسف تھا۔

”ماما پلیز حارث نہیں..... کہیں اور کر دیں کسی سے بھی مگر وہ نہیں۔“ وہ بلبلی ہوئی ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں اظہارِ نفرت کرتی انکار میں سر ہلاتی ان کی متاثری آغوش میں سما گئی۔ اس نے بھی حارث کے کسی سیریس رومانس یا فلرٹ کا نہ سنا تھا مگر اسے اس کی لڑکیوں سے دوستی بھی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ وہ سمجھ نہ سکی کہ وہ ماما کو کیا بتائے۔ اس نے گول مول لفظوں میں واضح انکار کیا تھا۔

”ٹھیک ہے تم جاؤ، ہم کچھ سوچتے ہیں۔“ ماحول پر بھاری پن طاری ہو گیا تھا۔ ماما اور بابا کے چہروں پر ٹھکر کی لکیریں پھیل گئیں۔ ممانے اس کا کندھا تھپتھپا کر حوصلہ دیتے ہوئے جانے کی تاکید کی تھی وہ آنسو پونچھتی اٹھ گئی۔

☆☆☆

رات دھیرے، دھیرے سرک رہی تھی، وہ کھلے آسمان تلے تخت پر نیم دراز تھا۔ عینہ نے صاف انکار کر دیا۔ وہ اس کی نفرت کو ہمیشہ غصہ سمجھتا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس سے اتنی نفرت کرتی ہے کہ وہ اس کا نام سنتے ہی صاف انکار کر دے گی۔ اس نے عینہ سے شدید محبت کی تھی۔ اس سے جدائی کا تصور سوہانِ روح تھا۔

بے شک وہ لڑکیوں سے جلد فری ہو جاتا تھا مگر

اس نے کبھی کسی لڑکی کو دھوکا نہیں دیا تھا۔ اس نے عینہ سے بھی فری ہونے کی کوشش کی مگر وہ ہر بار اس کی کوشش ناکام بنا دیتی۔ بابا کو عینہ بچپن سے اس کے لیے پسند تھی۔ وہ بچوں کی بچپن کی ممکنگی کے سخت خلاف تھے اسی لیے انہوں نے بیٹی کا رشتہ نہ مانگا۔ حارث کو جوں ہی جاب کی آفر ہوئی انہوں نے فوراً بھائی کے سامنے ہاتھ پھیلا دیا تھا۔

چچا اور چچی بھی خوش تھے انہیں حارث پسند تھا۔ وہ جب بھی نیچے جاتا چچی اس کی خوب آؤ بھگت کرتیں۔ وہ اکثر عینہ اور زینہ سے نوک جھوک کرتا اور چچی ہر بار اس کی سائڈ لیتی تھیں۔ وہ دونوں اپنی ماں سے خفا ہو کر منہ پھلاتیں مگر چچی اس کے لاڈ اٹھاتے نہ ٹھکسیں۔

”عینی..... مت کرو ایسا.....“ اس کا دردِ دل بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ وہ سوچوں کے جال میں پھنسا نڈھال سا ہو گیا۔

”مجھ میں کیا کمی ہے حارث.....“ دفعتاً اس کی یادداشت کے پردے پر اک آواز ابھری اس نے تڑپ کر آنکھیں میچ لیں۔ وہ دھک رہ گیا۔ کہیں اسے جاشیہ کی بددعا تو نہیں لگی۔ وہ جھٹکے سے اٹھ بیٹھا اور آنکھیں کھولے سامنے نیم تاریکی میں گھورنے لگا۔ اس نے کبھی کسی لڑکی کو دکھ دیا تھا اور نہ ہی کسی کو دھوکا..... پھر اس کے ساتھ ایسا کیوں ہوا تھا۔ کہیں اس نے انجانے میں تو جاشیہ کا دل نہیں دکھا دیا۔ وہ سوچ، سوچ کر پریشان ہوتا رہا۔

☆☆☆

ماہِ رمضان کا آغاز ہو چکا تھا۔ گھر میں بوجھل خاموشی چھائی رہتی تھی۔ ماما اور بابا اگرچہ اس سے خفا نہ تھے مگر وہ اس سے ضرورتاً بات کرتے تھے۔ اس نے والدین کے قدرے بدلے روئے کو اپنا وہم سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔ زینہ بھی اکثر منہ پھلائے رہتی۔

نمازِ ظہر اور تلاوتِ قرآن پاک کے بعد ماما کے سنانے کا وقت ہوتا تھا۔ وہ نمازِ عصر کے وقت اٹھتیں۔ اس دوران بابا آفس سے آ جاتے۔ زینہ اور عینہ کے

وقت وقت کی بات

ایک والدہ نو جوان سے ایک بھکاری نے کہا۔

”صاحب! کیا بات ہے؟ دو سال پہلے آپ مجھے دس روپے دیا کرتے تھے۔ پچھلے سال پانچ روپے دینے لگے اور آج صرف ایک روپیہ!“

نو جوان بولا۔ ”بھئی پانچ سال پہلے میں کنوارا تھا، پچھلے سال میری شادی ہوئی اور اب میں ایک بچے کا باپ ہوں۔“

از: ناہید اختر نداء

دلچسپ خیالات

☆ نیکی کر کے ایسے بھول جاؤ جیسے مرد شادی کر کے مسکراتا بھول جاتے ہیں۔

☆ خوش فہمیوں کی عینک جب اترتی ہے تو ہر چیز صاف دکھائی دیتی ہے۔ حتیٰ کہ اپنی اوقات بھی۔ کامیاب وہی ہے جو اس عینک کو وقت سے پہلے اتار دے۔

مرسلہ: مہرین ضیائیکش، کراچی

اصل وجہ

استاد (شاگرد سے)۔ ”بجلی کہاں سے آتی ہے؟“

شاگرد۔ ”میرے ماموں کے گھر سے۔“

استاد نے حیرانی سے پوچھا۔ ”وہ کیسے.....؟“

”شاگرد۔“ کیونکہ جب بھی بجلی جاتی ہے تو میرے ابو کہتے ہیں سالوں نے پھر بجلی بند کر دی۔“

مرسلہ: زرینہ خان، بہارہ کپو

ذستے افطاری تیار کرنا تھا۔ وہ دونوں کالج سے آکر فریش ہو کر افطاری کے کچھ لوازمات تیار کر کے فریج میں رکھ دیتیں۔ اور تلنے والی چیزیں افطاری سے تھوڑی دیر پہلے تلتیں۔ ان کے ہاں افطاری کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔ عینہ اب وہی پہلے تیار کر رہی تھی۔ زینی اس سے ذرا کھینچی، کھینچی رہتی تھی۔ اس نے اپنی ناراضی چھپانے کی چنداں ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ عینہ نے وہی منگوانے کے بہانے اسے مخاطب کیا تھا۔ زینی نے خاموشی سے وہی اس کے سامنے لارکھا۔

”زینی ذرا ٹماٹر دینا۔“ وہ پکڑے کے لیے بین گھول رہی تھی۔ اس نے قصداً اسے زچ کرنے کے لیے کہا۔ اس سے زینی کی یہ ناراضی ہمضم نہیں ہو رہی تھی۔ وہ اسے منانا چاہتی تھی مگر وہ کیا کہہ کر اسے مناتی۔ ان دونوں میں ڈائریکٹ کوئی جھگڑایا ناراضی تو نہیں تھی۔ ماما اور بابا سنبھل کر نارمل ہو چکے تھے۔ انہوں نے بیٹی کے فیصلے کو دل سے قبول کر لیا تھا۔ زینی نے سابقہ خاموشی سے اسے ٹماٹر لارک دے دیے۔

”زینی تم مجھ سے خفا ہو؟“ وہ ڈائریکٹ مدعا پر اتر آئی تھی۔ زینی کا رویہ بدلا تھا اگر وہ اس سے خفا نہ ہوتی تو اسے ترنت (خورا) انکار کر دیتی۔ عینی نے اس کے کندھے تھام لیے۔

”نہیں.....“ زینی مختصر جواب دے کر بین گھولتی رہی۔ اس نے بین گھول کر فریج میں اور رکھا اور رکھائی سے منہ پھلائے ہوئے چلی گئی۔ عینہ اور اس کی کافی دوستی تھی۔ اس نے کبھی آپنی یا باجی کہنے کا تکلف نہ پالا تھا۔ وہ بے تکلفی سے اس کا نام لیتی عینہ نے بھی کبھی اسے نہ ٹوکا تھا۔ اس کا اتنا حق تو بنتا تھا کہ وہ بہن پر اپنی خفگی باور کراتی۔ اس نے انجانے میں ایک بہترین ہم سفر کھو دیا تھا۔ حادثہ اسے بے حد چاہتا تھا وہ یقیناً اسے خوش و غرم رکھتا۔ عینہ اس کی سنگت میں مثالی خوشگوار زندگی گزارتی مگر وہ کوئی ٹھوس وجہ بتائے بغیر انکار کر چکی تھی۔ ماما اور بابا نے دل پر جبر کیے بیٹی کی خوشی کے لیے کڑوا گھونٹ پی لیا تھا۔ اس نے عینہ سے

بات لرتا چاہی تو ممانے اسے روک دیا۔ وہ اس پر کوئی
ذہنی دباؤ نہیں ڈالنا چاہتی تھیں۔ آخر زندگی اسی کو گزارنا
تھی۔ عینہ کی آنکھوں میں دکھ سے نمی تیرنے لگی تھی۔
زیبہ نے کن آنکھوں سے اس کی نم آنکھوں کو دیکھا۔
اس کا دل لمحہ بھر کو پگھلا۔ اگلے پل سے عینہ کی فضول
ہٹ دھری یاد آئی تو وہ آگے بڑھ گئی۔ عینہ لب کلاتی
اگلیاں مروڑتی نمی اپنے اندر اتارنے لگی تھی۔

☆☆☆

حارث کی پسندیدگی گھر میں کسی سے چھپی نہیں تھی
صديق صاحب بیٹے کی تعلیم مکمل ہونے کا انتظار
لرہے تھے۔ دونوں بھائیوں کی کلاتھ مارکیٹ میں
پڑوں کی دکانیں تھیں۔ چھوٹے بھائی رفیق نے
کاروبار شپ ہونے پر مقامی فرم میں جاب ڈھونڈ لی
تھی۔ صديق صاحب کا کاروبار خوب چل رہا تھا۔ سعد
باپ کا ہاتھ بٹاتا تھا، حارث جاب کرنا چاہتا تھا۔ اسے
جو بھی جاب آفر ہوئی اس نے فوراً کنٹریکٹ سائن
کر لیا۔ وہ ایگزامز کے بعد رزلٹ کا انتظار کر رہا تھا۔
سب کو ہی عینہ پسند تھی۔ انہوں نے رشتہ مانگا تو بھائی
نے رسماً سوچنے کے لیے مہلت مانگی اور چند روز بعد
انکار کر دیا۔ انہیں عینہ کے انکار کا سن کر صدمہ ہوا تھا۔
مگر رفیق کی بات میں بھی وزن تھا۔ عینہ کو اپنی زندگی
جینے کا حق حاصل تھا۔ انہوں نے بیٹی کی خوشی کے لیے
مصلحتاً ہامی بھری تھی، وہ اس پر جبر نہیں کرنا چاہتے تھے۔

☆☆☆

وہ یونیورسٹی سے آکر نماز ظہر کے بعد سوئی تو ڈور
بیل پر آنکھ کھلی۔ بیل کافی دیر سے ہو رہی تھی۔ وہ
کسلندی سے بستر پر پڑی رہی۔ ماما بھی سو رہی تھیں۔
بابا بھی کسی کام سے گئے ہوئے تھے۔ گرمی زوروں پر
تھی اور اسے روزہ بھی ستا رہا تھا۔ اس کا اٹھنے کا قطعاً
موڈ نہیں تھا۔ آنے والا بھی اپنے نام کا کوئی ڈھیٹ تھا۔
اس نے بیل پر انگلی رکھی تو ہٹانے کا نام نہیں لیا۔ ناچار
ماما کی نیند کا سوچ کر اسے اٹھنا ہی پڑا۔ اس نے سستی
سے دوپٹا اوڑھ کر ڈھیلے قدموں سے آگریٹ کھول دیا

اور سامنے نگاہ پڑتے ہی وہ بھونچکا رہ گئی۔
”آپ؟“ مارے حیرت کے اس کی رہی سہی
نیند بھی اڑ چھو ہو گئی تھی۔ اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔
”آپ اندر آنے کو نہیں کہیں گی۔“ تیمور کے
چہرے پر شوخ سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہ اسے دلچسپی
سے تنک رہا تھا۔

”آ میں.....“ وہ خفیف ہو کر پیچھے ہٹی۔ اس
کے ہمراہ ایک گرلیس فل دراز قد خاتون بھی تھیں۔ وہ
یونیورسٹی میں کافی خاموش اور لیے دیے رہتی تھی۔

اب وہ وقت گزرنے کے ساتھ، ساتھ تارل ہوتی
گئی۔ تیمور کو اسی وقت کا انتظار تھا۔ وہ محبت کے دکھ سے
سنبھل چکی تھی۔ اسے کسی مخلص چاہنے والے، ہم سفر کی
اشد ضرورت تھی جو اس کے بکھرے وجود کو اپنی محبت سے
سنوار دیتا۔ تیمور اپنی ماں کو لے کر ان کے ہاں آ گیا
تھا۔ اس نے جاشیہ سے اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی
تھی۔ وہ سیدھے سبھاؤ اس کا ہاتھ مانگنا چاہتا تھا۔

”بیٹا اور آپ کے کیا مشاغل ہیں؟“ سلمیٰ بیگم کو
بیٹے کی پسند پہلی نظر میں ہی بھاگتی تھی۔ جاشیہ اس اثنا
میں ماما کو جگا کر لے آئی تھی۔ چونکہ ان لوگوں کا روزہ تھا
وہ کھانے پینے کے تکلف میں نہ پڑی تھی۔ سلمیٰ نے
جاشیہ کو محبت سے دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

”آئی مجھے کوئی کنگ کرنا پسند ہے۔“ جاشیہ نے
شرکیں مسکراہٹ سے نظریں جھکائے جواب دیا۔ اس
کے دل میں تیمور کے لیے نرم گوشہ ابھرا تھا۔ اس نے
کسی فلرٹ یا دوستی کے بجائے عزت سے اس کا ساتھ
چاہا تھا۔ تیمور نے اسے معجز کر دیا تھا۔ جاشیہ کو کوئی کنگ
کرنا بھاتا تھا وہ ہر ویک اینڈ پر کوئی نہ کوئی نئی ڈش ٹرائی
کرتی رہتی تھی اور اس کی مٹائی ہر ڈش بابا بے حد شوق و
رغبت سے کھاتے تھے۔

”واؤ.....“ تیمور اکثر گھر میں اپنی بہنوں اور
بھائیوں سے کہتا کہ وہ امور خانہ داری خصوصاً کوئی کنگ
میں دلچسپی رکھنے والی سے شادی کرے گا۔ وہ چھ بہن،
بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا اور لاڈلا ہونے کی وجہ

گئی۔ بات کچھ خاص نہیں تھی مگر دل کو بہت لگی تھی۔ ہوا کچھ یوں کہ تاپا ابو کے دیرینہ دوست نے حارث اور اپنی بیٹی کے رشتے کی بات چلائی تھی۔ رشتہ معقول تھا سوتا یا ابو اور تانی کا جھکاؤ بھی اسی سمت تھا۔ گھر میں سب حارث کی ممکنہ اور رشتے کی باتیں کر رہے تھے گھر والوں کی باتیں کسی نشتر کے مانند دل میں گڑی جا رہی تھیں۔

وہ کمرے میں اندھیرا کیے بستر پر لیٹی سوچوں میں گم تھی۔ اس نے کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ زیبہ اسے بلانے آئی تھی اس نے بھوک نہ ہونے کا بہانہ بنا دیا تھا۔ وہ لاشعوری طور پر نہ جانے کب حادثہ کو جاننے لگی تھی اسے خود بھی خبر نہیں ہوئی تھی۔ وہ اس کی لڑکیوں سے دوستی سے چٹنی تھی وہ اسے ناپسند کرتی تھی۔ محبت نے انجانے میں اس پر شب خون مارا تھا۔

”مجھے اس سے نفرت ہے۔“ دل و دماغ سچائی واضح کر رہے تھے اور وہ سرنفی میں ہلاتی ہوئی جھٹلا رہی تھی۔ حارث کا بہانے، بہانے سے آتا۔ اسے مخاطب کرنا، اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے بے تاب ہونا اسے سب کچھ یاد آ رہا تھا۔ حارث کا التفات اور پھر اس کے انکار کے بعد اس کا لیا دیا انداز..... اسے نہ جانے کیوں بہت کچھ یاد آ رہا تھا۔

”یعنی، یعنی بھابی بہت پیاری ہیں، وہ تو رومہ بہت اچھا پکاتی ہیں، ان پر بلیک کمر بے حد چٹا ہے اور.....“ زینی بھی لڑکی دیکھنے لگی تھی وہ جب سے لونی تھی اسی کی تعریف میں رطب اللسان تھی۔

”تو میں کیا کروں.....؟“ وہ خود پر ہونٹے نئے ادراک سے ہراساں تھی اس پر طرہ یہ کہ زیبہ مسلسل اس منحوس لڑکی کی تعریفیں کیے جا رہی تھی۔ لفظ بھابی تو سیدھا حیرت بن کر اس کے دل میں جا گڑا تھا۔ ضبط گریہ سے آنکھوں میں سرنفی پھیلی تھی وہ ضبط کی طنائیں دامن سے کھو بیٹھی اور غصے سے اس پر الٹ پڑی۔ یعنی کی تعریفوں میں مصروف زیبہ نے چونک کر بہن کو دیکھا۔

اس کے حسین مکھڑے پر بارہ بچ رہے تھے۔ احساس زیاں اس کے وجود سے لپٹا تھا، قیمتی متاع لٹ جانے کا

سے وہ سب کی چھیڑ چھاڑ کا بھی نشانہ بننا رہتا تھا۔ تیمور کے ہونٹ اس حسین اتفاق پر سیٹی کے مانند گولا کی میں پھیل گئے تھے۔ سلمیٰ بھی اس اتفاق سے کافی محفوظ ہوئی تھیں۔

کچھ دیر بعد وہ لوگ چلے گئے۔ سلمیٰ بیگم جاتے سے اپنا خاندانی تعارف اور آمد کا مقصد بتائیں مگر کاغذ بہن گہری سوچ میں ڈوبتا چلا گیا۔

رات میں جاشیہ کی کمانے شوہر کو سلمیٰ بیگم اور تیمور کی آمد کا بتایا۔ کونسلر کا حوالہ سن کر بابا کافی مطمئن تھے۔ خرم علی عوامی فلاح و بہبود کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے اور وہ عوام میں خاصے مقبول بھی تھے۔ ماما اور بابا نے باہمی رضامندی سے ہامی بھرتے ہوئے بیٹی کی رائے لینا بھی ضروری سمجھا تھا۔ ماما کو بھی تیمور پسند آیا تھا..... بیٹیوں والے مناسب رشتوں کے متمنی ہوتے ہیں۔ جاشیہ ان کی اکلوتی اولاد تھی۔ انہوں نے اس کی ہر خواہش پوری کی تھی۔ وہ اس کی مکمل رضامندی سے حتمی فیصلہ کرنا چاہتی تھیں۔

”بیٹا مجھے تیمور بے حد بھایا ہے، تمہیں وہ کیا لگتا ہے؟“ ممانے لگی لپٹی رکھے بغیر اس کی رضا پوچھی تھی۔ ”ماما جو آپ کی پسند ہو مجھے قبول ہے۔“ جاشیہ نے اپنا مکمل احتساب کیا تھا۔ وہ محبت کی کٹھنیاں سبہ کرزم پڑ چکی تھی۔ اس کے دل کی سرزمین غیر آباد تھی۔ دل کا مین مدت ہوئی دل سے نکل چکا تھا۔ اس نے پوری دیانت داری سے دل میں جھانک کر تیمور کے حق میں فیصلہ کیا تھا۔ وہ بہتر و مخلص، ہم سفر ثابت ہوتا۔

”اللہ تمہارے نصیب بہترین کرے بیٹا۔“ وہ مطمئن و شاد اس اے دعا میں دیتی اٹھ گئیں۔ جاشیہ نے کمرے کی کھڑکی کھول دی، دل کی ٹھن زردہ وادی میں نرم ہوا کا جھونکا دھیرے، دھیرے اترنے لگا تھا۔ اس عید زندگی کے خوشیوں سے بھرپور ہونا تھی۔ اس کے لبوں پر نرم مسکان پھیل گئی۔

☆☆☆

”خبر تھی کہ دھماکا.....“ اس نے سنا تو ساکت رہ

اے چہرے پر لبیل کے مانند چسپاں تھا۔
 ”یعنی“ وہ شکر سی بات ادھوری چھوڑ کر بہن کا
 کندھا استفہامیہ انداز میں ہلانے لگی تھی۔

”زینبی، میرے سر میں درد ہے پلیز یہاں سے
 چلی جاؤ۔“ بہن کی تشویش و فکر بھری محبت پر نادم
 ہو کر رہ گئی۔ زینبی نے تو حارث سے شادی سے انکار پر
 اس سے دنوں بول چال بند رکھی تھی پھر وہ بھی ماما اور بابا
 کی طرح نارمل ہوتی چلی گئی تھی۔ حارث اس کے جوگ
 میں ساری عمر کنوارا تو نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ کس بات پر
 اتنی ہاتھ ہو رہی تھی۔ وہ عداوت سے چور دھیمے لہجے
 میں کہتی رخ موڑ گئی۔

کہیں کوئی گڑبضرورتی زینبیہ کو زیادہ دیر نہ لگی تھی
 وہ بہن کا ہم رو تہ کھوج چکی تھی۔ اس کے لبوں پر شوخ و
 معنی خیز مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔ اب آیا ناں اونٹ پہاڑ
 کے نیچے۔“ اس کے چہرے پر لمحہ بہ لمحہ معنی خیز مسکراہٹ
 گہری ہوتی گئی جبکہ عینہ اس سے اپنے آنسو چھپانے
 کی سعی میں ٹنڈا ہال ہوتی جا رہی تھی۔

”عینہ، تایا ابوا اور تائی امی حارث بھیا کی شادی
 اسی عید پر کرنا چاہتے ہیں۔“ لوہا خوب گرم تھا، زینبیہ
 نے کاری ضرب لگائی۔ وہ مجھے دل سے کالج آنے،
 جانے اور گھر کے کاموں میں لگی رہتی۔ بے کیف سی
 اداسی اسے ہمہ وقت گھیرے رکھتی۔ احساسِ زیاں
 اسے کسی پل چین نہ لینے دیتا تھا۔ اس نے انجانے میں
 اپنے پیروں پر خود کھپاڑی ماری تھی۔ وہ کسی کو کیا دوش
 دیتی۔ اس نے تو کسی کی خوشیوں کی پروا نہیں کی تھی۔
 شاید اسی لیے اسے قدرت نے یہ سزا دی تھی۔ آنسو ہمہ
 وقت اس کی حسین پلکوں پر نکلے رہتے اور بات بے
 بات آنکھوں کے گوشوں سے نکلنے کو بے تاب رہتے۔
 رمضان المبارک کے آخری عشرہ کا آغاز ہو چکا تھا۔
 اس کی عبادت و وظائف میں شدت آگئی تھی۔
 اس کی یہ تبدیلی زینبیہ سے مخفی نہ رہ سکی۔ اس نے اپنا
 شک و ہم جانچنے کو عینہ کو دانستہ ستانے کی ٹھانی۔
 ”اچھا.....“ اس کے لبوں سے سرسراہٹ نکلی

تھی۔ وہ عید کے لیے سلا جوڑاتہ کر کے رکھ رہی تھی اس
 کے دوپٹا نہ کرتے ہاتھ ساکت رہ گئے۔ وہ خود کو سمجھا،
 سمجھا کر تھک گئی تھی۔ دلِ ناداں اسی کے نام کی مالا جپتا
 رہتا تھا۔ درد کی شدید ٹیسس وجود میں آئیں اور سارے
 بدن کو تڑپا گئیں۔

”بے وقوف وہ تمہاری خاطر جوگ تو لینے سے
 رہا۔“ دماغ نے دل کی نادانی پر اسے بری طرح گھرکا
 تھا۔ سارا قصور اور فساد اسی دل کا تو ڈالا ہوا تھا۔ دل نہ
 اس کی محبت میں تڑپتا اور نہ وہ بے قرار ہو کر اسی کو ہمہ
 وقت سوچتی۔

”وہ مجھ سے محبت کرتا تھا۔“ دل کو بہت کچھ یاد آیا
 تھا۔ دل تو اس کی محبت کا عادی تھا۔ وہ اسے کسی اور کا
 ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ دل نے دماغ کی گھرک پر بچوں
 کی طرح منہ بسورتے ہوئے اپنے حق میں دلیل دی۔
 ”کیسی محبت؟ جسے تم نے دھکا دیا تھا۔“ دماغ کو
 غصہ آنے لگا۔ جو حارث اس کی ایک جھلک دیکھنے کے
 بہانے ڈھونڈتا تھا اور وہ اسے دیکھتے ہی چڑ جاتی تھی۔

”محبت اتنی ارزاں نہیں ہوتی ہے کہ یوں اتنی
 جلد خفا ہو جائے۔ محبت اپنا وجود منوا کر رہتی ہے۔“ دل
 کسی کی کہاں سنتا ہے وہ دماغ کے غصے کو خاطر میں
 لائے بنا کہنے سے باز نہیں آیا۔ ”محبت تو انسان کو کندن
 بناتی ہے۔ محبت جیسا اصول جذبہ انسان کے وجود سے
 آسانی سے ختم نہیں ہوتا ہے۔“

”وہ تمہارے لیے فراق میں مبتوں بننے سے
 رہا..... وہ ایک پریکٹیکل انسان ہے، مس عینہ رفیق۔“
 دماغ نے حقیقت کا تلخ آئینہ اسے دکھایا۔ تلخ حقیقت کا
 عکس دل پر پڑا تو دل کا درد بڑھنے لگا تھا۔ ٹیسس دل پر
 چٹکیاں لینے لگیں تو اذیت قطرہ، قطرہ روح تک کو گھائل
 کرنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں دھیرے، دھیرے نمی
 اترنے لگی۔

”واؤ..... عینہ تمہارا سوٹ بہت پیارا ہے۔“
 اس کی لمحہ بہ لمحہ متغیر ہوتی رنگت اور زلزلوں کی زد پر آیا
 وجود زینبیہ کو صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ اس کا پائلٹ پہ مخیر مگر

مسروقتی۔

اس کی دلی خواہش تھی کہ عینی کی شادی حارث بھیا سے ہو۔ لڑکی کو بیاہ کے بعد عزت دینے والے قدردان لوگ ملیں تو لڑکی کی قسمت چمک اٹھتی ہے۔ وہ تاپا اباؤ کے گھر خوش و خرم رہتی۔ وہ اس کی آنکھوں میں جھللاتی نمی بھی دیکھ چکی تھی۔ زینبہ سوٹ کی تعریف کرتی مسرور سی پلٹ گئی تھی۔ شک یا وہم یقین کی صورت ڈھل چکا تھا۔ عینہ سر ہلاتی دوپٹا نہ کر کے پلٹی تو کرا خالی تھا۔ خود میں تم عینہ کو اس کے جانے کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ اس نے آنکھوں کے نموشے جھلساتے آنسو ضبط کرنے کی کوشش ترک کر دی۔ آنسو تو اترے گا لوں پر جھسلنے لگے تھے۔

☆☆☆

گھر میں حادث کی مگنی کی تیاریاں زور شور سے جاری تھیں۔ سب تیاریوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ ماما اور زینہ کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ حادث کی مگنی عید کے روز طے تھی۔ زینہ نہایت جوش سے اسے روزانہ ہر رپورٹ سناتی۔ یمنی کیسی ہے۔ اس کی پسند تا پسند..... اور ہر شے اسی کی پسند سے خریدی جا رہی تھی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی زینہ کی باتیں سننے پر مجبور تھی۔

عید کا چاند نظر آ گیا تھا۔ سب تایا ابو کے پورشن میں جمع تھے۔ باتوں کی آوازیں نیچے اسے بخوبی سنائی دے رہی تھیں۔ وہ درپردہ سے بے حال صحن میں لگے پودوں کے قریب رکھی چیز پر بیٹھی تھی۔ اچانک حادثہ کی نگاہ اس پر پڑی۔ اس کے چہرے پر درج دکھ کی تحریر نے اسے ٹھایا۔

”زینبی کی چچی..... اسے بچ بتا دو یار۔“ وہ عینیہ کی خاطر اپنی دوست سے الجھ پڑا۔ یہ آئیڈیا بھی اسی کا تھا۔ اس نے سب سے پہلے عینیہ کی بدلی کیفیت نوٹ کر کے حارث کو بتایا تھا۔ دراصل مہروالے لڑکی دیکھنے گئے ہوئے تھے مگر یہی عمر میں حارث سے بڑی لنگی تھی۔ تاہی امی کی چھوٹی بہن اپنے بیٹے کے لیے کئی لڑکیاں کھ رہی تھیں۔ یہی دلکش نقوش کی حامل خوب صورت

پیرچا
نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچانہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر چادستیاب نہ ہو۔

☆ شہر اور علاقے کا نام -

☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL مامو مائل نمبر -

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

0301-2454188 **ثمر عباس**

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت

63-C فیۃ اللہ! میں نے اپنے باپ کو سنگ اتھار لی میں کوئی روک ٹوک تھی

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

۱۱۔ لے لوٹ کیا تو پختہ یقین ہونے کے بعد اس نے سب لو اپنے پلان میں شامل کر لیا۔ وہ بہن کو ذرا تنگ کرنا چاہ رہی تھی۔ حارث نے اختلاف کیا تو بھابی اور ہانیہ نے اسے فوراً بیاہ سے پہلے زن مریدی کا طعنہ دے مارا۔ وہ بلبلا کر نہ چاہتے ہوئے بھی مان گیا۔ اس سے عینیہ کا یاسیت بھرا چہرہ سہانہ جارہا تھا۔ اس کی محبت بھری نظریں عینیہ کے پرسوز حسین کھڑے پر جمی تھیں۔ ”بھیا..... اس نے بھی آپ کو ستایا تھا ناں.....“

زہیر نے ہنس کر اسے گویا رضامندی دے دی۔ وہ واقعی بہت سزا کاٹ چکی تھی، اسے بھی اپنی بہن پر ٹوٹ کر پیار آ رہا تھا۔ اس نے مسکرا کر کندھے اچکا تے ہوئے ہانیہ کو دیکھتے ہوئے اسے نیچے جانے کا اشارہ کیا۔

”عید مبارک عینی۔“ اجازت ملنے کی دیر تھی وہ بوتل کے جن کی طرح اس کے سر پر موجود تھا۔ عینی چونک کر اسے دیکھتے ہوئے سیدھی ہوئی۔

”خیر مبارک.....“ عینی نے آنکھوں میں بس بے ساختہ اندلی نمی اندر دھکیل کر چہرے پر جبری مسکراہٹ طاری کی۔ وہ دشمن جاں کل کسی اور کا ہونے والا تھا۔ حقیقت تلخ تھی مگر سہنا مجبوری تھی۔

”تم نے مجھے منگنی کی مبارک باد نہیں دی۔“ وہ اسے حقیقت بتانے آیا تھا۔ مگر اب دل اسے ذرا ستانے پر مائل ہونے لگا۔ وہ اس کے انکار پر کتنا تڑپا تھا۔ بابا اور چچا تو اس رشتے کے زبردست حامی تھے۔ انہیں عینیہ کی پسند کا علم ہوا تو وہ بھی بچوں کے پلان میں شریک ہو گئے۔ حالانکہ تایا ابو نے مخالفت کی تھی مگر وہ بھابی کے کہنے پر مجبور آمان گئے تھے۔ حارث نے اس کے حسین کھڑے پر آئی بالوں کی لٹ کو دچھپی سے دیکھتے ہوئے مصنوعی گلہ کیا۔

”سوری حارث.....“ وہ آسانی سے اپنی غلطی مان کر تادم ہو گئی۔ حارث کو اس پر ٹوٹ کر پیار آیا۔

”عینیہ، میں تمہارے لیے گفت لایا تھا۔“

حارث اس کے لیے تازہ پھولوں کے گجرے لایا تھا۔ اس نے عینیہ کی سمت گجرے بڑھائے۔

”تم یہ بیٹنی کو دے دینا۔“ دل کی دنیا میں کہرام مچ گیا تھلہ کوئی اور موقع ہوتا تو دل اسی کے ہاتھوں پہننے کی خواہش کرتا۔ اس نے نرمی سے لینے سے انکار کر دیا۔

”اسے تو جمیل دے گا۔“ اس کی نظروں میں دنیا بھر کی شوخی اور چہرے پر خوب صورت مسکراہٹ تھی۔

”جمیل اور بیٹنی؟“ عینیہ کے ذہن میں زور دار جھماکا ہوا۔ وہ کرنٹ کھا کر اچھلی اور حارث کو بغور دیکھنے لگی۔ وہ مذاق کے موڈ میں بالکل نہیں لگ رہا تھا۔ چہرے پر ہلاک بنجیدگی تھی۔

”حارث.....!“ اس کی لبوں سے ابھرا۔

”جی جان حارث۔“ حارث کی شوخی قابل دید تھی۔ عینیہ بے یقینی سے اسے پھٹی، پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگی۔

”مجھ سے شادی کرو گی؟“ حارث نے محبت سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ بے یقینی سے یقین کا سفر طے کر کے آئی تو آنکھیں خوشی و مسرت کے آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

”تم.....!“ وہ اسے مصنوعی غصے سے کئے مارنے لگی۔

”ارے، ارے، ارے! اس بچارے کا کوئی قصور نہیں ہے۔“ اوپر سے لڑکیوں کا ٹولا آ رہا تھا۔ بھابی فضا میں لہراتا مکا و نگہ کر شوخی سے چہکیں۔ وہ سارا پلان سمجھ گئی۔

دل کی دنیا میں محبت کے پھولوں کی ولفریب مہک اتر گئی۔ حارث اس کا ہاتھ صرف اور صرف اس کا۔

”آئی لو یو حارث۔“ وہ دھڑکتے دل سے دھیما اقرار کر گئی۔ اقرار محبت، روح کو تازگی بخشتا ہے۔

حارث کی روح تک سرشار ہو گئی۔ عینیہ کسی ٹرائل میں محو اسے نکلے جا رہی تھی۔

”اوہ، اوہ.....“ سب نے شوخی سے زور دار ہنکارا ابھرا تو وہ شرما کر تیزی سے کمرے کی طرف بھاگ گئی۔ حارث کا جاندار قہقہہ اس کے ہمراہ تھا۔

روشن چاند کی مسکراہٹ چاندنی بھی مہک اٹھی اور فضا میں محبت کی گنگناہٹ پھیل گئی۔



پنھنی خواہش

سرح طاہر

”امی وہ دوسری گلی میں جو عالم اٹکل رہتے ہیں
 ناں..... اس بار وہ بہت موٹی تازی گائے لے کر آئے
 ہیں..... پچھلی بار بھی انہوں نے ہمیں گوشت بھیجا تھا
 ناں..... اس بار بھی وہ گوشت بھیجیں گے تو آپ اس
 گوشت کی نہاری بنانا..... بالکل ویسی نہاری جیسی گلی
 کے کنڈ والے رفیق چاچا بیچتے ہیں.....“ بہت پرجوش
 لہجے میں اس نے وقت سے پہلے اپنی فرمائش نوٹ
 کروادی تھی جسے سن کر طلحہ فوراً بولا۔



”اوتھ تم نہاری کی بھوکی ہو..... ہر وقت نہار نے دماغ پر نہاری کا بھوت چڑھا رہتا ہے۔ حالانکہ ابا کبھی، کبھی ناشتے یا رات کے کھانے میں نہاری لے آتے ہیں..... ورنہ ریش چاچا کی نہاری شوربا اگر بیچ جاتا ہے تو وہ خود ہی ہمارے گھر دے جاتے ہیں..... پھر بھی تمہارا نہاری سے پیٹ نہیں بھرتا.....“ طلحہ نے ناک چڑھا کر اس کا مذاق اڑایا تھا۔

عید قربان کے مفہوم سے اچھی طرح واقف وہ بھی تھے بلکہ دل سے اس فریضے کی ادائیگی کرنا چاہتے تھے۔ مگر قربانی انہیں جانور کی نہیں بلکہ اپنی خواہشات کی دینی پڑ جاتی تھی۔

مگر بچے تو بچے ہی ہوتے ہیں ہر آنے والی عید دلوں میں جوت جگاتی کہ اس بار شاید ہم بھی بکرا قربان کر پائیں۔

”تم چھوڑو نہاری کو..... اس بار ہم باری کی کو لطف لیں گے.....“ طلحہ نے آنکھیں بند کر کے چٹکارا لیا تو نبی نے قدرے حیران ہو کر پوچھا۔

”باری کیو..... وہ کہاں سے آئے گا.....؟“ اس کی چھوٹی سی آنکھوں میں بہت سی حیرانی نمایاں تھی۔ جسے محسوس کر کے طلحہ نے کہا۔

”کہیں سے نہیں آئے گا..... بلکہ میں خود جاؤں گا لینے.....“ اتنا کہہ کر وہ ذرا رکا پھر اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

”پچھلے محلے میں جو بڑا سانپ رنگ کا بگلا ہے ناں وہاں میرے دوست کی امی کام کرتی ہیں وہ بتا رہا تھا کہ اس عید پر وہ لوگ باری کی کو پارتی منائیں گے..... تو اس نے کہا تھا میں بھی وہاں آ جاؤں پھر اس کی امی اسے اور مجھے بھی بہت سی بوٹیاں اٹھا کر دیں گی.....“ آف کتنا مزہ آئے گا ناں.....“ آنے والے وقت کے تصور نے اس کے منہ سے رال ٹکا دی تھی۔

اور میں جو ایک طرف بیٹھی خاموشی سے ان دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔ بہت اچھی طرح اس

حقیقت سے واقف تھی کہ سب جھوٹ ہے فسانہ ہے۔ اس کے باوجود بھی نہ جانے کیوں ان کی خوش گمانیوں کی مردہ تیلیوں کو ہاتھ میں اٹھا کر پھونک مار کر انہیں اڑانے کی کوشش میں خود کو بھی خوش گمان ہوتا محسوس کرنے لگی تھی۔

”شاید اس بار حقیقت میں ایسا کچھ ہو ہی جائے.....“

گلابی تازہ گوشت سے بنی نہاری..... اور باری کی کی خوب مسالا لگی بوٹیاں..... خوش گمانیاں انتہا کو پہنچنے لگی تھیں ایسے میں امی ہمیشہ کی طرح ہمیں خوش گمانیوں سے کھیلنے دیکھ کر وہاں سے چپکے سے اٹھ کر اس طرح دبے پاؤں چل دیتیں کہ ہمیں ان کی گھسی ہوئی جوت کی مرل سی چاپ ہمیں حقیقت کی دنیا میں لا کر ان کی طرف متوجہ نہ کر دے..... شروع، شروع میں تو میں بڑی حیران ہوتی پھر امی کو یوں اپنے درمیان سے اٹھ کر جاتا دیکھ میں سب سوچوں کو بھٹکتی اس سوچ میں پڑ جاتی کہ آخر امی اس طرح ہمیں یوں چھوڑ کر خود کہاں چلی جاتی ہیں؟ پھر ایسے میں ایک دن جب امی ہمیں انہی خواہشوں میں ملن دیکھ کر چپکے سے ہمارے پاس سے انھیں تو میں بھی دبے پاؤں ان کے پیچھے چلی آئی..... میں جانتا چاہتی تھی کہ ایسے وقت میں ہر بار امی کو اپنی کون سی بھولی بھری مصروفیت یاد آ جاتی ہے جس کی تکمیل کی خاطر وہ یوں اٹھ کر متناطیسی انداز میں چل پڑتی تھیں..... اسی لیے آج میں اس راز سے پردہ اٹھانے کے لیے امی کے پیچھے، پیچھے چل رہی تھی..... امی میرے آگے بڑے ناپ تول کر ہلکے، ہلکے قدم اٹھا رہی تھیں۔ پھر ایک دم ان کی چال میں واضح فرق نمایاں ہونے لگا..... تو میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا..... ان کے ناپ تول کراٹھتے قدموں کی چال پہلے دھیمی ہوئی پھر سست..... اس کے بعد ٹوٹی پھوٹی پھر ان کی چال بالکل لتکڑی، لولی محسوس ہونے لگی۔ اور پھر اس وقت مجھے حیرت کا شدید جھوکا لگا جب خود کو گھسیٹ کر آگے بڑھتی امی نے اپنے پہلو میں گرے ہاتھ کو پہلے

مجھے دلہن بناؤ

کہ ابٹن ملو مجھ کو مہندی لگاؤ
مجھے پھولوں کلیوں سے ایسے سجاؤ
میں خوشبو سے بہکوں میں بس جاؤں اس میں
بہاروں مرے دل میں یوں مسکراؤ
سنوں میں کھنک کی صدائیں گھڑی پل
مری ہانپوں میں چوڑیاں تم سجاؤ
ہوں ہر راک کنواری کے بیدار سینے
اے سکھو! یوں ڈھولک ذرا تم سجاؤ
مری بہنوں تم اپنے ارباب نکالو
مجھے اپنے ہاتھوں سے دلہن سجاؤ
دینا کہ حیران رہ جائے ساری
مجھے اس قدر تم مثالی بناؤ
مرے دل کا آئینہ کہ پھر جھوم اٹھے
ذرا میرے ساجن کو جا کے بلاؤ
گلاب اور تم موچے لے کے آؤ
مری سچ کو خوشبوؤں سے سجاؤ
یقین ہے محبت کا مجھ کو اے بچا
مرے کانوں میں آؤ رس گھول جاؤ
خدا ساتھ خاتم کا دے لہ، لہ
اسے اس کے دل کے پیا سے ملاؤ
شاعرہ: فریدہ خاتم..... مرسلہ: سیماسان، لاہور

کے قریب آگئی۔ پھر کھڑکی سے اندر جھانکا۔

جہاں چڑھی پر صبر و شکر کی عملی تفسیر بنی امی ہاتھ پر
ہاتھ دھرے بیٹھی تھیں۔ امی کا رویہ میری سمجھ سے باہر
تھا..... میں ابھن کا شکار ہونے لگی..... کیونکہ میں نے
دیکھا تھا امی روٹی نہیں تھیں..... مگر ان کی آنکھیں
انگارے کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔ انہوں نے مایوسی
کا ایک لفظ بھی ادا نہیں کیا تھا..... مگر اس سے وہ بری
طرح مایوسی کا شکار دکھائی دے رہی تھیں۔ شاید اولاد کی
کبھی نہ پوری ہونے الی خواہشات نے ان کو ادھ موا
کر دیا تھا تبھی بظاہر تو انہوں نے کچھ نہیں کہا تھا مگر صبر
کی تصویر بننے کے باوجود کہیں نہ کہیں کوئی دہی ہوئی آہ

دیوار سے لگایا اور پھر ہاتھ کی انگلیوں کو پورا گھول کر
تھپٹنے کے سے انداز میں دیوار کے ساتھ تھپتی ہوئی
آگے بڑھنے لگیں۔ اندر کمرے سے باہر باورچی
خانے کا قافلہ ہی کتنا تھا مگر وہ امی نے کس کرب سے
طے کیا میں نہیں جان سکتی تھی۔ اس سے ایسا محسوس ہوا
جیسے امی دیوار میں لگی بے جان انیٹوں کی طرح خود کو
بے جان تصور کرتی بے خودی کے عالم میں آگے بڑھتی
جاری ہیں..... حیرت کے اس شدید جھٹکے سے خود کو
نکال کر امی کی پشت کو گھورتے ہوئے میرا دل بڑی
شدت سے خواہش کرنے لگا کہ اس سے میں آگے بڑھ
کر امی کا چہرہ دیکھوں..... مگر اپنی خواہش کو دل میں
دبائے میں وہیں کھڑی اپنی جگہ پر جمی رہی..... امی کا
رخ مٹی سے لپ کے باورچی خانے کی طرف
تھا..... مگر چند قدم کی مسافت کے بعد امی کے ہاتھ اور
قدم دونوں ہی رک گئے۔ وہ باورچی خانے کے اندر
نہیں گئی تھیں۔ تو میں بھی آگے نہیں بڑھی تھی۔

”نہ جانے امی یوں باہر کیوں رک گئی
ہیں.....؟“ میں خود سے الجھنے لگی تھی۔ جب میں نے
دیکھا امی نے اپنے دونوں ہاتھ پشت پر باندھ کر آسان
کی جانب نظر اٹھا کر دیکھا تھا۔

مجھے لگا کہ شاید وہ اب خدا سے ہمارے لیے کچھ
مانگ لیتا چاہتی ہیں، اس لیے میں نے فوراً خود کو سمیٹ
کر مزید کونے میں گھسیڑ لیا کہ کہیں میری موجودگی کی
نشاندہی ان کے اتنے اہم کام میں کوئی رکاوٹ نہ ڈال
دے۔ میں نے محتاط نظروں سے امی کی جانب دیکھا۔
اور حیران ہو گئی۔ انہوں نے دعا کے لیے ہاتھوں کو بلند
نہیں کیا تھا۔ شاید انہوں نے اس ایک نظر میں خدا سے
سب کچھ طلب کر لیا تھا، اس لیے اس ایک نظر کے بعد
دوبارہ سر کو جھکا کر وہ اسی طرح قدم تھپتی باورچی
خانے کے اندر داخل ہو گئیں۔ میں واپس پلٹ جانا
چاہتی تھی۔ مگر امی کا چہرہ دیکھنے کی خواہش نے میرے
قدموں کو واپس کے بجائے باورچی خانے کی طرف
موڑ دیا۔ تو میں دبے پاؤں چلتی ہوئی باورچی خانے

۱۱۔ امی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ ماں تھیں، جنہیں
 ۱۲۔ دھکے لے دھکے لے دھکی کیا تو لاکھ ضبط کی کوشش کے
 ۱۳۔ ایک منہ زور بے ضبط آنسو پلکوں کی باڑھ توڑ کر
 ۱۴۔ اٹھان ہوا ہانڈی میں پکتی مسور کی دال میں جا کر.....
 ۱۵۔ اب اس آنسو کو دال کے ساتھ پک کر ان کے حلق میں
 ۱۶۔ ڈالتا تھا جس سے ان کا صبر کچھ اور بڑھ جاتا تھا۔ مجھے
 ۱۷۔ اسے سوال کا جواب مل چکا تھا۔ اس لیے میں نے
 ۱۸۔ ہان لیا تھا کہ امی یوں ہمارے درمیان سے اٹھ کر اس
 ۱۹۔ لپٹے پکے سے ادھر چلی آتی ہیں کیونکہ وہ اپنے دکھ کو ہم
 ۲۰۔ سے چھپا کر ہمیں آگاہی کے عذاب سے بچالینا چاہتی
 ۲۱۔ تھیں۔ اپنا بھرم رکھ لینا چاہتی تھیں۔ اسی لیے
 ۲۲۔ انہوں نے ہمیں کبھی خواب دیکھنے سے نہیں روکا..... ہم
 ۲۳۔ خود ہی خواب بولتے، خواب بنتے اور آخر میں خود اپنے
 ۲۴۔ خوابوں کو دفن دیتے..... کیونکہ اپنے خوابوں اور
 ۲۵۔ خواہشوں کو پورا کرنے کی استطاعت نہ تو ہم میں تھی
 ۲۶۔..... نہ ہمارے والدین میں..... کیونکہ ابو ایک دکان پر
 ۲۷۔ سارا دن سیلزمین کا فریضہ سرانجام دے کر بس اتنی ہی
 ۲۸۔ رقم گھر لے آتے جس سے ایک دن کی گزر بسر پوری
 ۲۹۔ ہو جاتی تھی..... اس اتنی کم رقم کے باوجود بھی ہماری
 ۳۰۔ سلیقہ شعار امی کچھ نہ کچھ بس انداز کر کے بچت کر رہی
 ۳۱۔ لیتیں..... اور ان کی یہ بچت اکثر کسی اہم تہوار کے موقع
 ۳۲۔ پر سامنے آتی۔ اب جو عید سر پر آئی کھڑی تھی اس کے لیے
 ۳۳۔ امی نے اپنی بچت کے روپوں سے ہمارے لیے سیل
 ۳۴۔ بازار سے کپڑے لے کر خود انہیں سلائی کیا..... پھر چند
 ۳۵۔ روپے ابو کے ہاتھ میں تھما دیے..... جسے لے کر ابو ہمیں
 ۳۶۔ سیل کی دکان سے سستی جو تیاں دلوالائے یوں ہماری
 ۳۷۔ عید کی تیاری مکمل ہو چکی تھی..... مگر ہمیں یہ عید یوں
 ۳۸۔ تیاری کے ساتھ مکمل ہوتی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔
 ۳۹۔ اس لیے ہم میں سب سے پہلے ننھی منہ بسور کراہی کے
 ۴۰۔ سامنے جا کھڑی ہوئی۔

”امی یہ عید تو قربانی کی عید ہے ناں.....؟“

”ہاں.....“ چاول چنتی امی نے مصروف سے

انداز میں مختصر جواب دیا تو ننھی نے فوراً دوسرا سوال

بلند کیا۔

”تو پھر قربانی کے لیے ہم نے تو بکرا لیا ہی نہیں ہے؟“

”اچھا ہم بھی بکرالے آئیں گے۔“ امی نے یونہی
 سر جھکے انداز میں اس کو ٹالنا چاہا تو وہ فوراً پلٹ کر بولی۔

”دب لے آئیں گے امی..... اب بس دودن ہی

تو باقی بچے ہیں..... محلے میں سب کے گھروں میں قربانی

کے لیے بکرے اور گائے آچکی ہے..... بس ہم ہی رہ

گئے۔“ وہ اب بہت بے چین دکھائی دے رہی تھی۔ اس

لیے امی نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا..... وہ ابھی اتنی

بڑی نہیں ہوئی تھی کہ اپنے حالات کو سمجھ کر ان سے

سمجھوتا کرتی اسے تو بس ضد کر کے اپنی بات منوانے کا

شوق تھا۔ مگر اس کی یہ ضد پوری کرنے کی استطاعت وہ

کسی صورت میں نہیں رکھتی تھیں۔ اس لیے امی نے ان الفاظ کو

جمع کرنا شروع کر دیا جنہیں بول کر وہ اس کے دل کو ٹونے

سے بھی بچالیں اور اس کی ضد کا مان بھی رکھ لیں..... اس

لیے چند منٹ رک کر انہوں نے لفظوں کو جمع کیا پھر گہری

سانس بھر کر بولیں۔

”بہت جلد..... مگر اس کے لیے تمہیں دعا کرنی

ہوگی۔“

امی دعا کو مشروط کر دیتیں تو ننھی فٹ سے اٹھا

سوال داغ دیتی۔

”اچھا میرے دعا کرنے سے ابو بکرالے

آئیں گے؟“

”ہاں، بالکل.....“ امی بڑے یقین سے اقرار

میں سر ہلاتیں تو ننھی اپنی آنکھیں بند کر کے اسی وقت

اپنے چھوٹے، چھوٹے ہاتھوں کو دعا کے لیے

اٹھا دیتی..... اور ہم سب اس کے لبوں کی خاموش دعا پر

چپکے سے آمین کہتے وہاں سے اٹھ جاتے۔

☆☆☆

امی آس کے موتی لفظوں کی مالا میں پرو کر

ہمارے گلوں میں ڈال دیتیں تو ہم سر جھکا کر اس عید کا

انتظار کرنے لگتے جس پر ہماری دعاؤں کی قبولیت کی

صورت ہم بھی قربانی کے لیے وقت پر بکرالہ لے سکتے.....

تب تم جی بھر کے گوشت کھا لینا۔ مگر آج ابھی تو تم یہ چاول کھا لو..... میں نے خاص تمہارے لیے بنائے ہیں.....“ اس کے ہاتھوں میں زبردستی پلیٹ تھا کرامی اس کا دھیان ہر گز بھی گوشت پر سے نہیں ہٹا سکتی تھیں۔ مگر اس بار بھی نے مزید کوئی اعتراض کیے بنا پلیٹ پر اپنے ہاتھوں کی گرفت مضبوط کی اور باورچی خانے سے نکلنے کے لیے قدم بڑھانے کے ساتھ، ساتھ اس نے اسی پل سے اگلے سال کی بڑی عید کا انتظار شروع کر دیا تھا۔ پھر جوں، جوں دن گزرتے جاتے اس کی دعا کی شدت میں اضافہ ہو جاتا..... مگر سال کے تین سو پینسٹھ دن گزارنے کے بعد بھی جب وہ اپنے گھر کے آگین میں بکرے کو موجود نہ پاتی تو سراپا سوال بن کرامی کے سامنے کھڑی ہو جاتی۔

”آپ نے کہا تھا دعا کرو..... پھر اگلے سال ہم بکرا ضرور لیں گے..... مگر اس بار پھر عید میں دو روز باقی رہ گئے ہیں..... اس بار بھی ہم بکرا نہیں لے سکے..... حالانکہ میں نے اتنی زیادہ دعا کی تھی مگر اللہ نے میری دعا قبول نہیں کی.....“ مایوسی کے گرداب میں گردن تک جھنسی نہجی اس لیے امی سمیت ہم سب کو بے تحاشا دکھی کر گئی..... جیسی امی نے تڑپ کر کہا تھا۔

”ایسے نہیں کہتے نہجی بیٹیا..... خدا ہمیشہ ہماری دعا میں سنتا ہے، ہاں مگر ہماری دعاؤں کی قبولیت کو تین صورتوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ جس میں پہلی صورت تو یہ ہوتی ہے کہ جب ہم کوئی دعا مانگتے ہیں تو ہماری دعا کو فوراً قبولیت کا درجہ عطا فرما دیا جاتا ہے..... جس کی بدولت ہمیں ہماری خواہش کے مطابق ہماری مطلوبہ چیز فوراً عطا کر دی جاتی ہے..... دوسری صورت میں یہ ہوتا ہے کہ ہم دعا کر رہے ہوتے ہیں مگر ہماری دعا کو فوری طور پر قبولیت کا درجہ عطا نہیں کیا جاتا..... کیونکہ وہ ہمارا مہربان رب ہم سے زیادہ بہتر جانتا ہے کہ جو ہم اپنی دعا میں طلب کر رہے ہیں وہ ہمارے حق میں اچھا ہے یا نہیں..... تو اگر ہماری طلب ہمارے حق میں اچھی نہ ہو..... تو ہمارا رب ہماری دعا کو کچھ عرصے کے لیے رکھ

ایسی عید کے لیے دل سے دعا گو ہوتے پچھلی عیدوں کی طرح اس عید پر بھی ہم امی، ابو کے ساتھ بیٹھے گوشت کی آمد کے منتظر تھے..... جب پورا دن گزر جانے کے باوجود کہیں سے گوشت آنے کی امید دکھائی نہیں دی تو ہماری بھوک کا خیال کر کے امی پھر سے ہمیں بہلائی زیرے والے چاول پکانے کے لیے باورچی خانے کی طرف چل دیں۔

دروازے پر کھٹکے کی آواز سن کر ہم سب سے پہلے نہجی نے پھرتی کا مظاہرہ کیا اور امی کے پاس پہنچ گئی۔

”امی ابھی ہم نے دروازے پر کھٹکا سنا ہے..... کیا کوئی گوشت دے گیا ہے؟“ نہجی اکثر اسی طرح بڑے بڑے سوال کر کے امی کو پریشان کرنے کی کوشش کیا کرتی..... مگر امی بھی ہماری امی ہمیں ہمیشہ اس کے سوالوں کو گھما کر اسے بہلا لیتی تھیں..... جس طرح انہوں نے اب اس کو چکارتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔ گوشت تو کوئی نہیں دے گیا..... مگر میں نے تم لوگوں کی پسندیدہ ڈش تیار کر لی ہے۔ دیکھو میں نے زیرے کے چاول پکائے ہیں۔ تم مسور کی دال الال کر اب مزے سے کھانا۔ اور ہاں مرچوں کا اجار بھی ہے۔“ انہوں نے اس کی توجہ دوسری طرف مبذول کراتے ہوئے چپکے سے گوشت کے شاہر کو پیچھے کیا تھا جو ابھی ابھی دروازے پر کوئی دے گیا تھا۔ جس میں ہڈیوں کی بڑی تعداد کے ساتھ لگے ڈرا سے گوشت کے علاوہ الگ سے گوشت کی کوئی ایک بوٹی بھی نہیں تھی۔ جسے امی اگلے دن کے لیے بچا کر رکھتیں کہ کوئی مہمان آجائے تو اس کے لیے پائے کا مسالا ڈال کر سالن بنا سکیں۔ آج کا کھانا تو بن گیا تھا۔

”مگر امی..... آج مجھے گوشت کھانا تھا.....“ نہجی کی سوئی ابھی تک وہیں انکی تھی۔ مجھے خواہ خواہ اس پر غصہ آنے لگا..... مگر اس سے پہلے کہ میں غصے میں اس کو ایک آدھ ہاتھ جڑتی امی نے پلیٹ میں دال چاول اکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”انشاء اللہ جب ہم اگلے سال قربانی کریں گے

والی عید میں اسے اس کی دعا کا اجر عطا کر دیا جائے۔
مگر امید کے ٹٹماتے دیے کی روشنی تلے انتظار کے بعد آنے والی اگلی عید سے چند روز قبل امی کو بخار نے اس بری طرح اپنے لپیٹے میں لیا کہ پھر وہ اس امید اور انتظار کی ساری کھڑیوں کو مات دیتی دنیا کو الوداع کہتی خالق حقیقی سے جا ملیں..... ایسے سے جب ہم امی کو یاد کر کے بلک رہے تھے..... نہ جانے ننھی کو کیا ہوا..... وہ امی کے سر ہانے کھڑی ہو کر مسکرانے لگی..... مجھے اس کی ڈھنی حالت پر شک گزرا تو میں تڑپ کر اس کی طرف بڑھی۔

”ننھی.....“ میں اسے بانہوں میں بھرنے کو ننھی جب وہ میرے ہاتھوں سے اپنے بازو آزاد کراتے ہوئے بولی۔

”باجی! امی بھی تو میری طرح بکرے کے لیے دعا کیا کرتی تھیں ناں..... دیکھو ان کی دعا قبول تو نہ ہو سکی اور وہ مر گئیں تو اب وہ اللہ کے پاس جو چلی گئی ہیں وہاں اللہ نے انہیں ان کی دعاؤں کے بدلے میں قربانی کا بکرا دے دیا ہو گا ناں.....؟“ اتنا کہہ کر اس نے میرے بازو کو کھینچ کر دوبارہ کہا۔

”اب ہمارا بکرا تو امی کے پاس ہے..... وہ وہاں ہمارا انتظار کر رہی ہوں گی..... تم بتاؤ اب تم طلحہ، ابو اور میں کب مریں گے؟“

اس کی سوچ کے حساب سے اس کا سوال درست تھا مگر میں اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے پھٹی، پھٹی نظروں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے خود کو یہ سوچنے سے روک نہیں پا رہی تھی..... کہ آخر دکھائی نہ دینے والی یہ خواہشات انسان کی روح میں اس قدر اندر تک پہنچے گاؤں کہ اس طرح کیوں برا بھلا ہو جاتی ہیں کہ پھر ان کی تکمیل کی خواہش میں انسان خود اپنی ہستی تک کو مٹا ڈالنے کے در پے ہو جاتا ہے۔

اور ہستی کے اس مٹانے کے عمل کا ذمے دار کون تھا؟ خود خواہش کرنے والا نادان انسان یا زمانے کی بے بسی۔

لہذا ہے پھر جب ہماری طلب ہمارے حق میں اچھی آتی ہے تو وہ ہمیں ہماری طلب سے نواز دیتا ہے..... بری اور آخری صورت وہ ہوتی ہے جس میں ہم مسلسل دعا کیے جاتے ہیں..... مگر بہت دعاؤں کے باوجود ہمیں ہماری طلب عطا نہیں کی جاتی..... تو ایسی صورت میں بھی انسان کو مایوس نہیں ہونا چاہیے کیونکہ بھلے سے ہم اس دنیا میں عطا کے درجے سے محروم رکھ دیے جاتے ہیں مگر وہ ہمارا رب ہماری تمام دعاؤں کو بہت قریب سے سنتا ہے اور جو دعائیں دنیا میں ادھوری رہ جاتی ہیں وہ اس کا اجر ہمیں آخرت میں عطا کر دیتا ہے.....“ امی نے اپنے نرم اور خوب صورت انداز میں بہت حلاوت سے ننھی کو مایوسی کے اس گرداب سے نکالنے کے لیے سمجھایا تو وہ ذرا دیر چپ رہ کر ان کی باتوں پر غور کرتی رہی..... اور جب ان کی باتیں اس کی سمجھ میں سامنے لگیں تو وہ سر ہلانے لگی۔

”تو اس کا مطلب ہے اگر میری بہت ساری دعائیں کرنے کے باوجود اگر ہم اگلے کسی سال بھی قربانی کے لیے بکرا نہ لے سکے تو اللہ میری دعاؤں کے اجر کے بدلے میں آخرت میں ہمیں قربانی کرنے کے لیے بکرا دے دیں گے؟“ وہ مصومیت کی انتہا پر تھی۔

بڑا ہی بے ساختہ انداز تھا اس کا..... امی کی آنکھیں جھپکنے لگی تھیں..... انہیں احساس ہونے لگا تھا کہ ننھی اب حالات کو سمجھنے لگی ہے..... اس کو اندازہ ہونے لگا ہے کہ وہ کبھی کسی بھی عید پر قربانی کے لیے بکرا نہیں لے سکتے..... آگاہی اپنے در اس پر وا کرنے کو تیار کھڑی تھی..... مگر امی نے چاہا کہ ابھی کچھ اور وقت وہ اسی طرح نا سنجی میں گزار دے..... اس لیے انہوں نے ہلکے سے مسکراتے ہوئے سر ہلا کر کہا۔

”ہاں مگر تم دعا کرتی رہو..... کیا معلوم تھا ہماری دعا کی بدولت ہم اگلے سال قربانی کا فریضہ ادا کرنے کے لائق ہو جائیں.....“ امی نے اس کے ہاتھ میں دعا کے یقین کی ڈور تھما لی..... جسے مضبوطی سے تھام کر اس نے اس امید پر اگلی عید کا انتظار شروع کر دیا کہ شاید آنے

بیٹی اور پیٹی آٹھ ماہ



”اماں میں نے ٹیوشن کے پیسوں میں سے کچھ رقم
جمع کی ہے، بچوں کا ہاتھ پکڑ، پکڑ کر انہیں اے بی سی لکھائی
آمنہ نے دبی زبان میں اماں کو کہا۔

”ہاں لے آتا.....“ خلاف توقع جواب ہاں میں تھا۔
”سچ اماں تم بہت اچھی ہو، میں اپنی کالج کی عید ملن
پارٹی پر وہ گلابی سوٹ ہی پہنوں گی۔“ آمنہ نے گود میں بیٹھی
گول مٹول سی بچی کو پیار کرتے ہوئے خوش ہو کر کہا۔

”میں نے کہا ہے سوٹ لے لینا، یہ نہیں کہا کہ

”اماں وہ اس دن جو ہم نے بازار میں گلابی جوڑا
دیکھا تھا ناں..... مجھے وہ لینا ہے۔“ آمنہ نے دھیرے

لہذا مہینہ بھی لیتا۔“ سردھری آواز نے آمنہ کی خوشی پر
ہنس پانی ڈال دیا۔

”اتنا اچھا اور مہنگا سوٹ تم یہاں پہن کر کیا
کر دو گی..... لے کر بیٹی میں رکھ لیتا۔“ آنسوؤں سے
بھری آنکھوں سے آمنہ نے برآمدے میں پڑی بڑی
ساری لوہے کی بیٹی کو دیکھا اور جلدی، جلدی بے دلی سے
بچوں کو ڈانٹا یاں کروانے لگی۔

☆☆☆

”آمنہ کے ابا آج اسٹور سے ذرا ادھی چھٹی لے
کر آ جاتا۔“

”جو حکم سرکار، ویسے جلدی بلانے کی کوئی خاص
وجہ.....؟“ ابا نے ذرا جھک کر مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔
”آئے ہائے اس عمر میں ٹھیا گئے کیا، ہر وقت
کے چونچلے اچھے نہیں لگتے سعد صاحب، بچی جوان ہو گئی
ہے..... اب اس کی فکر کریں.....“ اماں نے اچھا خاصا
لتا ڈ دیا، ابا بیچارے شپٹا کر رہ گئے۔

”گھر کے خرچ اور سلائی کے پیسوں سے خالہ
ہاجی کے یہاں ایک کمیٹی ڈالی تھی۔ اس دفعہ میرا نمبر ہے
اور دو پہر تک وہ مجھے رقم دے دیں گی تو ذرا بازار جا کر
کچھ سامان لے آئیں گے۔ مہنگائی روز بروز بڑھتی
جاری ہے، چار چیزیں جڑی رکھی ہوں گی تو کام
آئیں گی۔“ اماں حسب عادت بولے چلی جا رہی تھیں۔
”ٹھیک ہے نیک بخت تیار رہنا، میں دو پہر تک
چھٹی لے کر آ جاؤں گا۔ آج کل بیماریاں اس قدر بڑھ گئی
ہیں کہ اسٹور پر ہر وقت بھیڑ لگی رہتی ہے۔ چلو اللہ مالک
ہے، یہ کام بھی ضروری ہے میں اسحاق بھائی سے کہوں گا
تو وہ چھٹی دے دیں گے۔“ ابا بڑبڑاتے ہوئے گھر کی
دلیز پار کر گئے۔

☆☆☆

آمنہ باورچی خانے میں برتن دھو رہی تھی، بے
اختیار اس کی آنکھوں سے دو شفاف قطرے صابن اور
میلے پانی کے جھاگ میں گر کے کم ہو گئے..... بیٹی کے
ماں، باپ کو کتنی مشقت کرنی پڑتی ہے، اسے بیاہنے کے

لیے کاش یہ رسم و رواج نہ ہوتے تو کس قدر آسانی ہوتی۔
ابا ایک میڈیکل اسٹور پر کام کرتے تھے، اماں نے
ساری جوانی سلائی مشین کے آگے بیٹھ کر گزاردی، چھوٹا
سامکان تھا پرانے وقتوں کا..... دادا نے بنوایا تھا۔ بجلی،
گیس، پانی کے بل، راشن..... اماں بہت سینٹ سینٹ کر
خرچ کرتی تھیں۔

انہیں جب جہاں موقع ملتا وہ پیسے جوڑ کر کوئی نہ کوئی
چھوٹی موٹی چیز آمنہ کے لیے لے کر رکھ لیتیں اور بیٹی میں
ڈال دیتیں۔

”آمنہ.....“ اماں کی آواز گونجی۔

”جی اماں.....!“ ہاتھ ذرا جلدی، جلدی چلنے لگے۔
”برتن دھو کر جلدی باہر آ جا، میں نے پرچی پر
سامان لکھوانا ہے سامان لکھا رکھا ہو تو آسانی ہوتی ہے اور
پھر اپنے ابا کا پتا ہے ناں کتنی جلدی بچاتے ہیں اور کوئی
انہیں سمجھائے نہ چیزیں ذرا چھان چھک کر لی جاتی ہیں۔
کولر، استری، بجھکوں کا سیٹ، جوسر، پنکھا۔ آٹھ عدد
مردانہ جوڑے، آٹھ عدد زنانہ جوڑے۔ ایک عدد
چٹائی۔“ اماں لسٹ لکھواتی جا رہی تھیں اور لکھتے، لکھتے
آمنہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ اگر ان پیسوں سے
اماں واشنگ مشین منگوا لیتیں تو دونوں ماں، بیٹی کو کتنی
سہولت ہو جاتی۔ گرمی، سردی ہاتھ سے پکڑے دھونے
پڑتے ہیں مگر اماں سے کہتا کون ان کی اپنی نرانی
منطقہ تھیں۔

”ہاں، موٹی مشین منگوا لو اور پھر بجلی تو سارا، سارا
دن آتی نہیں، صابن پانی ڈال کر سارا دن انتظار کرتے
رہو، ہاتھ کا کیا ہے ادھر بھگوئے ادھر دھوئے اور تاروں پر
پھیلا دیے۔“

”اماں جہیز دینا ضروری ہوتا ہے کیا؟“ واشنگ مشین
کے بارے میں سوچتے، سوچتے آمنہ کے منہ سے اچانک
نکل گیا۔ اماں نے گھور کر اسے دیکھا۔ انہیں لڑکیوں کا یوں
سوال کرنا پسند نہیں تھا۔ آمنہ نے گھبرا کر سر نیچے کیا کاپی پر قلم
کی نوک رکھی اور اگلے لفظ کا انتظار کرنے لگی۔
تھوڑی دیر خاموشی چھائی رہی اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔

ہرگز رخصت نہیں کروں گی۔“ آمنہ حیرت سے اماں کی باتیں سن رہی تھیں اتنا زیادہ تو وہ کبھی نہیں بولی تھیں۔

”اور پھر تمہاری پیدائش پر جو بھی خرچی ملی میں نے اس سے یہ بیٹی خرید لی اور آج سترہ سال سے اس میں سامان اکٹھا کر رہی ہوں تاکہ میری بیٹی بھرے ہاتھوں سسرال جائے اور اسے کوئی کچھ کہنے والا نہیں ہو۔“ انہوں نے بات کرتے ہوئے ٹھنڈی سانس بھری۔

”ارے میں بھی کن باتوں میں لگ گئی جلدی سے روٹی پکالے، تیرے ابا آتے ہی ہوں گے۔ میں بھی پرلے محلے والی باجی کا سوٹ مکمل کر لوں، پرسوں ان کے یہاں میلاد ہے تو یہ نیا سفید سوٹ ہی وہ پہنے گی میلاد میں۔“ اماں نے سر جھکا لیا اور مشین کا پھپہ اپنی مخصوص رفتار سے چلنے لگا۔

☆☆☆

”اماں آج تو میں رس ملائی یا گاجر کا حلو کھاؤں گی.....“ آمنہ نے دھیرے سے اماں سے فرمائش کی۔ اسے میٹھا بہت پسند تھا مگر گھر میں عید کے سوا کبھی نہیں بننا تھا بقول اماں کے یہ فضول خرچی تھی۔ دو وقت کی روٹی مل رہی ہے، شکر ادا کرو۔

آج آمنہ کا رزلٹ آیا تھا، وہ فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوئی تھی اور محلے کے ایک اسکول میں اسے نوکری چھٹی مل گئی تھی۔

”ارے نیک بخت لاڈ پیے، میں اسے بازار سے اس کی من پسند چیز لا دیتا ہوں.....“ اماں نے اخبار کو تکر کے کہا جو وہ سامنے والے چچا سے لاکر کبھی، کبھی پڑھ لیتے تھے۔

”ارے آپ بھی کس کی باتوں میں آرہے ہیں، دو گھڑی کا زبان کا چمکارا ہے، پتا بھی ہے ان دونوں چیزوں کے کیا ریٹ ہیں، شوق بھی نوابی ہیں محترمہ کے۔“ اماں نے آنکھیں نکالیں۔

”اگلے ماہ تنخواہ ملے گی اس میں سے کھالینا جو کھانا ہو۔ تمہارے ابا کی تنخواہ اور میری سلائی سے تو بل، گھر کا خرچہ اور کینٹی کے پیسے ہی پورے نہیں پڑتے۔ سردی جانے والی ہے وہ جو تمہارے لیے رضائیاں اور گدے

اماں اپنے چشمے کو اتار کر آنکھوں میں آئی نمی کو صاف کر رہی تھیں۔

”اماں میں نے ایسا کیا کہہ دیا کہ آپ رونے ہی لگیں؟“ آمنہ بچ میں پریشان ہو کر اماں کے پاس ہو گئی۔

”ہاں بیٹی، جھجھ دینا ضروری ہوتا ہے۔“ اماں کی آواز دور سے آتی محسوس ہوئی۔

نظریں سامنے رکھی سلائی مشین پر جمی ہوئی تھیں مگر صاف محسوس ہو رہا تھا کہ نگاہوں کے سامنے اس وقت نظر کوئی اور ہی ہے۔

”اللہ جنت نصیب کرے ہماری اماں کو وہ بس ہم ہی سادی ان پڑھ گھریلو عورت تھیں۔ زیادہ چالاک یا مایہ نہیں تھا ان میں کھایا پیا اور سو گئے ہم تین بہنیں تھیں وقت رکتا نہیں گزر جاتا ہے۔ اور ہم تینوں جوان ہو گئیں تو اماں، ابا کو شادی کی فکر ہوئی۔ کہیں بات چلی اور سب کچھ لہیک لگا تو اماں نے میری اور مجھ سے چھوٹی بہن کے لیے ہاں کر دی۔ پرانے زمانے میں سیدھے اور سچے لوگ ہوتے تھے اس لیے رشتے کے لیے اتنی تنگ و دو نہیں لڑنی پڑتی تھی۔ سب کا کردار سب کے سامنے ہوتا تھا۔

ہیزل کو باتوں کی رنگ برنگی پنوں میں لپیٹ کر چھپایا لکھن جاتا تھا۔ صورت سے زیادہ سیرت کو اہمیت دی جاتی تھی بس ایسے ہی تھوڑے دنوں میں نکاح کی تاریخ

اے دی۔ ابا کی گاؤں میں چھوٹی سی دکان تھی، اماں چند دن میں چند جوڑے ہی بنا پائیں اور ہمیں خالی ہاتھ رخصت کر دیا۔ حالانکہ اگر وہ مجھ بوجھ سے کام لیتیں تو

مارے بچپن سے ہی کچھ نہ کچھ جمع کر لیتیں تو کام ہی آجاتا۔ سسرال میں خالی ہاتھ جانا عذاب مسلسل بن گیا۔ اور پتا ہے آمنہ زندگی کے ہر موڑ پر سسرال والوں کا یہ طعنہ کے تم تو خالی ہاتھ آئی تھیں، میرے لیے عذاب بن گیا۔ ساس، ننندیں کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھیں۔ وہ تو تمہارے ابا اچھے تھے عمر گزر گئی، اب اللہ کا دیا فانی کچھ ہے..... لیکن جب تم پیدا ہوئیں تو میں نے اپنے آپ سے عہد کیا تھا کہ میں اپنی بیٹی کے لیے میرے، دھیرے سب جوڑ کر رکھوں گی ایسے خالی اتھ۔

بارے میں سوچ رہی تھی جس سے اس کا نصیب جوڑا جا رہا تھا۔

”اور ہاں آمنہ اب بیس کی ہوگئی ہے یہی دو تین سال ہوتے ہیں، بیٹی کو رخصت کرنے کے ورنہ بعد میں تو مشکل ہو جاتی ہے۔“ جائے پیتے ہوئے کوثر خالہ نے اماں سے کہا جو فیصہ کی ترپائی کر رہی تھیں۔

”تھوڑی چھان بچک کر دالو بلکہ میں تو کہہ رہی ہوں کہ میں برسوں سے انہیں جانتی ہوں یہاں کیشن کا معاملہ تو ہے نہیں کہ میں غلط بیانی کروں۔ راج کرے گی اپنی آمنہ اور دعائیں دے گی اپنی کوثر خالہ کو..... اور ہاں تم نے کچھ جوڑ جاؤ کر بھی رکھا ہے۔“ کوثر خالہ نے رازداری سے پوچھا۔

”ہاں آپا اللہ کا کرم ہے۔ میں نے جب سے یہ پیدا ہوئی تھی سامان جوڑنا شروع کر دیا تھا۔ میرے پاس آمنہ کے ابا کے دیے سونے کے بھکے ہیں وہ بھی میں نے اس کے لیے رکھ چھوڑے ہیں۔“ اماں نے مطمئن اور مسرور نظروں سے بیٹی کی طرف دیکھا۔ دروازے پر کھڑی اماں، خالہ سے باتیں کر رہی تھیں اور آمنہ بچوں کی کاپیاں چیک کر رہی تھی۔

آنا فانا تھوڑے دنوں میں رشتہ طے ہو گیا کچھ لوگوں سے پتا بھی کر لیا تھا۔ سب نے واجد کی تعریف کی تھی اور تین مہینے بعد شادی کی تاریخ بھی طے کر دی تھی کہ واجد سے چھوٹے بھائی واجد کی ماموں کے گھر ملگنی تھی اور ماموں بیمار تھے اس لیے وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے تھے۔ وقت گزرتے پتا ہی نہیں چلا اماں نے اسٹور کے مالک سے کچھ قرض لیا، سامان جمع کرنے پر سب نے اماں کی تعریفیں کیں اور سارا سامان پرانی بیڑی سے نئی بیٹی میں شفٹ ہو کر فرنیچر کے ساتھ سرال شفٹ ہو گیا اور یوں آمنہ پیادلس سدھا رہ گئی۔

☆☆☆

”ارے بڑی بہو ذرا اپنا چوہر تو نکالنا، عائشہ نے کہا بوں کا سالہا پیٹا ہے واجد کے ابا تو جو چوہر لائے تھے اس میں قیمرہ، پستانا ہی نہیں ہے۔“

انہی دنوں وہ بھی اٹھانے ہیں، دکان سے آگے بچے ہو گئے تو اتنا اچھا اور پائدار کپڑا بھی ہاتھوں سے جانے گا کن قوتوں کا لیا تھا۔ اس دن میں بازار گئی ویسا کپڑا وہ بھی نکلی دس گنا زیادہ مہنگا بتا رہا تھا کم بخت دکاندار..... ہاں بلکہ شام تک میرے ساتھ بیٹی کی ترتیب توڑی ٹھیک کروانا تاکہ بستر وں کی جگہ بن سکے۔“

آمنہ بہت فرمانبردار اور شہنڈی طبیعت کی تھی مگر جانے اب کیوں اسے برآمدے میں رکھی لوہے کی بدرنگ بیٹی سے چڑھنے لگی تھی۔ بچپن سے لے کر اب تک کی کتنی خواہشیں اور خوشیاں اس بھدی سی بیٹی میں بند تھیں اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ اسے اٹھا کر پھینک دے۔

☆☆☆

”ارے بہن بہت اچھا رشتہ ہے، بچہ بھی قابل ہے، سرکاری نوکری ہے۔ اور سب سے بڑھ کر تیرے میرے جیسے شریف لوگ ہیں..... سوچ لو میرا کیا ہے، ایک گھر سے دوسرے، دوسرے سے تیسرے تم سے محلے داری بھی ہے اور آمنہ میری بچیوں جیسی ہے اس لیے..... پہلے تمہارے پاس آئی۔ سچ پچھلے سال انم کی ملگنی ہوگئی ورنہ میں آنکھیں بند کر کے اپنی انم کا ہاتھ تھما دیتی۔“

دو گھر چھوڑ کر خالہ کوثر رہتی تھیں۔ رشتوں کی بات کرواتی تھیں اماں نے ان سے کہہ رکھا تھا۔

”ٹھیک ہے، کوثر رات کو آمنہ کے ابا گھر آئیں تو ان سے بات کروں پھر تم ان لوگوں کو لے آنا۔“

ماہنامہ پاکیزہ

ستمبر 2017ء

کراچی
ماہنامہ
سرگزشت

مرگِ ناگہاں نمبر

بے وقت موت نمبر نئے عنوان
اور نئی تحریروں کے ساتھ

وہ جو بے وقت موت کا شکار ہوئے، جوانی میں
ملکِ عدم کے راہی بنے۔ نامور لوگوں کی روداد اور
کہانیاں، جو اپنی مختصر سی زندگی میں یادگار کام کر گئے۔

وہ جس کے نقش قدم سے چراغ جلتے تھے
جلے چراغ تو خود بن گیا دھواں وہ شخص

ناقابلِ فراموش خاص نمبر جسے مجلد کرا کر آپ رکھیں گے۔

بہت جلد قارئین کی خدمت میں

چاول صاف کرتی آمنہ ”جی امی“ کہہ کر اوپر
 مہت پر مچی مچی میں سے چو پر نکالنے چلی دی۔
 نیچے گھر میں تین کمرے تھے ایک آمنہ اور واجد کا دوسرا
 عائشہ اور ماجد کا اور تیسرا ان کے امی ابو کے استعمال میں تھا
 تیسرے نمبر کا دیور پچا رابر آدمے میں بستر لگا کر سوتا تھا۔
 اس لیے جہاں انسانوں کے لیے جگہ نہیں تھی وہاں
 بیٹی کہاں آتی تھی۔ اس لیے اماں کی دی ہوئی اصلی لوہے
 کی چادر والی بیٹی اوپر چھت پر دھوپ میں پڑی اپنی
 قسمت کو رو رہی تھی۔ بس اس کے اوپر پلاسٹک ڈال دیا گیا
 تھا۔ آمنہ نے بیٹی پر لگا تالا کھولا اور کافی دیر کی اُٹھا پٹخ
 کے بعد چو پر کا ڈبا پر آمد کر لیا۔ ڈبا ہی اس قدر پرانا اور میلا
 ہو چکا تھا کہ چند لمحے کو وہ شرمندہ سی ہوگئی۔ اتنے عرصے
 بیٹی میں سامان..... پڑا رہنے کی وجہ سے وہ بالکل بھی نیا
 نہیں لگ رہا تھا۔
 مگر سیل تو لگی ہوئی تھی اس نے یہ سوچ کر دل کو تسلی
 دی۔ کوئی ایسے سینڈ پیٹڈ نہیں سمجھے گا۔ سامان کو ترتیب
 سے رکھ کر واپس تالا لگانے تک میں جھکے، جھکے اس کی کمر
 دھری ہوگئی۔ آمنہ نے کمر پر ہاتھ رکھ کر ایک لمبی سی سانس
 لی اور ڈبالے کر بیڑھیاں اترنے لگی۔
 آج گھر میں بڑی منہ کلشوم اور ان کے سرکاریوں
 کی دعوت تھی۔ بڑی فیملی تھی کل پندرہ افراد تھے اور
 سات، آٹھ ان کے اپنے تو کھانا اس مقدار میں پک رہا
 تھا کہ وہ اور عائشہ صبح سے ہی کام میں جتی ہوئی تھیں۔ مگر
 بھانجی ہونے کا اسے پورا، پورا فائدہ تھا۔ اماں زیادہ تر
 کام آمنہ سے کہیں وہ بلا کسی جیل و جنت کے مان لیتی
 کیونکہ اماں نے بات ماننا، بڑوں کے آگے ایک لفظ نہ کہنا
 تو اس کی گھٹی میں اسے پلایا دیا تھا۔
 ”اے ہے بہو، یہ کس زمانے کا چو پر ہے؟ اس
 میں تو صرف جوس والا جگ ہی ہے اس میں تو قیرہ نہیں
 پے گا۔“ اماں نے ڈبا کھولتے ہی دہائی دی۔
 ”ارے بھابی آج کل تو اتنے جوسر آرہے ہیں
 جن کے ساتھ چو پر پلینڈر سب آتا ہے۔“ چھوٹا دیور ڈبا
 الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا ساتھ میں تیرہ بھی جاری تھا۔

”ارے عائشہ بیٹا تم نکال لاؤ، خواہ مخواہ اتنا تانے
 ضائع کیا۔“ اماں منہ بگاڑ کر بڑا بنائیں۔
 آمنہ شرمندہ، شرمندہ کبھی ڈبے اور کبھی ساس کے
 منہ کی طرف دیکھتی اسے تو خود پتا نہیں تھا کہ اماں نے یہ
 کب لیا تھا اور اس کے اندر کیا، کیا تھا۔
 کیونکہ گھر میں اماں جب بھی کوئی چیز لاتیں فوراً ہی
 بیٹی میں ڈال دیتی تھیں۔ بھی اسے دکھانے یا پوچھنے کی
 زحمت ہی نہیں کی اب تو ویسے ہی کچھ نہیں کہتے تھے اور آمنہ
 کو بھی اپنی پڑھائی اور پڑھانے سے فرصت نہیں تھی۔
 بیٹی تو ویسے ہی اسے اپنی دشمن لگتی تھی اس لیے وہ اس کی
 طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی تھی۔

☆☆☆

شام کے سائے منڈیوں پر ڈیرے جمانے لگے تو
 چڑیوں نے واپسی کی تیاری کر لی۔ آنگن میں لگی رات کی
 رانی کی کلیاں ابھی جو خواب تھیں۔ آمنہ نے سخن میں
 رکھے کوئٹوں میں دانہ پانی ڈالا..... گھڑی کی طرف نظر
 بڑی تو اس کی سویاں چھ کے ہندسے کی طرف دوڑ رہی
 تھیں وہ جلدی سے اپنے کمرے کی طرف چل دی۔
 گھر والے کی عزت کے گھر گئے تھے حسن نے اسے فون
 کیا تھا کہ وہ تیار رہے آج کہیں باہر کھانا کھانے چلیں گے۔
 کافی دن سے اس کی طبیعت عجیب سی ہو رہی تھی۔
 ساس قریبی ڈاکٹر کے پاس لے گئیں جس نے اس کے
 امید سے ہونے کی تصدیق کر دی تھی۔
 گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی کیونکہ پچیس سال بعد
 گھر میں کوئی ننھا مہمان آتا تھا اور آج کی دعوت بھی حسن
 کی طرف سے اسی خوشی میں تھی۔ باہر کھانا کھانے کا موقع
 بھی کافی عرصے بعد آیا تھا ورنہ وہ صبح سے شام تک گھر
 کے کاموں اور حسن آفس کے کاموں میں اتنا مصروف
 ہوتا کہ ایسا کوئی پروگرام بن ہی نہیں پاتا تھا۔
 آمنہ نے جونی میں بل ڈالے، آنکھوں میں کا جل
 کی دھار کھینچی اور ہلکی سی لپ اسٹک لگا کر تیار ہوگئی۔
 اتنی سی تیاری میں وہ بہت پیاری لگتی تھی کیونکہ
 اماں نے شادی سے پہلے اسے بھی کچھ لگانے نہیں دیا تھا

نصیحت

ایک لڑکی کی منگنی ہوئی تو ایک خاتون نے اسے نصیحت کی۔ ”تمہیں شوہر سے اپنے حقوق کا پہلے ہی دن مطالبہ کر دینا چاہیے۔ میری طرف دیکھو بیس سال قبل ہماری شادی ہوئی تھی تو میں نے اپنے شوہر سے کہا تھا کہ وہ شراب نوشی اور تباہی کو نوشی فوراً ترک کر دے۔“

”تو کیا آپ کے شوہر نے یہ عادتیں ترک کر دی تھیں؟“ لڑکی نے پوچھا۔ ”مجھے نہیں معلوم۔“ خاتون نے کہا۔

”میں نے اسے بیس سال سے نہیں دیکھا ہے۔“

مرسلہ..... غزالہ طارق، سرگودھا

دیور کے کمرے سے باہر جانے کے بعد آمنہ نے استری سیٹ کر رکھ دی۔ استری کی طرح اس کا دل بھی گرم لودینے لگا تو آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے..... اماں کا دیا ہوا سامان گھبراؤ میں تو زیادہ تھا مگر پرانے وقتوں کا..... عائنہ تھوڑا سامان لائی تھی مگر ساری چیزیں بے حد جدید اور کارآمد تھیں۔

اماں کے دیے جوڑے بھی جوں کہ توں رکھے تھے اصل جاپانی مگر آج کل تو چائنا کا دور تھا اور ان جوڑوں میں فٹائل کی گولیوں کی خوشبو اس قدر بس گئی تھی کہ سب نے دیکھ کر ناک بھوں پڑھا کہ اس کے بیڈ پر ہی واپس رکھ دیے تھے اور اس نے ننھے جوڑے ساتھ بیٹی میں واپس۔

آمنہ نے دیکھے دل سے جھٹ پر رچی سامان سے بھری اصلی لوہے کی بھدی سی پٹی کے بارے میں سوچا جس میں اس کی ننٹی تھی، ننھی خواہشیں اور حسرتیں دفن تھیں۔

”چلو آمنہ میں تمہیں اماں کی طرف چھوڑ دوں۔“ حسن آفس جانے کے لیے تیار کھڑے تھے تو اسے اداس دیکھ کر آواز دے ڈالی۔

”مگر اماں.....؟“

اس لیے اس کی جلد بہت نرم اور شفاف تھی۔ موٹر سائیکل کے ہارن کی آواز پر آئینے پر الوادی نگاہ ڈالی اور دروازہ کھولنے چل دی۔

☆☆☆

”بھابی آپ کی استری کہاں ہے، مجھے اپنی شرٹ استری کرنی ہے۔“ چھوٹے دیور نے کمرے میں آ کر آواز لگائی، آمنہ تسبیح پڑھ رہی تھی سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

”وہ اماں والی استری بابا آدم کے زمانے کی تھی اور اب آخری سانسوں پر بھی کل رات رحلت فرما گئی، بس نے خود ہی وضاحت دی کیونکہ آمنہ کی تو کچھ پوچھنے کی عادت ہی نہیں تھی۔

آمنہ کی ساس نے بھی صحیح موقع پر بیٹوں کی شادی کی تھی جب گھر کا تقریباً سارا سامان جواب دے چکا تھا یا دینے والا تھا۔

اماں کے کہنے پر آمنہ اور عائنہ نے اپنی، اپنی استریاں کھول کر اسے کمروں میں رکھ لی تھیں۔ ضرورت پڑنے پر استعمال کر سکتی تھیں..... عائنہ کو ذرا دیر سے اٹھنے کی عادی تھی مگر آمنہ شروع سے ہی نماز پڑھ کر اذکار اور تلاوت کی عادی تھی۔ سو چھوٹا دیور اس کے کمرے میں چلا آیا تھا اسے کاج ٹرپ پر جانا تھا۔ اس کی ساس نے اپنے بیٹوں کی تربیت کافی سختی سے کی تھی، وہ اپنے کام زیادہ تر خود کرنے کے عادی تھے۔

”ارے بھابی اس میں کیا پتھر بھرے ہیں؟“ چھوٹا دیور زیادہ تر اماں کے قریب رہا تھا اس لیے اس میں کافی ساری زنانہ خوبیاں بدرجہ اتم موجود تھیں۔

”یہ تو بہت بھاری ہے، عائنہ بھابی کی استری اتنی ہلکی ہے اور مزے کی بات کہ اس میں سے تو پانی کا سپرے بھی ہوتا ہے۔ آپ کا تو سارا سامان بہت ہی پرانا ور آؤٹ آف فیشن ہے آپ نے اپنی شاپنگ خود نہیں کی تھی؟“ کالر کاٹن بند کرتا وہ سوال پر سوال پوچھ رہا تھا اور آمنہ ہمیشہ کی طرح خاموش تھی۔

”جی میرے تو ہاتھ دکھ گئے آپ کی ہمت ہے بھابی تو بھائی کے اتنے کپڑے اس سے استری کرتی ہیں۔“

”ان سے میں نے رات کو ہی پوچھ لیا تھا، رات کو تمہارے ابا کا فون آیا تھا کہ وہ اداس ہو رہے ہیں۔“ وہ اماں، ابا سے ملنے کی خوشی میں ساری باتیں بھول کر ناشتا بنانے چل دی۔

☆☆☆

سردیاں جانے والی تھیں اور ابا رات کو اسٹور سے آتے ہوئے آمنہ کے لیے مونگ پھلی، تل کے لڈو اور گاجر کا حلوا لیتے آئے تھے۔ اماں نے حسن کو فون کر دیا تھا کہ وہ رات کو آمنہ کو اپنے پاس رکھیں گے اور صبح خود چھوڑ جائیں گے۔

”ارے آپ بھی ناں کوئی چیز لے آتے۔ پتا بھی ہے اتنی مہنگائی ہے اور اب خیر سے نئے مہمان کی تیاری کرنی ہے۔“

”ہو جائے گا نیک بخت۔“ ابا بولے۔

”دن ہی کتنے رہ گئے ہیں، اللہ خیر کا وقت لائے میں نے تو یہ خبر سنتے ہی کینٹی ڈال دی تھی۔ بس کچھ دنوں میں نکلنے والی ہے تو بازار جا کر سارا سامان لے آؤں گی۔“ مونگ پھلی چھلینے ہوئے آمنہ کے ہاتھ رک لے کر لیے رکے اس نے دھیمی نظروں سے اپنی ماں کو بولتے دیکھا اور سنا۔

”اماں جب سامان لینے جائیں تو مجھے بلا لیجیے گا، میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔“ اس نے دبے لہجے میں کہا۔

”ہائے، ہائے دماغ پھرا ہے کیا..... ان حالوں میں بازاروں میں گھومتی پھرو گی۔ سال بھر میں اتنی بڑی ہو گئی کہ اب میں تیرے مشوروں پر چلوں گی۔ شادی پر دیکھا تھا اتنا سامان دیکھ کر سب کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ سارا محن، برآمدہ بھر گیا تھا اتنا سامان نکلا تھا پٹی سے۔“ اماں فخر سے پٹنی کو یاد کرنے لگیں۔

”مگر اماں چلیں ہم بعد میں سامان لے لیں گے، آپ کے پاس ایک مہینہ تو رکنا ہی ہو گا ناں مجھے.....“ آواز کافی مدھم تھی، اماں ناراض سی کھانا لگانے چل دیں۔ اور ابا ان کا دل بہلانے لگے۔

اب وہ اماں کو کیا بتاتی کہ آپ کا اتنی مقدار میں دیا

گیا فرسودہ سامان اسے سسرال میں کس طرح قدم، قدم پر ڈھکیل کرتا ہے۔

تھوڑی دیر میں اماں بھی اپنی ناراضی بھول بھال کے اس کے پاس آ بیٹھیں، آخر ماں تھیں۔ ابا کھانا کھانے کے بعد سونے چل دیے تھے اور اماں اسے آنے والے وقت کے بارے میں سمجھانے لگیں۔ کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے اماں کے پاس معلومات کا ایک خزانہ تھا اور پھر باتیں کرتے، کرتے اتنی رات ڈھل گئی کہ ماں، پٹی کو پتا ہی نہیں چلا..... وہ بھی سونے کی تیاریاں کرنے لگی۔ آخری پہر کے تارے اب اپنی ڈیوٹی سنبھالنے والے تھے، چاند کبھی بادلوں کی اوٹ سے جھانک کر دیکھ لیتا نیند اور رات کی خاموشی سارے آنگن میں پھیل رہی تھی۔

☆☆☆

آج صبح سے ہی آمنہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، دودن پہلے احسن اسے اماں، ابا کے پاس چھوڑ گئے تھے کہ رواج کے مطابق پہلا بچہ بیٹے میں ہی ہوتا تھا۔ آج اماں نے ابا کی چھٹی کروالی بھی کہ شاید کسی بھی وقت اسپتال جانا پڑ جائے۔ ”آمنہ کے ابا جلدی سے ٹیکسی لے آؤ۔“ ابا اخبار پڑھ رہے تھے کہ اماں... بوکھلائی ہوئی کمرے سے برآمد ہوئیں۔ وہ جلدی سے ایک چھوٹے سے بیگ میں ضرورت کی چیزیں رکھنے لگیں۔ اندر ہی اندر تکلیف کو برداشت کرتی آمنہ سورہ مریم پڑھ رہی تھی بقول اماں کے آخری وقت میں سورہ مریم کی تلاوت آسانی پیدا کر دیتی ہے۔

پاس ہی ایک میٹرنٹی ہوم تھا۔ اماں، آمنہ کو وہاں لے آئیں تھیں ان ڈاکٹرنی صاحبہ کا نام اور کام سارے علاقے میں مشہور تھا وہ دو تین بار پہلے بھی آمنہ کو یہاں چیک اپ کے لیے لائی تھیں۔ ڈاکٹر صاحبہ عادت کی بھی بہت اچھی تھیں۔

”مبارک ہو خالہ آپ نانی بن گئی ہیں..... اللہ کی رحمت آئی ہے، نواسی ہوئی ہے اب جلدی سے مٹھائی کھلائیں۔“ نرس نے دانت نکالتے ہوئے مبارک باد دی اور ساتھ میں مٹھائی کا مطالبہ بھی کر دیا۔

وہ کافی دن سے کتر رہی تھی۔

”نہیں اماں، میں اپنی معصوم بچی کے خواب اور خواہشیں کسی بچی میں بند کر کے نہیں رکھوں گی۔ وہ اپنی خوشی اور مرضی سے جیے گی۔ اللہ زندگی دے اس کے باپ کو ان کی اتنی اچھی نوکری ہے میں انہیں کہوں گی ہر ماہ کچھ نہ کچھ بچا کر اس کے نام سے بیک میں رکھوا دیں۔ اور جب اس کی شادی کا وقت آئے گا تو میں سب سامان اس کی پسند اور وقت کی ضرورت کے مطابق خریدوں گی۔“ سوئی فاطمہ کو تھپکتے ہوئے اس نے پیار سے اماں کا ہاتھ دبایا اور تیار ہونے چل دی۔

اس نے اماں کو بتایا کہ جھمنہ لے جانے پر انہیں ساری عمر جتنے طعنے ملے اس سے زیادہ اسے اس ڈھیر سارے سامان کی وجہ سے شرمندگی اٹھانی پڑی اب خاموش ہونے کی باری اماں کی تھی۔

آئینے کے سامنے کھڑی چوٹی یا ندھتی آمنہ آج خود کو بہت ہلکا اور مطمئن محسوس کر رہی تھی اس نے سوچ لیا تھا کہ اللہ پاک نے اگر اسے بیٹی دی تو وہ اس کی تربیت بہت دلار سے کرے گی۔ اس کی ہر جائز خواہش کو پورا کرے گی اور اس کے چھین کو کسی بھدی سی بیٹی میں بند ہونے نہیں دے گی۔

☆☆☆

”ارے بیٹا تم تو ہمارے گھر کی رونق لے کر جا رہے ہو اب ہمارا دل فاطمہ کے بغیر کیسے لگے گا۔“ اماں نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا۔

کھانا کھانے بعد وہ اور حسن جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اماں بدستور خاموش تھیں۔

”اور ہاں اماں اب تم اپنے اور اماں کے عمرے پر جانے کے لیے کمپنی ڈالو، فاطمہ کا فرض تمہارا نہیں.....“ دروازے کی دہلیز سے نکلتے ہوئے آمنہ نے اماں کو اک سمت کا سرا پڑا دیا تھا اور وہ بھی اپنی بیٹی کی سمجھداری اور صبر پر مطمئن سی دروازے کی کنڈی لگا کر سوچ کے لیے ایک نئے سفر پر چل دی۔

”ہاں، ہاں مٹھائی بہت، ماں، بچی دونوں ٹھیک ہیں ناں۔“ اماں نے نگر سے پوچھا۔

”ہاں، ہاں خالہ زچہ، بچہ دونوں ٹھیک ہیں ابھی ڈاکٹر صاحبہ باہر آئیں تو آپ سے ملواتی ہوں۔“

اماں جلدی سے باہر برآمدے میں بیٹھے حسن اور آمنہ کے ابا کو یہ خبر سنانے چل دیں۔

آمنہ نے اپنی بیٹی کا نام فاطمہ رکھا تھا۔ بلکہ رکھا کیا تھا پہلے ہی لڑکا اور لڑکی کی مناسبت سے اس کی نند نے نام سوچ لیے تھے۔ بچی آمنہ کی طرح بہت... پیاری تھی۔ ننھیال و ددھیال میں پہلی بچی تھی تو سب کی طرف سے ڈھیروں پیار اور خرچیاں مل رہی تھیں۔

آمنہ کا چھلا پورا ہو گیا تھا۔ اور دو دن بعد حسن نے اسے لینے آتا تھا وہ کل ہی اماں کے ساتھ بازار جا کے سامان خرید لاتی تھی بالکل جدید، فیشن ایبل اور کارآمد.....

”اماں آپ ذرا فاطمہ کو سنہال لیں، میں تیار ہو جاؤں۔“ اس نے بچی کو نہلا، دھلا کر حسب روایت باندھ دیا تھا جیسا کہ اماں نے بتایا تھا اور اب بچی اطمینان سے سونے کی تیاریوں میں تھی۔

”آمنہ.....!“ کمرے کی طرف جاتی اماں نے اسے پکارا۔

”جی اماں.....“

”وہ فاطمہ کی اتنی خرچی جمع ہو گئی ہے یوں کرو ایک بیٹی منگوا کر یہیں رکھ چھوڑو..... پھر کچھ نہ کچھ اس میں ڈالتی رہنا، حسن میاں کی آسانی کے حساب سے۔“ آمنہ پلنگ کے کنارے پرٹک تو مٹی تھی مگر اس نے اماں کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

”تیرے گھر میں تو جگہ نہیں ہے اور میں بھی حسب توفیق جوا کٹھا ہوتا گیا لے، لے کر اس میں ڈالتی رہوں گی، ہمارا تیرے اور اس کے سوا ہے کون جو ہم اکٹھا کریں۔“ وہ بکر بکر ماں کو دیکھے جا رہی تھی۔

”کیا بات ہے گوٹے کا گڑ کھا کر بیٹھی ہو کیا، تم سے بات کر رہی ہوں میں۔“ اماں نے پریشان نظروں سے اس کی طرف دیکھا، آخر وہ لمحہ آن پہنچا تھا جس سے

امرت

شیریں حیدر

قسط 9

تخلیق کائنات سے لے کر اب تک... کئی ادوار بدلے مگر عورت کی کہانی ہر دور میں لگ بھگ وہی رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں رشتوں کی ڈور میں باندھا تو اس کا مقصد یہ تھا کہ ہم اپنی تخلیق کے مقصد کو اور بھی خوب صورت بنائیں مگر اس کے پیدا کردہ دل میں جذبہ بھی اسی کے پیدا کردہ تھے۔ محبت، نفرت، رشک، حسد، رنج، غصہ اور خوشی... اب ہم پر منحصر ہوتا ہے کہ ہم کس جذبہ کو خود پر حاوی کر لیتے ہیں، یہ ہماری خصلت بن جاتا ہے اور ہماری کل شخصیت کا خلاصہ... یہی ہمارے کردار کی تعمیر کرتا ہے اور ہم اسی کا تاثر دوسروں پر عمر بھر کے لیے چھوڑتے ہیں۔ ہماری عادات صرف ہم پر ہی نہیں بلکہ دوسروں کی زندگیوں پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔ کسی کی زندگی کا سفر کس طرح سہل یا کٹھن ہوتا ہے اس کا انحصار ان لوگوں پر ہوتا ہے جو ان کی زندگی کے اہم کردار ہوتے ہیں اور جن کا ہونا یا نہ ہونا اہمیت رکھتا ہے۔ پیدائش سے لے کر اپنی موت تک رشتوں کی ڈور سے بندھے ہوئے کردار زندگی کو پنس کر گزارتے ہیں یا روکی، مشقت سے سانس لیتے ہیں یا خوشیوں کے ہندولوں میں جھولتے ہوئے اس کا سارا دار و مدار ان سے وابستہ رشتوں پر ہوتا ہے۔ وقت بدل جاتے ہیں مگر کہانی وہی رہتی ہے اور اپنی باری سے اس میں مختلف کردار شامل ہوتے رہتے ہیں۔

زندگی کے انہی چچ و خم اور نشیب و فراز سے نبرد آزما ہوتی ایک چشم کشا تحریر.....





ضبط کا حوصلہ نہیں باقی

”امرت گل..... بنت کمال احمد، تمہیں زین جمال ولد جمال احمد کے ساتھ..... تمام گواہان کی موجودگی میں، بعوض حق مہر پانچ لاکھ مکہ رائج الوقت، نکاح قبول ہے؟“ میرے کانوں میں گویا پگھلا ہوا سیسہ اڑیلا جا رہا تھا..... ایک اور لڑکی ماں باپ کی خواہشات پر ملی چڑھائی جا رہی تھی، خاندان کی ساکھ اور باپ کے مان کے نام پر! ”نہیں..... نہیں..... اور نہیں ہرگز نہیں!“ میں چیخ، چیخ کر کہنا چاہ رہی تھی مگر میرے ایک طرف بیٹھے ہوئے ابو جان اور ان کے ساتھ جمال چاچو، دوسری طرف امو جان جو میرے ساتھ گلی بیٹھی تھیں اور ان کا وجود دلرز رہا تھا، ان پر زلزلے کی کیفیت طاری تھی۔ ایسا ہی ہوتا چاہیے تھا ان کے ساتھ، میری زندگی کی خوشیوں کو پہاڑوں کی طرح ریزہ، ریزہ کر کے ہر طرف بکھیر دیا گیا تھا تو اس کا لرزہ تو طاری ہوتا چاہیے تھا ناں۔

”ہاں کہو بیٹا.....“ ابو جان کا ہاتھ میرے سر پر آن لگا تھا۔ ”قاسمی صاحب پوچھ رہے ہیں کہ تمہیں یہ نکاح قبول ہے؟“

میں خاموش رہی، نہیں کرنا تھا یہ نکاح قبول مجھے۔ صاف انکار تھا مجھے ابو جان کے اس فیصلے سے جو انہوں نے اپنے مان کے نام پر مجھ پر مسلط کر دیا تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ بچپن میں سال پہلے کی پھوپھو مجھ سے بہتر تھیں جنہوں نے اپنی روایات سے بغاوت کر لی تھی..... مگر ہاں، اس لیے کہ ان کے ساتھ ان کا محبوب بہادری کے ساتھ کھڑا تھا۔ میرا طالب و مطلوب تو اس بات کو سن کر ہی میدان چھوڑ کر بھاگ گیا تھا کہ میرے ابو جان نے اس کے رشتے سے انکار کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے کیونکہ بڑی پھوپھو کا یہ عجیب سا مطالبہ تھا کہ میرا رشتہ اگر سرمد کو نہیں دیا گیا تو کامل کو بھی نہیں دیا جائے گا۔

ہاں جمال چاچو کے ہاں رشتہ ہونے پر کسی کو کوئی اعتراض نہ تھا..... کیونکہ شاید یہ واحد رشتہ تھا جو جمال چاچو کے ہاں ہونا ممکن تھا اور بقول ابو جان، دادا جان کا کہنا تھا کہ اس رشتے کی وجہ سے جمال چاچو کا اس خاندان سے رشتہ مضبوط رہتا، ان کی اگلی نسل گاؤں سے منسلک رہتی۔ کتنا ضروری تھا جمال چاچو کے خاندان کی اگلی نسل کا اس گاؤں سے منسلک رہنا.....! ان کے اپنے بچے تو گاؤں کے ماحول سے دور بھاگتے تھے، مہینوں گاؤں کی شکل بھی نہ دیکھتے تھے، نہ ہی انہیں گاؤں کے رشتے دہروں کا علم تھا اور اس سے اگلی نسل کے رابطے گاؤں سے بحال کرنے کے خواب دیکھے جا رہے تھے۔

”کتنا جانتے ہیں ہم سب زین کو امو جان؟“ میں نے ان کے سوال کرنے پر ان سے پوچھا تھا۔ ”کیا اتنا کہ اس سے میرا رشتہ کرنے کی خواہش ابو جان نے بال لی ہے؟“

”ایسا تو ہر رشتے میں ہوتا ہے بیٹا..... جہاں ہمیں باہر بھی رشتہ ہو گا تو ہم اس لڑکے کو اتنا ہی یا اس سے بھی کم جانتے ہوں گے۔“ انہوں نے رساں سے کہا۔ ”اور پھر یہ ہماری تمہاری نہیں..... تمہارے دادا جان کی خواہش تھی۔“

”دنیا سے چلے جانے والوں کی خواہشات کیا زندہ انسانوں سے زیادہ اہم ہوتی ہیں؟“ میں سسکی تھی۔

”بیٹا..... تمہارے جمال چاچو تمہیں بہت پیار کرتے ہیں۔ کیا تم اپنے ابو جان کی خواہش، ان کے باپ کی خواہش کو کسی وجہ کے بغیر ٹھکرادو گی..... کیا تمہیں اس خاندان میں کسی سے بھی رشتہ ہونے پر اعتراض ہے؟“

”ایسا نہیں ہے امو جان.....“ میں نے بحث کی۔ ”دین کے علاوہ خاندان میں جو آپشن ہیں ان کو دیکھیں، ابو جان سے بات کریں.....“ میں نے کامل کا نام لیے بغیر ان سے بات کی۔

”تم کامل کے بارے میں کہہ رہی ہوتی بیٹا؟“ ان کے سوال پر میں خاموش رہی، میں ان سے کیا کہتی۔ وہ اس نازک موڑ پر اپنا مقدمہ لڑنے کے بجائے، میرے ساتھ کھڑا ہونے کے بجائے..... مجھے بتائے، مجھ سے ملے

بغیر چلا گیا تھا، میں اس سے اور زیادہ کی کیا امید کرتی۔

”میں اسی کی بات کر رہی ہوں اموجان مگر وہ میری خواہش رکھنے کے باوجود یوں چلا گیا، اس نے کوشش ہی نہیں کی۔“ میں نے باپوی سے کہا۔ ”میں اس کے بارے میں بھلا کس منہ سے بات کروں؟“

”وہ بہت کوشش کر کے..... بہت منت سماجت کر کے..... تمہارے ابو جان کے تقریباً پاؤں پڑ کر کہتا رہا مگر ان تمام بزرگوں نے مل کر نہ صرف اس کی بے عزتی کی بلکہ اسے گھر سے نکال دیا کہ وہ اس باپ کا بیٹا ہے جس نے کئی برس پہلے اس گھر کی عزت کو قدموں تلے روند دیا تھا۔“ اموجان نے کہا۔

”ایسا کس نے کہا؟“ میں حیرت سے منہ کھولی کر رہ گئی۔

”تمہارے ابو جان نے اور بڑی پچھو نے.....“ اموجان نے کہا۔ ”حالانکہ حقیقت سب جانتے ہیں، میں نے بہت کوشش کی مگر اس وقت ہوا کا رخ مخالف تھا بیٹا..... اگر تم کوئی بھی قدم اٹھانا چاہو تو میں تمہارا ساتھ دینے کو تیار ہوں تمہاری دادی جان کی طرح..... جنہوں نے اندر خانے گل بانو کا نکاح کروا کر اسے خاموشی سے رخصت کر دیا تھا..... اس کے ابا جان اس نکاح میں شریک بھی نہ تھے۔“ اپنی دانست میں وہ میرے سامنے انکشافات کر رہی تھیں مگر دادی جان کی زبانی میں اس ساری کہانی کو سن چکی تھی..... ”تمہارے ابو جان کی خواہش جو بھی ہو، میں نہیں چاہتی کہ تم پر جبر یا زبردستی کی جائے، میں تمہارے ہر فیصلے میں تمہارے ساتھ کھڑی ہوں، مجھے تمہاری خواہش کا احترام ہے.....“ میں نے ان کا چہرہ دیکھا اور میرے اندر امید کی کرن جاگی۔ ”میں اسی طرح خاموشی سے تمہارا نکاح کامل کے ساتھ کروا کر تمہیں رخصت کر دوں گی، تم خوش ہو گی تو مجھے سکون ہو گا۔“

”دادی جان نے گل پچھو کو ان کی زندگی کی خوشی تو دلا دی اموجان مگر ان کے ہاتھ کیا آیا، بیٹی کی عمر بھر کی ہدائی..... گل پچھو نے اپنی زندگی کا بہترین وقت کتنے ہی رشتوں کے بغیر گزار دیا، وہ ہم سے ملنے کو ترستی رہیں اور ہم بھی اپنی اتنی پیاری پچھو کے پیار سے محروم رہے۔“ میں نے روتے ہوئے کہا۔ ”میں جانتی ہوں کہ دادی جان ان کو کتنا مس کرتی تھیں..... میں جانتی ہوں کہ گل پچھو کی کوئی خوشی مکمل نہیں ہوتی تھی کہ اس میں ان کے اپنے پیارے موجود نہ ہوتے تھے..... اور پھر حاصل کیا ہوا، اتنے سالوں کے بعد بھی ان کے بیٹے کو سب بزرگوں سے یہ سننا پڑا ہے کہ وہ ان ماں، باپ کا بیٹا تھا جو اس خاندان کی اور اپنے ماں باپ کی عزت کو روند کر چلے گئے تھے۔ میں رشتوں کی ڈور توڑ کر سکون حاصل نہیں کر سکوں گی اموجان..... جو بھی ہو گا اس میں میرے لیے سب کی موجودگی، سب کی رضا اور سب کی خوشی کا ہونا اہم ہے..... کامل چلا گیا ہے مگر میں ابو جان کے سامنے اپنا مقدمہ خود لڑوں گی۔“ میں نے عزم کیا تھا۔

☆☆☆

”کے جی کلاس کے لیے آئندہ سیشن کے لیے، چھٹیوں کے تین مہینوں کے بعد نئی ٹیچر کی ضرورت ہو گی.....“ تمام ٹیچرز کی ماہانہ میٹنگ میں پرنسپل نے اعلان کیا۔ ”کیونکہ مس گل بغیر کسی پلاننگ اور پیچھلی اطلاع کے پریکٹس ہو گئی ہیں۔ اگرچہ چند ہفتوں کے بعد، تین ماہ کی چھٹیاں ہو رہی ہیں اور ہمیں کوئی مسئلہ نہیں ہو گا مگر ہمیں نئے سیشن کے لیے ایک اچھی ٹیچر چاہیے ہو گی۔ آپ کے جاننے والوں میں اگر کوئی ہمارے اسکول کے معیار پر پورا اترتی ہو تو آپ اسے انٹرویو کے لیے بلا لیں۔“ انہوں نے تمام ٹیچرز سے کہا تھا۔ کیا ضرورت تھی انہیں میرے بارے میں اتنی وضاحت کرنے کی..... ایسا کہنے کی کہ بغیر کسی پلاننگ کے اور پیچھلی اطلاع سے ان کی کیا مراد تھی، مجھے ان کی بات اچھی نہیں لگی تھی مگر میں خاموش رہی۔

”ہاں اگر کوئی پہلے سے تربیت شدہ ٹیچر ملے تو وہ سب سے بہتر ہے کیونکہ مس گل کو ٹیچنگ کا کوئی تجربہ نہیں تھا، ابھی تو ہم نے آن جاب ٹریننگ دی تھی، ہاں جب وہ اس کی اہل ہو گئیں کہ ہم انہیں فخر سے والدین کے سامنے

ناٹ لیں تو وہ بغیر بتائے.....“ مسز عالیہ جلیل نے مزید اضافہ کیا تاکہ میں اچھی طرح شرمندہ ہو سکوں۔ میں اپنی سیٹ پر بل کھا کر رہ گئی۔

”اسکول کے اصولوں کے مطابق تو انہیں اسکول سے اس کی پیشگی اجازت لینا لازم تھی.....“ رپنسل نے پھر بات شروع کی، جانے یہ لوگ خود کو خدا کیوں سمجھ بیٹھی تھیں کہ جس کی اجازت کے بغیر ایک پتا بھی حرکت نہیں کر سکتا۔ میں اپنی سیٹ سے اٹھی، معذرت کی کہ مجھے ہاتھ روم جانا ہے اور اپنا بیگ اور فائلیں اٹھا کر باہر نکل آئی۔ کھلی فضا میں بیٹھ کر گہری گہری سانسیں لینے لگی، ساتھ ہی ان آنسوؤں کو بہہ جانے دیا جو اس وقت سے قابو میں رکھے ہوئے تھے۔ کیا جرم کر دیا تھا میں نے..... کیا خطا تھی اس معصوم کی کہ جس کی دنیا میں آنے کی خبر نے سب پر بجلی گرا دی تھی۔ کوئی بے بسی سی بے بسی محسوس ہو رہی تھی، ابوجان کے غلط فیصلے نے میری زندگی میں سب کچھ غلط کر دیا تھا۔ خود تو وہ سکون میں تھے..... ازلی سکون جو کسی کو زندگی میں میسر نہیں آتا۔

☆☆☆

میرے دل سے واپسی کے سفر میں ہی وہ بھیانک حادثہ ہوا تھا جس نے ہم سب سے ابوجان کو چھین لیا تھا۔ ابوجان گاڑی کی پچھلی سیٹ پر تھیں، انہیں بہت سی چوٹیں آئیں مگر اگلی سیٹ پر بیٹھے ابوجان اور نصیر چاچا لقمہ اجل بن گئے تھے..... میری شادی ہوتے ہی مجھ سے میرے باپ کا سا بہان چھین گیا تھا۔ ویسے کی تقریب کے ختم ہونے کے بعد ہم گھر پہنچے ہی تھے اور لاؤنچ میں جمع تھے، ہنسی مذاق اور قہقہے..... تصاویر بنانے کا دور ختم ہی نہیں ہو رہا تھا۔ ملازمین کو کچائے بنانے کا کہہ کر چاچی آئیں کہ اسی دوران وہ منحوس کال آئی۔ چاچو نے فون اٹھایا اور غیر بہم طریقے سے بات کرنے لگے، سب ہم تن کوش تھے۔

”نہیں، نہیں!“ ان کی آواز نے سب کو احساس دلایا کہ معاملہ گمبھیر تھا..... فون رکھ کر انہوں نے صوفے پر بیٹھ کر اپنا سر تھام لیا، ان کی آنکھیں اشک بار تھیں۔

”کیا ہوا.....؟“ کئی لوگوں کے منہ سے اسٹھے سوال نکلا۔

”لٹ گئے ہم..... ختم ہو گئے ہم!“ چاچو نے سسک کر کہا۔

”کچھ کہیں بھی تو.....“ چاچی نے انہیں جھجھوڑ کر سوال کیا تھا۔ ”کیا کسی فیکٹری میں آگ لگ گئی ہے؟“ ان کے خیال میں غالباً لٹ جانا، کاروبار میں نقصان کے باعث ہی ہو سکتا ہے۔ میرے دل میں عجیب سا احساس ہوا، جانے ان کا کیا نقصان ہو گیا تھا، شاید کچھ ایسا جو ناقابلِ تلافی تھا، میرے قدیم اس گھر کے لیے مبارک ثابت نہیں ہوئے تھے۔ مگر چاچو جب بولے تو میرے لیے تو قیامت ہی آگئی تھی۔

☆☆☆

میں غمِ حال اور بے حال جب سب کے ساتھ گاؤں پہنچی تو ابوجان نیند کی دواؤں کے زیر اثر سو رہی تھیں اور ابدی نیند سو جانے والے ابوجان کے آخری دیدار سے بھی محروم رہی تھیں۔ میں پھوٹ، پھوٹ کر روئی تھی..... کاش ایسا نہ ہوتا، مجھے ان کا چہرہ دیکھ کر ان کی آخری باتیں یاد آگئی تھیں۔ ویسے کے سناچ پر میں کھڑے ہو کر ان سے گلے ملی تھی، میرے ساتھ ہی کھڑے زین نے ان سے مل کر ان کی طبیعت کے بارے میں پوچھا تھا۔

”ارے میں بالکل ٹھیک ہوں بیٹا، اب تو اور بھی ٹھیک ہو گیا ہوں، تم دونوں کو ساتھ اور خوش دیکھ کر، سوچ رہا ہوں کہ آج ابا جان کی روح کس قدر خوش ہوگی۔“ میری تو خیر تھی، میری خوشی اہم نہ تھی، نہ میرے جذبات اور احساسات کی کوئی وقعت..... اصل مقصد تو ابا جان کی روح کی خوش تھی، میں نے جل کر سوچا تھا۔

”میری بیٹی مجھے تم پر فخر ہے کہ تم نے میرے فیصلے کی لاج رکھی، اس رشتے کو تم نے مرتے دم تک نبھانا ہے،



دہلی اور دہلی میں پیش، پیش ہوتے تھے۔ ان دونوں کو علم تھا کہ گاؤں کے رسوم و رواج کیا ہیں اور خاندان کی روایات کی بھراٹ کیا۔ یہ تو ان کے اپنے گھر کی سادہ کا معاملہ تھا، لوگ کہتے کہ باپ کی وفات نے ان کی کیسی مت ماری۔ لہٰذا انہیں کسی کا خیال نہیں، اس لیے وہ اپنے غم کو اپنے اندر اتارے ہوئے لوگوں کا خیال رکھ رہے تھے۔

زین، ابو جان کا بڑا دادا ہونے کی حیثیت سے اہم تھا اور لوگوں سے دونوں بھائیوں کے ساتھ مل کر پرستہ وصول کر رہا تھا۔ جب بھی تھک جاتا تو اندر آ جاتا اور کمرے میں جا کر آرام کرنے لگتا۔ کئی بار وہ میرے پاس بھی آیا اور کئی بار ایسا ہوا کہ اسے اندر آتے دیکھ کر اموجان نے مجھے زبردستی اٹھا دیا کہ جا کر اس سے کچھ کھانے پینے کا پوچھ لوں۔ اسے زیادہ تر تو سگریٹ کی طلب اندر لے کر آتی تھی تاکہ وہ تنہائی میں اپنا شوق پورا کر سکے۔

”زین آپ کو کافی بنادوں؟“ پہلی بار جب اموجان نے مجھے اندر بھیجا تھا تو میں نے اس سے سوال کیا تھا۔

”نہیں.....“ اس نے اپنا ہاتھ نیچے کر کے وہ سگریٹ چھپانا چاہی تھی جو وہ سلگا چکا تھا۔

”کھانا کھایا آپ نے؟“ میں نے حلق میں اپنے آنسوؤں کا گھونٹ اتارا۔

”تم نے کھایا کھانا؟“ اس نے غالباً سگریٹ بجھا کر پھینک دی تھی۔ ”یہاں آؤ میرے پاس!“

”جی!“ میں نے چند قدم کا فاصلہ طے کیا اور اس کے پاس صوفے پر جا بیٹھی۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ لگا لیا، میرا سر تھپکنے لگا، میرے آنسوؤں کے بندھن ٹوٹ گئے، میں سسکیاں اور ہچکیاں لے کر رو رہی تھی اور اس کی انگلیاں میرے بالوں میں گردش کر رہی تھیں۔

”حوصلہ کرو، میری جان!“

”کہاں سے لاؤں ایسا حوصلہ زین؟“ میں ہلکنے لگی تھی۔ ”مجھ سے یہ دکھ برداشت نہیں ہو رہا۔“

”وقت گئے گا پیاری..... جانتا ہوں کہ تمہارا دکھ بہت بڑا ہے اور کوئی بھی الفاظ بہت چھوٹے کہ تمہارے دکھ کا مداوا کر سکیں۔ تاہم جی بہت اچھے انسان تھے اور یقیناً بہت اچھے باپ، ان کی کمی کو کوئی بھی پورا نہیں کر سکتا۔ وہ اس خاندان کی پہچان تھے، نہ صرف اس گاؤں میں بلکہ جہاں تک لوگ اس گاؤں کو جانتے ہیں۔“

زین کے منہ سے ایسی باتیں سن کر مجھے حیرت ہو رہی تھی، کہاں وہ باہر کی یونیورسٹیوں اور کالجوں کا پڑھا ہوا بے پروا سلاٹک اور کہاں ایسے تعزیتی کلمات..... غالباً وہ دونوں بھائیوں اور خاندان کے باقی لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر پرستہ وصول کرتے ہوئے ایسے روایتی الفاظ بار، بار سن کر انہیں حفظ کر چکا تھا۔ اگرچہ وہ انگریزی میں ہی بات کر رہا تھا مگر ایسے انداز میں کہ مجھے سکون مل رہا تھا۔

واقعی ابو جان اس گاؤں میں ہی نہیں بلکہ اس علاقے میں اس خاندان کی پہچان تھے، وہ اس خاندان کے وہ چراغ تھے کہ جس سے علاقہ ہمارے خاندان کو جانتا اور پہچانتا تھا۔ وہ نہ تو ایسے تنگ نظر تھے اور نہ ہی حد سے زیادہ آزاد خیال اور ان کی شخصیت کا ایسی خاصہ انہیں دوسروں سے ممتاز کرتا تھا۔ ایک میرے معاملے میں انہوں نے میری رائے کا احترام نہ کیا تھا، ورنہ وہ اپنی اولادوں سے بہت دوستانہ انداز رکھتے تھے۔ شاید میں ہی اپنا موقف صحیح طریقے سے پیش نہ کر سکی تھی..... یا کل جیسو اور ہاشم پھوپا کی سالوں پہلے کی اس غلطی کا خمیازہ ان کی اگلی نسل کو اسی طرح بھگتنا تھا۔

ابو جان کا ایک فقرے کا جواب..... ”جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتی میری بیٹی، اس لیے اس بے مقصد موضوع پر مجھ سے بحث نہ کرو۔“ اور مجھ جیسی بیٹی میں کہاں جرات تھی اپنے اتنے پیار کرنے والے باپ کی بات ٹالنے کی، میں اس طرح بے بس ہو گئی تھی۔ یا میرے باپ نے اپنے مان کی ڈور اور اپنے شیلے کی لاج میرے ہاتھ میں تھما کر مجھے بے بس کر دیا تھا۔ ”پھر بھی میری بیٹی، اگر تم چاہو تو میرے شیلے کو اپنے پیروں تلے روند کر چلی جاؤ..... اسی طرح جس طرح برسوں پہلے کل..... کمال کے باپ کے ساتھ چلی گئی تھی، میں جانتا ہوں کہ اس کے بعد

میرا باپ سراسر اٹھا کر گاؤں کی گلیوں میں نہیں چلتا تھا، چہار اطراف کے دیہات اور قصبوں میں کوئی پنچایت میرے باپ کی سربراہی کے بغیر نہیں ہوتی تھی، اس کے بعد میرا باپ گاؤں کی کسی پنچایت میں بھی نہیں گیا اور نہ ہی اس نے مرتے دم تک اپنا شملہ دوبارہ اپنے سر پر رکھا۔ بیٹیاں ماں باپ کی عزت کی پاسدار ہوتی ہیں، ان کے ہاتھوں میں اپنے باپ کی شان کا شملہ ہوتا ہے جسے وہ فخر سے بلند رکھیں یا پیروں تلے روند دیں!“

”اللہ نہ کرے ابو جان!“ میں اتنا ہی کہہ سکی تھی۔ ان کی یاد کے ساتھ پھر ایک یاد نے آ لیا۔ ”اگر انہیں اس وقت تک ہی جینا تھا تو میری شادی کی کیا جلدی تھی، چند دن نہ ہوتی تو شاید! ایک گھنٹیا سی سوچ دماغ میں آئے بنا نہ رہ سکتی تھی۔ دروازے پر دستک نے چونکا دیا تھا۔

”کون ہے..... آ جاؤ!“ میں نے سیدھے ہو کر بیٹھ کر کہا۔

”گل پھوپھو واپس جا رہی ہیں امرت!“ تمنا نے بتایا تھا، ہم دونوں اٹھے تاکہ پھوپھو کو دوسروں کے ساتھ الوداع کر سکیں۔ زین باہر مردانے میں چلا گیا تھا، تمنا نے باہر نکلتے ہوئے میرا ہاتھ تھام لیا۔

”تم یہیں رکو.....“ اس نے ہولے سے کہا۔

”کیوں؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیا پھوپھو کو خدا حافظ نہ کہوں؟“

”کامل بھائی تم سے ملنا چاہتے ہیں امرت!“ اس نے سرگوشی نما آواز میں کہا تھا۔

”دماغ درست ہے تمہارا؟“ میں نے غصے سے کہا۔ ”کیوں ملنا چاہتا ہے وہ مجھ سے؟“

”یہ تو تم انہی سے پوچھنا۔“ تمنا نے میرے غصے سے خفا ہو کر کہا۔

”مجھے اس سے نہیں ملنا تمنا.....“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”وہ میرے ہاضمی کی راکھ ہے اور مجھے راکھ میں دبی چنگاریوں کو ہوا دے کر اپنے حال کو خراب نہیں کرنا ہے۔“ کہہ کر میں باہر نکلی کہ اموجان کے پاس جا کر گل پھوپھو کو رخصت کروں۔

”امرت پلیز.....“ وہ جانے کہاں سے نکل کر سامنے آ گیا، میں نے مزید مدد طلب نظروں سے دیکھا، میرے عقب سے تمنا غائب تھی۔

”مت آؤ میرے سامنے..... مت آؤ ماؤ میری برداشت کو! مجھے کمزور نہ کرو، دفن کرنے دو مجھے... محبت کو شادی کے مزار میں!“ میں سوچ کر رہ گئی۔

”میرا راستہ چھوڑ دیں پلیز.....“ میں نے اندر سے اٹھنے والی سسکیوں کا گلا گھونٹا۔

”میری بات تو سنو امرت پلیز، صرف چند لمحے کے لیے!“ اس نے سامنے سے ہٹے بغیر کہا۔

”کچھ بھی نہیں رہ گیا کہنے اور سننے کے لیے.....“ میں نے چہرے پر غصے کے تاثر کو چھپانے کی کوشش بھی نہ کی تھی، وہ ذرا سا ہٹا اور میں جھکائی دے کر وہاں سے نکل آئی۔ دائیں بائیں دیکھا کہ کوئی اس سارے منظر کو اپنی نظروں میں قید تو نہیں کر رہا تھا۔



”مجھے معاف کر دو پیاری.....“ وہ میرے گھٹنوں پر اپنی ٹھوڑی رکھ کر بیٹھی ہوئی تھی۔

”ارے کس بات پر؟“ میں نے اسے وہاں سے اٹھا کر اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس صوفے پر بٹھالیا۔

”جو کچھ بھی میں نے تم سے کہا تھا..... میں عدم تحفظ کا شکار ہو گئی تھی۔“ رانی نے میرے پاس بیٹھ کر کہا تھا۔

”کوئی بات نہیں.....“ میں نے اسے تسلی دی۔

”مجھے تو بعد میں علم ہوا کہ تم اور کامل ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے اور پھوپھو نے تمہارا رشتہ مانگا تو کمال تایا

لے گا اور دیا اور تمہاری شادی.....“

”بس رانی!“ میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا۔ ”اس سے آگے ایک لفظ بھی نہیں..... آج اتنی بات کی ہے، اس کے بعد اتنی بات بھی نہ کرتا۔“

”کیوں کیا ہوا؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”کل پچھو کی خواہش تھی رانی..... ویسے ہی جیسے بڑی پچھو کی سرمد بھائی کے لیے..... اس سے زیادہ کچھ نہیں اور ابو جان کو دونوں رشتے ناپسند تھے اور انہوں نے وہی کیا جو انہوں نے میرے لیے بہتر سمجھا۔ ان سے زیادہ کون سمجھ سکتا تھا کہ میرے لیے کون بہتر ہے رانی، یوں بھی شادیاں تو قدرت کے فیصلے سے ہوتی ہیں، ہم انسان تو ادنیٰ سے مہرے ہیں۔“ میں نے رمان سے کہا۔ ”تم تو خوش ہونا سرمد بھائی کے ساتھ؟“ میں نے اس موضوع سے اس کی توجہ ہٹانے کو سوال کیا۔

جانتی تھی کہ جو کچھ وہ کہہ رہی تھی وہ حرف بہ حرف سچ تھا مگر مجھے اس کے شک کو یقین میں نہیں بدلنا تھا۔ اس سے پوچھتی کہ اسے یہ سب کچھ کس نے بتایا تو اسے یقین ہو جاتا کہ جو کچھ اس نے سنا تھا وہی سچ تھا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میرے ماضی سے منسلک کوئی بھی بات میری سسرال تک جائے اور وہاں اسے رائی بنا کر پریت کھڑے کیے جائیں۔ مجھے اپنی شادی کی عمارت کی بنیاد میں اندیشوں، شکوک اور موسموں کی اینٹیں نہیں لگانا تھیں۔ یقیناً بڑی پچھو نے اپنی بہو سے سارا معاملہ شیر کیا ہوگا، انہیں اندازہ ہی نہیں ہوگا کہ ایسی باتیں میری ازدواجی زندگی پر کس، کس طرح سے اثر انداز ہو سکتی تھیں۔

”کیا واقعی ایسا ہی ہے؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”تو کیا تمہیں لگ رہا ہے کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا۔

”میں معذرت چاہتی ہوں کہ میں کچھ اور بھی تھی!“ وہ مطمئن ہو گئی تھی شاید..... اچھا ہی ہوا کہ اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہ دیکھا ورنہ جان لیتی کہ یہ میرا وہ راز تھا جو میں آئینے کے روبرو بھی خود سے چھپاتی تھی۔

☆☆☆

”تم خوش ہو پیاری؟“ اموجان نے سوال کیا، میں نے چہرے کو مزید جھکا لیا۔

”ہوں.....“ میں نے جواب دیا۔

”کچھ دن رہو گی یا کل سب کے ساتھ چلی جاؤ گی؟“ انہوں نے پوچھا۔

”کچھ علم نہیں اموجان! زین سے پوچھوں گی رات کو۔“ میں نے ہولے سے کہا۔

”زین اچھا تو ہے ناں تمہارے ساتھ؟“

”جی اموجان!“

”زیادہ تو میں جانتی ہوں، وہ تو اس رشتے پر راضی اور خوش نہیں تھی مگر جمال اور زین کی خوشی اہم ہے.....“

”آپ اپنی دوا باقاعدگی سے لیتی ہیں ناں اموجان؟“ میں نے موضوع تبدیل کیا۔

”ہاں.....“ مختصر سا جواب۔

”فاطمہ کب تک لاہور چلی جائے گی؟“

”بس آج کے دن کا ہی انتظار ہو رہا تھا یعنی چہلم کا..... کل مہرا سے ساتھ ہی لے جائے گی۔“

”کبیر بھائی بھی ساتھ جائیں گے؟“

”نہیں.....“ انہوں نے سر ہلا کر کہا۔ ”ابھی تک تو لوگ پر سے کے لیے آرہے ہیں مگر ایک دو دن پہلے کبیر

بھی چلا جائے گا!“

”آپ تنہا رہ جائیں گی۔“ میں نے ان کے چہرے کو دیکھا۔

”تمنا آتی جاتی رہتی ہے.....“ انہوں نے ادا سی کہا۔ ”پھر چند دنوں میں فاطمہ بھی انشاء اللہ تعالیٰ لوٹ آئے گی!“

”اپنا خیال رکھا کریں اموجان..... مجھے آپ کی بہت فکر رہتی ہے۔“ میں ان کے ساتھ لپٹ گئی۔

”تم بھی خوش خوش رہا کرو میری جان، ماضی کو بھول کر اپنے حال میں خوش رہو۔“ انہوں نے مجھے سہلایا۔

”میرا کوئی ایسا ماضی نہیں ہے کہ جسے میں بھلا نہ سکوں۔“ میں نے انہیں تسلی دی۔ ”میں خوش ہوں اموجان!“

اس ایک فقرے کو کہنے کے لیے میں نے کتنے ہی آنسو آنکھوں تک آنے سے روکے تھے۔

☆☆☆

”یہ گولیاں اپنے پرس میں رکھ لو بیٹا!“ انہوں نے مجھے گولیوں کے کچھ پیکٹ پکڑائے۔ میں نے ان کے ہاتھ

میں پکڑے ان پیکٹوں کو دیکھا پھر سوالیہ نظروں سے ان کے چہرے کو۔ ”کسی کو ان کے بارے میں علم نہ ہو۔“

”کس چیز کی ہیں یہ گولیاں چچی جان؟“ میں نے سوال کیا۔

”ایک تو تم اس فضول طریقے سے مجھے چچی جان کہنا چھوڑ دو اب.....“ انہوں نے خفگی سے کہا۔

”تو اور کیا کہوں چچی جان؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”میں تو ہمیشہ اموجان اور ابو جان نے اپنے سے

بڑوں کو احترام اور اپنائیت سے مخاطب کرنے کا بتایا تھا، ان رشتوں کے ساتھ جی اور جان کا اضافہ کر کے۔

”جو کچھ مجھے سب لوگ یہاں کہتے ہیں..... ماما!“ انہوں نے جواب دیا۔

”جی..... ماما جان!“ میں نے یہ مشکل انہیں ”ماما جان“ کہا تھا۔

”ماما جان نہیں..... صرف ماما!“ انہوں نے زور دے کر کہا۔

”جی ٹھیک ہے۔“ میں نے تھوک نکل کر کہا۔

”یہ گولیاں تم نے باقاعدگی کے ساتھ، دی گئی ہدایات کے مطابق استعمال کرنا ہیں!“ انہوں نے لہجے میں پھر

نری پیدا کی تھی۔

”مگر یہ کس چیز کی گولیاں ہیں؟“ میں پوچھے بنانہ رہ سکی تھی۔

”اس کی وضاحت زین کر دے گا.....“ انہوں نے کہا۔ ”اور ہاں تمہیں یہ سمجھانے کی ضرورت نہیں ہونی

چاہیے کہ جو کچھ تم میاں بیوی کے درمیان ہے وہ تم لوگوں کا ذاتی معاملہ ہے، زوجین کے مابین جو راز ہیں ان کی تشہیر

گناہ ہے۔“ انہوں نے جانے کن رازوں کی طرف اشارہ کیا تھا۔ میرا ذہن تو ان چاچی میرے کمرے میں آگئی تھیں اور

”جی ٹھیک ہے.....“ میں نے ہولے سے کہا۔

”اپنے اور زین کے بیچ کی باتیں اور اس گھر کے معاملات کو خود تک رکھنا، اپنے پیچھے بھی رپورٹیں بھجوانے کی

ضرورت نہیں ہے۔“ میں سمجھتی تھی کہ ”پیچھے“ سے ان کی کیا مراد تھی۔ میرا میکا، وہ تو ابو جان کے جانے سے ویسے ہی

کمزور ہو گیا تھا۔ ان کی وفات کے بعد ہم واپس لوٹے تھے تو اسی دن چاچی میرے کمرے میں آگئی تھیں اور

ہمارے درمیان یہ گفتگو ہو رہی تھی۔

”میں کس سے کہوں گی جی..... ماما جان!“ انہیں چچی جان کہتے، کہتے رک گئی تھی مگر ماما کے ساتھ جان اچانک

ہی منہ سے پھسل گیا تھا جس پر مجھے ان کے چہرے پر ناگواری نظر آئی۔

”پھر بھی، گاؤں کی لڑکیوں کو عادت ہوتی ہے ناں اپنی ساسھی سگیوں، بہنوں اور کزنوں کے ساتھ اپنے ذاتی

راز شہر کرنے کی۔“ انہوں نے پھر گاؤں کی لڑکیوں کا مصحفہ اڑایا تھا۔

”جی مجھے قطعی عادت نہیں ہے ہر کسی سے اپنی ذاتی باتیں کرنے کی۔“ میں نے انہیں بتایا۔ ”اور ویسے بھی فضول اس نے کی عادت کسی کو بھی ہو سکتی ہے مہما..... خواہ وہ کوئی لڑکا ہو یا لڑکی، جو ان ہو یا بوڑھا، شہر کا ہو یا گاؤں کا۔“

”تمہیں شاید کسی نے یہ نہیں بتایا کہ اپنے سے بڑوں کے ساتھ بے مقصد بحث کرنا سب سے بری عادت ہے اور کم از کم میں ایسے لوگوں کو برداشت نہیں کر سکتی جو خواہ مخواہ ایسا کریں۔“ انہوں نے نخوت سے کہا۔ جانے مجھے بیاہ لڑکیوں لائی تھیں اگر میں انہیں شروع سے ہی اتنی بری لگ رہی تھی۔

”جی سوری.....“

”اور ہاں..... زین کو تم اچھی لگیں مگر اس طرح کہ جیسے لڑکوں کو لڑکیاں اچھی لگتی ہیں، دوستی وغیرہ کر لیتے ہیں، چائے، کافی پی لی، گپ شپ لگالی، اکٹھے گھوم پھر لیا..... زین پابند یوں کو برداشت کرنے والا بچہ نہیں ہے.....“

”میں سمجھی نہیں.....“ میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟“ جانے وہ کس ملک، معاشرے اور ماحول کے لوگوں کے بارے میں بات کر رہی تھیں۔

”اس گھر میں تم اپنے صرف چاچو کی وجہ سے ہو، ان کی دھمکی، خواہش اور ضد کے باعث..... ان کی محبت میں زین نے تمہیں قبول تو کر لیا ہے اور وہ اس رشتے کو نبھانے کی بھی پوری کوشش کرے گا مگر اسے یہ سب تسلیم کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔ وہ اس پرتیا نہیں تھا، کچھ مجبوری بن گئی تو اسے راضی ہونا پڑا..... جمال دل کے مریض بھی ہیں اور میں نہیں چاہتی کہ وہ کچھ ایسا سنیں کہ دل پر اثر لیں۔ زین کو وقت اور مہلت دو، اسے اپنے آپ کو برتنے اور سمجھنے دو، اگر تم اسے جیتنے میں کامیاب ہو گئیں تو پھر سب اچھا ہے.....“ وہ رکیں۔ ”لیکن اگر تمہیں اس سے کوئی مسئلہ ہو یا آپس میں دونوں کا کوئی اختلاف ہو تو اس کی شکایت جمال سے مت کرنا، تمہیں جو کچھ کہنا ہے مجھ سے یا اپنے شوہر سے کہنا، چیزوں کو اس کے مقررہ نظام کے تحت چلنے دو تو بہتر ہے، چھپیل کر اس کرنے کی کوشش کرو گی تو اچھا نہیں سمجھا جائے گا۔“

”جی!“ ان کی اتنی لمبی تقریر کے جواب میں میں کچھ نہ کہہ سکی۔

”کوشش کرو کہ زین کو خوش اور مطمئن رکھ سکو، اپنی اطاعت، وفا اور محبت سے اسے جیتنے کی کوشش کرو..... اسی میں تمہاری اور اس کی بھی بہتری ہے۔“

یہ مہما کی میرے ساتھ پہلی انتہائی طویل اور واضح گفتگو تھی جو کہ اس گھر میں مجھے ابتدائی بریفنگ کے طور پر دی گئی تھی۔ اس سے نہ صرف مجھے اندازہ ہو گیا کہ میری حیثیت ان کی اور ان کے بیٹے کی نظر میں کیا ہے بلکہ یہ بھی علم ہو گیا کہ زین نے کسی مجبوری کی حالت میں یا کسی دھمکی سے ڈر کر مجھ سے شادی کے لیے ہاں بھری تھی۔ وہ مجبوری کیا تھی، مجھے جاننے میں کوئی دلچسپی نہ تھی، اس جیسے نوجوانوں کے لیے جاندا اور مال و دولت سے عاق کر دینا ہی سب سے بڑی دھمکی ہوتی ہے۔

☆☆☆

”وہ گولیاں لاؤ، میں تمہیں ان کی بابت سمجھا دوں۔“ اس نے ٹیلی وژن کا ریموٹ پکڑ کر چینل بدلا۔ میں کوئی ڈراما دیکھ رہی تھی، اس نے مجھ سے پوچھا تک نہیں کہ وہ چینل تبدیل کر سکتا ہے کہ نہیں، مجھے اس جیسے نوجوان سے اس بدتمیز ہی کی توقع نہ تھی۔

”کون سی گولیاں؟“ میں نے جان بوجھ کر پوچھا۔

”جو مہما نے تمہیں دی ہیں۔“ اس نے میری طرف دیکھ بغیر کہا۔

”اوہ، اچھا.....“ میں نے بیڈ کی سائڈ ٹیبل کی دراز سے وہ لفافہ نکال کر اسے تھمایا، اس نے ان میں سے ایک

پیکٹ نکالا اور ہدایات پڑھنے لگا۔ ساتھ، ساتھ مجھے سمجھانے لگا۔

”میں نے ممتا سے پوچھا تھا کہ یہ کس چیز کی گولیاں ہیں اور مجھے کیوں کھانی ہیں؟“ میرے سوال پر اس نے میرے چہرے کی طرف دیکھا اور ہنس پڑا۔ پھر اس نے مجھے بتایا کہ وہ گولیاں کس لیے تھیں۔

”مگر کیوں؟“ اس کے ہاتھ پر میں نے زور دے کر پوچھا۔
 ”کچھ وقت ہم ایک دوسرے کو سمجھنے میں گزاریں، اپنی زندگی کو بغیر کسی اضافی ذمے داری کے کچھ عرصے کے لیے انجوائے کریں۔“ بودی سی دیل۔ ”بچے تو بعد میں بھی ہوتے رہیں گے۔“
 ”کیا اس کا شربت نہیں مل سکتا؟“ میں نے منت کی۔

”ہا۔ ہا۔ ہا۔۔۔۔۔“ وہ منہ پھاڑ کر ہنسا۔ ”شریت والی دوائیں بچوں کے لیے ہوتی ہیں بے بی! اور ظاہر ہے کہ یہ بچوں کے استعمال کی دوا نہیں ہے۔“ میں جھل سی ہو گئی۔

”یہ گولیاں تو یوں بھی چھوٹی سی ہوتی ہیں۔“ اس نے ایک گولی نکال کر اپنی ہتھیلی پر رکھی۔
 ”بات چھوٹی بڑی کی نہیں، میں گولی کو نگنہ نہیں جانتی۔“

”یہ بھی کوئی بات ہے..... لو یہ پانی کا گلاس پکڑو..... منہ کھولو۔“ اس نے میرے حلق کے اندر اس طرح گولی رکھی کہ میرے پانی پینے سے پہلے ہی وہ میرے منہ سے غائب ہو کر گلے کی گہرائی میں پہنچ چکی تھی۔ میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”تم نہیں کھاؤ گے یہ کوئی؟“ میرے سوال پر اس نے منہ پھاڑ کر قہقہہ لگا دیا۔
 ”تم بہت کیوٹ ہو۔“ اس نے ہنستے، ہنستے کہا۔

میں نے شروع میں اسے آپ جناب کہہ کر بات کرنے کی کوشش کی تو اس نے مجھے ٹوک دیا کہ میں اسے اس کے ام سے اور برابری کے لیول پر رہ کر یعنی 'تم' کہہ کر بات کروں۔ ہمیں تو اپنے سے چھوٹوں کو بھی تم کہنے کی تربیت نہیں دی گئی تھی، کبایہ کہ میں اپنے شوہر کو اس طرح مخاطب کرتی مگر مجھے ایسا کرنا پڑا کیونکہ زین کو تکلفات سے بچنا تھی۔

☆☆☆

کبیر بھائی کے بیٹے کی ولادت کی خبر نے اس خاندان کی خوشیوں پر پڑے جمود کو توڑا تھا۔ ابوجان کی وفات کے بعد سے کوئی ایسی خبر نہیں لی تھی کہ جس پر خوش ہوا جاتا، میرا دل جاہ رہا تھا کہ اڑکلا ہو رہنچ جاؤں۔

”چاچو..... مبارک ہو، کبیر بھائی کا بیٹا ہوا ہے۔“ میں اپنے کمرے سے باہر نکلی تو چاچو لاؤنج میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ چھٹی کا دن تھا، زین سمیت سب لوگ سو رہے تھے۔

”ارے واہ بھئی، یہ تو بہت اچھی خبر سنائی دینا تم نے۔“ انہوں نے مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ ”مبارک ہو تمہیں مٹی میری بیٹی! تم چھوہو بن گئی ہوناں! بھائیاجی کے جانے کے بعد اس گھر میں پہلا خوشی کا جھونکا آیا ہے، اللہ اس گھر کی خوشیوں کو سلامت رکھے۔“ ان کے منہ سے ادا ہونے والا ایک، ایک لفظ ان کی اندرونی خوشی کا عکاس تھا۔

”کیا شور مچا رکھا ہے تم لوگوں نے سویرے، سویرے؟“ ماما اپنے کمرے سے آوازیں سن کر باہر نکلی تھیں۔
 ”زیبا..... کبیر اور فاطمہ کو اللہ تعالیٰ نے پیدائے عطا کیا ہے.....“ چاچو نے جوش سے انہیں بتایا۔

”اچھا.....“ کہہ کر وہ واپس مڑیں۔ ”لیکن شور تو کم کریں آپ لوگ، سارے گھر کو جگا دیں گے آپ، چھٹی

”اے بیٹا، یہ بات سن کر تو ہنس رہا ہے۔“

”اے ماں، گھر پر چکا ہے زین!“ چاچو نے اپنی بات مکمل بھی نہ کی تھی کہ انہوں نے اپنے کمرے کا دروازہ دوبارہ بند کر لیا تھا۔ انہوں نے مجھے مبارک باد دینا تو کجا، چہرے پر جھوٹی خوشی کا رنگ بھی نہ آنے دیا تھا۔ الٹا واپس مڑتے وقت انہوں نے مجھ پر ایسی نظر ڈالی تھی کہ مجھے سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ ان کی وہ قاتل نظر کس جرم کی پاداش میں تھی۔

”میری بیٹی لاہور جانا چاہتی ہے کیا؟“ چاچو نے سوال کیا۔

”مما سے پوچھنا پڑے گا چاچو!“ میں نے کہا۔ ”زین سے بھی بات کر کے دیکھتی ہوں۔“

”میں جو کہہ رہا ہوں کہ تم جانا چاہتی ہو تو جاؤ.....“ انہوں نے کہا۔

”لیکن چاچو..... ما!“

”لیکن ممّا کیا؟“ انہوں نے سوال کیا۔ ”کیا زین تمہیں منع کر دے گی؟“

”پتا نہیں چاچو!“ میں نے تذبذب بھرے لہجے میں کہا۔

”سب ٹھیک تو ہے ناں بیٹا؟“ انہوں نے میرا سر تھکا۔ ”میں اپنے جھیلوں میں اتنا مصروف رہتا ہوں کہ کئی کئی دن تک اپنی بھی خبر نہیں ہوتی..... اس گھر میں تمہیں لا کر کہیں میں نے اس بات کو نظر انداز تو نہیں کر دیا کہ میری بیٹی یہاں خوش تھی ہے کہ نہیں؟“

”میں خوش ہوں چاچو!“ میں نے انہیں تسلی دی۔

”اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے.....“ انہوں نے دعا دی۔ ”چلو تو اپنی تیاری کرو، میں تمہیں لاہور بھجوا رہا ہوں،

اگر زین ساتھ جائے تو گاڑی سے چلی جاؤ ورنہ آج شام کی ہی فلائٹ لے لو۔“

”بہت شکریہ چاچو!“ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور اپنے کمرے کی طرف چلی تاکہ اپنی تیاری کر لوں۔

لاہور..... لاہور جانے کا تو کوئی شوق نہیں تھا مجھے، لاہور سے تو میں کتر اپنی بھی گمراہیاں تھا کئی دن تک فاطمہ کو لاہور ہی رہنا تھا، اسوجان اور کبیر بھائی بھی لاہور میں ہی تھے۔ تمنا اس لیے نہیں گئی تھی کہ اس کی شادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی اور وہ اس کا سرانی گھر تھا۔

☆☆☆

”زین تیاری کرو اور گل کو لے کر لاہور چلے جاؤ۔“ ناشتے کی میز پر چاچو نے زین کو براہ راست کہا تھا۔ ”اپنی ممّا سے کہنا کہ میں نے اسے جو رقم دی ہے وہ گل کو دے، دے..... وہ چاہے تو کبیر کے بیٹے کے لیے تحفہ لے لے یا نقد رقم دے۔“

”کس کی بات کر رہے ہیں پاپا؟“ وہ بوکھلا گیا تھا۔

”کبیر اور فاطمہ کا بیٹا پیدا ہوا ہے..... بتایا نہیں تمہیں گل نے؟“

”وہ چاچو میں شاور لے رہی تھی تو زین کمرے سے باہر نکل آئے، اس سے پہلے وہ سو رہے تھے۔“ میں ہلکائی۔

”اچھا گڈ!“ زین نے کہا۔ ”تو وہ لوگ لاہور میں ہیں؟“

”زین جب کوئی ایسی خوش خبری سنائی جائے تو مبارک باد کہتے ہیں.....“ چاچو نے اسے ٹوکا۔ ”نہ تمہاری ممّا کو خود توفیق ہوتی ہے نہ اس نے تم لوگوں کو سکھایا ہے کہ دوسروں کی خوشی میں کیسے خوش ہوتے ہیں۔“

”میں کس وقت مبارک باد کہتی.....“ ممّا نے فوراً اپنا دفاع کیا۔ ”سویرے، سویرے ایک تو آپ لوگوں نے میری نیند خراب کی اوپر سے.....“

”اب تو ہم ناشتے کی میز پر پچھلے آدھے گھنٹے سے بیٹھے ہیں اور تمہیں خبر مل چکی ہے۔“ چاچو ایسے موقعوں پر

اس بات کا لحاظ بھی نہ کرتے تھے کہ ان کے بچے اور، ہو بھی وہاں موجود ہیں۔

”مبارک ہو بھی!“ انہوں نے لٹھ مارنے کے انداز میں مجھے مبارک یاد دی۔ ”صبح سویرے چاچو کی گود میں بیٹھ کر یہی شکایتیں لگائی جا رہی تھیں۔“ ان کے الفاظ اور لہجے میں خنجر کی کاٹ تھی، چاچو کی گود؟ مجھ میں اتنی جرأت نہ تھی کہ میں نظر اٹھا کر ان کو دیکھتی۔

”فضول باتیں بند کرو زیبا.....“ چاچو نے کہا۔ ”اور ہاں زین کس وقت نکل سکتے ہو تم لوگ لاہور کے لیے؟“

چاچو نے زین سے سوال کیا۔

”دیکھتا ہوں پاپا۔“

”کیا دیکھتا ہے تمہیں؟“ چاچو نے چتون چڑھا کر پوچھا۔

”اپنی مصروفیات دیکھنا ہوتی ہیں پاپا.....“ اس نے دوہرہ جواب دیا۔

”کون سی مصروفیات ہیں تمہاری..... آج ویسے بھی چھٹی ہے، ملازمت تو تم میرے ساتھ ہی کرتے ہو اور میں ہی تمہیں جانے کو کہہ رہا ہوں!“

”شام کو دوستوں کے ساتھ پلان ہوتے ہیں پاپا!“

”اس وقت وہ اہم ہے جو میں کہہ رہا ہوں.....“ چاچو نے حتی انداز میں کہا۔

”میں وہاں بور ہوتا ہوں پاپا!“ اس نے التجائیہ لہجے میں کہا۔

”کل پچھو کی طرف رک جانا، کامل کے ساتھ تو تمہاری اچھی دوستی ہے نا!“ میرے دل کی کئی دھکنیں مس ہوئیں۔

نسوانی حسن میں اضافہ (بلوسم یونانی کریم) کل نہیں آج خوبصورت اور جازب نظر آئیں

بلوسم بریسٹ ڈولپنگ اینڈ ٹاسٹنگ کریم (ہربل)

چھوٹی بریسٹ میں اضافہ کر کے بریسٹ کی نشوونما مکمل کرتی ہے
بریسٹ کی نرمی کو دور کر کے کشی لاتی ہے۔ بریسٹ کو سٹڈل اور خوبصورت بناتی ہے۔
گرفتہ 30 سال سے آزمودہ



تفصیلی پڑھائی کے لیے براہ کرم اس لنک پر کلک کریں
لکھنؤ، جہان پور، لاہور، کراچی، اسلام آباد، راولپنڈی، سکس
کے لیے مفت ڈیلیوری ہے۔

چھوٹے کے فاضل
بالوں کو ہمیشہ کیلئے
ختم کرتی ہے۔

گلیسی

اپنی PIC روانہ کریں
watsapp: 0311-5800057
Email: bdhdeva@yahoo.com
skype: devapak
0322-2916250 کراچی ہوم ڈیلیوری
0300-2500026 چنڈی ڈیلیوری

- | | | |
|---|--|--|
| ☐ مسٹر دوا خانہ سالہ دوا خانہ | ☐ خالد دوا خانہ صراف بازار احمد آباد | ☐ خیرا سٹور ایئر بیس مارکیٹ صدر کراچی |
| ☐ صاحب ہوسٹل سوسائٹی بازار لکھنؤ | ☐ قومی چینی دوا خانہ کھری بازار سرگودھا | ☐ صدر میڈیکل سٹور ایئر بیس مارکیٹ صدر کراچی |
| ☐ عوامی دوا خانہ سین بازار مظفر آباد | ☐ مسلم پشادری کوڑو بازار دوا خانہ | ☐ مسلم جنرل سٹور ریاضت مارکیٹ کراچی |
| ☐ فوری دوا خانہ شاہ بازار ہری پور | ☐ جی ایم جی بازار سٹور پتیلہ | ☐ ایم ایم بازار پتیلہ مارکیٹ کراچی |
| ☐ انعام ہوسٹل بازار دھبک بازار دھبک | ☐ یو پی ہسٹور سٹور ہری پور | ☐ ڈاکٹر میڈیکل سٹور آصف مارکیٹ 22 کراچی |
| ☐ مسٹر دوا خانہ کھنڈ بازار | ☐ ناصر دوا خانہ 20 صدر لکھنؤ بازار | ☐ قریبی بازار جنرل سٹور چنگ بازار احمد آباد |
| ☐ علی ہوسٹل کھنڈ بازار | ☐ کاشک ہوسٹل کھنڈ بازار | ☐ محمودی دوا خانہ وٹار دھبک |

پاکستان میں گھر پر منگوانے کے لیے اور بریسٹ میں کمی یا اضافہ کے بارے میں مفصل طور پر کے لیے حکیم صاحب سے تمام امراض کے طور پر کی مکتوب بریسٹ ڈیلیوری کے بارے میں معلومات اس نمبر پر حاصل کریں۔
Cell: 0333-5203553, Website: www.devaherbal.com

”وہ جرنی گیا ہوا ہے پاپا.....“

”میں چلی جاتی ہوں چاچو، ڈرائیور کے ساتھ!“ میں نے زین کی مشکل آسان کرنے کو کہا۔
”ٹھیک ہے زین، ڈرائیور سے کہو گاڑی تیار کرے، پٹرول اور تیل وغیرہ بھی چیک کرے..... میں خود لاہور جا رہا ہوں۔“

”آپ جائیں گے لاہور..... مگر کیوں؟“ ممانے حیرت سے پوچھا۔

”ہماری اگلی نسل کا پہلا چشم و چراغ دنیا میں آیا ہے..... اس کے اپنے دادا ازندہ ہوتے تو وہ اس وقت کہاں ہوتے؟“ چاچو نے جوش سے کہا۔ ”یوں تو تمہارا جانا بھی بنتا ہے زیبا..... مگر میں اصرار نہیں کروں گا، تمہارا دل چاہے تو تیار ہو جاؤ..... اور ہاں صاحب زادے، تم دوستوں کے ساتھ اپنی مصروفیات میں کوئی خلل نہ آنے دینا، چاہے گھر میں تمہارے باپ کا جنازہ پڑا ہوا ہو۔“ چاچو نے اٹھتے ہوئے کرسی کو زور سے واپس دھکیلا، کرسی الٹ کر گری اور زوردار آواز پیدا ہوئی۔

میز کے گرد بیٹھے ہوئے، مجھ سمیت چھ لوگوں کو گویا سانپ سونگھ گیا تھا، کسی کے پاس کہنے کو کچھ تھا بھی نہیں۔ اس کے بعد زین بھی اسی انداز سے اٹھا، اسی طرح کرسی گھسیٹ کر گرائی.....
”آگیا تمہیں سکون پاپا سے میری بے عزتی کروا کے؟“ مجھ پر سنگ باری کرتا ہوا وہ ناشتا ادھورا چھوڑ کر تن فن کرتا اپنے کمرے کی طرف چلا۔

”مجھے معلوم تھا.....“ اس سے اگلی کرسی ممانے گھسیٹی۔ ”اسی لیے یہ اپنے خاندان کی کوئی لڑکی لا کر اس کے سر پر مسلط کرنا چاہتا تھا کہ اسے بار، بار مات کر سکے۔“ باقی چار لوگ جو بیٹھے رہ گئے تھے وہ ہونقوں کی طرح ایک دوسرے کو بھی نہیں دیکھ رہے تھے۔

”مبارک ہو بھابی!“ عارب کی آواز نے اس سکوت کو توڑا۔

”بہت شکر یہ پیارے بھائی!“ میں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”مبارک ہو بھابی!“ حسن نے بھی کہا اور میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

”کیا تم اسے اس بات کی مبارک دے رہے ہو کہ اس نے ماما کے خلاف پہلا معرکہ جیت لیا ہے؟“ حسن نے انتہائی تنفر سے کہا اور اٹھ کر چلی گئی، اس کے جانے کے بعد میں نے وہیں میز پر سر رکھ کر سسکیاں لینا شروع کر دیں۔ اتنی بے عزتی..... اتنی سی بات پر۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس گھر کا نظام کیا اور کیسے چل رہا تھا۔ بات، بات پر خوف کی فضا کہ کس کو کیا برا لگ جائے۔ خود تو اس گھر کے نفوس چاہے جس کی عزت کے اوپر سے بھی دندناتے ہوئے گزر جائیں مگر اپنی اناؤں کے پرچم ایسے بلند کر کیا کہتا۔

☆☆☆

کیسا پیارا سا گل تھو تھنا بچہ تھا۔ اللہ کا لاکھ، لاکھ شکر کہ ماں اور بیٹا دونوں صحت مند اور عافیت سے تھے۔ ہمارے بچے سے وہاں خوشی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی تھی۔ ”زیبا کو بھی لے آتے تم لوگ ساتھ۔“ اموجان یوں کہہ رہی تھیں جیسے وہ انہیں جانتی نہیں تھیں۔

”وہ لمبے سفر سے بہت گھبراتا ہے بھابی، آپ کو تو علم ہے، ہمیشہ سے ہی وہ ایسی ہے۔“ چاچو نے صفائی پیش کی۔

”جانتی تو ہوں مگر سوچا کہ اب امرت کے حوالے سے.....“ اموجان نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

”آپ سنائیں کہ نام کیا سوچا ہے اس جوان کا.....؟“ چاچو نے فوراً بات بدلی۔

”ہم نے تو اپنے بچوں کے نام رکھ لیے، اب اس کے والدین جو نام رکھنا چاہیں۔“ اموجان نے فراخ دلی سے کہا۔

”کمیل نام زیر غور ہے.....“ کبیر بھائی نے بتایا۔ ”آپ بتائیں چاچو کہ کیسا نام ہے؟“
 ”بہت پیارا نام ہے یارا!“ چاچو نے تعریف کی۔

”ابو جان کے نام سے ملتا جلتا بھی ہوگا.....“ کبیر بھائی نے وضاحت کی۔ میرے ذہن کے نہاں خانوں میں ایک یاد جھلکائی۔

”میں نے اس کا نام..... بھائیاجی، آپ کے نام سے ملتا جلتا رکھا ہے!“ گل پھوپھو جب پہلی بار ہمارے ہاں کامل کے ساتھ آئی تھیں تو وہ ابو جان کو بتا رہی تھیں۔ ”اردو میں تو وہی بچے ہیں صرف ان کی ترتیب فرق ہوگی اور انگریزی میں صرف ایک ہی بچہ مختلف ہے۔“

”ارے ہاں!“ ابو جان نے حیرت اور مسرت کو کبجا کر کے کہا تھا۔ ”تم نے تو بڑی محنت سے نام بچھ کیا ہے۔“
 ”محنت سے نہیں عائشہ..... پیار سے کہو!“ پھوپھو نے صحیح کی۔ ”بھائیاجی سے مجھے بہت پیار ہے، اتنا کہ ان کی یاد سے میں کسی ایک دن بھی غافل نہیں ہوتی۔“

کمیل نام بھی کمال اور کامل دونوں سے ملتا جلتا نام تھا، بلانے میں کامل سے زیادہ قریب۔ جب بھی اسے پکارا جائے گا، اس کے ساتھ کوئی اور یاد در آئے گی۔

”تو پھر فائل کر دیں یہ نام چاچو؟“ کبیر بھائی نے چاچو سے پوچھا۔
 ”بھئی جو تم لوگوں کو اچھا لگے۔“

”آپ بھی تو اس کے دادا ہیں، بھائیاجی زندہ ہوتے تو وہ اس کا نام تجویز کرتے۔“ مہر پھوپھو نے جذباتی لہجے میں کہا۔
 ”کیوں بھابی جان؟“ چاچو نے ابو جان سے پوچھا۔

”ٹھیک ہے، اچھا نام ہے..... بچوں کو پسند ہے، سادہ اور بلانے میں آسان ہے اور معافی کے اعتبار سے بھی اچھا ہے۔“ ابو جان نے کہا۔

”تو پھر فائل ہو گیا یہی نام.....“ چاچو نے مسرت سے اعلان کیا۔ ”آپ سنبھ کو کمیل کبیر کے نام کی مبارک ہو۔“
 ”کمیل احمد ٹھیک رہے گا چاچو!“ کبیر بھائی نے کہا۔

”بالکل ٹھیک..... کیوں بھی میاں کمیل..... خوش ہو اس نام سے؟“ چاچو نے اس ننھے سے بچے کو اٹھا کر اس سے سوال کیا۔ سب ہلکھلا کر ہنسنے لگے..... ایسا اقبہ نہ جانے کب سے نہیں سنا تھا، ہنسی اس گھر میں لوٹ آئی تھی۔



ہمارے قیام کے دوران ہی گل پھوپھو، تحریم کے ساتھ ہمیں ملنے کے لیے آئیں۔ ان کے چہرے پر حزن کی کیفیت تھی، مجھے ملتے ہوئے وہ سسکیاں لینے لگیں۔ ”تم سے مجھے اپنے بھائی کی خوشبو آتی ہے، انہیں تم سے بہت پیار اور تم پر بڑا مان تھا۔“ میں بھی اپنے جذبات پر قابو نہ پاسکی۔

”خوشی کا موقع ہے پیاری.....“ چاچو نے ہمیں الگ کیا۔ ”ایسے موقع پر روئیں نہیں، بھائیاجی کو یاد چاہے کریں مگر رو کر نہیں، ان کے لیے دعا کیا کریں۔“ ہم دونوں نے اپنے آنسو پونچھے۔

”کب واپس آ رہا ہے کامل؟“ چاچو نے سوال کیا، میں نے نظر چرا کر پھوپھو کو دیکھا۔
 ”کہاں سے؟“ انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

”سنا تھا کہ وہ جرمی گیا ہوا ہے.....“ چاچو نے سادگی سے کہا۔

”وہ تو کہیں نہیں گیا.....“ پھوپھو نے کہا۔ ”البتہ واپس کینیڈا جانے کے منصوبے بنا تا رہتا ہے..... مگر آپ نے کہاں سے سنا ایسا؟“ انہوں نے چاچو سے پوچھا۔

”اے ملتا ہے کہ کسی اور کی بات ہوئی ہو اور میں کامل کا سمجھا.....“ چاچو نے بات گول کی۔ زین نے کتنا سفید ہنس بولا تھا۔

”ابھی وہی ہمیں ڈراپ کر کے گیا ہے اور واپسی پر بھی لینے آئے گا..... آتا ہی ہوگا بلکہ.....“ ان کی بات ہاری بھی نہ ہوئی تھی کہ وہ نظر آ گیا، لاؤنج کے دروازے کے پاس وہ باہر کھڑا تھا۔ ”یہ لیسن وہ آ گیا۔“ پھپھو گرم جوشی سے کہہ رہی تھیں اور میں کوئی راہ فرار نہ پا رہی تھی۔ وہ دشمن جاں یوں میرے سامنے آ جائے گا، سوچا تک نہ تھا۔ زین سے یہ سن کر کہ وہ جرمی گیا ہوا ہے میں دل سے مطمئن ہو گئی تھی کہ لاہور جا کر اس سے سامنا نہیں ہوگا۔

”تم ٹھیک تو ہو امرت؟“ فاطمہ نے مجھے دیکھ کر سوال کیا تھا۔

”ہاں بس وہ سفر کی تھکاوٹ.....“ میں نے عذر تراشا۔

”بس دس منٹ میں کھانا لگ جاتا ہے، کھا کر آرام کر لیتا۔“ مہر پھپھو نے فوراً کہا۔

”جی پھپھو!“ میں نے ہولے سے کہا۔

وہ سب سے مل رہا تھا، چاچو نے اٹھ کر گرم جوشی سے اس سے معاف کیا، کبیر بھائی بھی اس سے ملے۔ امو جان اور مہر پھپھو نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ میں خواہ مخواہ چوروں کی طرح محسوس کر رہی تھی، میرے لیے ممکن ہوتا تو میں سلیمانی ٹوٹی پہن کر اس منظر سے غائب ہو جاتی۔

”السلام علیکم.....“ وہ میرے سامنے کھڑا تھا، اس لمحے کی طرح جس سے میں کتر اگر گزرتا چاہتی تھی۔

”وعلیکم السلام.....“ میں نے بھد کو شش اپنے وجود کے پاتال سے آواز نکالی۔

”دیکھی ہو؟“ سوال آیا۔

”جی اچھی ہوں!“ ہولے سے میں نے جواب دیا۔

”مبارک ہو تمہیں!“ اس نے پھر کہا، میں کیوں چاہ رہی تھی کہ وہ چلا جائے، اس کا مبارک باد کہنا بھی مجھے اچھا نہ لگا۔ اپنے دل میں چور تھا اس لیے مجھے لگا کہ سب لوگ ہمیں غور سے دیکھ رہے ہوں گے۔

”شکریہ.....!“ اس تمام گفتگو میں میں اپنا سر نہ اٹھا سکی تھی۔

”زین نظر نہیں آ رہا؟“ اس نے جانے کس سے سوال کیا کیونکہ وہ میرے سامنے سے ہٹ چکا تھا۔

”وہ نہیں آیا یا.....“ اس کی کوئی مصروفیت تھی۔“ کبیر بھائی نے جواب دے کر میری مشکل آسان کر دی۔

”چلو بھائی ہاتھ دھو لو سب لوگ..... کھانا پانچ منٹ میں میز پر ہوگا.....“ اور ہاں میثاق، تم ذرا خانساں کو بتاؤ

کہ جمال کے ڈرائیور کو کھانا وغیرہ ٹھیک سے دے، دے اور اسے آرام کرنے کے لیے اس کا کمرہ بھی بتا دے۔“

”جی ماما!“ میثاق میرے ساتھ والی کرسی سے اٹھ کر گیا تو کامل کو بیٹھنے کی جگہ مل گئی۔ میں سانس روکے بیٹھی تھی کہیں میری سانسوں کے زیرِ دم سے کوئی معنی اخذ نہ کر لے۔

☆☆☆

”یہ کیا بات ہوئی..... کل ہی تو تم لوگ آئے ہو اور آج چل دیے۔“ مہر پھپھو چاچو سے ناراضی سے کہہ رہی تھیں۔

”اصل میں، میں تو اپنے خاندان کی اگلی نسل کے اس پہلے فرد کو دیکھنے کے اشتیاق میں آیا ہوں اور اس لیے کہ

امرت تمہانہ جانے ورنہ میں تو اسے کہہ رہا تھا کہ جہاز سے سفر کر لیتی۔“

”اچھا کیا ناں کہ تم بھی چلے آئے ساتھ!“ انہوں نے چاچو کو پیار کیا۔ ”یا نہیں کہ کب بچھلی دفعہ تم آئے تھے.....“

”ارے آپ اپنی ابھی تو اگلے دن آیا تھا فاطمہ کی مہندی پر!“ چاچو نے صفائی پیش کی۔

”وہ اگلا دن دو سال پہلے آیا تھا۔“ پھپھو نے مصنوعی غصے سے ان کا کان کھینچا۔

”ادوہ واقعی ماموں.....؟“ فاطمہ نے حیرت سے پوچھا۔ ”یہ تو واقعی بہت زیادتی ہے۔“

”آج تو نہیں جا سکتے تم واپس، چاہے جب بھی ہو جائے۔“ مہر پھونے کہا۔ ”بھائی جی اقبال بھی آج آرہے ہیں..... ورنہ تمہیں انہیں ملنے کے لیے جاتے ہوئے نور پور سے ہو کر جانا پڑے گا۔“

”ارے نہیں آپ!..... میں تو موٹر وے سے واپس جاؤں گا، نور پور نہیں جا سکتا..... اور میرا آج جانا لازمی ہے، کل میری اپنے کارڈیا لو جسٹ کے ساتھ اپائنٹمنٹ ہے..... ورنہ پھر کئی ہفتے انتظار کرنا پڑے گا۔“

”ادوہ.....“ پھونے کہا۔ ”میں تو خوش ہو رہی تھی کہ آج نصیب سے میرے دونوں بھائی میرے گھر میں ایک ساتھ ہوں گے۔“

”میں دیر سے نکل جاؤں گا، بھائی جی کو مل کر.....“ چاچو نے کہا۔ ”اور امرت ابھی ر کے گی، جب تک اس کا دل چاہے گا۔“

”نہیں اندھیرا پڑ جائے گا، دیر سے سفر کرنے سے بہتر ہے کہ تم اپنے پروگرام کے مطابق ابھی نکل جاؤ۔“

”پتا ہے کیا آپ!.....“ چاچو نے شرارت بھرے لہجے میں کہا۔ ”میری گاڑی کی ہیڈ لائٹس بھی ہیں..... جب وہ چلتی ہے تو اس کی بٹیاں جلنے سے سامنے سڑک بھی نظر آتی ہے۔“ اس پر سب کا بھرپور ہتھکڑ پڑا تھا۔

تایا اقبال لوگوں کے پہنچنے ہی پھونے فوراً کھانا لکھوایا تاکہ جمال چاچو وقت پر نکل سکیں۔ ان کے روانہ ہونے کے تھوڑی دیر کے بعد شام کی چائے پی گئی اور تایا جان مع تانی جان اور تمنا کے واپس روانہ ہوئے۔ تمنا سے بھی میری بہت دنوں کے بعد ملاقات ہوئی تھی مگر اس کے ساتھ تہا بیٹھے کا وقت ہی نہ ملا۔



”کل نے کل دن کے کھانے پر بلایا ہے سب کو۔“ رات کے کھانے پر مہر پھونے بتایا۔

”میں کیسے جا سکتی ہوں ماما.....؟“ فاطمہ نے معذرت کی۔ ”اچھے پھونے سے بچے کے ساتھ اتنا سامان لے کر جانا۔“

”میں فاطمہ کے پاس رک جاؤں گی۔“ میں نے فوراً اپنی خدمات پیش کیں۔

”کل نے سب کو کھانے پر بلایا ہے..... تمہیں خاص طور پر کہ تم اپنی شادی کے بعد پہلی بار آئی ہو۔“ مہر پھونے بتایا۔

”مگر ابھی تو میں اکیلی آئی ہوں، جب کبھی زین کے ساتھ آئی تو.....“ میں نے تاویل پیش کی۔

”زین کے ساتھ.....“ میثاق ہنسا۔ ”جیسے کہ وہ تمہارے ساتھ لاہور آئی جائے گا۔“

”کیوں نہیں آئے گا؟“ میں نے چتون چڑھا کر پوچھا۔

”جیسے کہ ابھی نہیں آیا.....“ میثاق نے وضاحت کی۔ ”وہ کہتا ہے اسے اپنے دوستوں کے ساتھ سفر کرنا پسند ہے نہ کہ فیملی کے ساتھ..... اور تو اور فاطمہ کی ہندی پر بھی وہ اپنے دوستوں کے ساتھ سفر کر کے آیا تھا اور رات کو دیر سے فارغ ہو کر سونے کے لیے بھی وہیں گیا تھا جہاں وہ لوگ کسی ہوٹل میں قیام پزیر تھے.....“

”ظاہر ہے کہ شادی والے گھر میں مہمانوں کا رش ہوتا ہے۔“ میں نے فوراً زین کی صفائی میں کہا۔

”ادوہ..... اپنے شوہر کی صفائیاں دیتی ہوئی کتنی پیاری لگ رہی ہو امرت۔“ فاطمہ نے ہنس کر کہا۔

”ہرا بھی بیوی اپنے شوہر کا اسی طرح دفاع کرتی ہے۔“ اموجان کے لہجے میں میرے لیے فخر تھا، پھونے بھی مسکرائیں۔

”اللہ کرے کہ وہ بھی اتنا ہی اچھا شوہر ہو جتنی اچھی یہ بیوی ہے۔“ میثاق نے کہا تو سب نے بیک آواز آمین کہا۔

”ہو سکتا ہے کہ وہ مجھ سے بھی اچھا ہو۔“ میں نے ابرو اچکا کر کہا۔

”اچھا لطفہ ہے.....“ میثاق نے کہا۔ ”جیسے کہ ہم اسے جانتے نہیں۔“ وہ جیسے زرب لب بڑبڑایا تھا۔

”اب تم مجھ سے مار کھاؤ گے بیٹا!“ پھپھو نے اسے سرزنش کی۔
 ”کوئی بات نہیں مہر..... بچے ہیں آپس میں مذاق کر رہے ہیں، تم اس بات کو سنجیدگی سے مت لو اور یہ تو یوں
 بھی سالی اور بہنوئی کا مذاق ہے.....“ اموجان نے بیٹا کو کا دفاع کیا۔
 ”مذاق میں بھی مراتب کا لحاظ رکھنا لازم ہے۔“ پھپھو کہہ کر کھانے میں مشغول ہو گئیں۔ بیٹا غجالت محسوس کر
 رہا تھا، سب اپنے، اپنے کھانے پر دھیان دینے میں کوشاں ہو گئے۔
 میرے فون پر پیغام کی سیپ بجی، فون میز پر الٹا رکھا تھا، میں نے سیدھا کیا۔
 ”سوری!“ بیٹا کا پیغام تھا۔
 ”چاول لیا بیٹا!“ میں نے مسکرا کر چاولوں کی ڈش اٹھا کر اس کی طرف بڑھائی۔
 ”ٹھیک ہے، کل سب چلیں گے گل کے ہاں دوپہر کے کھانے پر..... فاطمہ کے پاس اس کی ملازمہ رکے
 گی۔“ کھانا ختم ہونے پر پھپھو نے اعلان کیا۔

☆☆☆

”تم نے اپنے اسکول میں بتا دیا ہے کہ.....“ ممانے سوال کیا تھا۔
 ”جی ممانا..... انہیں ویسے بھی علم ہو ہی جاتا تھا، ڈاکٹر یاسین کی بھانجی میری کلاس میں پڑھتی ہے، اسے بھی اس کی
 ماں نے بتا دیا تھا اور مجھے بھی مبارک باد دے دی تھی، میں نے سوچا کہ اس سے پہلے کہ کہیں اور سے خبر پہنچے.....“
 ”ایک تو مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگوں کو کس بات کی اتنی خوشی ہو رہی ہے کہ مبارک بادیں دیتے پھر رہے
 ہیں، جب تک کہ تم ان سے نہ کہو کہ تم کتنی خوش ہو۔!“ چار دن پہلے لاؤنج میں بیٹھ کر زائید کی ساس کو زائید کے
 بارے ایسی ہی بات کی مبارک بادیں دیتی ہوئی ممانا..... اس وقت کتنی بڑی منافق لگ رہی تھیں۔
 ”مجھے تو خود علم نہیں ممانا کہ مجھے اس بات پر خوش ہونا چاہیے یا پریشان؟“
 ”تم اچھی طرح جانتی ہو کہ یہ تمہاری اپنی سازش ہے، میرے بیٹے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پھانسنے کے لیے تم
 نے یہ طوط اس کے گلے میں ڈالنے کا سوچا ہے۔“
 ”میں اس کے گلے میں کیا طوط ڈال سکتی ہوں ممانا..... اسے خود ہی اس ان چاہے رشتے کا طوط اپنے گلے
 میں نہیں ڈالنا چاہیے تھا۔“

”اللہ معاف کرے ان کو.....“ انہوں نے لہجے میں جہاں بھر کی تلخی سمیٹ کر کہا۔ ”تمہارے والد صاحب
 نے خود جہال سے کہہ کر بلکہ مجبور کر کے یہ رشتہ دیا..... انہیں جذباتی کر کے کہ یہ رشتہ ان کے والد صاحب کی خواہش
 تھی، اللہ جانتا ہے کہ ایسا تھا بھی کہ نہیں، ایسے بے جوڑ رشتے کے بارے میں انہوں نے سوچا بھی کیونکر..... رہتے
 یہاں تھے مگر فائدہ انہوں نے گاؤں والے بیٹے کا سوچا، جانے مر جانے والوں کی خواہشات زندہ انسانوں کی
 خواہشات پر فوقیت کیوں لے جاتی ہیں؟“ انہوں نے سو فیصد وہی بات کی تھی جو میں نے اس وقت سوچی تھی جب
 ابو جان نے مجھ پر یہ رشتہ مسلط کرنے کو یہ جواز پیش کیا تھا۔

مگر میں تو ممانا کو جوابا کہہ بھی نہیں سکتی تھی کہ مجھ پر بھی یہ شادی اسی طرح مسلط کی گئی تھی جس طرح کہ ان کے بیٹے
 پر، میں تو اپنے باپ کے مان کے آگے مجبور ہو گئی تھی مگر زین کو کیا مجبور ہی؟ اس روز کہہ رہا تھا۔ ”محبت!“ تو اسے مجھ
 سے محبت تھی، چاچو سے یا کسی اور سے محبت تھی؟ کیا واقعی ہم کسی مثلث کے کردار تھے.....
 ”بہت پڑھی لکھی اور عقلمند ہو تم مگر ایسی باتوں میں مشورہ کر لینا بہتر ہوتا ہے، کم از کم تم مجھ سے پوچھ لیتیں کہ
 کس طرح اس معاملے کو سنبھالنا ہے۔ چند دنوں میں، میں کوئی اور ڈاکٹر ڈھونڈ لوں گی اور پھر نہ یہ بچہ ہو گا نہ تمہیں

جاب چھوڑنے کی کوئی مجبوری.....“ انہوں نے بے رحمی سے کہا۔
 ”اب اور بھی زیادہ وقت گزر چکا ہے ماما.....“ میں نے لجاجت سے کہا۔
 ”بچے پیٹ میں مر رہی تو جاتے ہیں، پیدائش سے پہلے، آخری وقت پر بھی مر جاتے ہیں!“ ان کے لہجے میں
 کسی قاتل گفتگو کی جھلک تھی۔ میں خوفزدہ ہوئی تھی۔

☆☆☆

اموجان اور مہر پھوپھو بتا رہی تھیں کہ رانیہ کے ہاں بچے کی ولادت متوقع تھی اور اس کے بعد ثنا کی شادی کا ارادہ
 تھا، تسنیم چچی بھی چاہ رہی تھیں کہ وہ آئندہ برس اپنے دونوں بیٹوں کی شادیاں ایک ساتھ کر دیں تو عباس چچا کو شش
 کر رہے تھے کہ ثنا کا کہیں رشتہ طے ہو جائے۔ اموجان نے ثنا کے بارے میں شامیر کی رائے مانگی تھی تو اس نے
 انکار کر دیا تھا اس لیے اب اسے خاندان سے باہر ہی بیٹا تھا۔ رشتے کی ساری پھوپھیاں اور چچیاں، تائیاں اس
 وقت پیش، پیش تھیں کہ ثنا کے لیے کوئی اچھا رشتہ مل جائے۔

”تمہیں کیا لگتا ہے، اس کا بیٹا ہوگا یا بیٹی؟“ مہر پھوپھو چہرہ پر پوچھ رہی تھیں۔

”ہوں.....“ اموجان سوچ میں پڑ گئیں۔ ”اگر تو اس پر بڑی تو پھر تو بیٹی ہوگی اور اگر ساس پر تو بیٹا ہوگا۔“ لڑکھن
 کے یوں قیافوں پر مجھے دل میں ہنسی تو بہت آئی مگر ایسے معاملات میں ہم لڑکیوں کو بیاہ کے بعد بھی بولنے کی اجازت
 نہ تھی۔ ”ویسے اس کی چال سے تو لگتا ہے کہ بیٹا ہوگا۔“

”چلو جو بھی ہو بیٹا یا بیٹی..... صحت و سلامتی والا ہوا“ پھوپھو نے کہا۔

”مجھے تو بس یہ ڈر ہے کہ شہر بانو کا کیا رد عمل ہوگا اگر بیٹی ہوئی تو؟“ اموجان نے کہا۔

”کیوں، اسے کیا اعتراض ہے بیٹی کی پیدائش پر؟“

”جب تمہارے بھائی جی نے اسے تجویر دی تھی کہ عباس کے ہاں سے رشتہ لے، رانی کا یا ثنا کا تو اس وقت اس نے
 کہا تھا کہ ان کی ماں نے تو بیٹیاں ہی بنائیں جتنی ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کے گھر میں بیٹیاں ہی بیٹیاں جمع ہو جائیں۔“

”ہونہ..... خود تو جیسے اس نے سارے بیٹے ہی جنے ہیں، ناں ایک بیٹا پیدا کر کے پیچھے دو بیٹیاں اس نے بھی
 پیدا کی ہیں بھابی!“ مہر پھوپھو نے غصے سے کہا۔

”اچھا چلو..... ہمیں کیا لینا دینا کہ کسی کے ہاں کیا ہونا ہے اور کیا نہیں۔“ اموجان نے کہا۔ ”اس وقت تو بتاؤ

کہ چائے پینے کے بارے میں کیا خیال ہے؟ یہ امرت بہت مزے کی جائے بناتی ہے۔“ مجھے لگا کہ اموجان نے
 مجھے وہاں سے اٹھانے کے لیے ایسی بات کی تھی۔ کبیر بھائی اور فاطمہ اپنے کمرے میں آرام کر رہے تھے اور مجھے نیند

نہیں آرہی تھی تو میں وہیں بیٹھی تھی۔

”اس وقت چائے پی لی تو رات جاگ کر رہی گزرے گی پیاری بھابی!“ مہر پھوپھو نے ہنس کر کہا۔ ”تم صرف

چائے ہی اچھی بناتی ہو یا کچھ اور بھی؟“

”اور کیا مثلاً؟“ میں نے بوکھلا کر پوچھا۔

”بھئی تم بھی اب اپنا خاندان بناؤ، بچے و بچے پیدا کرو.....“ پھوپھو نے واضح بات کی تو میرے گال لال ہو گئے۔

”جب اللہ کی مرضی پھوپھو!“ میں نے ہولے سے کہا۔

”اللہ کرے کہ اللہ ہی کی مرضی ہو.....“ انہوں نے ہنس کر کہا۔ ”آج کل کے بچوں کی بھی بہت مرضیاں ہونے لگی

ہیں اور اسی من مانی اور مرضی میں اپنی جانوں کو ایسے، ایسے روگ لگا بیٹھتی ہیں کہ بعد ازاں مسائل ہوتے ہیں۔“

”چائے تیشی لیں گی یا پھلکی پھوپھو؟“ میں نے اٹھتے ہوئے سوال کیا۔

”بات ٹالنا بہت اچھی طرح آتی ہے تمہیں امرت!“ ان کی بات پر میں ہنسی۔ بات تو ان کی میں نے ٹال دی تھی مگر وہ بات میرے کانوں کے راستے دماغ میں اتر کر وہیں چپک کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

ہمارے کمرے کا اسی کام نہیں کر رہا تھا اور گرمی کڑا کے کی بڑی تھی، اوپر کے فلور کا جو کمراسب سے زیادہ دھوپ کی زد میں ہوتا تھا، وہ ہمارا تھا۔ یوں تو مجھے گرمی زیادہ نہیں لگتی تھی مگر اس حالت میں گرمی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔ گھر کے سب افراد اپنے اپنے کاموں کے سلسلے میں گھر سے باہر تھے۔ میں نے سوچا کہ نیچے جا کر ماما کو بتاتی ہوں کہ وہ اے سی کی مرمت کے لیے شکایت درج کروادیں۔ ماما کے کمرے کا دروازہ لاکڈ تھا، حسہ اور زائندہ کے کمرے بھی پگلی منزل پر تھے۔ میں نے تاب گھما کر چپک کیا تو حسہ کے کمرے کا دروازہ بند تھا، زائندہ کے کمرے کے بارے میں مجھے اندازہ تھا کہ اس کی شادی کے بعد اس کا کمرہ معمول میں استعمال نہیں ہوتا تھا مگر وہ اب بھی اسی کا کمرہ کھلاتا تھا۔ اس کمرے کی باقاعدگی سے صفائی کروائی جاتی تھی اور اس میں اس کے استعمال کی چیزیں اسی طرح بڑی ہوتی تھیں جس طرح کہ وہ یہاں رہتے ہوئے رکھتی تھی اور جاتے ہوئے چھوڑ جاتی تھی۔ لڑکوں کے کمروں کے دروازے لاکڈ نہیں ہوتے تھے مگر حسہ یونیورسٹی جاتے ہوئے اپنا کمرہ لاک کر کے جاتی تھی، ممکن ہے کہ اس کی کوئی بہت قیمتی چیزیں اس کمرے میں ہوں ورنہ اس گھر کے ملازمین تو انتہائی قابل اعتماد تھے اور گھر والوں کی عدم موجودگی میں بھی گھر کی دیکھ بھال اسی طرح کرتے تھے جس طرح کہ ان کے ہوتے ہوئے۔ تھوڑی دیر کے لیے میں لاؤنج میں بیٹھی مگر نیند آ رہی تھی، میں نہیں چاہتی تھی کہ وہاں بیٹھے، بیٹھے سو جاؤں اور ملازمین یا گھر کا بھی کوئی فرد مجھے وہاں سوئے ہوئے دیکھے۔

”چلو زائندہ کا کمرہ کھلے لیتی ہوں!“ خود سے کہتی ہوئی میں اس طرف بڑھی اور بے دھیانی میں دروازہ کھولا تو اندر روشنی بھی تھی اور کمرے میں ٹھنڈک بھی، گویا اندر اے سی چل رہا تھا۔ میں ٹھٹک کر رک گئی، اندر بیڈ پر ارسل سو رہا تھا، وہ گہری نیند میں تھا۔ اس کے پیروں میں اس کے جوتے تھے، غالباً اس کا سونے کا ارادہ نہ تھا اور وہ بیٹھے، بیٹھے سو گیا تھا۔ میں نے اسی آہستگی سے دروازہ بغیر آواز کے بند کیا اور وہاں ہی کے لیے مڑی۔ مگر وہی ایک لمحہ تھا کہ جس کی زد میں آ کر میں نے برے حالات کا شکار ہونا تھا، انہی قدموں پر میں آہستگی سے پلٹی تھی اور مڑی تو ماما اور زائندہ..... عین میری نظروں کے سامنے۔

”آپ کہاں تھیں ماما؟“ جانے کیوں میری زبان سے پھسلا۔

”تو تم یہاں اس کمرے میں مجھے ڈھونڈنے کے لیے آئی تھیں؟“ انہوں نے ابرو اچکا کر سوال کیا۔ ”تم نے

سمجھا کہ میں یہاں ارسل کے پاس ہوں؟“

”مگر مجھے تو علم نہیں تھا کہ ارسل بھائی اس کمرے میں ہیں.....“ میں نے صفائی پیش کی۔ ”تم کب آئیں

زائندہ؟“ میں نے بوکھلاہٹ میں ایک اور سوال کیا۔

”ارسل نے نہیں بتایا تمہیں؟“ اس کے لہجے میں کیا تھا، میں اندر سے سرد ہو گئی۔

”وہ تو اندر سو رہے ہیں، مجھے نہیں علم تھا کہ آپ لوگ آئے ہوئے ہیں اور اس کمرے میں ارسل بھائی.....“

میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی دروازہ کھلا اور ارسل باہر نکلا۔

”آگئے آپ لوگ واپس؟“ اس نے زائندہ سے سوال کیا۔

”کیوں، کیا ہم جلدی آگئے.....“ کل ہوئے ہم لوگ؟“ تیر ہی تیر..... میں اس کے الفاظ کے مطالبہ نہ چاہتے

ہوئے بھی سمجھ رہی تھی۔ ”یہ تو کہہ رہی تھی کہ تم سو رہے ہو..... مگر لگتا ہے کہ اس نے تمہیں صحیح طرح نہیں سلایا؟“

”کیا بتایا ہے ڈاکٹر نے..... سب ٹھیک تو ہے ناں؟“ اس نے زائنتہ کی باتوں کو نظر انداز کر کے سوال کیا۔
 ”تو کیا یہ تھی تمہاری منصوبہ بندی؟“ زائنتہ نے اپنے لہجے کی کچی کو برقرار رکھا۔
 ”کیا کبھی میری منصوبہ بندی؟“ اس نے بھی غصے سے کہا۔ ”کیا فضول باتیں کر رہی ہو تم زائنتہ؟ میں کچھ پوچھ رہا ہوں۔ تم سے اور تم کچھ اور جواب دے رہی ہوں!“

”تم وہاں سے میرے ساتھ آئے اور یہاں آ کر رک گئے، جانتے ہو گے کہ یہ گھر پر ہی ہے..... اور مجھے گھر سے ماما کے ساتھ بھیج کر تم اس کے ساتھ گھر پر رنگ لیاں.....“

”ماما..... اس کو روکیں..... اس سے کہیں کہ اپنی زبان پر قابو رکھے۔ اسے بتائیں کہ آپ کو میں نے اس کے ساتھ نہیں بھیجا تھا بلکہ آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ میں گھر پر رگوں کیونکہ میرے وہاں جانے کی ضرورت نہیں تھی۔“ وہ چلا کر بولا۔
 ”کول ڈاؤن.....“ ماما نے کہا۔ ”دونوں خاموش ہو جاؤ تھوڑی دیر کے لیے۔“ میں تو وہاں کسی ایسے مجرم کی طرح کھڑی تھی جس کے پاؤں پر میخیں گاڑ دی گئی ہوں اور وہ حرکت کرنے کے قابل نہ رہا ہوں۔

”آپ نے دیکھا ماما..... یہ اس کمرے سے ہمارے سامنے باہر نکلی ہے، اس میں کوئی دودراے نہیں ہیں ناں۔“ وہ چیخ کر بولی پلیر زائنتہ..... میرے کمرے کا اسی خراب تھا اس لیے میں نیچے آئی تھی۔“ میں نے صفائی پیش کی۔

”مجھے علم نہیں تھا کہ تم لوگ آئے ہوئے ہو اور پھر یہ تم اور ماما گھر پر بھی نہیں ہو..... میں نے دروازہ کھول کر ارسل بھائی کی جھلک دیکھی اور فوراً دروازہ بند کر دیا بلکہ میں تو خوش منہ.....“ میں نے جلدی، جلدی سے کہا۔

”تمہارے کمرے کا اسی خراب ہونے کا مطلب ہے کہ تم میرے شوہر کے ساتھ، میرے کمرے میں۔“ اس نے میری بات کاٹ کر اپنے مطلب کے حافی اخذ کرتے ہوئے فضول بات کی۔
 ”بند کر واپس آنا زائنتہ..... ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔“ ارسل چیخا تھا۔

”کیا برا ہوگا..... کیا برا کر لو گے تم میرے ساتھ؟“ وہ جواباً چیخی۔ ”اس نے میرا تم اور کیا کر لو گے، میرے باپ کے گھر کی چھت تلے، ان کی بیہوش کے ساتھ..... تم ان کی عزت کی دھجیاں اڑا رہے ہو، اس کے ساتھ رنگ لیاں منار ہے ہو اور کہہ رہے ہو کہ تم کچھ اور برا بھی کر سکتے ہو میرے ساتھ؟“
 ”زائنتہ! میں تمہیں طلاق.....“ وہ چیخا تھا۔

”خدا کے لیے ارسل بھائی..... ہوش میں رہیں آپ، اپنے حواس نہ کھوئیں..... زائنتہ کو غلط فہمی ہوئی ہے تو ہم اس کی غلط فہمی دور کر دیں گے۔“ میں نے ان کی منت کی۔

”تم اپنی حدود سے باہر نکل رہے ہو ارسل..... بات اتنی نہیں ہے جسے تم اتنا بڑھا رہے ہو۔“ ماما نے بھی غصے سے کہا۔ ”اس بے حیا لڑکی کی وجہ سے تم نے معاملہ اس حد تک پہنچا دیا ہے کہ تم نے میری بیٹی کو طلاق کی دھمکی دے دی ہے۔“
 ”میں نے اسے کوئی دھمکی نہیں دی.....“ ارسل چلایا۔ ”میں اسے طلاق دیتا ہوں۔“

”بس ارسل بھائی!“ میں ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ ”اس سے آگے کچھ نہ بولیں! آپ بہت غصے میں ہیں مگر اپنے حواس قائم رکھیں، ایسا نہ ہو کہ آپ کو بچھڑانا پڑے کہ جو الفاظ آپ کے منہ سے نکل جائیں گے وہ واپس نہیں آ سکیں گے۔“

”یہ اسی قابل ہے شاید..... اس نے صرف تم پر ہی نہیں امرت، مجھ پر بھی شک کیا ہے، میری دیانتداری اور وفا پر شک کیا ہے میں اس کی زبان کی بہت سی بدترینوں کو برداشت کرتا ہوں مگر یہ نہیں..... میں مزید اس کے ساتھ رہ کر اس کی ایسی فضول اور گھٹیا سوچ کو برداشت نہیں کر سکتا! اس لیے میں ابھی اس کو، اسی وقت.....“

”خدا کے لیے ارسل بھائی! اس وقت آپ چلے جائیں یہاں سے اور مزید کچھ نہ کہیں.....“ میں نے رو،

رہا لہذا کر بیان بھی بھگولیا تھا۔ وہ دندنا تا ہوا واپس کرے میں گیا، اس کے عقب میں دروازہ پورا کھلا تھا، بیڈ کی سائڈ ٹیبل سے اس نے اپنا فون اور بیڈ اٹھایا تھا۔ وہ اسی چلیے میں سو رہا تھا جس میں وہ غالباً یہاں آیا ہوگا، بیڈ اپنی پیٹ کی جیب میں رکھتا ہوا وہ باہر نکلا، خوشخوار نظروں سے زائنتہ کو دیکھا۔

”آپ فکر نہ کرو بہن..... اللہ بہتر جانے اور انصاف کرنے والا ہے۔“ میرے سر پر ہاتھ رکھ کر خدا حافظ کہا اور ان دونوں سے کچھ کہے بغیر باہر نکل گیا۔

میں پچکیوں سے رونے لگی اور زائنتہ کی زبان سے گویا گولیاں فائر ہونے لگیں۔

”بے غیرت..... بے حیا..... ذلیل..... گھنٹی..... بے شرم..... زانی.....“ جو کچھ اس کے منہ میں آ رہا تھا وہ بکے جا رہی تھی، جانے اسے سنار ہی تھی جو چاکا چاکا تھا مجھے۔ اس کی لغت میں اتنی گالیاں ہوں گی اور وہ بھی ایسی، ایسی میں نے اس کے بارے میں کبھی درست اندازہ نہیں لگایا تھا۔

”اب تم بھی کہیں مرو گی یا یہیں کھڑے ہو کر تماشا دیکھتی رہو گی؟“ خون آشام نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے مہا پوچھ رہی تھیں۔ ”دفع ہو جاؤ تم کہیں..... دور ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے، میرے گھر کو چھوڑ دو تم“ ورنہ تم تباہ کر دو گی اس گھر کو۔“

”آپ میری پوری بات تو سنیں مہا.....“ میں نے لجاجت سے کہا۔

”میری بیٹی کے شوہر کو پھنسا کر اس کے منہ سے میری بیٹی کو طلاق تو کہلوادی، اب اور کیا سنانا چاہتی ہے تو؟“ وہ تم سے تو پر آگئی تھیں اور غصے سے ان کے منہ سے کف نکل رہا تھا۔ ان کا غصہ بیٹی کے شوہر کی طرف سے طلاق کے الفاظ کہے جانے پر بجا مگر وہ میری بات سنیں تو انہیں اندازہ ہوتا کہ وہ دونوں کتنی غلط تھیں۔ ”میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ تمہارے پیٹ میں جانے کس، کس کا بچہ ہے۔“

”تو کیا یہ بھی پریگنٹ ہے مہا؟“ زائنتہ کو اس صورت حال سے خاصی دلچسپی محسوس ہوئی تھی..... ”کیا زین..... میرا مطلب ہے کہ اس نے اسے اپنی بیوی بنا کر رکھا ہے اسے کیا؟ میں تو سمجھی تھی کہ پاپا کی ضد اور مطالبے کو مان کر صرف نکاح کر کے لاکر گھر میں ڈال دے گا۔“

”تمہارے باپ کی ضد تو تھی مگر جانے ان ماں بیٹی نے کیا جادو کر دیا تھا میرے بیٹے پر کہ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ باپ کے سامنے ہاں کر بیٹھا۔“

”پاپا نے اسے ڈراوا ہی ایسا دیا تھا مہا..... اور انہیں دوسروں کو جذباتی کر کے اپنی بات منوانا آتا ہے اچھی طرح.....“ زائنتہ کیوں پیچھے رہتی مہا سے..... ”اگر زین نے بحالت مجبوری اس سے نکاح کر لیا تو اسے بیوی بنانے کی کوئی مجبوری تو نہیں تھی اسے..... اب یہ کس طرح پریگنٹ ہے؟“

”یہی تو میں نہیں جانتی کہ اس کے پیٹ میں جو بچہ ہے وہ کس کا ہے۔“

”خدا کے لیے مہا.....“ میں چیخی۔ ”ایسا نہ کہیں۔ آپ کی بیٹی بھی اسی حالت میں ہے..... اگر یہی سوال کوئی اس سے کرے تو آپ کو کیسا لگے گا؟“

”بکواس بند کرو بے حیا..... میری بیٹی کو خود سے نہ ملاؤ..... چند منٹ پہلے تو تم رنگے ہاتھوں اس کے شوہر کے ساتھ پکڑی گئی ہو۔“ وہ مغلظات اگل رہی تھیں اور میں بے بسی سے سب کچھ سن رہی تھی۔ ”میری بیٹی تمہاری طرح... بدکردار ہے نہ ہی وہ اپنے شوہر کے علاوہ کسی اور مرد کے کمرے سے برآمد ہوئی ہے کبھی۔“ حد ختم ہو گئی تھی۔ ان کی سوچ اتنی غلیظ اور زبان اتنی کاٹ دار تھی، مجھے جلد ہی کوئی فیصلہ کرنا تھا، میں اس طرح کے حالات میں مزید نہیں رہ سکتی تھی۔ (جاری ہے)

کبھی، کبھی اداسیوں کے موسم اتنے طویل
ہو جاتے ہیں کہ سانس لینا محال اور جینا دشوار ہو جاتا
ہے۔ طلوعِ صبح کے انتظار میں صحنِ روم، روم میں سرایت
کر جاتی ہے۔

افق اور اس کی قسمت دونوں کو سیاہ بادلوں نے اپنی
پلیٹ میں لیا ہوا تھا۔
آسمان پر ایک پر شکوہ نگاہ ڈال کر وہ اپنے کمرے
کی طرف بڑھ گئی۔

اچانک ایک جگنو نے اس سمت کا رخ کیا تھا۔
ایک ایک اندھیرا چمٹا تھا اور اس کا آنگن روشن ہوا تھا مگر تب

بگنگنا دی؟ زندگی؟ دانیہ آفرین



۱۰ اپنی آنکھوں میں مایوسیوں کے رنگ لیے لوٹ
پلی تھی۔

☆☆☆

”حنین میں نے تم سے کہا تھا کہ میری بلیک شرٹ
استری کر دو، تم نے وائٹ شرٹ استری کر دی، کہاں
دامغ ہوتا ہے تمہارا آج کل؟“ اسود کڑے تیور لیے اس
کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

”سوری، بس پانچ منٹ میں بلیک شرٹ استری
کر دیتی ہوں.....“ شرمندگی سے سر جھکائے وہ استری
اسٹینڈ تک آگئی۔

”کب تک چلے گا یہ سب؟ تم آج کل ہر کام الٹا
کر رہی ہو۔“ اسود بھی اس کے پیچھے آکر کھڑا ہو گیا۔
”اسود پلیز میرے سر میں درد ہے۔“ بیزاری سے
کہتی وہ شرٹ استری کرنے لگی۔

”چھوڑو اسے، مت کرو یہ احسان مجھ پر۔“
اس کے ہاتھ سے شرٹ کھینچ کے اس نے وہی
سلوٹوں والی شرٹ پہن لی اور غصے سے بڑبڑاتا ہوا گھر
سے نکل گیا۔

حنین لب بھینے اپنے آنسوؤں کو پلکوں کی باڑ سے
باہر آنے سے باز رکھنے کی کوشش کرنے لگی۔

روز کا یہی معمول تھا۔ ناشتا، کھانا، صبح، شام، رات
پر دن کل، کل سے شروع ہو کر کل، کل پہ ختم ہوتا تھا۔ وجہ
کبھی صرف ایک.....

”آپنی ابو سے کچھ کہتی کیوں نہیں، آپ لاوارث
نہیں ہیں، آپ کے پیچھے آپ کے اپنے موجود ہیں۔“
افزائے بہن کو حلقی سے دیکھا۔

”افزا جانی سمجھا کرو، بابا کو کہوں گی تو معاملہ اور
مکڑے گا۔“ حنین نے بہن کا ہاتھ تھام کر سمجھایا۔

”میرا دل چاہتا ہے کہ اس شخص کو شوٹ کر دوں۔“
حنین نے چونک کر دیکھا۔

افزا کی بھوری آنکھوں میں اپنے بہنوئی کے لیے
نفرت اور رخت ناپسندیدگی کا رنگ نمایاں تھا۔
”یہ لیجیے آپ کے لیٹرز، یہی دینے آئی تھی آپ

کو.....“ افزائے لفافے اس کی طرف بڑھائے۔

حنین انہیں تھامتے ہوئے ماضی میں کھو گئی جب وہ
ڈاکے کا بے صبری سے انتظار کرتی تھی۔ ڈاکے کی دروازے
پر دستک اس کے اندر زندگی کی نئی لہر دوڑا دیتی تھی۔ اس کے
اس دیوانہ پن پر گھر والے اکثر اس پر ہنستے تھے۔

”پتا نہیں ہمارے ماں باپ اپنی بیٹی کے لیے کماؤ
داماد کیوں پسند کرتے ہیں؟“ جی ہاں، کئی نہ ہو تو شکل،
صورت، پیسہ سب دھرا رہ جاتا ہے۔“ افزائے گھر کے
انٹیریور کو دیکھتے ہوئے تاسف سے کہا۔

حنین اس کی آواز پہ ماضی سے حال میں لوٹی تھی۔
”ملک کی بہترین مصنفہ جس کے لاکھوں فینز ہیں،
جو ہر ادارے اور ایڈیٹر کی ڈیمانڈ ہے، اس کا شو ہر اسے
لکھنے سے روک رہا ہے اور عالم افسوس تو یہ ہے کہ وہ شخص
جاہل بھی نہیں، سول انجینئر ہے۔“

افزا کا غصہ کم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ بیل
بجنے کی آواز پہ دونوں چونکی تھیں۔
”لگتا ہے امی (ساس) آئیں، افزا پلیز تم ان سے
تمیز سے بات کرنا۔“ حنین نے اس کا ہاتھ تھام کر اٹھایا۔

”کون آیا ہوا ہے؟“ ثریا بیگم نے ڈرائنگ روم
کے دروازے سے رعب دار آواز میں پوچھا۔
”امی افزا آئی ہوئی ہے۔“

”اچھا تو ہمارے پیچھے ٹیکے والے آئے ہوئے ہیں۔“
ثریا بیگم نے بڑی سی عینک کے پیچھے سے افزا کو گھورا۔

”السلام علیکم آنٹی، وہ میں یہاں سے گزر رہی تھی تو
سوچا کہ آپنی سے ملتی جاؤں۔“ افزائے بوکھلاہٹ سے
جواب دیا۔

”اچھا ہے، آگئی ہو تو کھانا کھا کر جانا۔“ ثریا بیگم
نے بے دلی سے مرود دکھائی۔

”نہیں، نہیں میں بس چلتی ہوں، اوکے آپنی،
اللہ حافظ۔“

افزا، ثریا بیگم سے الوداع کر کے الٹے قدموں
بھاگی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے جذباتی انداز میں تقریر کرنے
والی افزا بھی ثریا بیگم کی رعب دار شخصیت سے گھبرا گئی

پھریوں ہوا کہ

پھریوں ہوا کہ
آنکھ میں آنسو نہیں رہا
پتھر اگئیں آنکھیں کوئی ارماں نہیں رہا

پھریوں ہوا کہ
راتے بھی تنگ سے پڑ گئے
ملنے کی حسرتیں سبھی دم توڑتی گئیں
پھریوں ہوا کہ

کہہ کے پشیمان ہو گئے
وہ بھی ساعتوں کے قابل نہیں رہا

پھریوں ہوا کہ
دل کی باتیں بھی گھٹ کے رہ گئیں
اور مجھ سے میرے حال پہ رویا نہیں گیا
پھریوں ہوا کہ

اس کے پاس بھی کوئی کہانی نہیں بچی
اور میں بھی تھک ہار کے ایسے ہی سو گیا

کاوش: طمانہ سجاد بخش، کوہاٹ

”صبح پوچھتی ہوں کلامی صاحب سے۔ چیک کو
دراز میں رکھ دو افزا۔ اور پلیز ماسٹرنہ کرنا، مجھے کچھ دیر سونا
ہے، سر درد سے بھٹ رہا ہے۔“ کہہ کر اس نے کمرٹ
منہ تک لے لیا۔

”جاتے ہوئے لائٹ آف کر دینا۔“ کمرٹ
کے اندر سے ہی اس نے آرڈر دیا۔
”اوکے!“ افزانہ بتاتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

☆☆☆

”کلامی صاحب، آپ مجھے میری کتاب کی رائٹنگ
دے چکے ہیں۔ پھر یہ چیک؟“ حنین نے صبح اٹھتے ہی
سب سے پہلے بلاشر کو فون کیا تھا۔

تھی۔ حنین بہن کی حالت سے خط اٹھاتی لفافے لیے
اپنے کمرے میں آ گئی۔

آج وہ بہت دنوں بعد مسکرائی تھی، کچھ لمحوں کے
لیے ہی سہی۔ سچ ہے بابل کے گھر کی ہوا بھی پاس سے
گزرے تو سکون کا احساس ہوتا ہے۔ افزا تو پھر اس کی
ماں جاتی تھی۔

”ڈیر حنین خان، ادارے کو آپ کی کمی شدت سے
محسوس ہو رہی ہے، آپ کے پرستار بھی آپ کی تحریر کا بہت
بہ ممبری سے انتظار کر رہے ہیں۔ پلیز سب کو مزید انتظار مت
کروائیں اور اپنا کوئی شاہکار ناول جلد بھیج دیجیے۔“

منیرہ ضیا

مدیرہ تحفہ بہار

حنین نے نم آنکھوں سے خط کو لفافے میں واپس
رکھ دیا اور بھی کئی خط تھے جو یقیناً پرستاروں کی طرف سے
تھے۔ حنین کے لیے مزید پڑھنا دشوار ہو رہا تھا۔ اس نے
سب لفافے الماری میں رکھ دیے اور کھڑکی میں آ کر
کھڑی ہو گئی۔

ٹھنڈی ہوانے اس کے اعصاب کچھ بحال کیے تو
وہ کاغذ قلم لے کر بیٹھ گئی۔ اس دن کافی دیر تک وہ قلم اس
پہ اپنے قلم سے الفاظ کھینچتی رہی تھی۔

☆☆☆

”حنین بیٹا اپنا خیال رکھا کرو، اس حالت میں خود
سے بے پروائی ٹھیک نہیں۔“ امی اس کی حالت دیکھ کر
متشکر ہوتی تھیں۔

”ٹھیک ہوں امی۔“ ہارے ہوئے انداز میں
کہہ کر وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔

آج وہ عرصے بعد میکے آئی تو سب اس کی حالت
کے پیش نظر پریشان تھے۔

وہ کیا ہستی سب سے کہ آپ لوگوں کے فیصلے کی ہی
وجہ سے تو ہوا ہے میرا یہ حال۔

”آپی بلاشر کی طرف سے یہ چیک آیا تھا آپ
کا۔“ افزا اس کے سامنے بیڈ پر کچھ فاصلے پر بیٹھ گئی۔

”پچاس ہزار کا چیک!“ حنین دفعتاً حیران ہوئی تھی۔

ہوادہ حنین کے قریب آ گیا۔

”حنین! ننھی پری کی آمد مبارک ہو۔“ اس نے چوہکے اسود کو دیکھا۔

”حنین مجھے معاف کر دو، میں ان لمحوں کو واپس تو نہیں لاسکتا جن میں تمہیں میری وجہ سے اذیت پہنچی مگر میں ماضی میں کی گئی اپنی غلطیوں کا مداوا ضرور کر سکتا ہوں، میری طرف سے یہ چھوٹا سا تحفہ قبول کرو۔“ اسود نے تحفہ اس کی طرف بڑھایا۔ حنین پلکیں جھپکاتا بھول گئی تھی، سمندر کے کنارے ایک نازک سی لڑکی بیٹھی مسکرا رہی تھی، بڑے، بڑے حرفوں میں ”مگننگا دی زندگی“ مصنفہ حنین خان لکھا تھا۔

”ہنی! تم مجھ سے چھپ کے ناول لکھتی تھیں، میری اجازت نہیں تھی اس لیے تم نے اسے پبلش نہیں کروایا، یہ بات میں پہلے سے جانتا تھا۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا، ایک لکھاری کو لکھنے نہ دینا، اس سے اس کی سانسیں چھین لینے کے برابر ہے۔ جب تم اپنے بابا کے ہاں گئی تھیں تب میں نے اسے پبلشر کو دے دیا، ارجنٹ پبلش کروانے کے لیے بڑے پاپڑیلے ہیں میں نے۔“ اسود مسکرا کے بتا رہا تھا، حنین نم آنکھوں سے اپنے شریک سفر کو ممنون نظروں سے دیکھ رہی تھی، ایک نہ ایک دن انسان کو اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے..... اندھیرا ایک دن ضرور چھٹتا ہے بس جگنوؤں کا انتظار ثابت قدمی سے کرنا ہوتا ہے۔

”ایک راز کی بات بتاؤں، ڈانٹو گی تو نہیں؟“

اسود نے مظلوم چہرہ بنا کے پوچھا۔

”نہیں ڈانٹوں گی۔“ حنین مسکرائی۔

”تم جیسے ہی نئی قسط لکھتی تھیں، اسی رات میں

تمہارے سونے کے بعد نئی قسط پڑھتا تھا، تمہارے لاکھوں فیض میں سے ایک ہم بھی ہیں۔“ اسود نے کان پکڑ کے اقبال جرم کیا، اسود کے انداز پہ بشمول حنین کے کمرے میں موجود سب لوگوں کے قہقہے بلند ہوئے تھے۔ کھڑکی سے جماعتی زندگی بھی اس لمحے مگننگا دی تھی۔

”حنین جی آپ کی کتاب کی ڈیمانڈ اتنی ہے کہ ہمیں آپ کی کتاب کا دوسرا ایڈیشن چھاپنا پڑا، یہ اس کی رائٹٹی ہے۔ لوگ تو آپ کی دوسری کتاب کے انتظار میں ہیں۔ کب دے رہی ہیں آپ ہمیں اپنا اگلا ناول؟“

کلامی صاحب پروفیشنل آدمی تھے۔ حنین کسی اور پبلشر سے رجوع کرے یہ انہیں گوارا نہیں تھا۔ اس لیے انہوں نے حنین کو بغیر مطلع کیے دوسرے ایڈیشن کی رائٹٹی بھجوا دی۔

”کلامی صاحب اگر میں نے آگے لکھا تو فکر نہ کریں اپنی کتاب پبلشنگ کے لیے آپ کو ہی دوں گی۔“ حنین، کلامی صاحب کی نیچر سے بخوبی واقف تھی اس لیے انہیں مطمئن کر کے فون بند کر دیا۔

ادارے، پبلشنگ ہاؤس اور قارئین سب کی طرف سے اس پر روز بروز دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

”مبارک ہو آہی! اللہ نے آپ کو بہت کیوٹ سی بیٹی دی ہے۔“ کمرے میں آنے پر افزا نے اس کے قریب آکے خوشی سے بتایا۔

”ماشاء اللہ! بیٹا اللہ نے رحمت سے نوازا ہے۔“ بابا نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

”مبارک ہو بہو، یہ تو تم بھی دیکھو چاند کے ٹکڑے کو۔“ ثریا بیگم نے مسکرا کے ننھی پری کو حنین کے پہلو میں لٹا دیا۔ آج حیرت انگیز طور پر ثریا بیگم کا موڈ بھی خاصا خوشگوار تھا۔ حنین نے کمرے میں نظر دوڑائی، اسپتال کے پرائیویٹ روم میں اس وقت سب موجود تھے سوائے اسود کے۔ ایک بے نام سے خدشے نے اس کے دل میں جنم لیا

حنین، افزا کی مدد سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور اپنی ننھی پری کو تم آنکھوں سے دیکھنے لگی، ماں بننا زندگی کا سب سے خوب صورت احساس ہوتا ہے، حنین بیٹی کو الہانہ انداز میں چوم رہی تھی۔ جب دروازہ کھلا اور اسود کمرے میں داخل ہوا۔ حنین نے سر اٹھا کر دیکھا دونوں کی نظریں ملی

تھیں ایک کی آنکھوں میں خدشہ، دوسرے تھے، ایک کی آنکھیں پشیمانی سے جھلی تھیں۔ آہستہ، آہستہ قدم بڑھاتا



دھواں دھواں ہے زندگی

نگہت غفار

”اے ہے... کیا یہ دہن ہے؟“ خالہ مہرونے
پان کی گلدی منہ میں رکھتے ہوئے حیرت سے مجھ سے
سوال کیا تو میں نے اقرار میں گردن ہلائی۔
”جی۔“

”ہائیں تو سچ کہہ رہی ہے فتو۔“ انہوں نے میرا نام
بگاڑتے ہوئے میری طرف غیر یقینی انداز میں دیکھا۔
”یہ ٹہل کیوں لگا رہی ہے کیا اس سے نچلا نہیں
بیٹھا جاتا..... موٹی بھی کسی درخت کی اوٹ سے

کہہ کر ملنا ملانا چھوڑ دیں گے۔ آج کل بیک ورڈ لوگوں کی کوئی عزت نہیں ہے۔“ میں نے خالہ کی بات پر آج کے زمانے کی ساندلی۔

”اے ہے بیٹا..... واہ..... کیا خوب کہہ رہی ہو، یہ فیشن ہے مواغیر مرد، جان نہ پہچان وہ دندنا تا ساری لڑکیوں اور عورتوں کے بچ کیسے پھر رہا ہے؟ کیسے، کیسے زاویے سے تصویریں کھینچ رہا ہے۔“ انہوں نے حقارت سے گردن پھیر کر ایک گھوری بڑے سے نکال کر منہ میں ڈالی۔ خالہ کا غصہ عروج پر تھا۔

”اری فتو۔“ وہ پھر میری طرف پلٹیں۔ ”میں تو تجھے بڑا دیندار اور صوم صلوة کا پابند سمجھتی تھی اور تو بھی موئے اس اجازت زمانے کے ساتھ چل رہی ہے۔“ انہوں نے مجھ پر ہی حملہ کر دیا۔ میں بے ساختہ ہنس پڑی۔

”پیاری خالہ جی..... الحمد للہ..... آپ نے صحیح اندازہ لگایا، میں ایسا کچھ کرنے کے حق میں نہیں تھی مگر دیکھیں ناں اتنے ڈھیر سارے مہمان دو سو دھیانے ڈھیروں عزیز و اقارب جب ان میں سے کسی کو ان باتوں پر اعتراض نہیں ہے تو ہم کون ہوتے ہیں ان باتوں کو برا سمجھ کر ان کو ایسا کرنے سے منع کرنے والے۔“ خالہ پھر بھی دینک بڑ بڑاتی رہیں۔

”پہلے زمانے میں اگر لڑکی کے رشتے کی بات ہوتی تھی تو وہ بیچاری چھوٹی موٹی کی طرح اپنے آپ میں سمٹ جاتی تھی، مگرے سے چل جاتی تھی۔ مگر آج اماں باوا کے سامنے پڑ پڑ میری شادی، میری سرال، میری نند، میرا دیور..... ارے اتنے عزے سے سب کا نام لے لے کر باتیں کرتی ہیں۔ میرا جہیز لانا ہے، میں بھی ساتھ چلوں گی۔ وقت سے پہلے ادھر بات پکی ہوئی ادھر دونوں کے کانوں پر مومنوں کی مہربانیاں انگ گیا۔ ساری، ساری رات مجال ہے دونوں آنکھ لگائیں۔ جیسی طرح، طرح کے مسائل اور پریشانیاں راہوں میں جاںک ہوتی ہیں جب ہمارا پیغام آیا تھا۔ بچپو، چچا، ممانی سب نے کہا مہر و لڑکے کو ایک نظر دیکھ لے۔ سب نے بہت اصرار کیا چچی بولیں تیرے چچا

جہا تک رہی ہے کبھی درخت کی ٹہنی پکڑے مسکرا رہی ہے۔ کبھی اس ستون کو گلے سے لگا رہی ہے، کیا بے چینی ہے اس پیر جلی ملی کو۔“ آج خالہ مہر و میرے نصیب میں آئی تھیں۔ اکثر شادیوں میں وہ یونہی گلے شکوے کرتی نظر آتیں، آج کے زمانے پر آج کی دہنوں پر دل بھر کر لعنت بھیجتیں۔ اپنے جہریوں بھرے گال پتیلیں گول، گول شیشوں والے خوشے میں ان کی آنکھیں کبھی روشنی، روشنی تو کبھی حیرت سے رنگ بدلتی نظر آتیں۔ ”اری فتو زرا دیکھ تو اس بے شرم..... بیہودہ کو کیسے میاں کے کندھے پر سر ڈال کر پڑی ہے۔“

”ارے بوا..... یہ پونڈنگ“ ہو رہی ہے آج کل ایسا ہی ہو رہا ہے سووی اور تصویریں بن رہی ہیں۔“ ”توبہ ہے۔“ انہوں نے پھر غصے سے دلہن بیچاری کو گھورا۔

”خالہ یہ فیشن ہے یادگار دن کی یادوں کو تو آپ لوگ بھی محفوظ کرتے تھے ناں۔“ میں نے ہلکی سی ناگواری سے کہا۔

”ہاں بالکل ہمارے زمانے میں بھی کرتے تھے ایسا..... کالی، سفید تصویریں کیمرے سے لیتے تھے۔ لاج کی ماری دلہن شرم سے ڈھری ہو جاتی تھی بار، بار کبھی خالہ، کبھی پھوپھی، کبھی کوئی کبھی کوئی اس گھوڑی کی منڈی کو اوپر کرتیں کہ چہرہ تو نظر آئے۔ ایسے تھوڑی کہ پورے ہال میں دندنا پی پھریں۔ لعنت ہے ایسے اماں باوا پر اپنی کو بے لگام گھوڑی کی طرح چھوڑ دیا ہے۔ ان ہی حرکتوں سے نت نئی مصیبتوں میں گھر رہے ہیں آج سب۔“

”خالہ وہ زمانہ اور تھا.....“ میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ خالہ نے ٹھیک ٹھاک میری کلاس لی۔

”اے بی بنو..... وہی ساری باتیں جو اس زمانے میں ہوتی تھیں اب بھی ہیں، تم ہم ویسے ہی ہیں، صبح، شام اسی طرح وقت پر آتے جاتے ہیں بیٹا زمانہ نہیں بدلتا ہم بدلتے ہیں۔“

”خالہ یہ آج کل کا فیشن ہے اگر ایسا نہیں کریں گے تو لوگ جاںک، کنجس، دقناوسی اور پتا نہیں کیا، کیا

اور کستان ہے؟ انہوں نے مجھے دیکھ کر گھبرا

”ارے وہ تو میں نے اسے بھیجا ہے کہ اپنی ماں کو بلا کر لائے جانے کہاں جا بیٹھی بس اب گھر چلیں گے کافی رات ہو گئی ہے۔“ وہ خود کو باتوں میں لگا رہی تھیں میں نے ان کی طرف دیکھا تو وہ بہت شرمندہ سی ہو رہی تھیں۔ اور بزرگوں کو شرمندہ کرنا میری سرشت میں نہیں تھا۔

☆☆☆

”نمو یار دیکھو، مجھے بزدل اور ڈرپوک لڑکیاں بالکل پسند نہیں ہیں جو پیار کرتے ہیں وہ ایسے نہیں ہوتے۔ ارے بھلی پیار میں، محبت میں، عشق میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ یہ جذبات انسان کو نڈر اور بہادر بنادیتا ہے۔ بزرگوں کے سامنے کھڑا ہونا سکھادیتا ہے، اپنا حق مانگنے پر مجبور کرتا ہے۔ مارو یا مر جاؤ ہر حال میں محبت حاصل کرو محبوب کو پالو، اپنالو، یہی تو زندگی ہے۔ اگر تم چاہتی ہو کہ مجھے حاصل کرو تو جاناں تمہیں ہمت، حوصلہ اور بہادری کو پہلے اپنانا ہوگا۔ میں نے سوچ لیا ہے اگر سیدی طرح سے بات نہ بن سکی تو ہم کورٹ میرج کر لیں گے۔“ نمو کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کرے تو کیا کرے؟ اس نے ایک بار پھر صغیر سے یہی کہا کہ وہ اماں سے پھر بات کرے گی۔

شہر کے وسط میں ایک خوب صورت ہوٹل کے
نیمیلی روم میں پچھلے دو گھنٹے سے وہ بیٹھے ہوئے تھے۔
معاظلات طے ہو کر نہیں دے رہے تھے کیونکہ دونوں
کے والدین نہیں مان رہے تھے۔

”بلیس بیٹا عمو آئی.....؟“ خالہ مہرو نے جائے نماز اٹھاتے ہوئے بہوسے پوچھا..... بلیس جہاں بھی پریشان ہو رہی تھیں۔

”پتا نہیں اماں کیوں دیر ہو گئی؟“

ہاں کہہ رہے ہیں کہ مہر و کوٹڑ کا دکھا دو۔ ساری زندگی کا
عالمہ ہے۔ مگر..... نہ..... نہ جی..... ہم نے مان کر
دیا۔ ہم نے کہا چچی، آپ چچا جان سے کہہ دیں
میں آپ سب کی مرضی چاہیے اور یوں ہم نے بیٹا
پلئے تمہارے خالو سے شادی کر لی۔ خیر سے زندگی کے
پچاس سال ایک دوسرے کے ساتھ رہے۔ ہمارے
مارے وجود پر نور ہی نور تھا۔ جس زبان پر دیکھو، مہرو
پر انکھار آیا ہے۔ مہرو پر کیسا نور آیا ہے؟ سن سن کر ہم
لوٹنی سے پھولے نہ سارے تھے۔ اب..... اب..... اب تو
مناظرین دلہن کا ہوتا ہے اتنا ہی اس کے چہرے پر میک
کا ہوتا ہے۔ اے ہٹاؤ اس بناؤنی خوب صورتی کو،
اللہ کے دیے حسن کا اور شرم و حیا کا مقابلہ کوئی نہیں
کر سکتا، یہ نور تو لازوال ہوتا ہے۔ آج کل کی
مہور کیوں پر پھنکار ہے ہمیں دیکھو اب بھی ذرا کا جل
مسی لگائیں تو کیسا روپ چڑھتا ہے کہ تیرے
خالو..... تو بس پو پلے منہ سے ہماری شان میں قصیدے
پڑھنے لگتے تھے۔“

”خالہ جوانی میں تو آپ کو خالو رات، دن،
تھکے ہی سناٹے رہتے ہوں گے۔“ میں نے ذرا
ہنس کر کہا تو وہ شرمائیں۔

”ارے چل ہٹ، مسخری، خالہ سے مذاق کرنے لگی۔“ خالہ نے منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے ہوئے کہا۔ تب ہی کھانا کھل گیا۔ بس پھر کیا تھا قیامت کی افراتفری دیکھنے میں آئی۔

کھانے سے فارغ ہو کر بیٹھے تو میں نے خالہ کو چھیڑا۔
 ”خالہ، آپ کی پوتی کا بھی تو رشتہ آیا ہے۔ کیا
 ہوا.....؟ لڑکی پسند آئی انہیں؟“

”اری فتو تو ہی بتا میری نمو میں بھلا کس شے کی
کی ہے؟“

”کسی بھی شے کی نہیں بس ذرا خود اور گستاخ ہے.....“ میں نے سچی بات کہہ دی بس پھر کیا تھا خالہ پوری تیاری کے ساتھ مجھ پر حملہ آور ہوئیں۔

”اوئی اماں..... کہ کس نے تجھ سے کہہ دیا کہ وہ خود میر

”اسی لیے تو میں کہتی ہوں کہ شہر کے حالات روز بروز خراب ہوتے جا رہے ہیں بس ختم کرو پڑھائی.....
 لتنا بھی پڑھا لو وہی ہانڈی چولہا ہی سنبھالنا ہے.....
 بس یہی کافی ہے کہ ماں بن کر بچوں کی پرورش اور نگہداشت اچھی طرح کر سکے۔“ خالہ مہر و واقعی پوتی کی طرف سے فکر مند تھیں۔
 نمود رتی، ڈرتی گھر میں داخل ہوئی واقعی آج بڑی دیر ہو گئی تھی۔

”السلام علیکم.....“ وہ سلام کرتی اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگی تو اماں اور دادی دونوں نے ایک ساتھ سوال کیا۔

”آج اتنی دیر کیوں ہو گئی؟“
 ”اماں گاڑی کی نگر ہو گئی تھی دوسری گاڑی سے۔“ اس نے جھوٹ بولا۔

”اے ہے اللہ خیر کرے، کیا ہوا کتنے زخمی ہوئے.....؟ کوئی مرا تو نہیں۔“ خالہ مہر و نے دل پر ہاتھ رکھ کر پریشانی سے سوال کیا تو نمود نے بڑی خوب صورتی سے کہا تھی گھڑی۔

”نہیں مرا تو کوئی نہیں ہاں البتہ کچھ لوگ زخمی ہوئے، ہشکر کریں میں محفوظ رہی۔“

”اری لڑکی تجھے تو کوئی چوٹ نہیں آئی؟“
 ”نہیں دادی اماں اللہ کا شکر ہے۔ میں محفوظ رہی۔“
 ”بس اب پڑھائی ختم کرو آئے دن، کوئی نہ کوئی حادثے ہوتے رہتے ہیں۔“

”دادی اماں ابھی پیچیز ہونے والے ہیں، یہ سال تو پورا کر لوں۔“ وہ منمنائی۔

”اماں میں آپ کو اسی لیے تو کہتی ہوں کہ مجھے ایک موبائل دلادیں۔ آج کل کے ان حالات میں یہ بہت ضروری چیز ہے۔“ اس نے لوہا گرم دیکھ کر ضرب لگائی۔

”اے لڑکی بس رہتے بھی دے۔ ہاں نہیں تو موا موبائل ٹھو بائل..... لڑکیاں اس کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی ایڈوانس ہو گئی ہیں، پر نکل آتے ہیں گوڑی ماریوں کے ہوا میں اڑنے لگتی ہیں، اماں، باوا گھر کے بزرگوں

کی عزت کا پاس نہیں رہتا۔ اپنی من مانی کرتی ہیں۔“ نمود، دادی اماں کو جواب دینے ہی والی تھی کہ اماں نے اسے اشارے سے چپ کرایا..... کیونکہ اگر وہ دادی سے الجھ پڑتی تو قمر صاحب کے آنے کا وقت تھا۔ اسی لیے انہوں نے مصلحتاً بیٹن منع کیا۔

رات بلیس جہاں نے قمر علی سے کہا تو وہ بھی حالات کے پیش نظر نمود کے لیے موبائل لے آئے۔ خالہ مہر و..... شور مچانی رہ گئیں خوب کلاس لے لی پر بیٹے، بہودونوں نے سمجھایا۔

”اماں یہ ضروری ہے، آج کل کے حالات اک لمحے میں مگر جڑ جاتے ہیں۔ خدا نخواستہ کبھی کوئی مسئلہ ہو جائے تو نمود گھر سے دور ہو، سواری کا مسئلہ ہو تو ایسے وقتوں میں یہ بہت کام آتا ہے۔ ویسے خود عقلمند ہے اتنی سمجھ تو ہے اسے کہ اسے کب اور کیسے استعمال کرنا ہے؟“ قمر صاحب نے اماں کو سمجھایا۔

”قمر میاں تم کہتے ہو تو مان لیتی ہوں پر ایسے نہ ہو..... جیسے دسویں میرے دل میں آرہے ہیں اللہ بہتر کرے.....“ وہ دوبارہ بیچ پڑھنے لگیں مگر نہ جانے کیوں ان کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔

وقت تو بر لگا کر اڑتا ہے اس اڑتے پیچھی کو کوئی بھی نہیں پکڑ سکتا کوئی بھی نہیں روک سکتا۔

☆☆☆

”مما..... مہاجی بلیس آئی ہیں۔“ میرے بیٹے نے آکر اطلاع دی تو میں کمرے سے نکل کر برآمدے میں چلی آئی۔

”آپا آئیں یہاں بیٹھیں، لائٹ نے تو دماغ خراب کر کے رکھا ہے آج صبح سے کوئی دس بار آئی گئی۔“ بلیس آپا میری بات پر خاموش رہیں۔ میں نے انہیں بیٹھنے کو پھر کہا تو وہ بہت پریشان لگ رہی تھیں۔

”نہیں آرزو بیٹھیں گی نہیں، آج ظہر کے بعد گھر میں قرآن خوانی اور میلاد ہے ضرور آنا۔“ میں نے بیٹھنے پر اصرار کیا تو وہ بولیں۔ ”نہیں ابھی اور جگہ بھی جانا ہے۔“ اور تیزی سے گیٹ سے باہر نکل گئیں۔

عمرہ

جب میں نے کعبہ دیکھا تھا
آنکھوں سے چشمہ پھوٹا تھا
رکنِ یمانی پہنچ کے دل سے
خوفِ جہنم کا چھوٹا تھا
حجرِ اسود چومنا تھا جب
سب سنسار ہی جھوم اٹھا تھا
زم زم پی کر ایسے لگا کہ
دل میں قرار پھر اترتا تھا
صفا و مروہ کے رستے پر
ہاجرہ کے دکھ کا سوچا تھا
مکہ شہر میں آکر میں نے
منزل کو اپنی پایا تھا
سب کو آتا نصیب ہو خانم
کلمہ زباں سے یہ نکلا تھا

شاعرہ: فریدہ خانم، لاہور

میں ان کی پریشانی کی وجہ نہ سمجھ سکی مگر مجھے تشویش ہو رہی تھی کہ وہ بھی اتنی سیریس نہیں ہوتی تھیں۔ میں نے اپنے شوہر پرویز سے کہا تو انہوں نے ہمیشہ کی طرح مجھے سمجھایا۔

”ارے بھئی بندہ بشر ہے زندگی میں ہزار مسائل، پریشانیاں ہیں ہو سکتا ہے کسی مسئلے کی وجہ سے فینشن میں ہوں۔“ ان کی بات پر میں نے بھی دھیان دوسری طرف کر دیا۔ سہ پہر کو بلیکس آپا کی طرف چلی گئی۔

جس چیز نے مجھے چونکا یا وہ خالہ مہر کی خاموشی تھی۔ خالہ مہر و خلاف معمول بالکل چپ تھیں کسی بات پر ان کا کوئی ٹیکچر نہیں تھا بالکل خاموشی سے سیپارے پر نظریں لگی ہوئی تھیں۔ میں اکثر انہیں دیکھ کر کتراتا تھی کبھی کسی کے گھر یا کسی تقریب میں خالہ مہر و نظر آتیں تو میری پوری کوشش ہوتی کہ ان سے دور رہوں ورنہ تقریب کا مزہ کر کر اہو جاتا جو بھی موضوع زیر بحث ہوتا اس پر انہیں مکمل عبور ہوتا، مثالوں کے ساتھ، دلائل کی روشنی میں اپنی تقریر جاری رکھتیں۔ بار، بار مخاطب کرتیں پھر جواب اور داد بھی وصول کرنا چاہتیں۔ مگر آج جان کر میں ان کے ساتھ بیٹھی مگر..... وہ سارا وقت چپ رہیں۔ میں نے سلام دعا کے بعد طبیعت پوچھی مختصر سا جواب دیا پھر خاموشی..... خالہ مہر و کسی کام سے اٹھ کر چلی گئیں تب ہی بنیلہ میرے پاس آکر بیٹھ گئی جو آپا کے پڑوس میں رہتی تھی۔

”بھابی آپ کو کچھ پتا چلانمو نے کیا گل کھلایا؟“

وہ میرے کان کے قریب ہو کر بولیں۔

”کیا؟“ میں ذرا سا اور اس کے قریب ہو گئی۔

”کیا ہوا.....؟“ میں ہمہ تن گوش تھی کہ جلدی سے

معلوم ہو کہ کیا ہوا؟

”وہ کسی لڑکے کو پسند کرتی ہے، اس سے شادی

کرنا چاہتی ہے بھابی بلیکس اور خالہ مہر و نے اسے

صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ وہ اپنی خالہ کے گھر جائے

گی اور بس اس نے رونا پیٹنا چھوڑ دیا مگر یہ لوگ نہ

مانے..... صاف آوازیں آرہی تھیں ہمارے گھر، خالہ

مہر و ہر کسی کی لڑکی کو برا بھلا کہتی تھیں..... مجھ پر کیسا نفیجتا مچایا تھا کہ سلطان کا اور میرا کوئی چکر ہے جبکہ وہ بھی نمونہ کے چکر میں آتا تھا۔ خالہ مہر و کبھی کوئی چھوٹا سا بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھیں، ہر کسی کی توہین کرنا برا بھلا کہنا الزام لگانا ان کے پسندیدہ شغل تھے۔ آج ان کی پوتی اپنی ماں اور دادی کے آگے سینہ تان کر کھڑی ہے۔“ وہ چپ ہوئی تو میں نے پوچھا۔

”قر بھائی نے کیا کہا وہ تو ناراض ہوں گے۔“

”وہ تو گھر پر نہیں تھے اس وقت.....“ بنیلہ

بولی..... تب ہی میلاد پڑھنے والی لڑکیاں آ گئیں اب

میں بھی کہ آپ بلیکس اور خالہ مہر و اتنی فینشن میں کیوں

ہیں، اڑوس پڑوس والوں نے یہ آوازیں سن لی تھیں۔

اس بات کو ایک ہفتہ ہی گزر تھا اس کے بعد پھر

ان کے گھر سے کسی قسم کی کوئی آوازیں نہیں آئیں۔

لوگ ہی کتنے تھے گھر میں ایک پوتی ایک دادی اور دو

مہاں بیوی..... مگر اس لڑائی اور شور کے بعد سے ساس، بہو، خور، ریزور رکھ رہے تھے مگر خالہ مہرو کا ریزور رہنا ناممکن تھا۔ ایک دن میرے پاس آئیں تو پھر پہلے کی طرح ہشاش بشاش تھیں۔ کیونکہ معاملات راہ راست پر آ گئے تھے یعنی سلجھ گئے تھے۔

”اری آرزو کہاں ہے بیٹا..... تجھے تو فرصت ہوتی نہیں کہ خالہ اتنے روز سے نہیں آئی تو خود جا کے خالہ کی خیریت لے لوں۔ اری لڑکی اب خالہ مہرو زیادہ دنوں کی نہیں ہے..... جو تمہیں نصیحتیں کرتی ہے پھر کوئی ایسا ہمدرد نصیحتیں کرنے والا نہیں ملے گا۔“

”ارے، ارے خالہ ایسی باتیں نہیں کیا کریں اللہ آپ کو سلامت رکھے۔ جی اس روز میلاد والے دن آپ جب بیٹھی بالکل بھی اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔ میں بار، بار بھی بچوں کو کبھی پرور کو بتا رہی تھی کہ خالہ مہرو کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے؟ بالکل چپ تھیں۔“ میں نے اپنی پریشانی اور خالہ سے انسیت کی وجہ بتائی تو وہ ہنس پڑیں۔

”اور تو بھی یقین کر..... میں بھی تجھے اپنا ہی سمجھتی ہوں کچھ دنوں سے میں بھی بڑی بے چین بے چینی سی ہوں، تجھ کو اک بات بتانی ہے۔“ وہ میرے قریب بیٹھتے ہوئے بولیں۔ میں سمجھ گئی ہونہ ہونو کے بارے میں بتائیں گی، میں بھی سنبھل کر بیٹھ گئی۔

”جی بولیں۔“ میں نے گاؤں کی ان کی پیٹھ کے پیچھے رکھتے ہوئے کہا تو انہوں نے پہلے تو نکیہ دینے پر مجھے دعائیں دیں پھر بولیں۔

”تجھے خبر ہے کہ نمونے کیا گل کھلایا ہے۔“ میں نے جھوٹ بولانی میں سر ہلایا۔

”نہیں تو کیا ہوا نمونہ؟“ میں نے ان سے سوال کیا۔ ”اے بیٹا ہونا کیا تھا اماں، باوا کو منع کرتی رہی بہتر اردو کا مگر نہ جی مجھ بڑھی کی کون سنتا ہے۔ اس منحوس ماری کو مو بائل دلا دیا اس کے بغیر کام نہیں چل رہا تھا۔ بس جی پڑھائی لکھائی اور گھر کے کاموں سے گویا اللہ واسطے کا بیر ہو گیا..... جب دیکھو وہ موا کبھی کان سے لگا

رہتا یا کبھی گھوڑی ماری اس کی انگلیاں مشین کی طرح چلتی رہتیں۔ وہ کہتے ہیں ناں بغیر آواز کی باتیں جو کرتے ہیں..... کیا بھلا سا نام ہے۔ اس کا وہ دماغ پر زور ڈالنے لگیں۔

”ایس ایم ایس.....“ میں نے کہا۔

”ہاں، ہاں وہی ایم ایس نہ جانے ایسی کیا باتیں ہوتی ہیں؟ وہ کس سے باتیں کرتی ہیں؟ کچھ خبر نہیں آخر یہ آزادی اور شیطان کی یہ پوٹکی کیا رنگ لائے گی۔“ وہ خاصی برہم نظر آ رہی تھیں۔

”آخر ہوا کیا؟“ میں نے خالہ کو کریدا۔

”اری بی بی! ہونا کیا تھا کسی مونے گھوڑ مارے لنگے سے ان کا دیدہ لڑ گیا اور بھئی مرنے جینے کی قسمیں کھائی گئیں۔ ایک دوسرے کو حاصل کر کے رہیں گے، دلوں میں یہ ٹھان لی نہ اماں باوا کا خیال نہ دادی کی عزت کا پاس..... بھی ایک روز ماں کے سامنے تن کے کھڑی ہو گئی۔ میں شادی اسی سے کروں گی جسے میں نے زبان دے دی ہے..... میں نے اس سے وعدہ کیا ہے ہم ایک دوسرے کے بنا جی نہیں سکتے۔ بے شرم، بے حیا، نامعقول، نافرمان اس نے میرے مان، میرے یقین میرے اعتماد کا خون کر دیا۔ اماں باوا پر اسے ترس نہیں ہے جنہوں نے اس پر اندھا اعتماد کیا تھا، میری باتوں کو میرے دوسوں کو بے جا مداخلت سمجھتے تھے یہ میاں، بیوی..... اب کھائی ٹھوکر، دیکھو تو ایک سیدھی سادی سی لڑکی کتنی نافرمان، خود سر ہو گئی ہے من مانی کر رہی ہے..... اس کی دیدہ دلیری تو دیکھو اس روز لڑکے والے دیکھئے آئے تو لائی سیدھی حرکتیں کرنے لگی۔ تمہو بڑا سچا بیٹھی رہی ان لوگوں کے سامنے اور ان کے جاتے ہی بھیا دہ تو شتر بے مہار کی طرح ماں پر چڑھ گئی۔ اس بے غیرت نے بڑی ڈھٹائی سے صاف انکار کر دیا۔ اس رشتے سے وہ تو باپ گھر پر نہیں تھا۔ نہیں تو اس بے لگام گھوڑی کی خوب شامت آتی۔“ میں خاموشی سے خالہ کی باتیں سنتی رہی اور دل ہی دل میں یہ سوچتی رہی کہ خالہ مہرو کی بڑی، بڑی

بھاگی ہے۔ میرا بڑا والا بیگ بھی میری الماری میں نہیں ہے۔ میں نے رات تمہاری الماری کھلی دیکھی تھی ذرا جا کر چیک تو کرو کہیں زیور اور نقدی ہے بھی یا وہ بھی لے آئی۔“ ان کی آواز شدید غصے اور نفرت سے کانپنے لگی تھی۔ ”ارے نہیں، وہ ایسا نہیں کر سکتی آپ میری بچی کا پتا لگائیں۔ کہیں سے ڈھونڈ کر لائیں.....“ بلیقیں جہاں شدت دکھ سے بلکنے لگیں۔ پھر بلیقیں جہاں نے کمرے میں جا کر الماری کا اندرونی خانہ دیکھا اور وہ وہیں چکرا کر گر پڑیں۔ خالہ مہر اور قمر علی گرنے کی آواز سن کر کمرے کی طرف دوڑے..... بلیقیں بیگ کا ایک ہاتھ دل پر تھا، آنکھیں کھلی پڑی تھیں اور وہ دروازے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ وہ ماں، بیٹے کچھ نہ سمجھ سکے۔ روتی ہوئی خالہ مہر نے بیٹے سے ڈاکٹر کو بلانے کا کہا اور خود بہو کو آوازیں دینے لگیں..... کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو وہ میری طرف بھاگی، بھاگی آئیں سانس پھول رہی تھی۔ بڑی مشکل سے انہوں نے روتے ہوئے مجھے تھوڑا بہت بتایا پھر تیزی سے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئیں۔ زور، زور سے یہ کہتی ہوئی باہر نکل گئیں کہ ”آرزو، بیٹا چل دی کر..... میری بلیقیں کو بچالے..... ہائے اللہ ہماری مدد کر.....“ اور پھر آنا فانا تھوڑی ہی دیر میں ڈاکٹر نے تصدیق کر دی کہ انہیں مرے ہوئے آدھا گھٹنا ہو چکا ہے۔ بڑی غیرت دار ماں تھی..... اچھا ہوا ورنہ اگر زندہ ہوتی تو ہر پل مرتی ہر پل جیتی..... ایسے لمحہ قسطوں میں مرنے کی اذیت بہت ہی ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ پھر لوگوں کی، کبھی کبھو جتنی تو کبھی نفرت سے دیکھتی آنکھوں کا دکھ کیسے برداشت کرتیں؟ لوگوں کی زبانوں پر آتے ہوئے..... بے شمار سوالوں کا کیسے جواب دیتیں.....؟ اکلوتی اولاد کے چھڑنے کا ایسا بھیاں تک دکھ کیسے برداشت کرتیں؟ مجھے سب سے زیادہ دکھ اور افسوس خالہ مہر کو دیکھ کر ہوتا..... اس عمر میں بوڑھی دادی اور شرمندہ باپ کسی کومنہ دکھانے کے لائق نہیں رہے تھے۔

باتیں دوسروں پر بلا سوچے روک ٹوک تنقید کرنا برا بھلا کہنا اور بڑے وثوق سے اپنے نواسے نواسی اور پوتا پوتی کی تعریف کرنا..... انہیں اپنے گھرانے پر بڑا فخر، بڑا نانا تھا۔ جو کچھ میں سمار ہو گیا۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ پہلے اپنے گریبان میں جھانکو پھر کسی کو بولو۔ مگر آج وہ میرے سامنے بڑی مجبور اور بے بس لگ رہی تھیں انہیں اپنی پوتی کی حرکت پر غصہ آ رہا تھا، اپنے بھرم کے کٹھننے کا کلام بھی بڑا تھا۔

وہ ہمیشہ اپنی تربیت کی تعریف کرتیں۔ ”فلاں کی لڑکی کو دیکھو اور فلاں کی پوتی کو دیکھو۔ میری نموتو اتنی سیدھی ہے کہ بس اللہ میاں کی گائے بالکل نا سمجھ چھوٹی بچی کی طرح ہے۔“ اور آج وہی بیٹی والدین کے لیے کتنا بڑا ناسور بن گئی تھی۔ وہ آج میرے سامنے بالکل مختلف خالہ مہر لگ رہی تھیں۔ ان پر افسوس بھی ہو رہا تھا۔

☆☆☆

صبح ہی صبح ایک شور اٹھا کہ شوگر سے غائب ہے گھر سے یہ کہہ کر نکلی تھی آج دیر ہو جائے گی مگر اتنی دیر کے پہاڑ جیسی رات بیت گئی۔ ساری رات باپ، چچا، ماموں سب ہی پریشان رہے جگہ، جگہ ڈھونڈا، سہیلیوں کے پاس نہ کسی رشتے دار کے پاس نہ شہر کے کسی اسپتال میں دل کی تسلی کے لیے مردہ خانے بھی تلاش کر لیے۔ تمام بسوں کے اوڑوں پر ریلوے اسٹیشن پر..... اب اور کہاں ڈھونڈتے؟ صبح کالج جا کر معلوم کیا تو پتا چلا کہ کالج بھی نہیں پہنچی..... اب تو یہ ہی ایک بات سمجھ میں آ رہی تھی وہ اپنی مرضی اور اپنی خوشی سے کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔

قمر علی نے قمر بی تھانے پر گمشدگی کی رپورٹ درج کرائی اور تھکے، تھکے سے گھر میں داخل ہوئے۔ ساس، بہو دونوں ان کی طرف لپکیں.....

”کچھ خبر ملی..... کچھ پتا چلا؟“ دونوں نے ایک زبان ہو کر پوچھا۔ قمر علی نڈھال سے تخت پر گئے۔ ”نہ خبر ملی..... نہ ہی پتا چلا..... بھول جاؤ اسے وہ بے شرم، بے غیرت، نا بھجار پوری تیاری سے گھر سے



منی ناول



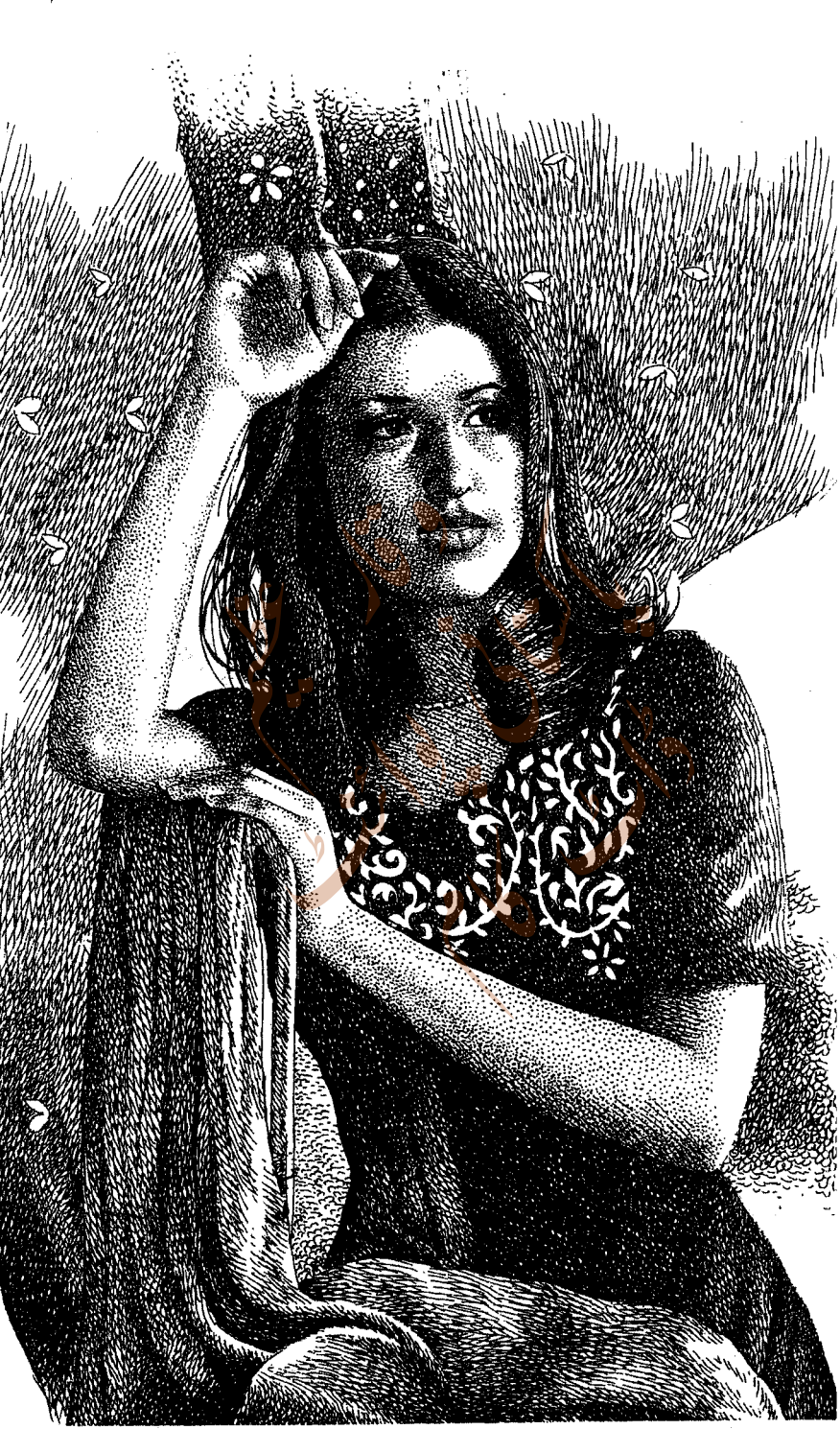
ہم کو عبث بدنام کیا

سیارِ اردا

بارہواں حصہ

خدا
کبھی کبھی اپنے فرشتوں کو
زمین پر بھی بھیج دیتا ہے
وہ پریش کر کا ڈھکنا کھولتی، بند کرتی، ہنڈیا میں

اس دن میں اتار دئی کہ دنیا اگر ایک خالی تھال ہوتی
تو میرے آنسوؤں سے بھر جاتی.....
میرا ملامت بھرا وجود اس دن سے آج تک
اس مہربان سائے کی پناہ میں ہے



الکیر چلاتی اور سبل بنے پر قہر بیستی ہوئی ادھ موئی ہوئی جارہی تھیں..... پکوان ہاؤس میں انہیں عارضی طور پر یہی نوکری ملی تھی..... اسنے گناہوں کو یاد کر کے وہ اندر ہی اندر آنسو کا ذخیرہ جمع کر رہی تھیں مگر ان کے اندر کا پریشر نگرہ لگی آج پر چڑھا رہا تھا..... اتنی ہلکی آج کہ ویٹ میں لرزش پیدا نہ ہو..... اور سیٹی کی آواز سنائی نہ دے۔

یہ خالہ زینب کی تیسری نوکری تھی جو بہ مشکل ملی تھی..... تیسرے محلے میں پکوان ہاؤس تھا۔ جہاں خواتین کو محنت زیادہ اور پیسے کم پہ رکھا جاتا تھا..... مگر زندگی گزارنے کے لیے، معاشی حالت بہتر کرنے کے لیے اس سے زیادہ بہتر نوکری وہ کیا کرتیں..... بیٹا جیل میں تھا، بیٹی گھر سے بھاگ گئی تھی..... شوہر بھی لاپتا تھا، بیٹے کو چھڑانے کے لیے ایس ایچ او نے پُرکشش معاوضہ طلب کیا تھا..... ساری زندگی عیاشی میں بسر کی، حرام حلال میں فرق نہیں کیا..... جو کیا شوہر پیارے نے، بے دریغ لٹایا..... دکھاوے کو ہمیشہ اپنا دین ایمان سمجھا..... لاچا ہوس بڑھتی رہی..... شوہر جو لے کر آتا..... چند دنوں میں ختم ہو جاتا۔ بچت کی عادت تھی نہیں..... دوسروں کے مال پہ ہمیشہ نظر رکھی..... زبان کی تیزی سے لوگوں کے دل بھی دکھائے اور کام بھی نکالے..... مگر اولاد نے سب ختم کر دیا..... ری آخر کب تک دراز رہتی۔

اگر کوئی خالہ زینب کو دیکھ لیتا تو پہچان نہیں پاتا کہ یہ وہ ہی اپنے زمانے کی خوب صورت حسینہ ہے..... جو اپنی اداؤں کے بل پر اتراتی تھی..... آج اس کی حیثیت ماسی سے کم نہ تھی..... ملکی چادر سر پہ لیٹے..... سر جھکائے کام کرتی..... مالکوں کی بھڑکیاں بھی کھاتی مگر زبان غموش رہتی۔

یہ وہی زینب تھی جس کے آگے ٹرے لیے اس کی ماں کھڑی ہوتی..... بہن اس کے غرے اٹھاتی..... مگر آج اس کے پاس کوئی اپنا نہیں تھا..... کوئی نہیں..... وہ اپنے گنہگار وجود کو لے کر کہاں جائے..... کیا

کرے..... چاول کی تھالی اس کے سامنے رکھی تھی..... اور ضمیر کا بوجھ بڑھتا جا رہا تھا.....

☆.....☆.....☆

گلابوں کی طرح دل اپنا شبنم میں بھگو تے ہیں محبت کرنے والے خوب صورت لوگ ہوتے ہیں "are you mad?"..... اعزاز کی آواز لوٹ کر انہی کو آ رہی تھی۔

اعزاز شاہ یہ حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹے تھے۔ وہ ڈاکٹر راجیل کے آفس میں بیٹھے تھے..... ریال کا کام ادھورا چھوڑ کر گاڑی بیک کر کے دوڑے آئے..... اور جب ان کی سانس بحال ہوئی تو ڈاکٹر راجیل نے جو خبر انہیں سنائی وہ ناقابل یقین تھی۔

"تم ہوش میں ہو راجیل..... میں کیسے یہ کام کر سکتا ہوں..... اتنا آسان نہیں ہے یہ سب..... یا تم نے سوچا بھی کیسے....." اعزاز شاہ نے حیرت سے کہا۔ "اتنا مشکل بھی نہیں ہے..... پانی کا گلاس پیو....." ڈاکٹر راجیل نے اعزاز کے حیرت زدہ چہرے کو دیکھا جو دباؤ کا شکار ہو رہا تھا۔ ان کے آگے ٹھنڈے پانی کا گلاس رکھا۔

اعزاز شاہ نے پانی کا گلاس منہ سے لگایا..... اور غنا غٹ بی گئے۔

"دیکھو دوست..... تم محبت سے گندھے ہوئے شخص ہو..... تم پیار سے مالا مال ہو..... تم ہر ایک کے دکھ پر تڑپ جاتے ہو تمہاری بات میں تمہارے لہجے میں جادو ہے یار..... پلیز مان جاؤ..... دیکھو دور، دور تک مجھے تمہارے علاوہ کوئی نظر نہیں آتا..... اس لڑکی کو تمہاری وجہ سے نئی زندگی ملے گی..... میرے دوست تم اس کی نئی زندگی کی وجہ ہو گے..... ڈاکٹر جوزف صرف ۲۱ دن کے لیے آئے ہیں..... ان لمحات میں واحد صرف تم ہو..... جس پر بھرپور اعتماد کر کے train کیا جاسکتا ہے..... مجھے تم پر بھروسہ ہے یار....." وہ انہیں ذہنی طور پر تیار کر رہا تھا۔

"تم محبت کرنا جانتے ہو..... تم محبت دے کر

ریال کو ہیمبرگ آئے تین سال ہو رہے تھے۔ اس سال کے آخر میں اسے ڈاکٹریت کی اعزازی سند ملنے والی تھی۔ اسلامی ریسرچ سینٹر نے اسے باقاعدہ یونیورسٹی میں اعلیٰ ملازمت کی آفر کی تھی۔ جو اس کے لیے خوشی اور اعزازی بات تھی۔ حالانکہ اس کا خواب تو یہ تھا کہ وہ ڈاکٹریت کی ڈگری لے کر واپس پاکستان جا کر پڑھائے گا۔

آہستہ، آہستہ زندگی میں خوشیاں آتی جا رہی تھیں۔ اس کی ماں نے کتنی محنت کی تھی۔ وہ ان کو یہ خبر سنانے کے لیے بے چین تھا۔ فی الوقت وہ پاکستانی سفارت خانے میں مدعو تھا جہاں نور بھی اس کے ساتھ تھی۔ سیاہ عبایا اور حجاب سے سر ڈھکا ہوا تھا۔ جہاں جشن آزادی کی تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ایوان کو سبز مٹالی پر چھوں سے سجایا گیا تھا۔ مقتدر شخصیات موجود تھیں۔

جرمنی میں مقیم پاکستانی سفیر نے ریال کا خیر مقدم کیا۔ ریال سفید کرتے پاجامے میں لمبوس تھا۔ کاندھے سے ڈرائیجے پاکستانی پرچم کا جج۔ انہوں نے اپنے خطاب میں پردیس میں مقیم پاکستانیوں کے مسائل پر بات کی۔ ”وطن کی عزت کو ہر حالی میں مقدم رکھنا ہے۔ وطن ہے تو ہم ہیں۔! ہمارا کردار مضبوط ہونا چاہیے۔ تاکہ لوگ ہماری صفوں میں شامل ہوں۔“

اسلامک یونیورسٹی کی طرف سے ریال کو بھی تقریر کرنا تھی۔ اس نے مختصر کہا۔

”میرا وطن میری شان ہے۔ اور میں ہر لمحہ اپنے وطن کی شام میں اضافہ کرنے کا خواہشمند ہوں۔ میری عمر کے ہر مرد کا دل وطن کی محبت میں دھڑکتا ہے۔ ہم جہاں بھی ہوں۔ اپنے وطن کی آزادی کے گیت گاتے ہیں اور میں ایک محب وطن پاکستانی ہوں۔ اگر میں یہاں ہوں تو اپنے پاکستان کی ترقی کے لیے کوشاں ہوں۔ میری شخصیت، میرا کردار۔ میرا پاکستان ہے۔“

زندگی دے سکتے ہو۔۔۔۔۔ پلیز۔۔۔۔۔ وہ لڑکی زندگی میں لوٹ آئے گی مجھے یقین ہے۔۔۔۔۔ میری بات مان کر تو دیکھو۔۔۔۔۔“

اعزاز شاہ چپ ہو کر اسے دیکھنے لگے۔ ان کا دل پیچھے لگا تھا۔ اسی لمحے تایاجی اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اعزاز کو کھڑے ہونے سے روکا۔ انہیں دیکھ کر وہ احتراماً کرسی سے کھڑے ہو گئے تھے۔ تایاجی بہت کمزور ہو گئے تھے۔

”بیٹا ایک امید کی کرن چمک رہی ہے۔ اگر آپ کا ساتھ مل جائے گا تو بہت سے دکھ ختم ہو جائیں گے۔ آپ شریف انسان ہیں، مہذب ہیں۔ کوئی اور نوجوان کہاں سے ملے گا۔ ان ڈاکٹر کو جانا بھی ہے۔ وقت کم ہے۔ کیا کریں؟“ تایاجی یہ کہہ کر آزرہ سے ہو گئے تھے۔

اعزاز شاہ کا دل عجیب سا ہو گیا۔ ایک انجان لڑکی کو وہ کس طرح ٹریٹ کریں گے۔ بہت مشکل مرحلہ تھا مگر وہ بے بسی سے اقرار کر گئے تھے۔ تایاجی اور ڈاکٹر راحیل کے چہروں پر اطمینان دوڑ گیا۔ لیکن وہ بے اطمینان ہو کر ڈاکٹر راحیل کے ساتھ ڈاکٹر جوزف سے ملاقات کے لیے تیار ہو گئے۔ زندگی عجیب امتحان کے لیے انہیں تیار کر رہی تھی۔ بظاہر محبت بانٹنے والے اعزاز اندر سے خود محبت کے متلاشی تھے۔

مگر ایک انجان لڑکی کو کیسے؟
کیسے وہ اسے محبت کی ڈور سے ہوش میں لے آئیں گے۔

کیا یہ ہوش و خرد کی دنیا میں واپس آجائے گی؟
ناممکن ہے ممکن تک کا یہ سفر انہیں ملے کرنا تھا۔

☆.....☆.....☆

اگست کا آخری ہفتہ تھا اور جشن آزادی کی تقاریب کا آخر بھی۔ کیونکہ پورا ماہ اگست ہی یہ تقاریب جاری رہیں۔ دیا ریغیر میں مقیم پاکستانی وطن کی محبتوں کو خراج تحسین پیش کرنے میں جوش و جذبہ کا مظاہرہ کرتے تھے۔

مُزور تالیوں میں ریبال نے اپنی گفتگو ختم کی..... پاکستان زندہ باد کے نعرے گونج رہے تھے..... تقریب کے اختتام پر سفیر پاکستان نے ریبال کو فخر پاکستان شیلڈ پیش کی..... جہاں نور کو بھی اسلام قبول کرنے پر خوب صورت تحائف دیے گئے..... متعدد میڈیا کے کیمرے ان لمحات کو قید کر کے خبر کی دنیا کی زینت بنا رہے تھے..... چار طرف سفید اور سبز جھنڈیوں سے ہال کو آراستہ کیا گیا تھا..... سفید اور سبز رنگوں کے لباس تیار کیے گئے تھے..... بعض خواتین نے سبز چمڑی کے دوپٹوں کے ساتھ سبز چوڑیاں بھی پہن رکھی تھیں جو ان کی کلائی میں بہت سج رہی تھیں یہ سب کچھ جہاں نور کو بہت اچھا لگ رہا تھا..... لڑکیوں نے اس کے گرد گھیرا ڈال دیا..... سوالات کے حصار میں اسے لے لیا..... آپ کو مسلمان ہونا کیسا لگ رہا ہے.....؟

”بہت اچھا..... بتائیں سکتی.....“ وہ خوشی سے آنکھیں پھینکتے ہوئے بولی..... ”بہت اچھا.....“

”جو آپ پہنتی ہیں اور اب ایک بالکل مختلف زندگی ہے..... کیا فرق لگتا ہے.....؟“

”بہت بڑا فرق.....“ وہ مسکرائی..... ”معجزہ ہوا ہے میری زندگی میں..... اللہ کی محبت مجھے علی الصبح جگا دیتی ہے..... سجدے میں جاتی ہوں تو مجھے سکون ملتا ہے..... اس کے نام سے اس کی عبادت سے میرے ہر کام میں برکت ہے..... ایک خوشی کا احساس مجھے رہتا ہے..... قرآن پاک کی تلاوت سے مجھے شفا ملتی ہے..... میں آپ کو کیا بتاؤں کہ میں نے کیا کیا پایا ہے.....“

”ریبال صاحب کے بارے میں کیا کہیں گی آپ.....؟ ان کا آپ کی زندگی میں کیا مقام ہے.....؟“ جہاں نور نے مسکراتے ہوئے ریبال کی طرف دیکھا جو تھوڑی دور کھڑا گفتگو میں مصروف تھا.....

”ریبال صاحب میرے محسن ہیں اور مجھے جننے کا شعور اور دوسری زندگی کا سہرا انہی کو جاتا ہے..... اگر آج وہ نہ ہوتے تو میں آپ کے سامنے نہ ہوتی.....“

”گویا ریبال آپ کی زندگی ہیں.....؟“ ایک خاتون نے ٹکڑا لگایا تو سب کھلکھلا کر ہنسنے لگیں..... جہاں نور کی ہنسی بھی شامل ہو گئی..... ریبال نے بے اختیار پیچھے مڑ کر دیکھا..... جہاں نور ان خواتین کے ساتھ مطمئن اور مسکراتی ہوئی بے حد خوش تھی..... وہ بہت آسودگی سے مسکرا دیا.....

واپسی پہ وہ سب سے ہاتھ ملا کر رخصت ہونے لگا تو ایک صاحب نے پوچھا جو وہیں آنکھیں میٹھی میں ہی کام کرتے تھے.....

”ریبال آپ کی پاکستان کب واپسی ہے.....؟“

”بس تین مہینے اور ہیں..... انشاء اللہ..... آپ سے مل کر جاؤں گا.....“ وہ مسکراتے ہوئے بولا.....

”ہاں یار..... پاکستان بہت یاد آتا ہے..... اس نوکری نے تو جکڑ لیا ہے.....“ وہ صاحب افسردگی سے بولے..... ”ساری نیکی کو یہیں بلالیا ہے..... اب میرا وہاں کوئی نہیں.....“

”خیر ہے یار..... وطن سے رشتہ تو قائم ہے ناں..... بس اپنا رشتہ مضبوط رکھیں.....“ ریبال اس کے کاندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بولا.....

”یہ رشتے کی ڈوری کبھی نہ ٹوٹے..... آپ جہاں بھی جائیں گے کہلائیں گے تو پاکستانی ہی ناں..... اور پہلی بات تو یہ ہے کہ پاکستان آپ کا گھر ہے..... اسے یاد بنانے سے کہیں زیادہ اچھا ہے کہ سال میں ایک دفعہ پیسے جمع کر کے چلے جایا کرو..... پاکستانی ہونا آپ کی شناخت ہے..... اوکے.....! وہ ریبال کی بات سے قائل ہو گیا.....

”مگر وہاں رکھا کیا ہے.....؟ کرپشن، مہنگائی، لوٹ مار، کم از کم یہاں سکون تو ہے..... وہاں تو جانیں بھی محفوظ نہیں ہیں.....“ شہر یار صاحب نے خفی سے کہہ کر گویا اپنا دفاع کیا..... ”پاکستانیت، پاکستانیت اور بس.....؟ ہم یہیں ٹھیک ہیں بھائی.....“

ریبال نے محل سے ان کی بات سننے ہوئے..... اقبال عظیم کے اشعار جوابا پڑھے.....



سحرا

حسین غنچوں کا ہے انتخاب پھولوں میں
عروس و نوشہ ہیں رشک گلاب پھولوں میں
ہر ایک پھول کی رعنائی جو حیرت ہے
چمک رہے ہیں جو دو ماہتاب پھولوں میں
بہنی عزیزہ عروسہ، برادر ہے نوشہ
سمٹ کے آئی ہے کیا آب و تاب پھولوں میں
خدا کا شکر ادا کریں مادر و پدر دونوں
مسرت ان کی ہوئی ہم رکاب پھولوں میں
لبوں پہ شکر خدائے بزرگ و برتر ہے
دلی مراد ہوئی کامیاب پھولوں میں
الہی ان کو عطا کرنا نیک بخت اولاد
شباب ان کا رہے کامیاب پھولوں میں
زبان فرخ یہ کہتی ہے ہو کے اب سرشار
عیاں ہے لطف رسالت مآب پھولوں میں
شاعرہ: فریدہ لاکھانی فرخ
مرسلہ: عرشہ جید، کراچی

مری بات ہوتی ہے دو بدو، میں خطاب کرتا ہوں رو برو
مرے سامعین کی خیر ہو، مجھے احتیاج قلم نہیں
یہ جو شکوے تم کو وطن سے ہیں، وہ بھاسی مرے دوستو!
مگر ایک بات نہ بھولنا، یہ تمہارا گھر ہے، ارم نہیں
دیکھیے شہر یا صاحب..... آپ جو کچھ بھی کہیں مگر
اپنے گھر سے، اپنے لوگوں سے ہی اختلاف ہوتا
ہے..... اگر غلط لوگ ہمارے درمیان آگئے ہیں تو کبھی
آپ نے سوچا ہے ایسا کیوں.....؟“ ریاں نے ایک
لمحے کے لیے سب کی طرف رک کر دیکھا..... اور پھر خود
ہی کہنے لگا۔

”بہت آسان ہے سمجھ لینا اس بات کو ہمارے
لیے کہ ہم خود راستہ دیتے ہیں ان غلط لوگوں کو جو اہل
نہیں ہوتے..... اور وہ ہماری کمزوریوں سے فائدہ
اٹھا لیتے ہیں..... اعتبار کرتے ہیں ان پر جو معتبر نہیں
ہوتے..... اپنی صفوں میں چھپی کالی بھیشروں کو نہیں
پہچانتے..... ان پہ نظر نہیں رکھتے..... ان سے سوال
نہیں کرتے..... اور پھر نتیجہ آپ کے سامنے ہے.....
آگے میں کیا کہوں.....“
ریاں نے جواب دے کر ایک سوال ان کے
سامنے رکھ دیا۔

”اور ویسے بھی بحث، گفتگو کی موت ہے..... اپنے
وطن سے پیار کریں کیونکہ وطن نے ہمیں کچھ دیا
ہے..... اگر ہم یہاں کچھ کر رہے ہیں تو اپنے وطن کے نام
کے ساتھ کر رہے ہیں..... میرا نام میری پہچان پاکستان
ہے بس.....“ وہ بہت جوش و جذبے سے کہہ رہا تھا۔
”اور ہم سب یہاں پاکستان کو سلامی پیش کرنے
کے لیے جمع ہوئے ہیں..... سلام پاکستان اور پاکستان
زندہ باد.....“ ریاں کے اختتامی جملوں کے ساتھ پورا
ہال پاکستان زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھا..... ریاں
نے آگے بڑھ کر شہر یا صاحب کو گلے لگا لیا..... اور وہ
بھی آنکھوں میں اشک لیے اس کے گلے لگ گئے.....
جہاں نور خواتین میں گھری ریاں کو دیکھتی رہی..... سفید
کرتے شلوار میں وہ کس قدر جاذب نظر لگ رہا تھا.....

نوش و خرم، مطمئن، بے داغ کردار کا مالک.....

تایا جی، راجیل کو بتا رہے تھے..... ”شہر میں مشکل سے اس بچی کا پتا ملا..... یہ تو واپس ملتان جا رہی تھی.....“ تایا جی نے بتایا..... ”بھلا ہوا اس کے شوہر کا کردہل گیا.....“

”اپنے وطن سے کتنی محبت کرتا ہے..... سمجھداری سے ہر سوال کا جواب دے رہا تھا.....“ وہ محویت کے ساتھ اسے دیکھتی رہی..... اور سوچتی رہی ریا ل اس کی طرف بڑھ رہا تھا..... تب ہی جہاں نور کے برابر میں بیٹھی مسز شہر یار نے اسے ٹھوکا دیا..... وہ چونک گئی..... ان کی طرف رخ موڑ لیا۔

”تمہیں پاکستان جانے کا شوق نہیں ہے.....؟ کبھی سوچا وہاں جانے کا..... اب تو تم مسلمان ہو گئی ہو..... تمہارا حق بننا ہے وہاں جانا.....“

”ہاں..... بہت شوق ہے پاکستان دیکھنے کا..... یہ میری خواہش بھی ہے.....“ وہ حسرت سے ریا ل کی طرف دیکھتے ہوئے بول رہی تھی۔

”تم اپنی خواہش اس طرح پوری کر سکتی ہو کہ ریا ل سے شادی کر لو وہ تمہیں پاکستان لے جائے گا ویری سہل! تم یہاں تو کسی سے شادی کر بھی نہیں سکتیں..... میری بات مان لو ڈیز..... یہ بندہ بہت اچھا ہے..... تم خوش قسمت ہو جو ریا ل تمہاری زندگی میں آ گیا اور ریا ل کو بھی تم سے ہی شادی کرنی چاہیے..... تمہیں تمہا نہیں چھوڑنا چاہیے.....“

آخری جملہ ریا ل کے کانوں سے ٹکرایا..... تو اس نے بے اختیار جہاں نور کو دیکھا..... اور جہاں نور کی آنکھوں میں جو کچھ نظر آیا..... وہ بہ آسانی پڑھ سکتا تھا لفظوں اور جذباتوں کے مفہوم سمجھنا اس کے لیے مشکل نہ تھا..... اس عجیب گھڑی میں اس کا نیک عمل سب کو نظر آ رہا تھا مگر جو اس کے دل میں تھا..... اس تک کوئی نہیں پہنچ سکتا تھا..... وہ خود کو سمجھاتا..... اسے لے کر سب کو سلام کرتا اس محفل سے لھٹا چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

گول، گول آنکھیں سمجھاتی مینا اپنے مخصوص سرائیکی لباس میں تھی..... ہرا پراندہ آگے ڈالا ہوا تھا..... کاہل آنکھوں سے باہر نکل رہا تھا..... اس کے ہاتھ میں سبز رنگ کی ڈائری تھی..... ڈاکٹر راجیل کے

”ہاں جی میں تو جا رہی تھی اپنے گھر..... صاحب آپ کا گھر تو بالکل ہی ختم ہو گیا ہے جی..... بیگم صاحبہ تو ہیں ہی نہیں..... اور بیچاری بی بی جی..... معصوم فرشتوں جیسی ان کو تو نظر لگ گئی..... ایسی بیبیاں تو میں نے اپنی زندگی میں دیکھی نہیں..... بس اپنے کام میں لگی رہتی تھیں میری کتنی مدد کرتی تھیں..... یہ دیکھیں یہ انکو بھی سونے کی ہے..... باجی نے ہی دی تھی خوش ہو کر..... میں نے جی بیگم صاحبہ سے یہ بات چھپائی تھی ورنہ وہ تو چوری کا الزام لگا دیتیں“ وہ تانی جی کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔

”مینا ان باتوں کو چھوڑو..... ڈاکٹر صاحبہ جو پوچھیں وہ بتاؤ..... تاکہ تمہاری بی بی جی کے علاج میں آسانی ہو.....“

”ہاں جی..... ہاں جی ضرور پوچھیں آپ.....“ مینا خود کو اعلیٰ ہستی سمجھ رہی تھی گردن اٹھا کر بولی اور خود کو اس طرح پوز کرنے لگی جیسے اس کے سامنے کبر اہو۔

”یہ بتاؤ مینا..... تمہاری بی بی جی کیسی تھیں تمہارے ساتھ..... کیا، کیا مصروفیات تھیں اور کیا کرتی رہتی تھیں.....“ ڈاکٹر راجیل نے پوچھا۔

اور مینا یک دم گول، گول آنکھیں سمجھانی شروع ہو گئی۔

”بی بی جی بہت اچھی تھیں، بہت پیاری..... میں ان کی بہت خدمت کرتی تھی اور یہ اس ڈائری میں سب کچھ ہو گا جی..... اسے دیکھیں.....“ اور اس نے ایک سبز ڈائری ڈاکٹر راجیل کی طرف بڑھا دی۔

سبز ڈائری پر اعزاز کی نگاہیں جم کر رہ گئیں.....

☆.....☆.....☆

سفید بورڈ پر موضوع لکھا تھا..... ”اپنے دل کے اندر جھانکیں.....“

سبز روشنی کے چار بلب ہال میں روشنی بکھیر رہے

حقیقی کی شکرگزاری کریں..... آئیں میں اور آپ مل کر اللہ کے شکرگزار بندے بنیں.....“ وہ خاموش ہوئے اور ماحول ایک دم سبکت ہو گیا۔

”اگر آپ لوگ اپنے مسائل کے متعلق کوئی سوال کرنا چاہیں تو میں حاضر ہوں۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ہال میں بیٹھے ہوئے ان کے مرید اور شاگرد سوالات کرنے لگے..... اور خالہ زنب، پنا سوال کیے سب کو سننے لگیں۔ سب کے اپنے، اپنے مسئلے تھے، پریشانیاں تھیں۔ سب ہی اپنے مسائل کے حل کے لیے پریشان تھے..... باباجی بہت اطمینان سے قرآن و سنت کی روشنی میں جواب دے رہے تھے۔

”یاد رکھیے..... پروردگار نے اپنے بندوں کو بہت پیار سے بنایا ہے۔ وہ چاہتا ہے میرے بندے جس دل میں مجھے رکھتے ہیں..... اس دل سے کینہ، کدورت، غرور نکال دیں..... اپنی زندگی سے اس عذاب کو دور کیجیے..... درگزر اور معافی کا راستہ اپنائیں..... اگر آپ ابھی تک بے چین اور بے قرار ہیں تو اس کا مطلب ہے جس کا دل آپ نے توڑا ہے..... دکھایا ہے..... اس کی آہ آپ کا پیچھا کر رہی ہے پھر آپ کیسے اپنی زندگی میں خوشیاں اور مسرتیں لاسکتے ہیں لہذا دل کو ان آلودہ چیزوں سے پاک کیجیے..... کیونکہ..... زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں.....“

باباجی کے اس بیان کے ساتھ سوال و جواب کا سیشن ختم ہو چکا تھا۔ لوگ آہستہ، آہستہ ہال سے باہر نکل رہے تھے۔ خالہ زینب خاموش بیٹھی تھیں..... ان کے دل کی دنیا اٹھل پھٹھل تھی..... پہلی بار ان کے ضمیر میں کوئی جرم کا احساس کوڑے مار رہا تھا۔

اچانک ان کی آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ گر..... جو اُن کے ٹمبل کے دوپٹے میں بہت تیزی سے جذب ہو گیا۔ ہال میں اکا دکا لوگ رہ گئے تھے جو باباجی کے گرد کھڑے تھے۔ وہ بھی نکلے گئے تھے۔ بابا جی نے جاتے ہوئے مڑ کر اس عورت کو دیکھا جو مظلوم

تھے..... یہ روشنی عام روشنی سے مختلف تھی..... اس میں ایک شہنشاہ اور نور تھا..... باباجی کی آواز گونج رہی تھی۔
 ”ہر وہ کامیابی انسان کی ہمارے..... جس کا مقصد کسی کو نیچا رکھنا ہو..... دنیا میں ہر چیز کی قضاے سوائے دل آزاری کے.....“ باباجی آج اپنے شاگردوں کو بہت اہم موضوع پر درس دے رہے تھے۔

باباجی کے سامنے بہت سارے لوگ بیٹھے ہوئے تھے..... ہال نما اس کمرے میں..... ان سب کے درمیان عورتوں کی قطار میں زنب خالہ بھی تھیں..... بڑی سی چادر میں خود کو چھپائے سر جھکائے بیٹھی باباجی کی تقریر سن رہی تھیں۔

”اللہ کے دروازے اپنے بندوں کے لیے ہر لمحہ کھلے رہتے ہیں..... وہ بہت پیار کرتا ہے اپنے بندوں سے..... وہ آپ کی، میری صدا میں سننا چاہتا ہے..... وہ تو ہماری شرگ کے قریب ہے..... جو بھی کہتا ہے اس سے کہو..... وہ سننے والا ہے..... اسی کی حمد بیان کرو انسان کتنا ہی گناہگار ہو، اس کے لیے توبہ کے دروازے کھلے ہیں..... وہ معاف کرنے پر قادر ہے..... آپ معافی تو مانگیں..... گرگڑا کر، غموشی سے، سرگوشی میں..... تنہائی میں، سب کے سامنے..... بس اسے پکاریں پھر دیکھیں آپ کو کس طرح نور اُزتا ہے وہ..... پکار کر تو دیکھیں.....“ وہ نورانی بزرگ بہت پیار بھرے لہجے میں مخاطب تھے۔

”اگر روحانیت کی راہ پر چلنا ہے تو دل سے کینہ، حسد، بغض، نفرت، تکبر اور انا کو نکالنا پڑے گا۔ اللہ کی دوستی حاصل کرنی ہے تو اس کے بندوں پر بہرمان ہونا پڑے گا..... یاد رکھیے..... اللہ کی عبادت کرنے سے گردار بلند ہوتا ہے؛ پارسائی نصیب ہوتی ہے اور نیکی کرنے سے رب ملتا ہے..... لہذا زندگی کی خوشیاں حاصل کرنے کے لیے اللہ کی عبادت کرو..... قرآن سمجھ کر پڑھو، لہجہ استغفار پڑھو پھر دیکھو زندگی کسے نعمتوں سے مالا مال ہو جاتی ہے۔ آپ کی زندگی کا سکون اور اطمینان صرف آپ کے ہاتھ میں ہے بس اسی مالک

الہامی دے رہی تھی..... کلکے سے لباس کے ساتھ سفید چادر لپیٹے خاموش بیٹھی تھی۔

باباجی آہستہ قدموں سے ان کی طرف بڑھے اور ان کے سر پہ ہاتھ رکھا۔

”بی بی سب جا چکے ہیں آپ بھی گھر جائیں..... شام ہونے والی ہے، بہت دیر ہو جائے گی۔“

”بابا! تو مجھے ہو چکی ہے..... میں کیا کروں..... مجھے رستہ دکھائیں.....“ خالہ زینب نے اپنا ستا ہوا شکستہ چہرہ اٹھایا اور بولیں۔

”اپنا سارا غبار صرف اللہ کے حضور بہائیں اور پھر ایسا رستہ ملے گا جو آپ کو سرخرو کر دے گا.....“

”رستہ.....؟“

”تلاش کریں..... ان لمحوں کو آواز دیں جو آپ کو پریشان کرتے ہیں..... رستہ مل جائے گا..... اگر کسی کا دل دکھایا ہے تو فوراً اس سے رجوع کریں، ہرگز دیر نہ کریں.....“

باباجی جا چکے تھے..... اور جرم کے پردے پر خالہ زینب کو کتنی ہی تصویریں نظر آرہی تھیں، ہر تصویر ان سے اپنا جرم پوچھ رہی تھی۔

”کتنی بے دردی سے زیہ پوتم نے ہر دل پہ پاؤں رکھا، کیسے اب اس عمر میں دل کی دلدل سے نکلو گی.....؟“

سوالات کا بول کا ٹائبن کر جسم میں چپے جارہا تھا۔

کس، کس سے معافی مانگوں.....

کس، کس کے زخموں پہ مرہم رکھوں.....

کیا مجھے رہائی ملے گی.....؟

آئو قطرہ، قطرہ کر کے بہتے جا رہے تھے.....

☆.....☆.....☆

کوئی روشن سہارا ڈھونڈتا ہے

فلک پر وہ ستارہ ڈھونڈتا ہے

ذرا یہ سادگی دیکھو تو اس کی

مرے دل پر اجارہ ڈھونڈتا ہے

چاند جیسے مشرق کی سمت چلا گیا تھا..... اور چاند

کی چاندنی نے دبے پاؤں خوشبو کے ہالے میں گھرے

ہوئے چپا، موتیا اور مولسری کے پودوں پر اپنے لب رکھ دیے تھے..... شبنم سے بھیگا ہوا ستاروں بھرالاں جگمگا رہا تھا۔

وہ دونوں ہوٹل کے عقیبی حصے میں تھے..... جہاں اکا دکا لوگ نظر آرہے تھے..... یہ گوشہ ہر ایک کے لیے عام نہیں تھا..... یہاں خاص ٹیبل بک ہوا کرتی تھی۔

ان میں سے ایک ٹیبل فیضان شاہ کی تھی..... وہ اور روزی آمنے سامنے تھے۔

وہ روزی کا سراپا جان رہا تھا..... بلکہ اس کی نظریں الجھ کر رہ گئی تھیں۔ جوہنر اور گولڈن رنگ کی میکس میں انگارہ بنی ہوئی تھی..... گولڈن میکس گردن میں سجا ہوا تھا..... بھرے، بھرے ہونٹوں پہ میروان رنگ کی لپ اسٹک جمی تھی اور آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔

”کس قدر خوب صورت ہو تم.....“ فیضان شاہ کی نظریں اس سے نہیں ہٹ رہی تھیں۔

”تمہاری نظروں کا احساس خوب صورت ہے اور تو کچھ نہیں.....“ وہ ادائے خاص سے بالوں کو جھٹکتے ہوئے بولی۔

ویٹر قریب آکر ادراغ جوس کے گلاس سرور کرنے لگا۔

فیضان نے گھونٹ، گھونٹ جوس پیتے ہوئے اسے دیکھا جو گلاس میں پڑے اسٹرا سے کھیل رہی تھی۔

”روزی مجھے نہیں معلوم..... کہ تم کون ہو..... تمہارا خاندان کیا ہے.....؟ تمہارے والدین کہاں ہیں.....؟ میں یہ سب کچھ نہیں جانتا..... میں صرف تمہیں جانتا ہوں..... میں سامنے بیٹھی روزی کو دیکھتا ہوں..... جو بہت آرام سے میرے دل میں اتر گئی ہے..... اور میں کسی الجھن میں مبتلا ہوئے بغیر تم سے کہنا چاہتا ہوں کہ.....“ وہ ایک لمحے کو جیسے چپ ہو گیا.....

الفاظ اس کے لبوں سے نکلنے کو تیار تھے..... روزی مسکرائی تو اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"I love you Rozi" کہتے ہوئے اس نے روزی کا ہاتھ تھام لیا..... روزی نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھا اور بے ساختہ کلکھلا کر ہنسنے

سہ ماہ نامہ پاکیزہ

160

ستمبر 2017ء

ہم کو عبث بدنام کیا

”او لے او لے مگر بہت دن انکار نہیں
کر سکوں گا“ روزی یاب ناما وہ وہی وہی وہی وہی
گئی۔

”بس اسی مسکراہٹ کو سجا کر رہنا“
اس کا موبائل فون تھر تھرایا۔ وہ محبت سے اسے دیکھتا
ہوا موبائل ریسیو کرنے لگا۔

”جی محبت انکل..... خیریت.....؟“
”او کے، میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں.....“ وہ
خدا حافظ کہہ کر موبائل جیب میں رکھنے لگا۔

”کیا ہوا.....؟“

”محبت انکل کے ساتھ جانا ہے..... چلو میں
تمہیں چھوڑ دوں.....“ وہ مسکراتی ہوئی تقاخر کے ساتھ
اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کے ساتھ چلتے ہوئے گاڑی میں
آ بیٹھی۔ محبت اللہ اس کے دباغ پر سو رہا تھا..... وہ اپنے
شکار کو بہت ڈھیل دے رہی تھی مگر کچھ سوچ کر..... وہ
سوچتے ہوئے بھی فیضان کی طرف سے غافل نہ تھی جو
سرخروئی کے ساتھ اسے دیکھ رہا تھا۔

فیضان شاہ کے ساتھ مل کر اب وہ اس گیم کو فائل
تک لے کر جائے گا..... اس کے چہرے کی مسکراہٹ
تیز ہوتی گئی۔ اس کی گہری لپ اسٹک کی طرح.....
آنے والا وقت جانے کیا کچھ اپنے دامن میں لا رہا تھا،
اس بات سے بے خبر کہ کا تب تقدیر ہر ایک کی چال سے
باخبر ہے اور وہ چال کو شہ مات دے کر ایک پناہ فرم
کر رہا تھا..... مگر سب انجان تھے..... سب بے خبر تھے۔

☆.....☆.....☆

ایک روز زندگی کے روبرو آ بیٹھے

زندگی نے پوچھا

درد کیا ہے.....؟

کیوں ہوتا ہے.....؟

کہاں ہوتا ہے.....؟

یہ بھی تو پتا نہیں چلتا

تنہائی کیا ہے آخر!

کتنے لوگ تو ہیں پھر تنہا کیوں ہوں!

گئی..... فیضان نے اسے ہنستے ہوئے دیکھا تو کہا۔
”کیا تمہیں میری محبت قبول نہیں ہے.....“
بولو روزی.....؟“ وہ بے تاب سے کہہ رہا تھا۔

”بالکل ہے..... I love you too faizan.....“
اور فیضان کو اس کے اقرار سے لگا..... زندگی
اچانک خوب صورت ہو گئی ہے..... اس بات سے...
بے خبر کہ روزی کا وار کا میاب ہو چکا تھا۔

فیضان اس کے عشق میں بری طرح گرفتار ہو چکا تھا۔
روزی کی چال کا یہ وہ انہم مہرہ..... جو باقی
مہروں کو کھولنے میں اس کے کام آ سکتا تھا..... وہ اندر
ہی اندر دل میں خود کو داد دیتے ہوئے خوش تھی۔ جب ہی
فیضان نے اس کا بایاں ہاتھ پکڑ کر اس کی تیسری انگلی
میں بیگماتے ڈائمنڈ کی رنگ پہنادی۔
”یہ کیا.....؟“ وہ اس کی جرات پہ حیران ہو کر
اسے دیکھنے لگی۔

”یہ میری اور تمہاری محبت کی نشانی ہے اور انجمنٹ
رنگ بھی..... اب تم میرے دل کی کلین ہو.....“ ابھی تک
وہ اس کا ہاتھ تھامے ہوا تھا۔

”تم فیضان شاہ کی منگیتر ہو.....“ فیضان محبتوں
کے رنگ سمیٹے اس سے کہہ رہا تھا۔
”تمہارے گھر والے.....؟“

”وہ سب میری خوشی سے راضی ہوں گے..... آج
تک بابا نے میری کوئی بات نہیں ٹھکرائی، وہ میرے اس
فیصلے پہ خوش ہوں گے۔“ وہ ضدی لہجے میں بولا۔

”او کے..... لیکن ایک بات میری آپ کو مانتی
پڑے گی.....“

”کیا.....؟“

”جب تک میں آپ سے نہ کہوں..... آپ
اپنے اور میرے حوالے سے کوئی بات نہیں کریں
گے..... کسی سے بھی نہیں..... پلیز.....“

”کیوں.....؟“ وہ حیران ہوا۔
”بس کچھ عرصے کے لیے.....“ وہ ہلتی لہجے میں
بولی تو وہ اس کے انداز سے پھل گیا۔

میرا چہرہ دیکھ کر زندگی نے کہا
میں تیری جڑواں ہوں
مجھ سے ناراض نہ ہوا کر
تجھ سے ناراض نہیں زندگی
حیران ہوں میں حیران ہوں
تیرے معصوم سوالوں سے
پریشان ہوں میں ہاں پریشان ہوں

☆☆☆

اس کی ڈائری میں باغ و بہار جیسے واقعات.....
کہیں درد میں ڈوبے ہوئے الفاظ تھے۔
کہیں محرومی کا احساس کسی خاص واقعے کے ساتھ
کسی اجنبی کی باتیں..... خواب موسم کا ذکر
دور دیس جانے والے پیاروں کا ذکر
اسکول، کالج، یونیورسٹی کے قصے.....
گلاب کے سوکھے پھول، کارڈز، ہر موسم کے
پھول جگہ جگہ تصویر کی صورت تھے۔
سبز رنگ کی ڈائری کے ابھی چند اوراق کی ورق
گردانی کی تھی مگر اس موم سی لڑکی کی شخصیت ورق در
ورق سامنے آتی گئی۔

اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے بہت ساری
دعائیں، ایک جگہ لکھا تھا.....
”آج میں نے اللہ کو منانے کے لیے بہت جتن
کیے..... اس کو راضی کرنے کے لیے روزہ بھی رکھا اور
اپنا سب سے خوب صورت جوتا کٹھوم کو دے دیا..... اور
کٹھوم کے چہرے پہ اتنی خوشی تھی کہ مجھے معلوم ہو گیا کہ
میری دعا قبول ہوگئی..... تایاجی نے مجھے اجازت دے
دی ہے کہ میں جاب کر سکتی ہوں..... اللہ سامیں آپ کا
بہت شکریہ کہ آپ نے میری بات رکھ لی..... میں
یونیورسٹی کے بعد مصروف ہونا چاہتی ہوں..... میرے
تایاجی کو بہت اچھا رکھنا انہیں صحت کے ساتھ سلامت
رکھنا..... اگر وہ نہ ہوتے تو کیا ہوتا..... تائی جی آخر کیا
چاہتی ہیں..... آپ انہیں بھی میرے لیے اچھا کر دیں
اللہ سامیں..... میں اپنے سارے اچھے سوٹ کٹھوم کو

دے دوں گی..... وعدہ.....!“

اس نے ڈائری بند کر کے گہری سانس لی۔
”کتنی معصوم لڑکی ہے یہ..... چھوٹی، چھوٹی خوشیوں
کے لیے اللہ سے دست سوال دراز رکھتی ہے.....“
”اعزاز بیٹا.....“ تایاجی اس سے کہہ رہے
تھے..... وہ اس کے سامنے آ کر بیٹھ گئے تھے۔

”میری بیٹی چڑیا جیسا دل رکھتی ہے..... وہ سہم
جاتی تھی بات بات پر..... بہت ذہین تھی مگر خود کو چھپا کر
رکھتی تھی ہمیشہ دوسروں کی خوشی کے لیے خود کو قربان
کر دیا..... خود کیا چاہتی ہے؟ کبھی نہ بتایا..... مجھے بھی
نہیں..... میں نے بھی تو اسے سمجھنے کی کوشش نہیں کی.....
کہ وہ کیا چاہتی ہے..... ہمیشہ میری بیوی میرے سامنے
آگئی..... اگر میں اس کے لیے کچھ کرنا بھی چاہتا تو میری
بیوی جلے بھانے سے مجھے روک دیتی..... میں اس کے
لیے کچھ نہ کر پایا مگر ایک بار وہ ہوش میں آجائے تو سب
ٹھیک ہو جائے گا..... اعزاز بیٹا..... تم اس سے ملو گے تو
تم سوچو گے کہ آج کے دور میں اتنی حیا.....! وہ سر جھکا
کر بات کرتی ہے..... وہ میری بہت پیاری بیٹی
ہے.....“ ان کا لہجہ گلوگیر ہو گیا تھا۔

”بیٹا تم ایک بار اس سے ملو گے تو احساس ہوگا
کہ وہ عام لڑکیوں سے کتنی مختلف ہے..... سہمی، سہمی
..... شرمیلی سی..... باحیا، باکر دار..... یہ ڈائری تمہیں
مدد دے گی..... اس کا علاج کرنے میں.....“ سبز رنگ
کی ڈائری کی طرف اشارہ کر کے وہ کہنے لگے۔

”اللہ خوش رکھے مینا کو کہ وہ ڈھونڈ کر لے آئی.....“
وہ ماسی کو دعا دیتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے..... ”اچھا بیٹا
اب میں چلتا ہوں..... اللہ تمہیں بھی خوش رکھے.....
تمہاری زندگی میں آسانیاں پیدا کرے.....“
”میں آپ کو چھوڑ دیتا ہوں انکل.....!“ اعزاز
شاہ یک دم کھڑے ہو گئے۔

”نہیں بیٹا بالکل نہیں..... تم اپنا کام کرو.....
تمہیں بہت اہم اسائنمنٹ ملا ہے.....“ وہ پھیکے.....
سے مسکراتے ہوئے گویا ہوئے..... اور اس کے سر پر

☆.....☆.....☆

رات کے گیارہ بج رہے تھے..... گاڑی تیز رفتاری سے سڑک کا سینہ چرتی ہوئی دوڑ رہی تھی..... یہ سڑک عموماً ریش سے خالی رہتی تھی اس لیے فیضان شاہ بے خوف ہو کر گزر رہا تھا۔ روزی اس کے ساتھ بیٹھی تھی..... اچانک ایک عورت نہ جانے کدھر سے نکل کر سامنے آ گئی..... تیزی سے گاڑی کو بریک نہ لگتا تو خوفناک حادثہ ہو جاتا۔

فیضان شاہ نے بریک پر پاؤں جمادیا اور گاڑی اس عورت کے بالکل قریب جا کر جھٹکے کھا کر رک گئی..... روزی کا سر ڈش بورڈ سے ٹکرایا تھا۔ فیضان نے روزی کے جھٹکے ہوئے سر کو اٹھا کر کہا۔

”خود کو سنبھالو پلیز..... میں ذرا ان خاتون کو دیکھوں.....“ یہ کہہ کر وہ تیزی سے گاڑی کا دروازہ کھول کر زخمی وجود کی طرف بڑھا..... جو گاڑی سے ٹکرا کر تھوڑے فاصلے پر بے سدھ پڑی تھی۔

فیضان گھبرا کر قریب پہنچا تو اسے دیکھ کر گھبرا گیا۔ روزی بھی ایسا سر پکڑے گاڑی سے اتر کر اس کے ساتھ ہی کھڑی تھی..... ”نہنہ خالہ.....؟“ اس کے منہ سے عجیب انداز میں نکلا۔

”آف خدایا..... یہ تو بالکل بے جان پڑی ہے..... ذرا دیکھو سانس چل رہی ہے یا نہیں.....“ فیضان شاہ ایک دم گھبرا گیا..... روزی نے خاتون کے سر پہ ہاتھ رکھا..... بازو چیک کیا..... نتھنوں کے قریب سانس کی بجالی دیکھ کر کہا۔

”ڈونٹ وری..... فوراً اٹھاؤ انہیں اسپتال لے چلتے ہیں..... فوراً میر جنسی میں چلتے ہیں..... قریب ہی اسپتال ہے.....“ خاتون بالکل بے ہوش تھیں..... سانس کی رفتار ملکی تھی۔

”اتنی رات کو یہ عورت اکیلے اس سڑک پہ کیا کر رہی تھی.....؟“ فیضان حیرانی و پریشانی سے کہنے لگا۔

”ہوش میں آنے دو سب پتا چل جائے گا۔“ روزی نے اسے بائیں طرف اشارہ کیا..... جہاں

ہاتھ پھیرتے رخصت ہو گئے..... وہ ان کی باتوں پہ غور کرتے ہوئے پھر سبز رنگ کی ڈائری میں الجھ گئے۔

”یہ ڈائری مجھے کیوں اپنی اپنی سی لگ رہی ہے..... جیسے میرے اور اس کے دکھ مشترک ہوں.....“ ڈائری کے اوراق اور مختلف حصے شہیرہ کی زندگی کی عکاسی کر رہے تھے۔

”میری شادی فاطمہ سے ہو رہی ہے..... میں تایا جی کو ناراض نہیں کر سکتی..... انہوں نے خود مجھ سے کہا ہے کہ فاطمہ محبت پا کر سیدھی راہ پر آ سکتا ہے..... بھٹکنے سے بچ سکتا ہے..... اگر میری اس قربانی سے وہ راہ راست پر آ گیا تو اس سے بڑی کیا بات ہوگی۔

مکرم تائی اماں کا حراج کیوں برہم رہتا ہے..... مجھے ان سے بہت ڈر لگتا ہے..... یا اللہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے۔ وہ مجھے اتنی خوفناک نظروں سے گھورتی ہیں کہ میں خود کو ان کی نظروں سے نہ چھپانا چاہتی ہوں جبکہ میں تو ان سے محبت کرنا چاہتی ہوں مگر نہ جانے کیوں وہ مجھے دھتکارتی ہیں۔ اور تایا جی کے سامنے میرا خیال رکھتی ہیں مگر میں تایا جی کو کبھی کچھ نہیں بتا سکتی..... یا اللہ تو میرے حق میں بہتر فیصلہ کر دے..... بس سب مجھ سے خوش رہیں.....“ پھر اگلی تاریخ لکھی تھی۔

”آج پلاؤ کی ڈش میرے ہاتھ سے ٹوٹ گئی..... آف تائی اماں کو معلوم ہو گیا تو..... چیزیں ٹوٹی رہیں گی تو سب خوش کیسے رہیں گے.....؟“

”پگلی.....“ اعزاز ایک دم کھلکھلا کر ہنس دیے۔

”دنیا تو ویسے بھی خوش نہیں رہتی.....“ وہ خود کلائی کرتے ہوئے..... منصوبہ بندی کے ساتھ سوچنے لگے کہ انہیں واقعی اب سنجیدگی سے اس پروجیکٹ پہ کام کرنا ہے۔ فیضان اب کاروبار سنبھال سکتا ہے..... اگر کچھ دن وہ آفس سے رخصت لے لیں..... بابا اور ماما کو بھی بتانا ضروری تھا..... بابا تو پریشان ہو جائیں گے خیر سب ٹھیک ہو جائے گا۔

زوار شاہ کو قائل کرنا اتنا آسان نہ تھا..... سبز ڈائری کے لیے انہیں بہت کچھ کرنا تھا.....

اپنا تال کی عمارت تھی..... گاڑی کے رکتے ہی اسٹریچر لانے کا اشارہ کیا گیا..... تھوڑی دیر میں ہی وہ ایمر جنسی دارڈ میں کھڑے تھے۔

ڈاکٹر ز چیک اپ کر رہے تھے..... فیضان شاہ اپنے ہونٹ بے بسی سے کاٹ رہا تھا..... جبکہ روزی بے تاثر چہرے کے ساتھ اس خاتون کو دیکھ رہی تھی۔ انتہائی کمزور اور غمزدہ سی عورت تھی..... نرس ان کی نس تلاش کر کے ڈرپ کے ذریعہ انجکشن لگا رہی تھی..... تھوڑی دیر میں ڈاکٹر فیضان شاہ کی طرف مڑا۔

”اب یہ خطرے سے باہر ہیں..... ان کا ہلڈ بلڈ پریشر انتہائی خطرناک حد تک گر گیا تھا..... جس کی وجہ سے یہ چکرا کر گری ہیں..... دائیں طرف پیشانی پہ معمولی سی چوٹ ہے..... ابھی تھوڑی دیر میں انہیں ہوش آجائے گا..... اچھا ہوا آپ لوگ انہیں بروقت لے آئے.....“ ڈاکٹر، فیضان شاہ کو سلی دیتے ہوئے آگے بڑھ گیا..... فیضان اور روزی کو اس وقت تک وہاں رکنا تھا جب تک کہ زنب خالہ کو ہوش نہ آجائے..... دیوار گیر گھڑی میں بارہ بجے تھے..... ٹک ٹک کر کے سوئی آگے بڑھ رہی تھی..... اور وہ سراپا انتظار تھے۔

☆.....☆.....☆

اور رات کے اسی پہر مہر و کے موبائل پر ریبال کا فون نمبر جگمگ کرنے لگا..... مہرالنسا نے تڑپ کر فون اٹھا لیا۔

”السلام علیکم! امی کیسی ہیں آپ.....؟“
”اللہ کا شکر ہے میرا بیٹا..... تم تو ٹھیک ہو.....؟“ ان کے لہجے کی خوشی دیدنی تھی..... ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کو گلے سے لگالیں۔
”جی امی بالکل ٹھیک ہوں.....“ ایسی ہی کیفیت ریبال کی بھی تھی۔

”امی آپ کو خوشی کی خبر سنائی ہے..... مجھے ڈاکٹر یٹ کی ڈگری اکتوبر میں ملے گی اور میں چاہتا ہوں..... میری ماں اس وقت میرے ساتھ یہاں موجود ہو..... امی یہ کانوکیشن میری زندگی کا سب سے

بڑا خواب ہے..... میں نے سفارت خانے میں آپ کے لیے بات کی ہے..... ہے تو مشکل مگر ناممکن نہیں..... آپ کا پاسپورٹ تو ویسے بھی بنا ہوا ہے جو آپ نے حج کی نیت سے بنایا تھا.....“

”لیکن بیٹا وہ تو ٹھیک ہے..... پیسوں کا انتظام کیسے ہوگا اتنی جلدی.....“ مہرالنسا خوشی کے احساس سے پریشان ہو گئی تھیں۔ انہیں فکر لاحق ہو گئی..... ریبال فون پہ ان کی پریشان آوازیں کر مسکرادیا۔

”ارے امی آپ پیسوں کی فکر نہ کریں..... بس دعا کریں آپ کو بلانے کی اجازت مل جائے، پیسے آپ کے بیٹے کے پاس ہے..... آپ کے سلیٹے اور بچت کے فارمولوں نے مجھے بھی سلیقہ شعار بنا دیا ہے میں ٹکٹ کا انتظام کر دوں گا۔“ مہرالنسا اس کی بات پر ہنس پڑیں۔
”امی تخمیرہ کا پتا چلا.....؟“ کچھ توقف کے بعد اس نے پوچھا۔ اس کا لہجہ پریشان کن تھا۔

”نہیں بیٹا..... میں جب اس کے گھر گئی وہاں تالا لگا ہوا تھا..... محلے والے بھی کچھ نہیں بتا رہے۔ اس کے تایا جی صبح سویرے چلے جاتے ہیں، رات میں کب واپسی ہوتی ہے کسی کو نہیں خبر..... اس کی تائی کی بھی کوئی اطلاع نہیں..... لیکن ایک دو لوگوں نے بتایا ہے کہ وہ گاؤں چلی گئی ہیں لیکن بیٹا تم نے اعزاز سے بھی تو کہا تھا.....“

”جی امی اس سے کہا تھا..... اللہ کرے اعزاز کو کچھ معلومات حاصل ہو جائیں..... اعزاز سے آپ کی ملاقات تو ہو رہی ہے ناں.....“

”ہاں بیٹا..... وہ اکثر آ جاتا ہے۔ مجھے کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دیتا..... اللہ اسے خوش رکھے۔ اچھا بیٹا فون رکھو..... پتا نہیں کتنے ریال گر گئے ہوں گے..... بات بہت لمبی ہو گئی ہے.....“

اور ریبال نے بے ساختہ تہتہ لگایا۔
”میری بھولی امی..... یہاں کے پیسے کو ریال نہیں کہتے۔“

”ارے جو کچھ بھی کہتے ہیں..... بس میں یہ جانتی ہوں..... کال بہت لمبی ہو رہی ہے.....“ وہ

”کیا ہوا.....؟ تمہارا کیا مطلب ہے.....؟“
 زوارشاہ بری طرح چونکے۔
 ”میرے دوست تم نے اپنی قیمتی زندگی کے کچھ فیصلے بہت عجلت اور افراتفری میں کیے ہیں.....“ محبت اللہ محل سے بولے۔

”کوئی عجلت میں نہیں کیے تھے..... بالکل صحیح فیصلہ تھا۔ وہ کسی اور مرد میں انٹرسٹڈ تھی۔ اسے بتانا چاہیے تھا، اس کی بہن نے تصویریں اور اس کی آواز سنا لی تھی اور ایک شوہر کی غیرت یہ برداشت نہیں کر سکتی..... سمجھے تم.....“

”تم تحقیق تو کرتے..... معلوم تو کرتے..... میں لفظ طلاق کے لکھ کر چلے آئے..... میرے دوست یہ ظلم کیا تم نے اس کے ساتھ..... بہت ظلم کیا.....“ محبت اللہ سانسف سے ہاتھ مل رہے تھے۔

”تم اس کے ساتھ کیے گئے سارے وعدے بھول گئے..... تم تو اس کی مصحوبیت کی تعریف کیا کرتے تھے ناں! وہ آج تک یہی سمجھتی ہے کہ تم غلط فہمی کا شکار ہو..... طلاق کے کاغذات تو اس تک پہنچے ہی نہیں تھے.....“

”کیا.....؟ میں خود اس کی بہن کو دے کر آ گیا تھا کاغذات.....“ وہ جھٹکا کھا کر گویا ہوئے..... زوارشاہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا..... ”21 سال ہو گئے ہیں..... اس کی بہن نے اس کو کاغذات کیوں نہیں دیے.....“ اب وہ مضطرب تھے..... ”مجھے معلوم کرنا پڑے گا۔“
 ”تمہیں یاد ہے جب چاندنی نے تمہارا آفس جوائن کیا تھا..... تو اس کی بہن سے اس کی خوب دوستی تھی..... کیا نام تھا اس کی بہن کا..... ہاں..... زیب النساء.....“
 ”ہاں..... یاد ہے.....“ زوار کی آنکھوں میں گزرے ماہ و سال اتر آئے۔

”ذرا سوچو کیا ہوا تھا.....؟“
 ”کیا ہوا تھا.....؟“ زوارشاہ نے کینٹی دباتے ہوئے کہا۔

”وہ مہر و کا خط لے کر آئی تھی..... میں اس کی پیٹڈ

جینپ کر بولیں۔

”اچھا ای میں رکھتا ہوں..... بس دعا کیجیے گا..... آپ کو بلواسکوں اور میں اپنی محنت اس کوشش میں کامیاب ہو جاؤں..... ڈگری لیتے وقت میری ای میرے پاس ہوں۔“

”انشاء اللہ بیٹا..... ایسا ہی ہوگا..... اپنا بہت خیال رکھنا.....“

”جی ای آپ بھی..... اللہ حافظ.....!“
 اللہ حافظ کہتے ہوئے ان کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں..... فون بند ہو چکا تھا..... بھیگی آنکھوں کے ساتھ ریپال کی ٹھہرے کے ساتھ زوارشاہ کی تصویر بھی سامنے آ گئی۔

”آپ کو تو پتا بھی نہیں ہے کہ آپ کا بیٹا کتنی کامیابی حاصل کر چکا ہے..... کاش آپ میرے ساتھ ہوتے تو مجھے زندگی کا کوئی غم نہ ہوتا۔ آپ نے جلد بازی میں اتنا غلط فیصلہ کیا، آپ کو کوئی پشیمانی بھی نہیں..... اتنے برس گزرنے کے باوجود بھی جاننے کی کوشش نہیں کی کہ میں کس حال میں ہوں.....؟“ وہ سکتے، سکتے رونے لگیں..... اور بھیگی رات آہستہ آہستہ بیت رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

”کوئی بھی انسان اتنا امیر نہیں ہوتا میرے دوست کہ وہ اپنا گزرا ہوا کل خرید سکے.....“
 بھابھا اڑاتی کافی کی پیالیاں دونوں کے سامنے تھیں..... سگریٹ کے مرغولے میں زوارشاہ سوچ و فکر کی پہنائیوں میں گم تھے۔

”جب تم اعزاز کی شخصیت کی بات کرتے ہوتاں تو یقین کرو مجھے مہر و بھابی بہت یاد آتی ہیں.....!“ مہر و کے ذکر پر وہ عجیب سے ہونکے تھے۔
 سگریٹ الٹش ٹرے میں ملتے ہوئے وہ اپنا ہاتھ جلا بیٹھے۔

”تم نے ہر فیصلہ غصے کی حالت میں کیا میرے دوست! اگلے ہوئے پانی میں اپنا کس دکھائی نہیں دیتا.....“

دھو کر پختی..... آپ کے قدموں کی دھول بن کر رہتی.....
ہے تو وہ میری بہن مگر آپ کے قابل نہیں ہے.....
زوار کے کانوں میں زیب النساء کی آوازی گونج
رہی تھی۔

”اور تم نے یقین کر لیا.....“ محبت اللہ نے طعنا کہا۔
”وہ اس کی سسکی بہن تھی..... یقین دلایا تھا اس
نے مجھے، ثبوت لے کر وہ میرے آفس آئی تھی..... اور
اس لڑکے کی بہن چاندنی کو بھی ساتھ لائی تھی۔ اور
چاندنی نے اپنے بھائی کے بارے میں بتایا کہ وہ مہرو
کے عشق میں پاگل تھا۔ اس نے خودکشی کر لی تھی.....
ایک بہن اپنی بہن کے بارے میں بتا رہی تھی تو اس
میں کیا غلط ہو سکتا ہے..... بتاؤ میں غلط تھا کیا.....؟“
زوار غصے سے بولا۔

”میرے پار تمہیں غلط بتایا گیا تھا بالکل غلط.....
جب تم نے چاندنی کو مظلوم سمجھ کر اپنے آفس میں رکھ لیا
تھا۔ تو ایک دن اس نے باتوں، باتوں میں مجھے بتایا
کہ وہ دنیا میں بالکل اکیلی ہے..... ماں باپ مر چکے
ہیں اور آٹھ (8) سال کی چھوٹی بہن ہے..... اس کا
بھائی کوئی نہیں.....“

”کیا.....؟ بھائی کوئی نہیں.....“
”جی..... اس کا کوئی بھائی نہیں تھا..... اس نے
یہ سب کسی کے کہنے پر کیا تھا..... پر کس کے کہنے پر.....
یہ پتا نہیں چلا..... ہاں وہ ڈرگ مافیا کے ساتھ کام کرتی
تھی..... تمہیں یاد ہے ناں..... انکوائری ٹیم ہماری کمپنی
آئی تھی..... تو چاندنی کی کیا حالت تھی..... تم نے اسے
اپنی پرسنل سیکریٹری کے عہدے پر رکھا تھا مگر ہماری کمپنی
کی ساکھ اس نے خراب کر دی تھی..... جانے کس نے
یہ اطلاع دی تھی کہ وہ ہماری کمپنی کے ذریعے ڈرگز
سپلائی کرتی ہے..... جب ہم نے اس سے پوچھ گچھ کی
تو اس نے گول مول جواب دیے اور صاف ٹکرائی بلکہ
سب میں مشہور کر دیا کہ وہ تم سے شادی کی خواہشمند
ہے اور تم اس سے کچھ دنوں میں شادی کرنے والے
ہو..... اور اس کے کچھ دنوں بعد اس نے آفس کی کھڑکی

پر لپکا ہوا تھا..... اس نے کسی کو لکھا تھا.....“ زوار
نہ ہٹا ہوا تھا۔

”میں بہت مجبور ہوں..... تم سے شادی نہیں
کر سکتی..... کیونکہ میری اماں کو وہ آدمی بہت پسند ہے
جس کا نام زوار ہے..... میں مجبور ہوں..... پلیز.....
میری ساری تصویریں جلا دینا..... جو ہمارے پیار کی
نشانی ہیں..... میں خود انہیں سب کچھ بتا کر طلاق لے
لوں گی..... تمہاری قسم میں ایسا ضرور کروں گی تم کوئی
جذباتی قدم نہ اٹھانا.....“

تمہارا پیار..... مہرو.....“
زوار شاہ کے سامنے جیسے اس خط کا مضمون
اترنے لگا..... ”تو میں کیا کرتا بتاؤ تم..... جب میں گھر
پہنچا تو وہ گھر پر نہیں تھی..... اس کی بہن زینب سے پوچھا
تو کہنے لگی کہ وہ تو گھر پہنچ گئی ہے.....“ پھر اس دن کا
منظر اس کی نگاہوں کے سامنے تھا..... میں نے پوچھا۔
”کہہ گئی ہے.....“

”مجھے پتا نہیں..... وہ تو اکثر کہیں نہ کہیں
چلی جاتی ہے..... کوئی فون آیا تھا..... وہ فوراً تیزی سے
بغیر بتائے نکل گئی.....“ زیب النساء نے کہا تھا۔
”ویسے حیرت ہے اس نے آپ کو بھی نہیں
بتایا.....؟ ہے تو میری بہن مگر کچھ کہوں تو وہ آپ کے
قابل نہیں ہے..... اب آپ نے تو اس سے محبت
کر کے شادی کی اور اس نے جبراً..... اس کو ساری
بات آپ کو بتا دیٹی چاہیے تھی.....“

”کیسی بات.....؟“ زوار شاہ حیران ہوئے۔
”یہی کہ وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے..... بلکہ ابھی
نہ..... اس نے اپنے دونوں گالوں اور کانوں کو ہاتھ
لگایا.....“ ”توبہ توبہ..... اس اپنے عاشق سے ملنے ابھی
نہ جاتی ہے..... اماں نے سمجھایا میں نے سمجھایا مگر وہ
نہیں مانتی..... کہتی ہے تم لوگ بھگتو..... میرا کیا تصور
ہے..... شادی تم لوگوں نے کی ہے..... تم لوگ
ہاں..... سچی بات تو یہ ہے زوار بھائی آپ نے غلط لڑکی
لوہی بیٹا لیا..... اگر کوئی اور ہوتی تو آپ کے پیر دھو،

”جی..... تمہارا بیٹا اور تمہیں پتا ہے جب ردا بھابی شیر خوار بچے کو چھوڑ کر چلی گئی تھیں تو اعزاز کو میں نے جس ڈے کیر بے بی سینٹر میں داخل کیا..... وہاں مہر و بھابی نے اعزاز کو سنبھالا..... اور آج بھی اعزاز اور مہر و بھابی میں ماں بیٹے جیسا رشتہ قائم ہے.....“

حیرتوں کے دھچکے تھے جو زوار شاہ کو لگ رہے تھے..... ان کو اپنے دل میں درد سا محسوس ہونے لگا۔

”یار بہت خوش نصیب ہو..... ریاں جیسا بیٹا تمہارا خون ہے۔ اس کا کردار دیکھو..... ایک غیر مسلم لڑکی اس کے کردار کو دیکھ کر مسلمان ہو گئی اور یہ سارا کریڈٹ ریاں کی ماں یعنی مہر و بھابی کو جاتا ہے۔“ وہ انکشافات کر رہے تھے۔

”اگر تم ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچتے تو آج حالات مختلف ہوتے.....“ وہ زوار شاہ کی کیفیت سے یکسر لاعلم اپنی کہہ رہے تھے..... زوار اپنے سینے کو دباتے ہوئے بیٹھتے چلے گئے۔

”کیا ہوا زوار.....؟“ محبت اللہ ایک دم تیزی سے ان کی طرف بڑھے..... ٹھنڈے، ٹھنڈے پسینے کے قطرے ان کے چہرے پر تھے۔

”میری گولی اور پانی کا گلاس دو..... وہ سائڈ پہ رکھی ہے ٹیبلٹ.....“

محبت اللہ نے جلدی، جلدی ٹیبلٹ اور پانی کا گلاس ان کے لبوں سے لگا دیا..... محبت اللہ نے زوار شاہ کو وہیں صوفے پر لٹایا اور اعزاز کو آواز دی..... اعزاز بھاگتے ہوئے قدموں کے ساتھ سیڑھیاں اترنے لگے..... ٹی وی لاؤنج میں زوار صوفے پہ نیم دراز تھے..... محبت اللہ ان کے ہاتھوں کو مسل رہے تھے۔

”کیا ہوا بابا کو.....؟“ وہ پریشان ہو گئے تھے۔

”کچھ نہیں بیٹا..... اب میں ٹھیک ہوں.....“

زوار شاہ نے ان کو اپنے قریب بٹھاتے ہوئے کہا۔

”بس ایسے ہی محبت گھبرا جاتا ہے..... کچھ زیادہ ہی محبت کرتا ہے مجھ سے.....“ انہوں نے محبت کو دیکھا۔

”سچ کہیں بابا..... سب ٹھیک ہے ناں.....“

سے کود کر اپنی جان دے دی۔

اس لیے کہ پولیس کو وہ مطلوب تھی..... اس نے جیل جانے سے بہتر یہی سمجھا کہ وہ خودکشی کر لے.....

”آف..... عجیب معما تھی وہ لڑکی بھی شکر ہے کہ ہمارے بزنس کی ساکھ بحال ہو گئی.....“

”تمہیں تو اس نے بھائی بنا رکھا تھا.....“ زوار نے محبت اللہ سے کہا۔

”جیسی تو بہت ساری باتیں پتا چلیں کہ پیسوں کے چکر میں اس نے اٹے سیدھے کام کیے..... اسے اپنے مقصد کے لیے کسی نے خریدا تھا..... کس نے یہ آج تک معاملہ نہیں ہوا مگر اس سب کے باوجود میں تم سے کہوں گا مہر و بھابی بے قصور تھیں..... اپنے فیصلے کو منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے تمہیں ان سے بات کرنی چاہیے تھی.....“ محبت اللہ نے ان سے کہا۔

”میں اس کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتا تھا..... وہ اتنی گر جائے گی میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا.....“ زوار شاہ نے سختی سے کہا۔

”تم نے تو ان کے فون کا بھی صحیح جواب نہیں دیا تھا.....“

”ہاں اس کا فون آیا تھا.....“ ایک ورق ماضی کا پھر سامنے آ گیا تھا..... ”مجھے آپ کو خوشخبری سنانی ہے..... آپ میرے لیے گجرے لے کر آئیے گا شام میں.....“

”میں نے کہا جو خوشخبری تمہیں ملے گی تمہاری بہن کے ذریعے وہ سب سے بڑی ہوگی..... یہ کہہ کر میں نے فون پٹ دیا تھا..... اس نے بار بار فون کیے میں نے وہ نمبر ہی تبدیل کر دیا.....“ وہ حسی لہجے میں بولے۔

”وہ میرے دل سے اتر چکی تھی.....“

”دیکھ یار..... چاندنی اگر زندہ ہوتی تو بہت سی باتوں سے پردہ اٹھ جاتا..... اور جو خوشخبری وہ سنا نا چاہ رہی تھی..... وہ تمہارے ولی عہد کی تھی..... جسے تم نے نظر انداز کر دیا.....“ زوار شاہ کے سر پہ جیسے ایک پہاڑ ٹوٹا۔

”ولی عہد.....؟“

اے میں میری ٹینشن نہ لیں..... میں شراب کو ہاتھ تک نہیں لگاتا..... بزنس پہ توجہ دے رہا ہوں..... آپ کو اب کوئی پریشانی نہیں ہونی چاہیے.....“ اعزاز کو تنویش ہوئی۔

”ہاں میرے بیٹے سب ٹھیک ہے..... بس یونہی چکر آگیا تھا..... اب ٹھیک ہوں، جاؤ جا کر آرام کرو..... جاؤ بیٹا.....“ وہ زبردستی اعزاز کو بھیجنے لگے۔

”ہاں اعزاز جاؤ..... میں نے جذباتی ہو کر تمہیں آواز دے دی.....“ محبت اللہ بولے۔

”اوکے انگل اور بابا..... آپ دونوں اپنے ڈرائے کی ریہرسل جاری رکھیں.....“ وہ مسکراتے ہوئے کہہ کر سیڑھیاں چڑھنے لگے۔

”میں تو خیر ہوں ہی ڈراما..... تمہارا نہیں پتا.....“ وہ زوار کو دیکھتے ہوئے کہنے لگے۔

”محبت یا خدا کے لیے کہیں سے بھی معلوم کرو..... سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا؟ ورنہ میں اپنے آپ کو معاف نہیں کر سکوں گا.....“ زوار نے سچی سچے میں محبت سے کہا۔

”اچھا یا..... سب ٹھیک ہو جائے گا..... پہلے تم اپنی طبیعت سچ کر لو پھر دیکھتے ہیں..... چلو آنکھیں بند کرو..... تھوڑی دیر آرام کر لو.....“

زوار نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور محبت اللہ کے چہرے پہ تردد کے آثار نمایاں ہو گئے۔

☆.....☆.....☆

اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں نرنس خالہ کو ڈرپ لگی ہوئی تھی..... اور باہر رانداری میں روزی اور فیضان شاہ ان کے ہوش میں آنے کے منتظر تھے۔ رات کے دو بج رہے تھے۔

”شکر ہے ابھی تک بابا کا فون نہیں آیا.....“ وہ سوچ رہا تھا..... ”ورنہ شامت ہی آجاتی..... میں اعزاز بھائی کو فون کر کے بتا دیتا ہوں۔“

وہ موبائل نکالنے لگا تھا کہ وارڈ بوائے کی آواز آئی۔

”مریضہ کو ہوش آگیا ہے..... آپ اندر آ جائیں۔“

”ٹھیک گاڈ.....“ کہتے ہوئے وہ اندر آ گئے..... خالہ نرنس نے آنکھیں کھول دی تھیں..... انہیں ہوش آگیا تھا۔

”آپ کیسی ہیں آئی اب.....؟“ فیضان شاہ نے ہمدردی سے پوچھا۔

”اللہ کا شکر ہے بیٹا..... آپ کا شکر یہ آپ یہاں لے آئے.....“

”آپ اس سنان سڑک پہ کیا کر رہی تھیں؟“

”کچھ نہیں بیٹا..... وہاں سے گزر رہی تھی..... دوسری طرف جانے کے لیے پتا نہیں کیا ہوا کہ روشنی آنکھوں کو عجب سا کر دیتا تھا..... پھر کچھ یاد نہیں ہے۔“

”چلیں اب..... یہ خاتون ٹھیک ہیں.....“ روزی بیڑاری سے بولی..... اتنی انکساری وہ صرف فیضان شاہ کی وجہ سے دکھا رہی تھی۔

نرنس خالہ نے روزی کو غور سے دیکھا پھر کہنے لگیں..... ”تم چاندنی کی بہن تو نہیں ہو..... اس کی شہادت آ رہی ہے تم میں.....“

”آپ چاندنی کو کیسے جانتی ہیں.....؟“ روزی نے تیز لہجے میں جذباتی ہو کر پوچھا۔

”وہ میری سہیلی تھی..... میری رازدار.....“ ان کی آنکھوں کے کنارے ٹیلے ہوئے لگے..... وہ رونے لگیں۔

”آپ انہیں آرام کرنے دیں..... اب یہ خطرے سے باہر ہیں.....“

”پھر مل لیجے گا ان سے.....“ ڈاکٹر نے قریب آ کر انہیں جانے کا سگنل دیا۔

”میں آپ سے ملنے آؤں گی.....“ اس نے پرس سے کچھ پیسے نکال کر ان کے ہاتھ پہ رکھے..... اور فیضان شاہ کے ساتھ اسپتال کے پارکنگ ایریا میں آگئی۔

”یہ چاندنی کو جانتی ہے تو باقی لوگوں کو بھی جانتی ہوگی..... لگتا ہے اب بانی ساری کڑیاں ملنے والی ہیں.....“ فیضان نے اسے اس کے گھر ڈراپ کیا۔

”سنو..... مگنی مبارک ہو.....“ فیضان کا جملہ

سٹیمبر 2017ء

ماہنامہ پاکیزہ

168

مقبول خواتین رائیٹرز کے شاہکار ناول شائع ہو گئے ہیں

قصہ سہل

نہیلہ عزیز

مصنفہ

1000/- روپے

دستیجا

نگہتے سینا

مصنفہ

600/- روپے

گل ہسار

فرح بخاری

مصنفہ

500/- روپے

عشق مجزوب

مصباح نوشین

مصنفہ

500/- روپے

وہ نہیں ملا تو ملا لیا

نادیہ احمد

مصنفہ

500/- روپے

حماقتیں

ام طیفور

مصنفہ

500/- روپے

کتابیں خوبصورت سرورق بہترین کمپوزنگ و طباعت کے ساتھ شائع ہو گئی ہیں

سرکلر روڈ، چوک اردو بازار لاہور

القریش پبلی کیشنز

فون: 37652546 — 37668958-042

اس لے کانوں میں پڑا تو وہ مسکرا دی..... اور انگلی والی ہاتھ اس کے آگے کر دیا..... خوب صورت ہاتھ میں اس کے نام کی انگلی پہنے وہ اترا رہی تھی..... اور رات آہستہ آہستہ بڑھتی جا رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

یہ دو دن بعد کا ذکر ہے..... ڈاکٹر جوزف نے اس کو ہر طریقہ علاج سے آگاہ کر دیا تھا..... اب وہ اس پوزیشن میں تھا کہ بہت اچھی طرح سے اس سے گفتگو کر سکتا تھا..... کیونکہ چھوٹی سے چھوٹی بات بھی اس نے مختلف زاویوں سے، مینا اور تایا جی سے معلوم کر لی تھی..... سبز رنگ کی ڈائری اس کے ہاتھ میں تھی..... جسے وہ جتنا پڑھتا اسے اتنا ہی مزہ آتا۔ آج وہ لمحہ آ ہی گیا تھا..... جب وہ اس کے سامنے کرسی رکھ کر نزدیک بیٹھا ہوا تھا..... اس نے دیکھا کہ وہ حسین لڑکی کھلایا ہوا زرد پھول لگ رہی تھی..... گلابی رنگ کا دوپٹا اس کے کمر سے باہر جھانک رہا تھا..... اس کا وجود گہری نیند میں تھا..... ڈاکٹر جوزف اور جدید ریسرچ کے مطابق وہ لاشعور میں متحرک ہے اور شعور میں لانے کے لیے اس کے ساتھ مکالمہ ضروری ہے۔

اعزاز شاہ نے کچھ دیر خود کو سنبھالا اور پھر دھڑکتے دل سے کہنے لگے۔

”سنو..... جن کے دل کی بات اس دنیا میں سننے والا کوئی نہیں ہوتا..... ان کی سب کچھ ان کی باتیں اس دل کا کلین سنتا ہے..... بڑے غور، دھیان اور پورے خلوص کے ساتھ اور پتا ہے۔“

اعزاز شاہ کچھ دیر کو رکے..... اس کی گھٹی گہری پلکوں سے ڈھکی بند آنکھوں کو دیکھا۔

کاش وہ آنکھیں کھول دے اس پل..... تو کائنات رک جائے..... اعزاز شاہ کے دل میں خواہش جاگی۔

”میرا رب جس دل میں رہتا ہے..... اسے دنیا والوں سے بات کرنے کی حاجت ہی نہیں رہتی.....“ ڈائری میں لکھا جملہ اسے یاد آیا۔

”تم تو سراپا محبت ہو.....“ اعزاز نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا..... ہر نقش بے مثال تھا..... ستواں ناک..... بھرے، بھرے ہونٹ اور لمبے بال..... اگر یہ لڑکی ابھی اٹھ کر بیٹھ جائے تو کیا ہو.....؟

بے اختیار انہوں نے بیڈ پہ پھیلے اس کے بازوؤں کو دیکھا..... اور ہاتھ تھامنے کی خواہش دل میں جاگی..... مصورانہ شاہکار تھی وہ..... اعزاز نے اس کے ہاتھوں کی انگلیوں کو غور سے دیکھا..... اگر وہ اس ہاتھ کو سیدھا کر کے دیکھے تو.....

اعزاز شاہ نے ہمت کر کے ہاتھ کو سیدھا کر دیا..... ایک لمحے کو اعزاز کو جیسے کرنٹ لگا..... یوں لگا جیسے اس نے اپنا ہاتھ چھڑا ہوا۔

تم میرے دکھوں کی تفصیل میں مت جاؤ..... مت پوچھو کہ

میری رات اور نیند کے درمیان آخری ملاقات کب ہوئی

مت پوچھ کہ

میری آنکھوں اور خوابوں کے راستے میں

یہ دیوار کس نے اٹھائی

جنہیں پتھر نہیں لگتے

انہیں پھولوں سے مت چونکاؤ

اتنے سوال مت اٹھاؤ

وہ پھول سا ہاتھ ایک اجنبی ہاتھ کو محسوس کر سکتا تھا..... یہ اعزاز کی پہلی کامیابی تھی

”تشمیرہ..... بیٹے ہوش میں آؤ..... تایا جی کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

”یہ تشمیرہ ہے.....؟“ وہ حیران ہوا..... جس لڑکی کے بارے میں ریبال نے معلوم کرنے کو کہا تھا۔

”یہ تشمیرہ ہے.....؟“

”ہاں بیٹا..... یہ میری بیٹی تشمیرہ ہے.....“ تایا جی نے تشمیرہ لہجے میں کہا..... کچھ ان کے اندر ٹوٹا تھا..... وہ سمجھ نہ پائے..... فائل پڑھتے ہوئے اعزاز شاہ اس کے نام پر غور کیوں نہیں کر سکے..... وہ حیران تھے۔

(باقی آئندہ)

”اللہ! کتنا خوب صورت کنگن ہے۔“ شمس نے
 میرے ہاتھ میں جڑاؤ کنگن دیکھ کر کہا۔
 ”ہاں بکل ہی طارق روڈ سے خریدا ہے۔“
 میں نے فخریہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
 ”بہت خوب..... تمہیں تو خریداری کرنے کا بڑا
 سلیقہ ہے، اس قدر خوب صورت بناوٹ بہت کم جیولرز
 کے ہاں ہوتی ہے۔ کہاں سے لیا؟“
 ”ارے وہیں حمدانی جیولرز سے؟“ میں نے کہا۔
 میں اپنی کزن کی مہندی میں شریک تھی۔ میرے
 خوب صورت کنگن پر لوگوں کی نظریں نہ ٹھہرتی تھیں۔
 کچھ رشک، کچھ حسد سے ملی جلی نظریں مجھے اپنے اوپر
 محسوس ہو رہی تھیں۔ تب ہی کمرے کے آگے سے

ہا کنگن؟
 جے کون

ثریا منرخ



کرتے ہوئے میں نے سنا میری تندر اپنی چھوٹی بہن (یعنی میری دوسری تندر) سے کہہ رہی تھیں۔

”تو بہ ہے، بھائی کس قدر اتراتی ہیں، ذرا دیکھ تو بھلا پچاس ساٹھ ہزار کانگن خریدنے کی کیا تنگ تھی۔ وہ بھی ایسے حالات میں..... بھائی جان بھی خوب ہیں..... ان کے اللہ تلوں پر ان کو ٹوکتے بھی نہیں..... ہونہہ جو روکے غلام.....“

”ہاں باجی.....! ذرا بھی اچھا نہیں لگ رہا..... بھائی کی ڈنڈا اسی کلائیوں پر یہ خوب صورت کانگن.....“ چھوٹی تندر نے جل کر کہا۔

باہر شامیانے میں پہنچ کر بھی میں نے اس کانگن کے متعلق گفتگو سنی۔ امی میری چھوٹی بہن شہلا سے کہہ رہی تھیں۔

”دیکھو عالیہ کتنی سکھڑ ہے، ہر مہینے کوئی نہ کوئی قیمتی چیز بنا لیتی ہے۔ فضول میں پیسے برباد نہیں کرتی۔ کل کو یہ اسی کے بچوں کے کام آئیں گے۔“

”بچی امی! باجی واقعی بہت سلیقے والی ہیں۔ اور ماشاء اللہ ان کے ہاتھوں میں یہ کیسا ج رہا ہے۔ ویسے بھی آج کل یہ کانگن بہت ان ہیں۔“ شہلا کے لہجے میں بچی خوش تھی۔

رات کو تقریب سے تھکی ہاری گھر واپس آئی تو میرے ذہن میں لوگوں کی کانگن سے متعلق باتیں گونج رہی تھیں..... آف یہ کانگن جس نے بہت سوں کو حسد میں مبتلا کیا..... بہت سوں کی نظریں رشک سے اس کی طرف اٹھ رہی تھیں..... اور کئی تو اس جیسا کانگن بنوانے کے لیے اپنے، اپنے شوہروں کو مصیبت میں مبتلا کرنے والی تھیں..... اور کئی بے رخصتیاں میرے لیے بلکہ اور بھی بہت کچھ کے لیے دعا کریں گی..... مگر.....

کاش میں نے اس کانگن کو حاصل کرنے کے لیے جو کچھ کیا اس سے تو بہتر تھا کہ میں سوئیڑھ سو روپے کی کانچ کی چوڑیاں پہنے ہوتی، جو میرے قلبی سکون کے ساتھ چھٹا چھٹا جیتیں..... اور اس کے ساتھ خوشیوں اور سکون قلب کے دیے جلتے..... مگر کاش.....

چلیں میں تو آپ کو اپنی کہانی سناؤں.....
بی اے کا رزلٹ آچکا تھا..... میں بالکل فارغ تھی۔ بہت سا وقت میرے پاس تھا اور کچھ کرنے کی لگن بھی..... ایک دن یونہی اخبار کی ورق گردانی کرتے ہوئے میں نے ایک بینک کا اشتہار دیکھا۔ نہ جانے میرے دل میں کیا آئی کہ میں نے امی سے کہا۔
”امی آج کے اخبار میں بینک میں ٹرینی آفیسرز کے لیے اشتہار آیا ہے کیا ایلان کی کروں؟“

”بیٹا اچھی طرح سوچ لو، بینک کی نوکری اچھی خاصی دوسری ہے۔ پھر یہ فل ٹائم جاب ہے۔“

”امی، بڑائی کرنے میں کیا حرج ہے۔“ تھوڑی سی روکد کے بعد امی نے اجازت دے ہی دی۔ ابو کو تو ویسے بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ان کا خیال تھا نوکری مل بھی گئی تو میں چند ہی ماہ میں تھک تھکا کر چھوڑ دوں گی۔

مگر..... ابو کا خیال، خیال ہی رہا۔ میری یہ غلطی میری زندگی کا روگ بن گئی۔ مجھے نوکری بھی مل گئی اور یہ میرے لیے پیرے تسمڑ پا ہو گئی..... صرف چھ ماہ بعد ہی میں اپنے ایک ساتھی کی شریک حیات بن کر ان کے گھر آ گئی۔ زاہد ہر لحاظ سے بہترین شوہر تھے، جاں نثار کرنے والے..... شروع کے دنوں میں ان کی بے پناہ

محبت اور توجہ نے مجھے خوشیوں کے جھولے میں یوں بھلایا کہ میں سب کچھ بھول گئی..... اپنے آپ پر خود پیار آنے لگا، زندگی اتنی حسین ہو گئی..... جس کا میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ میں نے بینک سے ایک ماہ کی چھٹی لی تھی۔ میں نے یہ سوچ رکھا تھا کہ ایک ماہ کے بعد ریزائن کروں گی۔ مگر ایک ماہ بعد ہی یہ بھیاںک راز مجھ پر کھل گیا کہ زاہد کو مجھ سے زیادہ میری نوکری سے، میری تنخواہ سے محبت تھی۔

”بھئی بیٹھے بٹھائے ہماری سیلری تو ڈبل ہو گئی۔“ بڑے فخر سے وہ دوستوں سے کہتے۔ ان کے اس فخر پر میرا سرندامت سے جھک جاتا۔ میں سوچا کرتی تھی میں ہی مون سے واپسی کے بعد گھر میں بیٹھ کر زاہد کا انتظار کیا کروں گی..... شام کی چائے ان

ہائیکو

کیسے کر دار
جام اٹھا کر وعظ کرے
اچھا ہے فکر

☆☆☆

آس کی ٹوٹی کلیاں
ساجن رستہ دیکھ رہی ہیں
پیار کی سونی کلیاں

☆☆☆

موسم کی سازش
طوفانوں میں بہہ جائے
دل کی ہر خواہش

☆☆☆

جانے والا کل
ڈھونڈ رہی ہوں میں کب سے
بچپن کا ہر بل

شاعرہ: بینی احمد

کے ساتھ پیوں گی۔ ان کی مرضی کے مزے دار کھانے
بناؤں گی..... اپنے ہنسنے ہنسنے گھر میں سارا دن کام بننا
کر شام کو ہنسنے مسکراتے ان کے ساتھ سیر کیا
کروں گی..... مگر یہ نہ ہو سکا۔

ہی مون سے واپسی پر میری چھٹیاں ختم ہو چکی
تھیں..... زاہد کی مرضی کے مطابق میں مہندی لگے
ہاتھوں سے ڈیپٹ کر ڈیپٹ کے واؤز چر سنبھالنے اور
لیجرز بیلنس کرنے لگی۔ اور اسی طرح پورا پہلا سال گزر
گیا۔ چھٹی کا دن گھر کے اور اپنے ذاتی ہزاروں کام
بنانے میں ختم ہو جاتا۔ یہ دن بھی جلد ہی بیت گئے۔
مصروفیت تو تھی مگر پھر بھی بیچ ہو ہی جاتا۔

سال کے آخر میں نے زاہد کو ننھے مہمان کے
آنے کی خوشخبری سنائی..... اس امید کے ساتھ کہ وہ تو
سننے ہی جھوم اٹھیں گے۔ ہماری محبت کی نشانی جو دنیا
میں آنے والی ہے..... مگر..... ”یہ خوشخبری“ سننے ہی
زاہد بچھ سے گئے۔

”ایسی بھی کیا جلدی تھی..... جانم! کیا تم کو واقعی
ایک بچے کی خواہش تھی.....؟ ہم نے تو ابھی اتنی جلدی
بچہ پلان نہیں کرنا تھا۔“ میں جو اس توقع میں تھی کہ
شاید زاہد اس خبر کو اسی طرح سے محسوس کریں گے جیسے
کہ دنیا کا تقریباً ہر شوہر پہلی دفعہ اپنے باپ بننے کی
خوشخبری سنتا ہے۔

”کیسا شخص ہے یہ؟“ میں نے دکھ سے سوچا.....
سال بھر گزرنے کے بعد بھی اسے یہ سب جلدی لگ رہا
ہے۔ اور واقعی یہ ان کے لیے جلدی ہی تھی۔ آٹھواں مہینہ
لگتے ہی انہوں نے آیا کی فکر شروع کر دی۔

”یا اللہ..... کیا بچہ ہونے کے بعد بھی.....؟“
مجھے اس بات سے شروع ہی سے چڑھتی کہ بچہ ماں کے
شفیق ہاتھوں کے بجائے اجنبی گود میں ملے۔ میں تو
ثانی، دادی سے بھی بچے پلانے کے حق میں نہیں تھی کہ
بچے کی شخصیت پر اثر پڑتا ہے مگر حکم حاکم مرگ
مغا جات..... ان کا حکم کیسے ٹالا جاسکتا تھا۔ کیونکہ واضح
پیغام مجھے مل چکا تھا کہ دوسری صورت میں علیحدگی

..... جسے نہ میں قبول کر سکتی تھی۔ نہ میرے ماں، باپ
اور نہ ہی معاشرہ.....

”تو عالیہ بی بی! صبر کرو..... نوکری کرو..... بچے پالو.....“
معمول کی نوے دن کی چھٹیاں پلک جھپکتے گزر
گئیں..... بلال اب مجھ سے خاصا مانوس ہو چکا تھا۔
ایک ماہ سے آیا بھی میرے ساتھ بچے کی دیکھ بھال
کرتی رہی تھی۔

پھر وہ دن بھی آ گیا۔ جب مجھے ڈیوٹی جوائن کرنا
تھی۔ آج بلال کو چھوڑ کر جانا تھا۔ پورا ایک طویل
دن..... آٹھ بجے سے پانچ بجے تک..... خیر اللہ مالک
ہے۔ اب جانا تو تھا ہی.....

سارا دن دفتر میں بلال کی معنوی صورت آنکھوں
میں رہی۔ ہاتھیں دوپہر کو سویا کہ نہیں..... آیا نے ٹھیک
سے نہلایا ہو گا یا صرف اچانک کیا ہو گا۔ کہیں دوا پلا کر سلا

ہی نہیں دیا ہو..... دو تین دفعہ گھرفون کر کے پوچھنے کے باوجود بھی میرا دل مطمئن نہیں ہوا۔

”کیا بات ہے مسز زاہد؟“ انچارج صاحب نے میرے سامنے داؤد چڑ کیا۔ ”1900 کو 9100 لکھ دیا۔“

”I am sorry sir“ میں نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا..... پھر دو، تین اور غلطیاں کر بیٹھی..... میری اتنے دن کی سروس میں مجھے ایک بار بھی سوری نہیں کرنا پڑا تھا۔ پھر تو روز بیبی ہونے لگا..... پہلے جو میں سارے کام نہایت ہی خوش اسلوبی سے کرتی..... مستقل انچارج صاحب کے غضب کا نشانہ بننے لگی کہ کام سے دھیان بھی بار، بار ہٹ جاتا اور کام صحیح نہ ہو پاتا..... کبھی کوئی انٹری غلط ہو جاتی کبھی بیلنسنگ میں..... نظر بد ہو جاتی..... یہ سب بہت تکلیف دہ تھا۔

ایک دن بلال کو بخار تھا..... کافی تیز بخار میں بچہ ساری رات بے چین رہا..... مگر مجھے صبح دفتر جانا ضروری تھا کہ کلوزنگ کے دن تھے اور چھٹی کا کوئی سوال ہی نہیں تھا..... میں مرنے کی قسم کھاتی دفتر چلی گئی۔

دن پر لگا کر گزرتے رہے..... بلال بڑا ہو گیا..... جیسے تیسے نوکری اور گھر داری چل رہی تھی..... میں دوستیوں میں پاؤں رکھے ڈمگ رہی تھی۔ ”امی مت جائیں..... امی آج میرے پاس رک جائیں۔“ اب بلال اکثر ضد کرتا..... ایسے میں، میں اپنے دکھ کو چھپا کر آیا پر غصہ کرتی۔

”اسے لے جاؤ..... باہر لے جا کر بہلاؤ.....“ آیا اپنے طور پر بہلانے کی کوشش کرتی..... مگر کیا کوئی بھی محبت کرنے والا ماں جیسی محبت کر سکتا ہے؟ میرا معصوم بچہ مجھے گھر میں نہ پا کر کیسے ٹوٹ کر روتا ہوگا؟

دن بھر میری جدائی کا خراج وہ یوں وصول کرتا کہ دفتر سے واپسی پر پورے وقت میری گود میں گھسا رہتا۔ ہر کام امی کریں..... پانی امی پلائیں، کپڑے امی بدلیں، کھانا امی سے کھاؤں گا۔ میں مشین بن گئی گھن چکر.....

گھر، بچے کی ذمے داری اور دفتر کی ذمے

داریاں..... ایسا لگتا کہ جیسے کسی لٹوکو زور سے گھما کر چھوڑ دو تو وہ گھومتا رہتا ہے ایسے ہی میں گھومے جارہی تھی..... بھاگے جارہی..... اپنی خواہش کے برعکس..... اسے میں زاہد کے خعرے۔

”اللہ توبہ..... عالیہ! تمہیں کیا ہو گیا ہے۔“ وہ کہتے۔ ”دیکھو تو تم اپنا بالکل خیال نہیں رکھتیں..... پال روکھے..... بد حالیہ ہوتی جارہی ہو، کپڑوں کا بھی خیال نہیں کرتیں..... دیکھو آفس میں سب کس طرح سے آتے ہیں، پہلے کی طرح کیوں نہیں رہتیں..... میری بھی پروا نہیں ہے تمہیں.....“ وغیرہ، وغیرہ.....

”باجی کے بچوں کی سالگرہ ہے، جلدی تیار ہونا، ہمیں جلدی جانا ہے مسٹر خان کے یہاں پارٹی میں دیکھا تھا۔ ساری عورتیں کس طرح ڈریس اپ تھیں، کتنی فریش لگ رہی تھیں۔ ایک تم تھیں، یار میک اپ تو ڈھنگ سے کر لیا کرو۔ یہ تمہارے ہاتھ، انہیں کیا ہوا..... ان پر توجہ کیوں نہیں دیتیں۔ آج رات کلب میں مشاعرہ ہے، چلو گی؟“ یہ وہ سنہرے جملے تھے جو وقتاً فوقتاً مجھے سننے کو ملتے..... اس وقت دل چاہتا کہ دیوار سے سر پھوڑ لوں..... سارا دن بینک میں انچارج صاحب کا شاعرانہ کلام (ڈانٹ) اور رات کو بلال میاں کی شاعری (ضدیں) سننے کے بعد کون سی تفریح کی گنجائش رہ جاتی تھی۔

پھر یہ کہ..... ”تم تو بڑی بور ہوتی جارہی ہو یار.....“ چہرے کا روپ بگاڑ کر..... زلفوں کے پیچ و خم کو چھوڑ چھاڑ کر یا بھلا کر میں تھکی تھکائی بزدل عورت یہ بھی..... تو نہیں کہہ سکتی تھی کہ میرا رنگ و روپ کیوں کھلایا..... میری بزلہ سخی کہاں ہو گئی۔

دن رات کی محنت، ہر طرح سے تکلیف دہ حالات سے گزرنے کے بعد اگر کبھی بکھار تو پی خوشی کے لیے لیکن یا کوئی زیور اپنے ہی پیسوں سے خرید کر پہن لیا جائے تو لوگوں کی یہ باتیں.....

کیا واقعی یہ لیکن مجھے بہت، بہت مہنگا نہیں پڑا؟



بات اتنی بڑی نہیں تھی جتنا ردِ عمل شدید تھا۔ وہ اپنی بات کے اختتام پر اپنے محبوب شوہر (فواد) کو ساکت و جامد بیٹھا دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ اس کے شوہر کا چہرہ غصے کی زیادتی سے سرخ ہو گیا تھا۔ یہ اس کے تاثرات نہیں تھے جنہوں نے آئمہ کو حیران کیا تھا بلکہ یہ اس کی آنکھوں میں اترتا سرد سا تاثر اور اس کی اجنبیت تھی جس نے آئمہ کو مخمد کیا تھا۔ فواد لحوں

میں پرکاشہ لگے اگا تھا اور سب نے اس کی آنکھوں میں یقین و اعتماد کی لمحہ بہ لمحہ مساس ہو لی تھی۔ اٹھ کر دیا تھا۔ آئمہ کے لیے اپنے قدموں پر لہا رہنا محال ہو گیا تھا۔ وہ بے دم سی ہو کر بستر پر گر گئی تھی۔ وہ اس کے کسی بھی تاثر کو دیکھتا نہیں چاہتی تھی لیکن اس کے اگلے جملے نے آئمہ کو دوبارہ نگاہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔

چھٹی جودھندہ

امیس جبار



”تم، تم اتنی چھوٹی سوچ رکھتی ہو..... اتنا تنگ ہے تمہارا دل، میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔“ دکھ، تاسف، بے یقینی کیا نہیں تھا فواد کے لہجے میں..... آئمہ اس کے تاثرات پڑھ چکی تھی لیکن پھر بھی فواد کے ان الفاظ نے اسے پہلے سے زیادہ تکلیف دی تھی۔ ”میں تمہیں بہت اگک سمجھتا تھا، مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم اتنی چھوٹی سوچ رکھتی ہو۔“ فواد اب بھی یقین کرنے میں متامل تھا جو اس نے سنا وہ آئمہ کیسے کہہ سکتی ہے، کیا واقعی اس کی آئمہ ایسا کہہ سکتی ہے۔ وہ صدمے کی کیفیت میں تھا۔ آئمہ کو اس سے اتنے شدید رد عمل کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ وہ فواد سے بڑھ کر شاک میں مبتلا تھی۔

دونوں نے ایک دوسرے کی خامی کو دیکھا تھا اور دونوں ہی بے یقین تھے۔ انسان فرشتہ نہیں ہوتا، وہ خطا کا پتلا ہوتا ہے، دونوں ہی اس بات کو بھلا بیٹھے تھے۔ ”تم نے جو کہا ہے اس کا وہی مطلب ہے یا میں غلط سمجھ رہا ہوں۔“ وہ یقین اور بے یقینی کے درمیان ڈولتا پھر سے تصدیق چاہ رہا تھا۔ فواد کا لہجہ ایسا آس بھرا تھا کہ لمحہ بھر کے لیے آئمہ شرمندگی کی دلدل میں خود کو اترتا محسوس کر رہی تھی۔ اسے لگا جیسے اس سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا ہو لیکن اگلے پل ہی کسی مہکتی سوچ نے شرمندگی کے احساس کو زائل کر دیا تھا۔ وہ جسے فواد اس کی چھوٹی سوچ کہہ رہا تھا، وہ ہرگز اس کی چھوٹی سوچ نہیں تھی۔ اس بات کے حق میں آئمہ کے پاس دلائل تھے۔ وہ دلائل جن کے بعد کسی پس و پیش کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ لیکن وہ اس کی بات مستجابھی تو..... اس سوچ نے آئمہ کے اعتماد کو واپس لوٹا دیا تھا۔ اس کے سفید پڑتے چہرے پر اچانک ہی اترتے سکون کے رنگ فواد کو چونکا گئے تھے۔

”میں نے ایسا کچھ نہیں کہا جس پر آپ یوں ری ایکٹ کریں۔“ اب کے وہ بولی تو اس کے لہجے میں ہمیشہ والا ٹھہراؤ تھا۔ ”میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی کہ آپ کو تاسف اور شرمندگی ہو اس یقین پر جو آپ مجھ پر کرتے ہیں۔“ آئمہ کے غم لہجے میں کئی شکوے مچلے

تھے۔ اس کی بات نے فواد کو بری طرح مشتعل کیا تھا۔ ”تم میرے اور میرے رشتے داروں کے درمیان دراڑیں ڈال رہی ہو، تمہیں ان کا یہاں آنا، میرا ان سے ہنسنا بولنا برا لگتا ہے۔ تم مجھے میری قبلی سے بدگمان کرنے کی کوشش کر رہی ہو، تم مجھے ان سے دور کر رہی ہو اور تمہارے نزدیک یہ کوئی غلط بات ہی نہیں؟“ فواد کی آواز غصے سے اونچی ہو گئی تھی۔

”فواد آپ غلط بات کر رہے ہیں، میں ایسی کوئی کوشش نہیں کر رہی۔“ آئمہ نے بے ساختہ اسے ٹوک کر صفائی دینے کی کوشش کی تھی۔

”تم.....!“ فواد اس کے جھوٹ بولنے پر ہکا بکا ہوا تھا۔ ”تم میرے منہ پر جھوٹ بول رہی ہو۔“ اسے مزید غصہ آیا تھا۔

”آپ میری بات کو غلط رنگ دے رہے ہیں، ایک بار میری بات محل سے سن تو لیں۔“ آئمہ نے نرم لہجہ اختیار کیا۔

”تمہیں کیا لگتا ہے، میں بہرہ ہوں یا پھر اندھا..... تمہاری بیزاری، تمہاری اکتاہٹ مجھے نظر نہیں آتی کیا؟“ فواد کا لہجہ خاصا سرد تھا۔

آئمہ کو اب رونا آنے لگا تھا۔ اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا کہ بات اتنی سنگین رخ اختیار کر جائے گی۔ فواد کی بدگمانی اسے سخت تکلیف دے رہی تھی۔ فواد نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بے بسی سے اپنا سر تھا تھا۔ آئمہ نے آگے بڑھ کر بے اختیار ہی اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تھا۔ وہ بہت سنجیدگی سے اسے دیکھنے لگا تھا۔

”آئمہ میں بہت چھوٹا سا تھا جب میرے ماں باپ فوت ہو گئے تھے۔ بہن، بھائی کوئی تھا نہیں..... یہی رشتے تھے جنہوں نے مجھے پیار دیا، اتنا پیار کہ مجھے ماں، باپ کی کمی تک محسوس نہیں ہونے دی۔ میرے کزنز نے مجھے بھی اکیلا نہیں چھوڑا۔ آج جو میں تمہارے سامنے کامیاب انسان کے طور پر موجود ہوں تو صرف ان سب کی وجہ سے، ان لوگوں نے میرے بچپن کو مسخ ہونے سے بچایا ہے۔ اور آج تم ان سب

کردوں کہ میری بیوی کو عادت نہیں ہے اور وہ پسند نہیں کرتی کسی کا آنا جانا۔“ فواد کا لہجہ کافی روکھا تھا۔

”آپ میری بات کو پھر غلط رنگ دے رہے ہیں۔“ آئمہ نے افسوس سے اپنے شوہر کو دیکھا۔ ہر بات تحمل سے سننے والا اس موضوع کے شروع ہوتے ہی بھڑک اٹھتا تھا۔

”میں غلط رنگ نہیں دے رہا۔ تم مجھے اپنے لفظوں کے جال میں الجھا رہی ہو۔ بات گھما پھرا کر دیا صاف مفہوم تو ایک ہی نکلتا ہے ناں کہ تمہیں ان کا آنا جانا پسند نہیں۔“ وہ تنفر سے اسے دیکھتا کھڑا ہوا تھا۔

”فواد پلیز.....“ آئمہ کو اس کے سامنے سخت بے بسی محسوس ہو رہی تھی۔

”اگر کوئی تمہاری وجہ سے ہرٹ ہوا یا تمہارے نادور خیالات ان تک پہنچے اور تمہاری وجہ سے ان کے اور میرے درمیان کوئی دوری پیدا ہوئی تو تم یاد رکھنا مجھے بھی کھودو گی۔“ وہ دروازے کی طرف جاتے جاتے واپس اس کی طرف پلٹا تھا، سردی نظر ڈال کر وہ کمرے سے نکل گیا تھا۔ آنسو جو آئمہ کی آنکھوں سے گرنے کو بے تاب تھے اس کے جاتے ہی بہہ نکلے تھے۔

☆☆☆

ان کی اس بحث کو ایک مہینہ ہو چکا تھا، آج پھوپھو اپنے بیٹے حماد کے ساتھ آئی تھیں۔ وہ محسن میں رکھے تخت پر بیٹھی تھیں، فواد اور حماد بھی پاس ہی بیٹھے کسی بات پر ہنس رہے تھے۔ ان کو دیکھتے ہی شرمندگی کے احساس نے آئمہ کو اپنی گرفت میں لیا تھا۔ سلیقے سے اوڑھی چادر کو اس نے غیر محسوس انداز میں پھر سے درست کیا۔ فواد نے آئمہ کے سپاٹ انداز کو محسوس کر لیا تھا۔ اسے آئمہ پر سخت غصہ آیا تھا۔ پھوپھو سے گلے ملتی آئمہ کو اس نے لب بچھینچ کر بہت تنفر سے دیکھا تھا۔

”میکے میں کچھ دن رہ آتیں آئمہ، تمہارے ای، ابو کیا کہیں گے کہ ہم نے تمام ذمے داری تمہارے سر پر ڈال دی ہے۔“ پھوپھو بہت محبت سے کہہ رہی تھیں۔

”جی پھوپھو، چکر لگاؤں گی کسی دن۔“ آئمہ کا دل

کے گھر میں داخلے پر پابندی لگانا چاہتی ہو..... مجھے ان رشتوں سے دور کرنا چاہتی ہو جن کے بغیر میں جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ تعجب ہے مہینوں کی رفاقت کے بدلے تم اتنی سالوں کی محبت کی قربانی مانگ رہی ہو۔“ اس کا کاٹ دار لہجہ تاسف میں ڈوبا ہوا تھا۔

”مجھے آپ سے منسلک ہر رشتہ بے حد عزیز ہے۔“ اس نے اپنی پوزیشن کلیئر کرنا چاہی۔ ”میں ان سب سے بے حد محبت کرتی ہوں جن کی وجہ سے اتنا اچھا شخص آج میرا نصیب بنا۔ میں اللہ کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے کہ اس نے مجھے اتنے پیارے رشتوں کی دولت سے مالا مال کر دیا ہے۔“ احساسِ تشکر آئمہ کی آنکھوں میں نمی بن کر پھیلنے لگا۔ فواد چند بل کے لیے اس کے سادہ اور بے ریا چہرے سے نظریں نہیں اٹھا پایا تھا۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں فواد، میرا یقین کریں۔“ اسے یوں اپنی طرف دیکھتا پا کر آئمہ نے اسے یقین دلانے کی سعی کی۔

”تو کیا تھوڑی دیر پہلے کوئی تمہاری ہم شکل تھی یا کوئی روح جو یہ سب کہہ رہی تھی۔“ وہ سخت جھنجھلاہٹ کا شکار ہونے لگا۔

”وہ بھی میں ہی کہہ رہی تھی۔“ آئمہ کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ چمکی۔

”آئمہ تم صاف، صاف بات کیوں نہیں کرتیں۔“ فواد کے ماتھے پر ناگوار سلوٹیں ابھر آئی تھیں۔

”صاف بات آپ کو پسند نہیں آتی اور مبہم بات آپ سمجھ نہیں پاتے۔“ آئمہ نے افسردگی بھری ایک گہری سانس لی۔

”پلیز اپنے لفظوں میں مت الجھاؤ مجھے۔“ فواد نے سخت اکتائے ہوئے لہجے میں ہاتھ اٹھا کر اسے ٹوکا۔

”اگر تحمل سے سنیں تو بات صرف اتنی سی ہے فواد کہ میں کسی بھی وقت ان کے یوں آنے جانے سے ان ایزی فیل کرتی ہوں..... میرا مطلب ہے کہ.....“ فواد کے تاثرات اچھے ہو گئے تھے کہ آئمہ کے لیے جملہ مکمل کرنا دو بھر ہو گیا۔

”یعنی میں سب کو یہاں آنے جانے سے منع

چاہا کہ وہ پھوٹ، پھوٹ کر رو دے، اس نے بہ مشکل نو دو کو کمپوز کیا تھا۔

”آج چھٹی تھی، آج چلی جاتی ناں.....“ پھپھو کو خیال آیا تھا۔ فواد نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ رات انہوں نے ایسا ہی تو پروگرام بنایا تھا۔ جس پر عمل کرنا پھپھو کے آنے کی وجہ سے اب ممکن نہیں رہا تھا۔ اور ایسا پہلی بار تو نہیں ہوا تھا، کئی دنوں سے یہی تو ہو رہا تھا۔ فواد کے کسی نہ کسی فیملی ممبر کی آمد روزانہ ہی ان کے پروگرام کو ملتوی کرنے کا باعث بن رہی تھی۔

فواد نے اس بات کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا تھا۔ نہ ہی آئمہ نے اسے کچھ کہا تھا۔ لیکن اس پل آئمہ کی آنکھوں میں محنت آنسو دیکھ کر اسے خود پر غصہ بھی آیا تھا۔ اور شرمندگی بھی محسوس ہو رہی تھی۔

”پھپھو آپ کے لیے کیا بناؤں.....؟“ آئمہ نے اٹھتے ہوئے ان سے ان کی فرمائش پوچھی تھی۔

”کچھ بھی بنا لو، تم جو بھی بناؤ سب اچھا ہی ہوتا ہے۔“ پھپھو کے لہجے میں آئمہ کے لیے محبت تھی۔ فواد کا دل دکھ سے بھر گیا تھا۔ وہ سب اتنی محبت کرتے تھے اور آئمہ..... ان کے آنے پر ناخوش ہوتی تھی۔ وہ..... بے اختیار ہی اپنی جگہ سے کھڑا ہوا تھا۔

”آؤ چاچو کی طرف ہو کر آتے ہیں؟ اس نے حماد کو بھی اٹھنے کا اشارہ کیا۔ ان سب کے گھر ایک ہی لائن میں تھے۔ مین گیٹ سے کم ہی جاتے تھے۔ وہ دونوں بھی باتیں کرتے لائن کی طرف نکل گئے تھے۔

☆☆☆

دن یوں ہی بے کیف اور بے پناہ معروف گزر رہے تھے۔ فواد اب تک اس سے خفا تھا۔ خود سے بات بھی نہیں کرتا تھا، اگر وہ بات کرنے کی کوشش کرتی تو وہ محض ہوں، ہاں میں جواب دے دیتا۔ رات اماں سے بات کرتے اس کا دل بھر آیا تھا۔ اس کا دل چاہا تھا کہ پھوٹ، پھوٹ کر رونا شروع کر دے۔ وہ ایسا ضرور کرتی اگر فواد وہاں موجود نہیں ہوتا۔ اماں اس کے نہ آنے پر سخت خفا ہو رہی تھیں۔ باقی سب اتنے خفا تھے کہ ناراضی

کے اظہار کے طور پر اس سے بات بھی نہیں کی تھی۔ ”فواد کی کچھ مصروفیات تھیں اماں اب انشاء اللہ دو تین دن میں چکر لگائیں گے۔“ اس نے ماں کی غلطی کم کرنا چاہی تھی۔

”تم پریشان نہیں ہونا میری بیٹی..... اللہ سب بہتر کرے گا۔ تم دل مت چھوٹا کرنا۔“ اماں کو اندازہ تھا کہ اسے ایڈجسٹ کرنے میں کتنی مشکل ہو رہی ہے تبھی اسے سمجھانے لگی تھیں۔

”جی اماں.....“ اس سے زیادہ وہ کچھ اور نہیں کہہ سکی تھی۔ اماں سے مزید کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد اس نے فون بند کر دیا تھا۔

☆☆☆

صبح فواد نے آفس سے چھٹی کی تھی۔ وہ آنا آئمہ کو اس کے میکے لے کر جا رہا تھا۔ آئمہ نے اس سے معافی مانگ لی تھی اور فواد کا غصہ بھی کم ہو گیا تھا۔ وہ اپنے غصے کا ازالہ کرنا چاہتا تھا آج آفس سے چھٹی کر کے اسے میکے لے جانا بھی اسی وجہ سے تھا۔ آئمہ نے فون کر کے اماں کو اپنے آنے کا بتا دیا تھا۔ فواد گاڑی پارک کر کے آیا تب تک آئمہ گیٹ کے باہر ہی کھڑی تھی۔

”کیا ہوا.....؟“ فواد نے اسے یوں کھڑے دیکھ کر حیرت سے پوچھا تھا۔

”بیل دی ہے اب کوئی آئے گا تو ہی اندر چلیں گے ناں.....“ سادگی سے جواب دیتے اس نے دوبارہ بیل پر ہاتھ رکھا تھا۔ فواد نے حیرت سے اودھ کھلے گیٹ کو دیکھا اور پھر آئمہ کو..... آئمہ اور اس کی فیملی کی اکثر عادات اسے یوں ہی حیران کرتی تھیں۔ ان سب کا رویہ ایک دوسرے کے ساتھ بھی اسے بہت لیے دیے والا لگتا تھا۔ ان کے اپنے گھر میں جس طرح ایک دوسرے کے گھر بے تکلفی سے آنا جانا تھا ایسے میں آئمہ کا گیٹ کھلا ہونے کے باوجود اپنے ہی گھر کے باہر کھڑے رہنا اسے بہت عجیب لگا تھا۔ آئمہ کے والد گیٹ پر آئے تھے اور انہیں دیکھ کر بہت پُر جوش انداز میں ان کا استقبال کیا

جانے کے لیے اس نے کبھی درمیان والا رستہ استعمال نہیں کیا تھا۔ سب کے ٹوکنے پر بھی اس نے اپنی اس عادت کو ترک نہیں کیا تھا۔ فواد کو اس کا انداز تکلف سے بھرا لگا کرتا تھا لیکن اس وقت نٹ کھٹ اور پیارا سا حارث اسے بہت ہی اچھا اور بہت مہذب لگا تھا۔

”آپ کو کس نے بتایا کہ کسی کے روم میں جانے سے پہلے ناک کرتے ہیں.....“ عبید بھائی فون سننے میں مصروف باہر نکلے تھے۔ بھی فواد نے بے اختیار اس سے پوچھا تھا۔

”دادو نے اور ماما بھی کہتی ہیں کہ کسی کے روم میں جانے سے پہلے ناک ضرور کرنا چاہیے کیونکہ اگر کسی کو ہماری وجہ سے تکلیف ہو تو اللہ تعالیٰ بہت ناراض ہو جاتے ہیں۔“ حارث نے بہت معصومیت سے جواب دیا تھا۔

”پچھو اگر آپ نے کوئی تکلیف دی تو اللہ تعالیٰ آپ سے بہت ناراض ہوں گے انکل.....“ حارث نے اسے جیسے دریا یا تھا۔ فواد اس کی بات سن کر ہکا بکا رہ گیا تھا۔

”آپ سے کس نے کہا کہ میں آپ کی پچھو کو تکلیف دیتا ہوں۔“ وہ بہ مشکل بولا تھا۔

”کسی نے بھی نہیں مجھے خود لگا..... وہ پچھو رو رہی تھیں ناں تو دادو انہیں کہہ رہی تھیں کہ صبر کریں۔ جب اللہ تعالیٰ کوئی تکلیف دے تو صبر کرنا چاہیے۔“ وہ بہت سنجیدگی سے فواد کو دادو کے سنہرے اقوال سنارہا تھا۔

فواد کے اندر اچانک غصے کی لہر دوڑ گئی تھی۔ حارث کی بات کی تصدیق دروازہ کھلا دیکھ کر اندر آتی آئمہ کے تاثرات نے کردی تھی۔ اس کا چہرہ سفید پڑا تھا۔ اس کی آنکھوں کی سرخی مزید کسی سوال کی متجاش نہیں چھوڑتی تھی۔ آئمہ اس کے تاثرات دیکھ کر ڈر کر اپنی جگہ کھڑی رہ گئی تھی۔

وہ ایک نظر اس پر ڈال کر تیزی سے کمرے سے نکل گیا تھا۔ کیا نہیں تھا اس ایک نظر میں۔ ایک سردی لہر اس کے پورے جسم میں دوڑ گئی تھی۔ وہ کچھ دیر بعد تیزی سے فواد کے پیچھے آئی تھی۔ وہ نیچے کھڑا اماں،

تھا۔ وہ دونوں ان سے باتیں کرتے اندر آئے تھے۔ پل لمبر میں سارا گھر ان کے گرد جمع ہو گیا تھا۔

تب ہی زوار اور عبید بھائی اندر داخل ہوئے تھے۔

”آج آپ دونوں نے آفس سے باجماعت چمٹی کیوں کی ہے؟“ آئمہ نے دونوں کو پھینچا تھا۔

”جس وجہ سے فواد نے کی ہے۔ اسی وجہ سے ہم نے بھی کی ہے۔“ عبید بھائی نے ان سے ملتے ہوئے مزے سے جواب دیا تھا۔

”یعنی آپ بھی اپنی بیویوں کو لے کر ان کے میکے ہارے ہیں؟“ آئمہ کی بات پر سب کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ فواد کو حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔

”کسی کے بارے میں فوراً گمان کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔“ سب کے کھلکھلاتے چہرے دیکھ کر اس نے سوچا تھا۔ وہ پہلی بار آئمہ کی فیملی کے ساتھ اتنا وقت گزار رہا تھا۔ وہ جو سوچ رہا تھا کہ وہ بہت فائل سے ہیں اور آپس میں بھی لیے دیے سے رہتے ہیں تو ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ آئمہ کی دونوں بھیمیاں ان ادلوں بہنوں کے ساتھ ہنسی مسکراتی بالکل سکی بہنیں لگ رہی تھیں۔ ان سب کے اصرار پر انہیں رات کے کھانے تک رکنہ پڑا تھا۔

وہ عبید بھائی کے کمرے میں ان کے کمپیوٹر کا لالٹ ٹھیک کرنے میں مصروف تھا جیسی دروازہ آہستہ سے بجایا گیا۔ عبید بھائی، اس سے باتوں میں مصروف تھے جیسی متوجہ نہیں ہوئے تھے۔ اگلی بار دروازہ قدرے دور سے بجایا گیا تھا۔

”آ جاؤ بھی.....“ عبید بھائی نے گفتگو روک کر کہا تھا۔ اجازت ملنے پر دروازہ کھول کر اندر آنے والے عبید بھائی کے سات سالہ بیٹے کو دیکھ کر فواد کے کی لارڈ پر تیزی سے چلتے ہاتھ ساکت ہوئے تھے۔ ایک مہونے سے بچے کا (دستک دینا) ناک کر کے اپنے والدین کے کمرے میں آنا اور اجازت ملنے تک انتظار کرنا، فواد کو یہ سب بہت حیران کن لگا تھا۔

اسے یاد آیا آئمہ بھی تو ایسے ہی کرتی تھی، آنے

ابا اور باقی سب سے جانے کی اجازت طلب کر رہا تھا۔ وہ سب اس کے بدلے تاثرات دیکھ کر پریشان ہو گئے تھے۔ وہ ضروری کام کا کہتے ہوئے جانے پر اصرار کر رہا تھا۔ مجبوراً سب کو اجازت دینا پڑی تھی۔ وہ زوار کے ساتھ لاؤنج سے نکل گیا تھا۔ اماں کے اشارے پر وہ بھی اپنا پرس اور چادر اٹھا کر سب کو خدا حافظ کہتی تیزی سے اس کے پیچھے بھاگی تھی۔ زوار بھائی اس کے ساتھ نہ ہوتے تو وہ یقیناً اسے چھوڑ کر جا چکا ہوتا۔ وہ اسے ساتھ لے کر جانے کے موڈ ہی میں ہی نظر نہیں آ رہا تھا۔ آئمہ اس کے تاثرات دیکھ کر پریشان ہو رہی تھی۔

”تم رکنا چاہو تو رک سکتی ہو۔“ فواد چاہتے ہوئے بھی اپنے تاثرات کو نارل نہیں رکھ پایا تھا۔ ”نہیں، میں ساتھ ہی چلوں گی۔“ وہ مدہم لہجے میں کہتی بھائی سے مل کر گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد بھی فواد کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ گاڑی کے مین روڈ پر آتے ہی آئمہ نے اس خاموشی کو توڑنے کی کوشش کی۔

”آپ ناراض ہیں مجھ سے؟“

”جسٹ شٹ اپ! میں تمہاری آواز تک سننا نہیں چاہتا۔“ وہ چلایا نہیں تھا لیکن اس کے لفظوں نے آئمہ کو گویا خنجر کر دیا تھا۔ وہ ہلکے تھک جھپکنا بھول گئی تھی۔ بات اتنی معمولی نہیں تھی جتنی وہ سمجھ رہی تھی۔ اس نے پہلی بار فواد کو یوں اندھا دھند ڈرائیونگ کرتے دیکھا تھا۔ وہ چاہنے کے باوجود اسے دوبارہ مخاطب نہیں کر سکی تھی۔

گھر آنے کے بعد وہ سپدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہ کتنی دیر یوں ہی لاؤنج میں کھڑی رہی تھی پھر کچھ سوچ کر اس نے بھی اپنے قدم کمرے کی جانب بڑھائے تھے۔ وہ صوفے پر بیٹھا پانی پی رہا تھا۔ وہ اس کے قریب بیٹھی تو وہ فوراً ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”فواد میری بات تو سنیں۔“ آئمہ نے

باعتیار اس کا بازو دھما دھما جیسے اس نے بے دردی سے

جھٹک دیا تھا۔

”آپ کو ہوا کیا ہے فواد؟“ وہ ایک دم ہی ہلکے پڑی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ فواد سے اپنی وجہ سے ہلکے روتے دیکھ رہا تھا۔ اسے تکلیف ہوئی تھی لیکن صرف ایک لمحے کے لیے..... اس کے رونے نے اسے حرا مشتعل کر دیا تھا۔

”تم ان آنسوؤں کے ذریعے مجھے ایمو مثل بلکہ کرنے کی کوشش مت کرو۔“

”آپ کو آخر ہوا کیا ہے کچھ تو بتائیں؟“ وہ بہت بے بسی سے التجا کر رہی تھی۔

”تمہارا اصل چہرہ سامنے آ رہا ہے اور کچھ نہیں مجھے۔“ غصے سے کہہ کر وہ ہاں رکائیں تھا۔ آئمہ کے لیے اس کے الفاظ بہت تکلیف دہ تھے۔ یہ سب اس کے ساتھ کیوں ہو رہا تھا وہ وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ وہ رات اس نے یوں ہی کمرے میں روتے تڑپتے گزاری تھی اور فواد نے اسٹڈی میں سگریٹ پھونکتے.....

☆☆☆

ان کے تعلقات میں ایک سرد مہری سی آگئی تھی۔ فواد اس کی طرف سے لاطعلق سا ہو گیا تھا۔ وہ جتنا اس سے بات کرنے کی کوشش کرتی، وہ اتنا ہی اسے انکور کرتا..... وہ ہر وقت مرجھائی سی رہنے لگی تھی۔

وہ اسے سزا دے رہا تھا وہ جانتی تھی لیکن کس بات کی سزا دے رہا تھا یہ بات وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ وہ پھر بھی سزا کاٹ رہی تھی۔ ان کے رشتے میں پڑنے والی اس دراڑ کو سب نے ہی محسوس کیا تھا۔

”تمہارے اور بھابی کے درمیان کیا چل رہا ہے؟“ ایک دن حماد نے اسے آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ وہ اور حماد کزن ہونے کے ساتھ، ساتھ بہترین دوست بھی تھے لیکن وہ آئمہ کے بارے میں حماد سے کوئی بات کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ حماد کو بھی اس کی پس و پیش سے اندازہ ہو گیا تھا۔

”تم نہیں بتانا چاہتے تو اور بات ہے لیکن تمہارے اور بھابی کے تعلقات ٹھیک نہیں چل رہے، یہ

بات اتنا ہی اسے غصہ دلاتی۔

وہ شدت پسند تھا محبت میں بھی اور نفرت میں بھی..... وہ بار، بار کوشش کے باوجود بھی اپنا دل آئمہ کی طرف سے صاف نہیں کر پاتا تھا۔

رات وہ بہت دیر سے گھر آیا تھا۔ آئمہ اس کے انتظار میں لاؤنج میں ہی بیٹھی تھی۔

”میں کھانا لگا رہی ہوں، آپ فریش ہو کر آجائیں۔“ فواد کے بیکر نظر انداز کرنے کے باوجود وہ اس کے پیچھے کمرے میں چلی آئی۔ وہ سنی ان سنی کرتے جھک کر اپنے جوتے اتارنے لگا تھا۔

”فواد ایسا آخر کب تک چلے گا؟ آپ ایک دفعہ تحمل سے میری بات سن تولیں۔“ آئمہ کی آواز بھرا گئی تھی۔ کئی دنوں سے وہ جس ذہنی اذیت سے گزر رہی تھی اس نے اس نے تھکا دیا تھا۔

”آپ میری بات نہیں سننا چاہتے تو کم از کم مجھے معاف کر دیں۔ میری پہلی بھول سمجھ کر پلیز فواد.....“ دنیا کا سب سے مشکل کام اپنے ناکردہ گناہوں کی معافی مانگنا ہے۔ انسان کو سب سے زیادہ تکلیف اس وقت ہوتی ہے جب وہ دوسروں کے سامنے محض ان کی انا کا جھنڈا سر بلند کرنے کی خاطر جھکتا ہے۔ بہت سے ناکردہ گناہ اپنے سر لے کر اقبال جرم کھیتا ہے..... ایسی ہی تکلیف سے اس وقت آئمہ گزر رہی تھی۔ اس نے اپنے اور فواد کے درمیان خاموش جنگ کو ختم کرنے کے لیے معافی تو مانگ لی تھی لیکن اسے لگ رہا تھا جیسے کوئی تیز رفتار ٹرین اس کے اوپر سے گزر گئی ہو۔ تکلیف حد سے سوا تھی۔ وہ روتے ہوئے اس کے قدموں میں بیٹھ گئی تھی۔ اس نے اپنی عزت نفس کو اس شخص کی خاطر خود ہی روند دیا تھا..... فواد بھی لمحہ بھر کو ساکت رہ گیا تھا۔

”تم نے بہت غلط کیا آئمہ، مجھے اپنا بھرم بے حد عزیز ہے۔ میں نے تمہیں شروع میں ہی بتا دیا تھا کہ ہمارے درمیان کبھی کسی قسم کا بھی جھگڑا ہوا تو ہم اسے خود تک محدود رکھیں گے، کسی تیسرے کو اپنے معاملات میں شامل نہیں کریں گے۔ میں نے آخر ایسا کیا تھا جس کا

بات پورا خاندان جانتا ہے۔“ حماد کی بات پر اسے جبرت کا شدید جھٹکا لگا۔ اس کے اور آئمہ کے درمیان جو لگی تھا پر دونوں سب کے سامنے اپنا بھرم اچھی طرح قائم رکھے ہوئے تھے۔ وہ کبھی نہیں جانتا تھا کہ ان کے آپس کے معاملات کسی تیسرے فرد کو پتا چلیں۔ لیکن یہاں تو پورا خاندان ہی واقف تھا۔ سب کا روزانہ ہی آنا جانا لگا رہتا ہے پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ انہیں کچھ پتا نہیں چلے گا۔ حماد نے اس کے تاثرات کو بھانپ کر کہا تھا۔ یہ پہلی بار تھا کہ فواد کو شدید محسوس ہو رہی تھی۔

”فواد، بھابی ایک مختلف ماحول سے آئی ہیں۔ انہیں مشکل ہو رہی ہے اس ماحول میں ایڈجسٹ کرنے میں..... یہاں ہر وقت سب کا آنا جانا لگا رہتا ہے تو وہ غیر آرام دہ محسوس کرتی ہیں۔ اس کا ذکر انہوں نے تم سے کیا اور تم ہاتھ پیر ہو گئے۔ تمہیں لگتا ہے وہ تمہیں رشتے داروں سے دور کر رہی ہیں جبکہ ایسا نہیں ہے فواد.....“ حماد نے نرمی سے اسے سمجھانا شروع کیا تھا۔

”کیا اس نے تمہیں کچھ کہا ہے، تب ہی تم نے آنا جانا کم کر دیا ہے؟“ فواد نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کی کوشش کی تھی۔ حماد کے چہرے پر ابھر کر معدوم ہوتا مگر اثر مندگی کا تاثر اس کی گرفت میں آیا تھا۔ وہ ابھ کر ماد کو دیکھنے لگا تھا۔

”تمہیں فواد، ایسا کچھ نہیں ہے انہوں نے کچھ نہیں کہا مجھے خود ہی احساس ہو رہا ہے۔“ حماد نے نظریں جراتے ہوئے جواب دیا تھا۔ فواد کے ماتھے پر کئی ناگوار سلوٹیں ابھر آئی تھیں۔ اتنے دن سے وہ آئمہ سے کوئی بات نہیں آ رہا تھا اور نہ ہی اس کی کوئی بات سن رہا تھا۔ آئمہ اگر اس کے سامنے اسے سخت سے سخت کہتی تو وہ تب بھی اتنا ہرٹ نہ ہوتا، اتنا بدگمان نہ ہوتا جتنا تھا اب ہوا تھا۔ آئمہ نے اس کی بدگمانی کو دور کرنے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ وہ اس کی بات کی تصدیق کر کے صفائی دینے کی کوشش کرتی رہی۔ یہ بات اسے مزید غصہ دلاتی، وہ کوشش کر رہا تھا کہ اس بات کو ذہن سے جھٹک دے لیکن وہ جتنا بھی جھٹکنے کی کوشش کرتا تھا یہ

احند و راتم اپنی اماں اور اپنی بھابیوں کے سامنے پیٹ رہی تھیں۔“ فواد ایک دم سے مشتعل ہوا تھا۔

”فواد میں نے ایسا کچھ نہیں کہا، میرا یقین کریں اور نہ ہی میں کبھی ایسا کروں گی۔“ وہ ایک دم ہی اس کے ہاتھوں پر سر رکھ کر شدت سے رونے لگی تھی۔ فواد کی اپنی آنکھوں میں بھی کچھ چھپنے لگا تھا۔ آئمہ کی ٹوٹی بھری حالت دیکھ کر اس کے دل کو کچھ ہوا تھا۔

”ٹھیک ہے آئمہ جو ہوا اسے بھول جاؤ۔“ فواد نے نرمی سے کہا تھا۔

آئمہ نے آنسو بھری آنکھیں اٹھا کر اسے بے یقینی سے دیکھا تھا۔

”تمہیں جو بھی شکایت ہو آئندہ صرف مجھ سے کہنا آئمہ.....“ وہ اور بھی بہت کچھ کہہ رہا تھا، اپنی ذات سے منسلک رشتوں کا احترام اور عزت کرنے کی تاکید اور نہ جانے کیا کیا..... وہ بس خالی، خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اعتماد اور یقین کی مسماہونی عمارت فواد کو نظر نہیں آتی تھی۔

☆☆☆

”امام غزالی کہتے ہیں۔ تکلف کی زیادتی محبت میں کمی کا باعث بن جاتی ہے۔“

آئمہ کو بھی اپنے درمیان کچھ ایسا ہی محسوس ہوتا تھا۔ بے تکلفی تو سب کے درمیان اب بھی تھی، ان دونوں کے درمیان تکلف آگیا تھا معلوم نہیں کیوں شاید محبت نہیں رہی تھی۔ ایک بناوٹی سی تھی اور ایک ضرورت وہ دونوں صبح ایک ساتھ نکلنے فواد اسے یونیورسٹی ڈراپ کر کے آفس آ جاتا..... وہ یونیورسٹی سے آکر اپنے کاموں اور لیکچر کی تیاری میں مصروف ہو جاتی۔

فواد رات کافی دیر سے تھکا ہارا گھر آتا تھا۔ ایسے میں اسے صرف آرام اور سکون کی طلب ہوتی تھی۔ وہ آج کل اپنے ایک پروجیکٹ کی وجہ سے بے حد مصروف تھا۔ لیکن رات کو کوئی نہ کوئی گھر میں موجود ہوتا۔ آئمہ کو کھانے پر اہتمام کرنا پڑتا۔ اس کے بننے، مسکراتے چہرے کے برعکس اس کی آنکھوں میں پھیلی تھکن فواد کو

پریشان کرتی تھی۔ اسے آئمہ کی تھکن کا احساس تھا لیکن وہ اس معاملے میں بے بس تھا۔ اس نے بچپن سے ایسا ہی دیکھا تھا۔ اس کے کزنز کی بیویاں یوں ہی بچپن میں دن رات ایک کیے رکھتی تھیں۔ آئمہ کچھ نیا تو نہیں کر رہی تھی۔ یہ سوچ اسے تسلی دیتی تھی۔ لیکن پھر بھی کچھ تو نیا تھا، کچھ الگ سا جو فواد کو محسوس ہوتا تھا۔

اس دن آئمہ یونیورسٹی سے لیٹ ہو گئی تھی۔ فواد آتے ہوئے اسے ساتھ لایا تھا۔ وہ خاصی تھکی ہوئی تھی۔ وہ ابھی گھر میں داخل ہی ہوئے تھے کہ فواد کے نمبر پر آئمہ کے بھائی کی کال آئی تھی کہ وہ ان کے گھر آ رہے ہیں۔ اس نے آئمہ کو فون دے دیا تھا۔

”بھائی آپ لوگ برسوں آجائے گا۔ چھٹی ہوگی ناں آج تو میں بہت تھک گئی ہوں۔ طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔“ آئمہ نے گھما پھرا کر بات کرنے کے بجائے صاف لفظوں میں منع کیا تھا۔ فواد کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔

”وہ لوگ گھر سے نکل چکے ہیں یا.....“ فواد کے چہرے پر ناگواری درآئی تھی۔

”تو کوئی بات نہیں.....“ اس کے انداز میں..... پرہیزی تھی۔

”وہ کیا سوچیں گے؟ اتنے عرصے بعد وہ لوگ ہمارے گھر آ رہے تھے اور تم نے فٹ سے منع کر دیا..... یہ کوئی طریقہ نہیں ہے۔“ حسبِ عادت اس نے غصے سے کہا تھا۔

آئمہ نے اس کی بات پر عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”وہ لوگ کچھ نہیں سوچیں گے اور نہ ہی میرے منع کرنے کی وجہ سے ان کے دل میں میرے لیے محبت میں کوئی کمی آجائے گی۔ آپ کو اس بارے میں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ آئمہ کا کچھ بتانا انداز ایک عجیب سا فخر لیے ہوئے تھا۔ وہ کمرے میں چلی گئی تھی۔ وہ حیران سا اس کے لہجے پر غور کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد اس کے موبائل پر زوار بھائی، عبید بھائی اور

وہ آفس سے نکل کر گھر جانے کا سوچ ہی رہا تھا جب عبید بھائی کی کال آئی تھی۔ وہ تین ماہ پہلے ایک بار جمعہ پڑھنے فیصل مسجد جایا کرتے تھے۔ ان دنوں تھا اور انہوں نے فواد کو بھی ساتھ چلنے کو کہا تھا۔ وہ ان کے ساتھ جمعے کی ادائیگی کے لیے فیصل مسجد چلا آیا تھا۔ مولوی صاحب خطبہ شروع کر چکے تھے وہ، زوار اور عبید بھائی سب انہماک سے ان کی بات سن رہے تھے۔ لیکن فواد کا دھیان بار بار ادھر ادھر بھٹک رہا تھا۔ جمعے کے بعد اسے جو کام کرنے تھے، وہ ان کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ تب یوں ہی بے دھیانی میں مولوی صاحب کے الفاظ اس کی سماعتوں کی گرفت میں آئے تھے۔ وہ ایک دم متوجہ ہوا تھا اور ایک سردی لہر اس کے پورے جسم میں دوڑ گئی تھی۔ وہ دل کو چھو لینے والے انداز میں تلاوت کرتے اب آیات کا ترجمہ کر رہے تھے۔

”اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔“ اے ایمان والو! اپنے گھروں کے علاوہ دوسروں کے گھروں میں ان کی اجازت کے بغیر داخل نہ ہو۔“ گویا نہ صرف دوسروں کے بلکہ اپنے گھروں میں بھی آہٹ کر کے آیا کرو۔ گھر میں داخلے کو اجازت سے مشروط کر دیا بلکہ اپنے گھر کو بھی تاکہ مسلمان معاشرہ محفوظ رہے۔ ہم یوں بلا اجازت ایک دوسرے کے گھر آنے جانے کو۔۔۔ بے تکلفی کا نام دیتے ہیں۔ محبت سمجھتے ہیں۔ لیکن دراصل بے تکلفی کی زیادتی، محبت میں کمی کا باعث بنتی ہے۔۔۔۔۔ بے تکلفی رہتی ہے لیکن محبت ختم ہو جاتی ہے۔ یوں ٹھمکھلا آنے سے توازن، راز نہیں رہتا۔ کوئی بات جو انسان گھر تک رکھنا چاہتا ہے، وہ ہر جگہ پھیل جاتی ہے۔ ہم ٹوٹ جاتے ہیں، رشتے چھوٹ جاتے ہیں۔“ مولانا صاحب کی آواز پوری مسجد میں گھوم رہی تھی۔

ایک فواد ہی خاموش نہیں تھا سب ہی بہت خاموشی اور توجہ سے ان کا بیان سن رہے تھے۔

”جب انسان کسی کے گھر جائے تو اس کے دروازے کے سامنے نہ کھڑا ہوتا کہ نگاہ اس کے گھر کے اندر نہ جائے“ آپ نے فرمایا۔ ”جب نگاہ گھر کے اندر

باقی سب کی کالز آئی تھیں۔ وہ آئمہ کی طبیعت کا پوچھ رہے تھے اور کافی پریشان ہو رہے تھے۔ وہ حیران ہو رہا تھا۔ وہ کچھ دن کے لیے آئمہ کو لے جانے کی اجازت مانگ رہے تھے۔ دوسرے دن اس نے آئمہ کی طبیعت کے پیش نظر اسے کچھ دن وہاں رہنے کی اجازت دے دی تھی۔

☆☆☆

فون پر تیزی سے میسج ٹائپ کرتا وہ حسبِ عادت درمیان کے راستے سے تایا جان کے پورشن کی طرف آیا تھا۔ اسے اور حماد کو اکٹھے کسی کام سے جانا تھا۔ گھر میں حماد اور بھابی اس کی بیوی کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ سب تانیہ کی سرال گئے تھے۔ وہ اپنے ہی دھیان میں اندر آیا تھا لیکن اس کے قدم جیسے زمین نے جکڑ لیے تھے۔ شرمندگی سے بڑھ کر کچھ تھا جو اس نے اس وقت محسوس کیا تھا۔ بھابی نے قدموں کی آہٹ پر پلٹ کر بچکن کے دروازے کی سمت دیکھا تھا۔ ہاتھ میں پکڑی کفگیر ان کے ہاتھ سے نیچے گر گئی تھی۔ انہوں نے اپنے بازو۔۔۔ بے اختیار اپنے گرد پھیلا کر اپنا کھلا گریبان چھپانے کی کوشش کی تھی۔ گرمی کی وجہ سے دوپٹا ایک طرف پڑا تھا۔ بالوں کا جوڑا کمر پر جمول رہا تھا۔ آج تک کسی کسی نے ردا بھابی کے بالوں تک کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہمیشہ بڑی سی شال اپنے گرد لپیٹ رکھتی تھیں۔ آج انہیں فواد کے سامنے شدید شرمندگی کا احساس ہو رہا تھا۔ سائنڈ پر پڑا دوپٹا اٹھا کر وہ تیزی سے بچکن سے نکل گئی تھیں۔ وہ اپنی جگہ سے ہل تک نہیں سکا تھا۔ اس پل اس پر انکشاف ہوا تھا کہ حماد نے ان کے گھریوں بے تکلفی سے آنا جانا کیوں چھوڑ دیا تھا۔ اس نے۔۔۔۔۔ جھجھری لی تھی۔ اسے شدید شرمندگی ہو رہی تھی۔ وہ تیزی سے ان کے گھر سے باہر نکل آیا تھا۔ اس کا ردا بھابی کے ساتھ بہت احترام والا ایک بڑی بہن جیسا رشتہ تھا لیکن اب نظر اٹھا کر ہمیشہ کی طرح ان سے بات کرنے میں ایک وقت لگ جاتا تھا۔

☆☆☆

رہیں گے۔ لڑکے، لڑکیوں کی دوستیاں، محبت کی شادیاں اور ایسے ہی دوسرے واقعات بلا اجازت آنے جانے کی وجہ سے ہوتے ہیں، جسے ہم بے تکلفی کا نام دیتے ہیں۔“ فواد کی ذہنی روکھان، کہاں بھٹک رہی تھی۔ ”اجازت لے کر آتا مہمان اور میزبان دونوں کے لیے باعثِ رحمت ہے کیونکہ اس سے دونوں فریق ذہنی اذیت سے محفوظ رہتے ہیں۔ اسی میں ہماری ہی بھلائی ہے اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہے۔“ مولانا صاحب اپنے خطے کا اختتام کر رہے تھے۔

فوادان کے لفظوں کے محرک نہیں پارہا تھا۔ دکھ، شرمندگی، پچھتاوا کیا نہیں تھا جو وہ محسوس نہیں کر پارہا تھا۔ اسے یہاں بیٹھے اب سمجھ میں آ رہا تھا کہ آئمہ کی ای نے اسے کس بات پر صبر کرنے کو کہا تھا۔ اور حادثہ کو کیوں اپنے والدین کے کمرے میں جانے کے لیے بھی اجازت لینے کی ضرورت تھی اور آئمہ اپنے ہی گھر کے باہر اجازت لینے کے انتظار میں کیوں کھڑی رہی تھی..... اس کے بہن، بھائی اس کے منع کرنے کے باوجود ناراض کیوں نہیں ہوئے تھے۔ اور حماد کیوں نظریں چراتا تھا اور کیوں آئمہ اس کے آنے پر ایک دم بے چین ہو جاتی تھی۔ اسے اب سمجھ میں آ رہا تھا۔

وہ شرمندہ تھا، دکھی تھا، اسے آئمہ سے معافی مانگنی تھی۔ ازالہ کرنا تھا اپنی غلطیوں کا..... عبید اور فواد بھائی نے کن آنکھوں سے اسے دیکھا تھا اور پھر ایک دوسرے کو دیکھ کر طمانیت سے مسکرا دیے تھے۔ اگر وہ خود فواد سے بات کرتے تو آئمہ اور فواد کے درمیان خلیج مزید وسیع ہو جاتی تھی۔ آئمہ کے لیے سب بہت قابلِ احترام تھے۔ فواد سے منسلک ہر رشتہ اسے جی جان سے عزیز تھا۔ لیکن اس ماحول میں ایڈجسٹ کرنا بہت مشکل اور تکلیف دہ تھا۔

بے شک ہر چیز اعتدال میں ہی اچھی لگتی ہے۔ آج فواد کی آنکھوں پر بندھی پٹی کھل گئی تھی۔ اسے غلط اور صحیح کا فرق سمجھ میں آ رہا تھا۔ بدگمانیوں کے بادل چھٹ گئے تھے اور آگے کی زندگی بہت بہل تھی۔

اصل، وہ جائے تواجارت کی کیا ضرورت.....“ تین بار اجازت طلب کرنی چاہیے۔ اگر اجازت نہ ملے تو الٹی بہتر ہے۔ اس بارے میں بدگمانی کا شکار نہیں ہونا چاہیے کیونکہ بعض اوقات انسان کسی مجبوری کی وجہ سے نہیں ملنا چاہتا۔ اس پر زبردستی ملاقات تو ہونا غلط ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت سعد سے ملنے گئے۔ آپ نے تین بار السلام علیکم کہا۔ حضرت سعد نے تین بار آہستہ آواز میں جواب دیا جو آپ نے نہ سنا تو خاموشی سے واپس لوٹ آئے۔ حضرت سعد آپ کے پیچھے دوڑتے ہوئے گئے۔ یا رسول اللہ آپ کی آواز میرے کانوں میں پہنچ رہی تھی۔ میں نے آپ کے ہر سوال کا جواب دیا لیکن اس خیال سے کہ آپ کی بہت سی دعائیں اور زیادہ برکت حاصل کروں آہستہ جواب دیا۔“

مولوی صاحب کی اگلی بات نے تو اسے مزید حیران کر دیا تھا۔

”ہمیں اپنے گھر جانے سے پہلے بھی اجازت طلب کرنی چاہیے کیونکہ گھریلو خواتین بعض اوقات ایسی حالت میں ہوتی ہیں کہ انہیں اس حالت میں دیکھیں تو دونوں کے لیے پریشانی ہوتی ہے۔“

فواد نے ایک دم جھرمھری لی تھی۔ اس کے دل کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ جب آئمہ نے اس سے ایسا کچھ کہنا چاہا تھا تو وہ کتنا بدگمان ہوا تھا۔ وہ بدگمانی جواب تک ختم نہیں ہوئی تھی۔ اب اس کا دل حیرت انگیز طور پر پھٹکتا جا رہا تھا۔ یہ آئمہ نہیں کہہ رہی تھی کہ وہ غصے سے سر جھٹک دیتا۔ یہ اللہ اور اس کے رسول کا حکم تھا جو اسے سنایا جا رہا تھا۔ یہ زندگی گزارنے کے سنہری اصول تھے جو اسے بتائے جا رہے تھے۔ جنہیں سن کر سر جھکانے کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ جنہیں سننے اور سمجھنے کے بعد کسی تذبذب اور کسی سوال و جواب کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔

”گھریلو زندگی کے استحکام کے لیے اجازت لینا ضروری ہے۔ جب اجازت کے ساتھ داخلہ ہوگا تو گھر کے افراد اور دیگر لوگ بے شمار ذہنی پریشانیوں سے بچیں

متاعِ عمر وہی

سعدیہ رئیس



وہ ابھی، ابھی اپنی سفید کلش میں اس راستے

سے گزر کر گیا تھا۔ سیاہ رنگ کے آہنی گیٹ پر دھوپ

چمک رہی تھی اور ابھی تک وہاں اس کی گاڑی کے

ٹائروں کی دھول اڑتی نظر آرہی تھی۔ جب وہ جارہا تھا

تو اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اسے روک لے۔

مگر وہ بھی ایسا نہ کر پاتی اور نہ ہی کر سکتی تھی۔ بھلا

وہ کس حق سے اور کس ناتے اسے روکتی..... اسے کیا

معلوم کہ وہ اس کے شہرِ دل میں پہنچل چائے ہوئے ہے،

بھر کا ساتھی بابر حسن بنے اور وہ کیا چاہتی تھی کہ اس سے کوئی بھی نہیں پوچھ رہا تھا۔
اور اسے بابر حسن کا ساتھ منظور نہیں تھا۔ اس کا سادہ سا سر اپا، بے ضرر سا وجود اور مشفقانہ سا برتاؤ اسے کبھی پسند نہیں آتا تھا۔ وہ تو شیراز عزیز کو دل میں بسائے اس کے ساتھ عمر بھر کا سفر کرنے کی تمنی تھی لیکن اس سے کوئی پوچھتا تو.....

وہ بے دلی سے کمرے سے باہر چلی آئی۔ کچن سے اس کی امی اور تائی امی کی باتوں کی آواز آرہی تھی لہذا اس طرف جانے کی غلطی کرنے کے بجائے وہ لاونچ میں چلی آئی مگر دروازے میں ہی ٹھک گئی۔ سامنے ہی وہ بے تکلفی سے کرسی پر نیم دراز تھا اور وہیں اس کا بھائی واصف بھی موجود تھا۔ اسے دیکھتے ہی بابر حسن سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس کی نیم باز آنکھوں میں اسے دیکھ کر عجب والہانہ سارنگ چھلکنے لگتا تھا اور وہ اسی قدر برہم ہو جاتی تھی۔ جب سے بابر حسن کے ساتھ اس کی شادی کا ذکر لگتا تھا، وہ اس کا سامنا کرنے سے بچنے لگی تھی۔ مگر اب فرار کی کوئی راہ نہیں بچی تھی۔

”اوہو..... بھئی بڑے وقت پر آئیں آپ..... آئے، آئے آپ ہی کا انتظار تھا۔“ اس کے بھائی واصف نے بڑے لطیف سے انداز میں بابر حسن اور اس کے رشتے کے حوالے سے چھیڑ چھاؤ کی۔

”شہزادہ پلیز ذرا امی سے کہنا جلدی چائے بنا دیں، مجھے دیر ہو رہی ہے۔“ اس کا تذبذب بھانپ کر بابر حسن نے اس کی مشکل آسان کی۔ اس تذبذب اور تامل کو بھی اس کی شرقی حیا سمجھ کر سب بہت بڑی غلط فہمی کا شکار ہو رہے تھے۔

”جانے کیا سمجھتا ہے خود کو جیسے میں اس کی ملازمہ ہوں۔“ اس کا آرڈر اسے سلگا گیا۔ وہ پاؤں پٹختی، پتختی کھولتی تائی کو بابر حسن کا پیغام دیے بغیر اپنے کمرے میں آگئی۔

بابر حسن اس کے تیا حسن احمد کا سب سے بڑا سپوت تھا اور اسی گھر میں رہائش پزیر تھا۔ جہاں شہزادہ

وہ لائی بے نیاز اور مغرور شہزادے کی طرح اس کی ہلاں پر اترے خوابوں کو روندتا ہوا چلا جاتا تھا۔ وہ دل میں پھلتے، تڑپتے جذبات کو ہمیشہ کی طرح تھپکیاں دے کر سلا دیتی کہ یہ جذبہ تو اس نے بہت سینت کر اپنے دل میں چھپا رکھا تھا۔

مگر سبک خرام ہوا کی لکھیلیوں سے لگتا تھا کہ یہ راز ان پر عیاں ہو گیا ہے۔ ان ہواؤں میں نامحسوس سی سرگوشیاں اور لطیف سی چھیڑ چھاؤ تھی۔ ہوا کے جھونکے کی شرارت سے اس کی چند شرارتی لٹیں اس کے چہرے پر آگریں۔ اسے ان ہواؤں کی سرسراہٹوں میں بھی اس کے وجود کا گمان ہو رہا تھا۔

وہ کچھ دیر تک خالی نظروں سے اس راستے کو دیکھتی رہی جہاں سے کچھ دیر پہلے شیراز عزیز ہو کر گیا تھا پھر اپنی کیفیت سے گھبرا کر وہاں سے پلٹ آئی۔ اندرونی رہائشی حصے میں معمول کی گہما گہمی تھی وہ ان سب رونقوں سے نظر بچا کر اپنے کمرے میں چلی آئی کیونکہ اس کے اپنے خیل کا ایک جہاں آباد تھا۔ اس کو سوچنا بھی اچھا لگتا تھا..... اس کے سنگ بیتا ہوا وقت اس کے لیے قیمتی تھا خواہ خیالوں ہی میں سہی.....

اس نے کھڑکی پر پڑے گلابی پردے کو ہٹایا تو ہوا کے سرد جھونکے اس کے دھکتے جذبات کو چھوتے ہوئے گزر گئے۔ بیرونی سڑک کے پار بنے پارک میں ہریالی نظر آرہی تھی۔ سبز پیڑوں پر چڑیوں اور تلیوں کے عکس تھرک رہے تھے۔ سب طرف رنگارنگ پھول تھے۔ وہ ان سب رنگوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لینا چاہتی تھی لیکن دور، دور تک ایسے کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ وہ اس کی نیندیں اڑا کر اور دل چڑا کر لے گیا تھا اور کسی کو معلوم ہی نہیں تھا..... کسی کو بھی اس واردات و قلب کی خبر نہیں ہوئی تھی سب کو صرف اور صرف بابر حسن ہی دکھائی دے رہا تھا۔

شہزادہ کی زندگی کا ہونے والا ہم سفر بابر حسن سب کی نظر میں اس کے لیے بہت مناسب و موزوں..... سب چاہتے تھے کہ شہزادہ سراج کا زندگی

کیا پردہ؟“ اس نے اپنی دانست میں تو اسے چھپھڑا تھا مگر نہیں معلوم تھا کہ بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا۔
”فضول باتیں مت کرو.....“ وہ تڑخ کر بولی۔
”ہائیں، تمہیں کیا ہوا..... ارے، تم رورہی تھیں کیا؟“ سہانہ ہٹا بٹا، حیران پریشان سی اس کی صورت نکلنے لگی۔

”تمہیں اس سے کیا اور یہاں کسی کو بھی میری پروا نہیں..... سب کو اپنی خوشی عزیز ہے..... سب مفاد پرست اور خود غرض ہیں یہاں.....“ اسے تو موقع مل گیا تھا دل کی بھڑ اس نکالنے کا۔

”ارے..... یہ کیا الٹا سیدھا بول رہی ہو آپنی.....“ سہانہ وہیں اس کے پاس بیٹھ گئی۔ شہزادہ کے لیے یہ بہترین موقع تھا اپنا انکار کھلانے کا..... اس نے سہانہ کے ذریعے اپنا انکار بڑوں تک پہنچا دیا البتہ شیراز عزیز کی محبتوں کو نہ دل سے گہرائیوں میں چھپا کر رکھا کیونکہ اسے اپنے جذباتوں پر یقین تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ جو اس کا رب ہے، اس کی جھولی اس کی منہ مانگی مرادوں سے بھر دے گا..... اس کے بعدے طویل ہوتے جارہے تھے۔ اور ایک ہی دھماکے پر جاری تھی۔
”یا اللہ شیراز عزیز کو میرا مقدر بتا دے۔“ اور مانگنے والے سے زیادہ تو دینے والا بھی شہنشاہ ہے جو کبھی سچے دل سے مانگی جانے والی دعاؤں نہیں کرتا۔

لیکن یہ بھی ایک سچ ہے کہ بندے سے زیادہ مالک کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لیے کون سا راستہ درست ہے اور کون سا غلط.....؟

ساری حکمتیں اور مصلحتیں رب ہی جانے..... مگر بندہ سدا کا جلد باز..... اور ناشکرا کبھی سمجھ نہیں پاتا ان مصلحتوں اور حکمتوں کے عہد اور نہ ہی سمجھ سکتا ہے۔
ہاں بس رب کی رضا پر سر جھکائے رکھے تو سب کچھ درست ہوتا چلا جاتا ہے۔

اس کا انکار جنگل کی آگ کی طرح سب طرف پھیل گیا۔ سب طرف ایک گہرا اور نامحسوس سا سکوت چھا گیا۔ ورنہ دوپوار سے لپٹی اداسی سے اس کا دل

بھی رہا کرتی تھی۔ وہ سراج احمد کی منجھلی بیٹی تھی۔ اس سے بڑی فرزانہ کی شادی ہو چکی تھی۔ اس کے بعد واصف تھا اور سب سے چھوٹی سہانہ تھی۔ حسن احمد اور سراج احمد برسوں سے اسی گھر میں اپنے، اپنے پورشن میں سکھ چین کی بنی بجارہے تھے۔ یہ اس کے تایا حسن احمد کی دیرینہ خواہش تھی کہ شہزادہ، بابر کی دہن بن کر ان کے رشتے اور تعلق کو انٹ کر دے۔ پہلے یہ بات ڈھکی چھپی رکھی گئی تھی مگر آج کل یہ تذکرہ کچھ زیادہ اور کھلے عام ہو رہا تھا جس کا مقصد تھا کہ اسے اور بابر کو ایک کرنے کا تہمتی فیصلہ اور دن مقرر ہو گیا ہے اور وہ ایسا بالکل نہیں چاہتی تھی۔

اسے شدید قسم کی جھنجھلاہٹ اور کوفت ہو رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح اس وقت کو ٹالے۔ اسی وقت گھر کی پرانی ملازمہ شانی چلی آئی۔
”باجی جی، آپ کو بیگم صاب چائے پینے کے لیے بلارہی ہیں۔“ اس نے پیغام دیا۔

”بھڑ میں ڈالو چائے کو اور دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“ وہ بھڑک سی گئی۔ شانی کی مسکراہٹ ماند پڑ گئی اس نے کچھ ہم کر اسے دیکھا اور پلٹ کر بھاگ گئی۔
”آف، پتا نہیں میں نے شانی کو کیوں ڈانٹ دیا۔“ اسے افسوس ہوا۔ اس کا بس چلتا تو لکھوں میں یہ فیصلہ بدلوادی مگر وہ کچھ نہیں کر پارہی تھی۔

”انسان نے دنیا میں نت نئی دریافتیں کر لی ہیں لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ وہ آج تک خود کو دریافت نہیں کر پایا۔ نہ وہ خود شناس ہوتا ہے اور نہ خدا شناس بس اسے صرف دوسروں کو کھوجنے کی پڑی رہتی ہے۔ دوسروں کی زندگی میں مداخلت کرنی آتی ہے۔“ وہ دکھ سے سوچتی چلی گئی۔

”زندگی میری ہے اس پر میرا اختیار ہوتا چاہیے۔“ ایک کے بعد ایک سوچ آئے جاری تھی۔

اسی وقت سہانہ چلی آئی اس کے ہاتھ میں اس کے لیے چائے کا کپ اور ایکٹ کی پلیٹ تھی۔
”چائے پینے کیوں نہیں آئیں بیٹی..... ابھی سے

اندرونی کمرے سے تو لیے سے منہ رگڑتا شیراز برآمد ہوا اور دونوں ہی یوں غیر متوقع ایک دوسرے کو سامنے پا کر ٹھٹھک گئے۔ شہزادہ تو اس کا ورزشی سراپا دیکھتی رہ گئی۔ وہ اس کی غضب کی خوش لباسی کے سحر میں جکڑ کر بے بس سی ہو گئی تھی۔ اس پر اس کی آنچ دیتی نظریں اسے بوکھلا رہی تھیں۔ اس کا دل زور، زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ اس کی مراد تھا اور اس کے سامنے کھڑا تھا یوں کہ نکلنے کا راستہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا وہ اپنی دراز قاضی کی وجہ سے جیسے اس پر چھاسا گیا تھا۔

”تم شہزادہ ہونا؟“ اس نے تجاہل عارفانہ سے سوال کیا۔

حالانکہ اس سے پہلے ان دونوں کی دو ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔

”جی ہوں..... وہ میں.....“ وہ بلاوجہ گڑبڑا گئی۔ وہ وہیں تخت پر دوسرے کنارے پر ٹک گیا تھا۔ ڈریز کی مدد سے خوشبو ماحول میں رچ گئی تھی اور وہ اس خوشبو سے مسحور بے اختیاری ہوئی جا رہی تھی۔

”شیری بیٹا بس ابھی پانچ منٹ میں چائے لا رہی ہوں۔“ اس سے پہلے کہ وہ اپنا جواب ٹھیک طرح سے دیتی مریم پھوٹنے لگی تھی اس سے ہی آواز لگا کر اس سے کہا۔ کچھ ہی دیر میں مریم پھوٹا لواز مات سے پُر چائے کی ٹرالی لیے چلی آئیں تو وہ ان فریبی لمحوں کے سحر سے نکل پائی۔

”میں نے صرف چائے ہی تھی ماں.....“ وہ کچھ بیزار سی بولا۔

”اب کھا لو کچھ..... کون سا تم روز یہاں کھاتے ہو۔ کبھی، کبھی تو آتے ہو ٹک کر بیٹھنے کے لیے ورنہ ہوا کے گھوڑے پر سوار آتے ہو ابھی آئے اور ابھی گئے۔“ ان کے انداز میں مان بھری ناراضی تھی۔

”آپ کو پتا تو ہے کہ مجھ پر کتنا ذمہ داریاں ہیں، پاپا کا حال ٹھیک نہیں، جب سے ان کو اٹیک ہوا ہے وہ بہت دیکھ رہے ہیں، بڑنس مجھے ہی دیکھنا پڑ رہا ہے۔“ اس نے ان کے پاس جاکر ان کے دونوں

کمرہ لائے۔ کسی نے بھی اسے سمجھانے کی کوشش نہیں کی بس ایک غیر معمولی سی خاموشی اختیار کر لی جو اس کے لیے بے حد تکلیف ثابت ہو رہی تھی۔

یوں لگ رہا تھا سب اس سے ناراض ہیں مگر ناراض بھی نہیں تھے..... گھر میں ہونے والی معمول کی بات چیت تو ہو ہی رہی تھی۔

اس روز بھی گہری شام میں ایک عجیب سا سوز گھلا ہوا تھا۔ کچھ بے قراری مریم پھوٹکی طرف چلی آئی۔ مریم پھوٹا اس گھر کے تیسرے پورشن کی مکین تھیں۔ لی طرح وہ صاف سترے چلیے میں گھری سی تخت پر لیٹی دال چاول چن رہی تھیں۔ اسے دیکھا تو ایک ایسی ہی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر رینگ گئی۔

”لائیں پھوٹو میں چن دیتی ہوں چاول.....“ آج کل وہ ان کی خدمت پر کمر بستہ رہتی اور صبح شام ان کی خبر گیری کو آ رہی تھی۔

”چن لیے میں نے، تم بیٹھو میں ابھی یہ کچن میں رکھ کر آتی ہوں۔“ وہ حتیٰ سے انداز میں کہتی ہوئی اٹھ گئیں۔

وہ وہیں تخت پر بیٹھ کر مریم پھوٹکی نفاس کے شاہکار دیکھنے لگی۔ وہ بہت آرتھک ذہن کی خاتون تھیں، انہوں نے آرٹ ورک کے بہت سے کورسز کر رکھے تھے اور گھر بیٹھے وہ بڑے پیارے شاہکار تیار کر کے اپنا گھر بھی سجاتی تھیں اور باقی کو مہینے داموں فروخت کر دیا کرتی تھیں۔

اس نے کارنز پر رکھے فابریکے خوب صورت پھولوں کو سٹائش نظروں سے دیکھا۔ ان پھولوں پر اصل کا گمان ہو رہا تھا۔

اصل اور نقل کا فرق بہت کم لوگ کرتے ہیں اور اکثر لوگ نقل پر اصل کا گمان کر کے دھوکا کھا جاتے ہیں۔ اسے خود بریقین تھا کہ وہ اصل اور نقل کے فرق کو پہچان سکتی ہے۔ لیکن زندگی کے مکر و فریب اور منافعتوں کو سمجھنے کے لیے وہ نا تجربہ کار ہی تھی۔

ابھی وہ خاموش جاتے جاتے میں مصروف ہی تھی کہ

یادداشت میں دھندلے سے موجود تھے کیونکہ تب وہ بہت چھوٹی تھی، نو دس سال تک دوسری بیوی کے ساتھ من پسند زندگی گزارنے کے بعد ان کے شوہر عزیز احمد کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ ان گزرے سالوں میں دوسری بیوی نے انہیں تین بیٹیوں کا تحفہ دیا تو ان کو بیٹے کی محبت آئی اور مریم پھوپھو کا رونا، گڑگڑانا بھی اثر نہیں کر سکا۔

”اگر تم آکڑو گی تو میں تمہیں ہمیشہ کے لیے اس سے محروم کر دوں گا۔ بہتر ہے کہ مجھ سے ملنے کے لیے اسے بھیجا کرو کیونکہ وہی میرا واحد وارث ہے۔“ وہ اپنی پچھلی لائق پر ذرا بھی شرمسار نہیں تھے اور بیٹے پر اپنا حق جتا رہے تھے۔ سب کے آپس کے باہم برائے مشورے سے یہ طے ہوا کہ شیراز کے باپ کو اگر اس کی یاد آگئی ہے تو ملنے سے محروم نہیں رکھا جائے یوں وہ اپنے باپ سے ملنے لگا اور اس کے بعد آہستہ، آہستہ عزیز احمد نے ایسا چال پھیلایا اور ایسا کلنجہ کسا کہ مریم پھوپھو تپتی اور آہیں بھرنی رہ گئیں۔ وہ اپنی پوری فیکس کے ساتھ بیرون ملک چلے گئے اور شیراز ان سے ہمیشہ کے لیے دور ہو گیا۔

اس وقت شیراز عزیز ایک کسن اور تاجا سمجھ لڑکا تھا۔ باپ کی چال بازیاب اس کی سمجھ سے بالاتر تھیں، وہ ان کے چنگل میں پھنس کر انہی کا ہو گیا اور چاہتے ہوئے بھی ماں سے رابطہ نہیں کر پایا۔

چند ماہ پیشتر اس کی حیرت انگیز آمد نے مریم پھوپھو پر شادی مرگ طاری کر دی..... اپنے سامنے کھڑے خوبو اور جوان بیٹے کو انہوں نے جوش ممتا سے چٹا لیا۔ وہ بیٹا جس کی پیشانی وہ جھک کر چومنا کرتی تھیں وہ ان کے قد سے اونچا ہو گیا تھا اور جھک کر ماں کو پیار دے رہا تھا۔

سب طرف یہ خوشخبری پھیل گئی جس نے سنا اس کو یقین نہیں آیا مگر پھر جب سب نے اسے اپنے سامنے مجسم دیکھا تو یقین کرنا ہی پڑا۔

ان گزرے سالوں میں وہ بہت بدل گیا تھا۔ پہلے سے زیادہ خوب صورت، توانا اور اس کا شاندار

شانے تمام کزنم لفظوں میں اپنی صفائی دی۔ اس سے اس کا شاندار سراپا اس کے دل میں اترتا چلا گیا۔ چائے پینے کے بورا بعد ہی وہ جانے کے لیے اٹھ گیا۔ جس وقت وہ باہر جا رہا تھا شہزاد کا دل سٹ کر چھوٹا سا ہو گیا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ ان لمحوں کو روک لے..... اس کا بس چلتا تو وہ اس شام کو کبھی گزرنے نہیں دیتی مگر ہمیشہ کی طرح وہ ایسا نہیں کر پائی۔ اس سے اس نے دل کی گہرائیوں سے شیراز عزیز کے ساتھ کی تمنا کی۔

شیراز عزیز پھوپھو کی زندگی کا ایک بند باب تھا جو عرصے بعد اپنی ساری گرد جھاڑ کر ایک بار پھر کھل گیا تھا۔ اسے اپنی ماں سے ملے ہوئے چند ماہ ہی ہوئے تھے۔ چند ماہ پیشتر اچانک ہی ایک ڈرامائی انداز میں اس نے مریم پھوپھو کی سپاٹ زندگی میں پہلچ مچادی تھی۔ ان کا پچھڑا ہوا بیٹا مدتوں بعد ان سے ملنے از خود آ گیا تھا۔ بغیر کسی روک ٹوک یا دباؤ کے وہ اپنی ماں سے ملنے کے لیے آنے لگا تھا۔ وہ بیٹا جسے کم عمری میں ان سے جھین لیا گیا تھا۔ آج کڑیل جوان کے روپ میں ان کے رو برو تھا۔ اب اس پر کسی کا زور نہیں تھا۔ وہ اپنی مرضی سے ماں سے ملنے آ رہا تھا اور مریم پھوپھو کے لیے تو یہ ایک معجزہ ہی ہو گیا تھا۔

مریم پھوپھو کے ساتھ قسمت نے وفا نہیں کی وہ شکل صورت کی جتنی پیاری اور اپنے زمانے کی سکھڑ اور ہنر مند لڑکی تھیں ان کی قسمت اتنی ہی بری نکلی۔ ان کے شوہر عزیز احمد کو بیوی کی کم اور سوشل حلقے میں رنگ بکھیرنے والی ایک تلی کی ضرورت تھی جو اپنی نمائش سے ان کی بزنس بارمیر کو کامیاب بنا دے اور ان کے لیے یہ سب ناقابل قبول تھا۔ سال بھر کی تکلیف دہ صورت حال کے بعد بالآخر انہوں نے اپنے شوہر سے علیحدگی اختیار کر لی۔

ان کی زندگی کا محور شیراز تھا، اپنے سارے غم بھلا کر وہ اس کی پرورش میں لگ گئیں۔ ان کے شوہر نے انہیں چھوڑنے کے فوراً بعد پسند کی شادی کر لی تھی۔ شیراز کے سنگ بچپن کے وہ بیتے ہوئے لمحے اس کی...

کے دل ٹوٹ گئے تھے لیکن اسے پروا نہ تھی، اس کا اپنا دل تو سیراب ہو گیا تھا۔ اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری۔ ہو رہی تھی۔

مریم پچھو غم کی باری تھیں، سب جانتے تھے کہ انہوں نے کیسی زندگی گزاری ہے۔ یوں شیراز عزیز کے حق میں فیصلہ دے دیا گیا۔

کئی لمحوں تک تو اسے یقین ہی نہیں آیا کہ اس آسانی سے اسے اپنی منزل مل گئی۔ اپنی اس کامیابی کے خمار میں اسے یاد نہیں رہا کہ زندگی پھولوں کی بیج نہیں کانٹوں کا بستر بھی ہوتی ہے۔

سب سے زیادہ حیران کن بات یہ تھی کہ اس رشتے پر اس کے والد عزیز احمد اور سوتیلی ماں فرخندہ نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا البتہ شادی سے پہلے عزیز احمد نے اپنی فطرت دکھاتے ہوئے یہ شرط لگا دی تھی کہ شادی کے بعد شہزادہ رخصت ہو کر ”العزیز“ جائے گی۔ مریم پچھو کے لیے یہی بہت تھا کہ ان کا بیٹا ان سے ملتا رہے گا اور اب تو بیٹی اس کی رفیق سفر بن گئی تھی اور یہ رشتہ اور بھی مضبوط ہو گیا تھا۔

”العزیز“ میں اس کا بہت خشک اور سرد سا استقبال ہوا۔ اس کی منندوں اور سوتیلی ساس نے اس کا رسی سا سرسری استقبال کیا تاہم جلد عروسی پوری شان سے سجایا گیا تھا اور باقی کسر شیراز کے انقادات اور والہانہ پن نے پوری کر دی۔ شیراز کی سوتیلی والدہ فرخندہ کی حیثیت اس گھر میں مسلم تھی لیکن شیراز کی حیثیت اپنی جگہ تھی۔ وہ اس گھر کا اکلوتا اور بڑا بیٹا تھا۔ اس لحاظ سے شہزادہ کی بھی اہمیت کم نہیں تھی اس گھر میں اس کا صرف ایک کمر انہیں تھا بلکہ ایک چھوٹا سا حصہ دو کمروں اور لاؤنج کے ساتھ اس کے تصرف میں تھا۔

یہ ایک خوب صورت ون پونٹ بنگلا تھا۔ جس کے اگلے حصے میں ایک چھوٹا سا سرسبز لان رنگ برنگے پھولوں سے سجا تھا۔ پورچ میں صرف ایک ہی گاڑی کھڑی ہو سکتی تھی بقیہ گھر کے حصے پر فرخندہ براجمان تھیں تاہم کچن بھی ایک ہی تھا اور سب کا کھانا، ناشتا

اپا اس پر بچ رہا تھا۔ شوخ نیلی قیص پر سفید ڈیزائننگ اور بنجر کی پینٹ میں ملبوس وہ مریم پچھو کے پہلو میں کھڑا دل میں اتر جانے کی حد تک پیارا لگ رہا تھا۔ تازہ شیو میں اس کا چہرہ گھبر رہا تھا لیکن ایک بجرمانہ سی شرمندگی بھی جھلک رہی تھی۔

وہ پہلی ہی نظر میں اس پر دل ہار گئی تھی۔ وہ ہو، ہو اس کے خوابوں میں ترانے ہوئے پیکر کی طرح تھا۔

”زبردست..... ڈیشنگ“ دل نے اسی وقت اسے قبولیت کی سند دے دی تھی۔ اس کا باہر حسن کے لیے انکار سب کے لیے ایک معما تھا۔ سب نے یہی سوچ کرنی اجمال خاموشی اختیار کر لی تھی کہ شاید وہ ابھی شادی کے لیے وقتی طور پر تیار نہیں اور یہ خیال بھی تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ اسے اس رشتے کے لیے ہموار کر لیا جائے گا لیکن اس کا انکار پچھو کے لیے ایک نیا دروازہ کھول گیا۔

اس کی دعاؤں کو قبولیت مل گئی تھی مریم پچھو بڑے مان سے اس کے لیے سوالی بن کر آئی تھیں۔ اس سے اسے یقین آ گیا کہ محبت ایک معجزہ ہوتی ہے، اس کی خاموش محبت بالآخر کامیاب ہو گئی تھی اس نے سرور کے عالم میں آنکھیں موند لیں۔ ایک سکون سا رنگ و بے میں اتر گیا۔ مگر سارے گھر میں ہچل سی مچ گئی۔ شیراز عزیز کا رشتہ کسی کو بھی قبول نہیں تھا۔

گھر میں سب لوگ اپنے طور پر اسے باہر حسن سے منسوب سمجھتے تھے۔ یہ رشتہ سب کے لیے ناقابل قبول تھا۔ تائی امی نے بذات خود اس سے بات کی جب اس نے بھی مروت کا چولا اتار پھینکا اور باہر حسن کے لیے صاف منع کر دیا۔

”میں نے ساری عمر اس گھر میں گزاری ہے، اب شادی کے بعد بھی اسی گھر میں نہیں رہنا چاہتی ویسے بھی میں باہر بھائی کا احترام کرتی ہوں اور ان کو اپنا بھائی سمجھتی ہوں۔“ اس کے صاف انکار پر سب ششدر رہ گئے۔

اس کے جواز قابل اعتراض نہیں تھے تاہم سب

ساتھ ہی تھا۔ فرخندہ کا رویہ اگرچہ روکھا اور خشک سا تھا مگر اس کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی تھی۔ دوسرے دن کی پہلی صبح میز انواع و اقسام کے لوازمات سے پر تھی اور یہ سب کچھ اس کے اعزاز میں کیا گیا تھا ورنہ وہ تو یہ سمجھ رہی تھی کہ جانے اس کے ساتھ کیسا سلوک کیا جائے گا۔

نئے دن کی پہلی صبح بہت خوب صورت تھی۔ وہ شیراز کی مخمور نظروں کے سامنے ٹھہر نہیں پاری تھی۔ وہ سلپنگ گاؤن بدل چکا تھا اور کلف لگے کرتا شلوار میں ملبوس ڈرینگ کے آئینے کے سامنے کھڑا خود پر بے دریغ کھنکھاتا رہا تھا۔ سارا کمر اٹھک اٹھا۔ ایک دم وہ پلٹا اور بیڈ کے پائنتی کھڑی شہزادہ کو الفت سے تھام لیا۔

”کیا سوچ رہی ہو؟ میرے بارے میں سوچ رہی ہوتا؟“ اس نے لگاوٹ سے پوچھا۔

”آن..... جی..... کچھ نہیں..... کچھ بھی تو نہیں.....“ وہ غیر متوقع سوال پر گڑبڑا گئی۔

”ارے..... کچھ کیسے نہیں..... اسے..... اوپر کی منزل کو استعمال میں رکھا کرو۔“ اس نے شرارت سے اس کی کپٹی پر انگلی سے دستک دی۔

اس وقت اس کے لبوں پر بھرپور مسکراہٹ تھی۔ ”کیسا لگا اپنا پورشن..... پسند آیا؟“ اس نے پھر ایک شرارتی جملہ کہا۔

وہ لب سے سن رہی تھی۔ اس کی باتیں اسے اچھی لگ رہی تھیں لیکن پھر اس نے کچھ سنجیدہ نوعیت کی باتیں شروع کر دیں۔

”دیکھو شہزادہ میں نے تمہیں اپنا یا ہے، اس گھر میں تمہارے سب سے زیادہ قریب اور تمہیں پیار کرنے والا میں ہوں اس لیے ہمیشہ مجھ پر بھروسہ کرنا، مجھے بھول کر بھی میرے بارے میں غلط مت سوچنا، جو بھی مسئلہ یا پریشانی ہو بلا جھجک مجھ سے شیئر کر لینا۔ سگے اور سوتیلے رشتوں میں بہر حال فرق تو ہوتا ہی ہے۔ یہ سب حاسد لوگ ہیں، دل میں کینہ رکھتے ہیں اور اوپر سے محبت سے

ملتے ہیں۔ کوئی بات ناگوار گزرے تو نہ ہی سانس برداشت کر لیتا۔ میں یہاں صرف بابا کی محبت میں رکا ہوا ہوں ورنہ میرا بس چلے تو ایک منٹ بھی ان لوگوں کو یہاں نہیں رہنے دوں کیونکہ شہزادہ بابا کی وارث کا حقدار میں ہوں اور اس گھر میں میری ماں کو رہنے کا حق تھا جسے ان ظالم لوگوں نے ان سے چھین لیا۔“

اس کی عجیب باتوں پر وہ پریشان سی ہو گئی لیکن سب سے زیادہ اطمینان بخش یہ بات تھی کہ اس ناموافق ماحول میں وہ اس کے ساتھ تھا۔

آج اس کا یہاں پہلا دن تھا اور گھر کے ماحول کو سمجھنے کے لیے وقت درکار تھا۔ ویسے بھی کسی کو جاننے کے لیے ایک لمبا عرصہ درکار ہوتا ہے۔ کسی کو سمجھنے میں زمانے لگ جاتے ہیں، وہ تو یہاں بالکل نئی تھی۔

”تم جلدی سے تیار ہو جاؤ، میں ابھی آتا ہوں۔“ اسے دعا دے کر وہ چلا گیا۔ شہزادہ کچھ دیر بے خودی کے عالم میں کھڑی رہی۔ شیراز اس کے خوابوں سے بھی بڑھ کر لگا تھا۔ اس نے میٹ کا پنک سوٹ زیب تن کر لیا جس پر ریشم کے دھاگوں اور رنگین پوت کا کام بنا ہوا تھا۔ میک اپ کے بعد اس نے رونمائی میں ملا ہاف سیٹ پہن لیا جو کہ مالیت کے اعتبار سے کافی قیمتی لگ رہا تھا۔ اس میں لگے ننھے، ننھے ٹکٹے لگا ہوں کو خیرہ کر رہے تھے۔ شیراز کا کیرئیر مضبوط اور مستقبل روشن تھا۔ اس لحاظ سے بھی وہ بہت خوش قسمت تھی۔ ابھی تک ان ماں بیٹیوں میں سے کسی نے بھی اس کی خبر نہیں لی تھی۔ شیراز کی دی ہوئی معلومات کی وجہ سے اب اسے ان کے نہ پوچھنے کا کوئی دکھ نہیں رہا۔ مگر ایک ملال سا تھا اسے امید نہیں تھی کہ یہاں ایسا ماحول ہوگا۔

دروازے پر ہولے سے دستک ہوئی تو وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی نندیں آئی ہوں گی مگر اس کے برخلاف ملازمہ ہاتھ میں ایک پلیٹ میں اورنج جوس کا گلاس لے کر چلی آئی۔

”سلام دلہن جی۔“ اس نے دانت نکال کر سلام کیا۔ ”کیا نام ہے تمہارا؟“ اتنی دیر سے اکیلے بیٹھنے

کوئی اثر نہیں ہوا تم پر..... تمہیں کیا معلوم اس گلاس میں
زہر ملا ہوا تھا۔“ اس کے انکشاف سے اس کا رواں،
رواں کا پ گیا۔
”زہر..... زہر.....“ اس کی آواز خوف سے
کپکپا گئی۔

یہاں موجود کھچاؤ کو اس نے محسوس تو کر لیا تھا مگر
اس حد تک ہوگا اس کا اندازہ نہیں تھا۔ اس کے چہرے
پر ہوائیاں سی اڑ گئیں وہ ہولے، ہولے کا پٹنے لگی۔
اسے اپنا آپ ایک دم غیر محفوظ سا لگنے لگا۔
شیراز نے آگے بڑھ کر اسے اپنے محفوظ حصار میں لے
لیا۔ اس کے وجود کی کپکپاہٹ اس سے مخفی نہیں رہی۔

”تمہیں کچھ نہیں ہوگا، میں ہوں ناں تمہارے
ساتھ، پریشان مت ہو، دیکھو یہاں تمہیں آنکھیں اور
کان کھول کر رہنا ہوگا۔ میں یہاں صرف بابا کی وجہ
سے رکا ہوا ہوں ورنہ وہ چالاک لومڑیاں بابا کا سارا
پیسہ ہضم کر لیں گی، تم یہاں صرف بابا پر ٹرسٹ کر سکتی
ہو۔“ وہ نرمی سے سرگوشی کرتا گیا۔
”خود کو سنبھالو اور اپنا حال صحیح کرو، ہمیں بابا کے
پاس چلنا ہے۔“ اس کے سہمے، سہمے چہرے پر پیار بھری
نظر ڈال کر اس نے تاکید کی۔

وہ بدستور اس کے حصار میں سٹی کھڑی تھی اس
کے ٹھوکا دینے پر بدقت چلنے پر آمادہ ہوئی۔
جب وہ اس کے ساتھ عزیز احمد کے کمرے میں
داخل ہوئی تو وہاں ایک نحیف و زار سے شخص کو دیکھا جو
آج اپنے کرتوتوں سے ان حالوں کو پہنچا ہوا تھا۔ ان
کے ہاتھوں میں رعشہ تھا اور دسے کے باعث سانس
بہت تیز چل رہی تھی۔ کسی کو پریشان کر کے انسان کبھی
خوش نہیں رہ سکتا۔

اس کے سلام کا جواب انہوں نے سر کے
اشارے سے دیا کہ سانس پھولنے سے بولنے میں
وقت ہوتی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد گلابو نے ناشتا میز پر چن
دیا اور جب وہ میز تک گئی تو..... فرخندہ اور ان کی
تینوں بیٹیاں بھی مصنوعی مسکراہٹ لیے وہاں موجود

بعد وہ خود ہی اس کا بولنے کا دل چاہا۔
”میرا نام گلابو ہے جی..... یہ جوس بیگم جی نے
میرا ہے آپ کے لیے۔“ اس نے احتیاط سے سائڈ
دل پر ڈھکا ہوا گلاس رکھ دیا۔

شیراز نے ایک سرسری نظر میں ہی اس کا حلیہ اور
انداز جانچ لیا۔ وہ بیس بائیس سال کی تھی لیکن بہت
جالاک اور تیز لگ رہی تھی۔ اس نے گہرے رنگ کے
کپڑے پہن رکھے تھے جو اس کے سانولے رنگ پر
بالکل بھی نہیں نہیج رہے تھے۔

”کوئی کام شام ہے تو بتا دیں دلہن جی۔“ اس
نے تابعدار انداز میں پوچھا۔

”نہیں، تم جاؤ، مجھے کوئی کام نہیں ہے۔“ اس
کے انداز سے اسے الجھن ہونے لگی۔ اتنی سی دیر
میں ہی وہ آنکھیں گھما، گھما کر کسی اچھے جاسوس کی طرح
سب طرف کا جائزہ لے چکی تھی۔

اس کے جانے کے بعد وہ کچھ دیر یونہی بیٹھی
سوچتی رہی پھر اورنج جوس پر نظر پڑی تو اسے اپنے خشک
حلق کا احساس ہوا۔

اس نے ابھی اورنج جوس کا گلاس اٹھا کر پینے کا
ارادہ ہی کیا تھا کہ شیراز چلا آیا۔

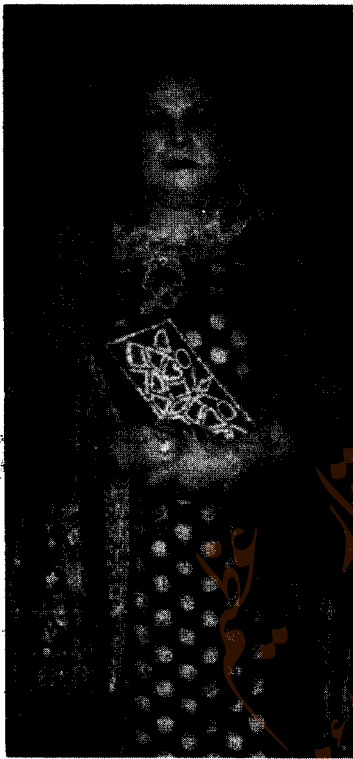
”ارے ٹھہرو..... یہ کیا کر رہی ہو تم؟“ اس نے
وہیں دروازے سے ہی آواز لگائی۔ وہ تاجی سے اسے
دیکھنے لگی۔ وہ تیز قدموں سے اس کے پاس آ گیا۔

”یہ کہاں سے آیا؟“ اس نے وحشت بھرے
انداز میں اس سے پوچھا۔

”ابھی ملازمہ دے کر گئی ہے۔“ اس نے حیرت
بھرے انداز میں جواب دیا۔

”دو ادھر مجھے..... مت پیو اسے.....“ اس سے
گلاس جھپٹ کر سارا جو اس نے واش روم کے مین
میں بہا دیا۔

وہ خاموش تماشائی بنی اس کی کارگزاری دیکھتی رہی۔
”میں نے صبح تمہیں ہوشیار بھی کیا تھا مگر اس کے
باوجود تم بے وقوفی کرنے جا رہی تھیں۔ میری باتوں کا



مصنفہ غزالہ فرخ اپنے عزیز کی شادی کے موقع پر

تھیں۔ اسے ان کی بناوٹی مسکراہٹ کے پیچھے چھپے مکروہ چہرے محسوس کر کے بہت دکھ ہوا۔ پُر تکلف ناشتے کے دوران مکمل خاموش رہی۔ اتنے خطرے کے باوجود شیراز کا ان لوگوں کو برداشت کرنا بہت حیران کن اور قابلِ تعریف بھی تھا لیکن اس اجنبیت اور خوف کی فضا میں اس کا دم گھٹنے لگا تھا اور وہ یہ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی کہ اس طرح وہاں کیسے وقت گزار پائے گی۔ ناشتے کے کچھ دیر بعد جب وہ شیراز کے ساتھ مریم پھوپھو کو سلام کرنے گئی تب اس نے سکھ کی گہری سانس لی۔

جب وہ شیراز کے ساتھ گھر لوٹی تو فرخندہ اور ان کی بیٹیاں اپنے اپنے کمروں میں بند تھیں ورنہ ان سب کے عجیب و غریب برتاؤ سے اسے الجھن ہونے لگتی تھی۔ صبح اس کی آنکھ کھلی تو شیراز اس سے پہلے جاگ چکا تھا اور کرسی پر بیٹھا ایک ننگ اسے دیکھے جا رہا تھا۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟“ وہ شرما ہی گئی۔

”مجھے خوشی ہے کہ تم جیسی خوب صورت، پیاری اور اپنی، اپنی سی لڑکی میری شریک سفر بن گئی۔“

اس کی تعریف پر وہ مغرورانہ انداز میں مسکرا دی۔ اسے فخر تھا کہ اس کا شوہر اس پر جان چھڑکتا ہے۔

”مجھے بھی اپنی خوش بختی پر ناز ہے کہ مجھے آپ جیسا ہم سفر ملا۔“ اس نے بھی اپنی چاہت کا یقین دلایا۔

”اب اٹھ بھی جاؤ۔ بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے۔ ویسے ہی رات کو نیند نہیں آئی۔“ اسے اپنے سہارے اٹھنے پر مجبور کرتے ہوئے اس نے کہا۔

”ارے..... نیند کیوں نہیں آئی؟“ اس نے کھمرے بال لپیٹتے ہوئے خوابیدہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”ایسے ہی..... بس تمہیں دیکھتا رہا..... جب زیادہ ایکساٹڈ ہوتا ہوں تو نیند اڑ جاتی ہے، میری خوشی سے۔“ اس کے والہانہ پن میں دیوانگی جھلک رہی تھی۔

”ارے واہ، میں نے تو سنا تھا کہ فکر کے مارے نیندیں اڑتی ہیں۔“ وہ بے ساختہ بولی۔

”ہوں، جب فرسٹرٹڈ ہوتا ہوں تب بھی کبھی ایسا

ہوتا ہے۔“

”اے ہاں۔“ اس کی دھاڑ پر وہ ایک زقند میں کمرے سے باہر نکل گئی۔

”خیال رکھنا شہزادہ اس دو نکلے کی ملازمہ کو منہ لگانے کی ضرورت نہیں۔ وہ اینجٹ ہے ان کی، جاسوسی کرتی ہے آکر ہماری۔“ اس نے خبردار کیا۔

اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ اس نے اسرار ماحول سے اسے کوفت ہونے لگی۔ کھل کر سانس لیتی بھی مشکل تھی۔

”میں ایک کام سے جا رہا ہوں اور پلیز تم اپنے ہی پورشن میں رہنا۔ ایک دو گھنٹے میں آ جاؤں گا میں۔ پھر ہم امی کی طرف چلیں گے۔“ ناشتے کے بعد اسے خاص ہدایت دے کر وہ دروازے کی طرف بڑھا اور پھر دوبارہ پلٹ آیا۔

”اداس مت ہونا اور پلیز اپنا خیال رکھنا کہ گلابو دوبارہ نہیں آئے بلکہ اندر سے دروازہ اچھی طرح بند کرلو۔ ریلیکس ہو کر بیٹھو، کہیں جانا مت، میرا انتظار کرنا۔“ اس کے چہرے پر بارہ بجتے دیکھ کر اس نے دلاسا دیا۔

اس کے جانے کے بعد وہ بے اختیار شیراز کے بارے میں سوچنے لگی۔ اسے شیراز کی ہمت اور حوصلے پر حیرت ہوئی کہ وہ اتنے ناپسندیدہ ماحول میں اپنا وقت گزار رہا تھا۔ فرخندہ کا سپاٹ چہرہ جذبات سے عاری لگتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سرد مہری تھی۔ وہ بظاہر لائق لگتی تھی مگر اس کی آنکھوں میں عجیب سی کھوج تھی۔

چار گھنٹے گزرنے کے بعد بھی شیراز واپس نہیں آیا تو اکیلے بیٹھے، بیٹھے گھبراہٹ ہونے لگی۔ وہ بے ارادہ باہر نکل آئی۔ جہاں لاؤنج پر ہو کا عالم طاری تھا۔ رہائشی کمروں کے دروازے بند تھے۔ سب اپنی محدود سی دنیاؤں میں مگن تھے۔ بیرونی حصے میں شیراز کی جھلک دیکھ کر وہ ٹھٹھک گئی۔ وہ ڈرائنگ روم کے دروازے سے اندر مستقل دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی اس کے پاس آگئی اور ادھر دیکھا جہاں وہ دیکھ رہا تھا۔ گلابو ہولے سروں میں گنگناتے ہوئے صفائی میں مصروف تھی۔ اسے بہت

معیوب محسوس ہوا۔ گلابو جو ان لڑکی تھی اور شیراز اسے مستقل نکلے جا رہا تھا۔

”تو یہ تھا آپ کا ضروری کام.....؟“ وہ چاہنے کے باوجود طعنے کرنے سے نہ رک سکی۔

”ارے، تم یہاں کیوں آگئیں؟“ اپنی محویت میں وہ اس کی آمد کو بھی نوٹ نہیں کر سکا۔

”ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو آیا ہوں میں، اب یہاں کھڑا اس کی نگرانی کر رہا ہوں، ان نوکروں کو اتنی چھوٹ نہیں دینی چاہیے مگر یہ ماں، بیٹیاں صرف عیش کرنا جانتی ہیں۔“ وہ سادہ سے انداز میں بتانے لگا۔

شہزادہ کو کچھ بھر پہلے کی سوچ پر شرمندگی ہوئی، وہ تو اپنی ذلت داری بھار رہا تھا اور وہ نہ جانے کیا سمجھ بیٹھی۔

پندرہ بیس دن بہت خوب صورت گزرے..... شیراز کی رفاقت میں اسے ذرا بھی یوریت نہ ہوئی لیکن جب وہ آفس جانے لگا تو اسے وحشت ہونے لگی۔

اکیلے بیٹھے کر وہ بیزار ہو گئی تو شام کو ایک سرسری جائزے کے لیے باہر نکل آئی۔ گھر میں چہل پہل کا احساس تھا۔ گلابو چمن میں برتن دھو رہی تھی۔ عزیز احمد مسکن دواؤں کے زیر اثر اپنے کمرے میں سو رہے تھے۔

فرخندہ کی بڑی بیٹی فرح کوئی ٹی وی شو دیکھ رہی تھی اور فرخندہ وہیں صوفے پر بیٹھی چائے پی رہی تھیں۔

اس نے اچھٹی نظر ان پر ڈالی اور شیراز کی ہدایت کے مطابق نظر انداز کر کے آگے بڑھ گئی۔ اسی پہل شیراز خلاف معمول جلد لوٹ آیا اور وہ خائف سی ہو گئی کیونکہ شیراز نے اسے بلا ضرورت وہاں جانے سے منع کیا تھا۔

”تم ادھر کیوں آئیں؟“ اس نے غصے سے پوچھا۔

”وہ..... وہ، بابا سے ملنے۔“ اسے بروقت یہی

بہانہ سوچ گیا۔

”بابا بہت دیر تک سوتے ہیں، تمہیں بتایا بھی تھا میں نے۔“ اس نے بھٹی ہوئی آواز میں اسے یاد دلایا۔ اس دوران وہ بہت محتاط انداز میں اس پاس نظر ڈال رہا تھا۔

”تم سے کسی نے کوئی بات تو نہیں کی؟“ اس

نے سوال کیا۔

”جی نہیں تو.....“ اس کے انتہائی سنجیدہ انداز پر وہ پریشان ہوئی۔

”شہزادہ تمہیں بتایا تھا میں نے کہ یہ سب مل کر میرے خلاف سازشیں کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ ان سب کی ہستی نظروں میں میرے لیے تحقیر ہوتی ہے، انہوں نے ہمیشہ مجھے خود سے الگ کر کے رکھا اب اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو..... تو میں برداشت نہیں کر سکتا۔“ وہ واپس اپنے پورن کی طرف اسے لے جاتے ہوئے خاص معلومات دیتا رہا۔

شہزادہ کچھ خوفزدہ، کھوئی کھوئی سی اس کے ساتھ اپنے پورن میں آگئی۔

”ایک گھنٹے بعد بابا اٹھ جاتے ہیں تم جب بابا کے پاس جانا اور وہیں بیٹھ کر گلابو سے چائے منگوانا بلکہ ہو سکے تو خود بنا لینا چائے، ان لوگوں کا کچھ بھروسہ نہیں۔ یہ لوگ دن رات ہماری جدائی کے منصوبے بنا رہے ہیں اور ہاں..... دوپہر کا کھانا بھی سب سے پہلے جا کر ہانڈی سے نکال لیا کرو..... بھری ہوئی ہانڈی میں وہ کچھ نہیں ملا سکتیں بلکہ میں کوشش کروں گا کہ تمہارا کچن ہی علیحدہ کر دوں تاکہ تمہیں بھی سکون ہو..... تم نہیں جانتیں شہزادہ یہ لوگ بہت چالاک اور خطرناک ہیں۔“ وہ دیر تک اسے سمجھاتا رہا اور شہزادہ ان حالات سے خوفزدہ اور پریشان سی سب باتیں سنتی رہی۔

یہ سب باتیں اس نے مریم پھوپھو سے بھی نہیں کہی تھیں کیونکہ شیراز نے اسے منع کیا تھا۔

”امی پریشان ہو جائیں گی..... بیکار میں ان کی طبیعت خراب ہوگی پھر۔“ اس نے خاص تاکید کی تھی۔ اس وقت تو اس نے تابعدارانہ بات مان لی تھی مگر اب اکیلے یہ بار سہ نہیں پارہی تھی۔

اگلے روز شیراز کا موڈ بہت خراب تھا۔ صبح اٹھ کر اس نے شہزادہ سے خاص بات نہ کی اس کے آفس جانے کے بعد وہ پھر تہارہ گئی۔ اسے شدت سے کسی ایسے راز دار کی ضرورت تھی جس سے دل کا حال کہہ دے یا پھر ان

خوفزدہ حالات کو بلانے کے لیے کسی ایسے دوست سے بہت ساری باتیں کرے، اس نے سہانہ کوفون کرنے کا ارادہ کیا۔ دروازہ کھول کر باہر جھانکا تو سب طرف سناٹا پھیلا تھا۔ لاؤنج خالی پڑا تھا لیکن فرخندہ ایک طرف بیٹھی کسی سے فون پر باتیں کر رہی تھیں۔ وہ خائف سی ہو کر آگے بڑھ گئی۔ فون تو ابھی مصروف تھا۔ ڈرائنگ روم سے فرح، زارا اور رملہ کی باتوں اور ہنسی کی آواز آرہی تھی۔ وہ لان کے ایک گوشے میں کھڑی ہو کر حالات پر غور کرنے لگی۔ اسی وقت گلابو کسی کام سے وہاں آئی تو اسے دیکھ کر ٹھٹھکی گئی۔

”دلہن جی..... آپ یہاں اکیلی کیوں کھڑی ہیں، بیگم جی کے پاس آ جائیں ناں.....“ اس نے پُرشوق نظروں سے دیکھتے ہوئے مخلصانہ مشورہ دیا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ فرخندہ کی خاص ایجنٹ ہے اور اسے اس کی جاسوسی پر لگایا گیا ہے۔ اس لیے اس پر ناگوار نظر ڈالی۔

”اپنے کام سے کام رکھو اور زیادہ مت بولا کرو..... چلی جاؤ یہاں سے۔“ اس نے بدلتی لہجے سے اسے جھڑک دیا۔

اس کی ڈانٹ سن کر گلابو کا کھلا، کھلا چہرہ اتر گیا۔ وہ چپ چاپ وہاں سے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد وہ لان میں جھپٹل قدمی کرتے ہوئے پھولوں کی مختلف اقسام کو دیکھتی رہی۔ اسی وقت گلابو ایک بار پھر چلی آئی۔ لیکن اس بار اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب تھی۔

”دلہن جی..... آپ کا فون ہے۔“ اس نے محتاط

انداز میں قدرے فاصلے سے ہی اسے اطلاع دی۔ وہ آنے والے فون کے متعلق سوچتی لاؤنج میں آئی تو وہاں فرخندہ اور فرح بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر دونوں کی باتیں سرگوشی میں بدل گئیں۔ اسے بہت غصہ آیا ان لوگوں نے پہلے ہی دن سے اس کے خلاف محاذ بنایا ہوا تھا۔ اس نے ریلوے پر کان سے لگایا تو دوسری طرف سہانہ تھی۔ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

وہ کچھ دیر لیٹی تو آنکھ لگ گئی۔ شام کو فرزانہ اور سہانہ کے ساتھ باتوں میں وقت کا پتا ہی نہیں چلا یہاں تک کہ شیراز کا فون خود ہی آ گیا۔

”کہاں ہو تم، کہاں چلی گئیں بغیر بتائے؟ حد کر دی تم نے غیر ذتے داری کی، دیکھو آئندہ میری مرضی کے بغیر کہیں مت جانا اور دوبارہ یہ غلطی بھی مت کرنا۔“ وہ غصے سے اس پر برسے لگا۔

شہزادہ دکھ اور تاسف سے سب سنتی رہی۔ شیراز نے اس سے وجہ معلوم کرنے کے بجائے اسے باتیں سنانی شروع کر دیں۔ اسے یقین تھا کہ یہ حرکت فرخندہ کی ہے۔ انہوں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اس کے خلاف شیراز کے کان بھر دیے تھے۔ اس نے یہ مشکل اپنا غصہ پیا اور مختصر سپاٹ سے انداز میں باپ کی حالت کے بارے میں بتا دیا۔ واپسی پر وہ وہیں اس کے میکے آ گیا۔

”سوری شہزادہ، مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تمہارے ابو کی اتنی سیریس حالت ہو گئی تھی۔“ اس کی متورم آنکھیں دیکھ کر اسے فوراً اپنی زیادتی کا احساس ہوا تو نرم لفظوں میں معذرت کر لی۔

اس روز شہزادہ نے گھر چلنے سے انکار کر دیا تھا۔ بے شک اس نے معذرت کر لی تھی۔ مگر اس کے رویے اور لہجے سے وہ بددل ہو گئی تھی۔ ویسے بھی اس وقت اس کی یہاں زیادہ ضرورت تھی۔

”بیٹا مجھے ابھی شہزادہ کی ضرورت ہے، اس کے ابو بھی اسپتال میں ہی ہیں۔ دعا کرو خیریت سے گھر آجائیں۔ کل آجائے گی یہ۔“ اس کی امی نے بڑھ کر اس کی یہاں رکنے کی راہ ہموار کی۔

وہ راضی تو نہ تھا مگر رضامندی دینی پڑی۔ جاتے وقت اس کی نظریں پلٹ، پلٹ کر شہزادہ کی طرف جاری تھیں۔ جیسے اس کے بغیر وہ جانا ہی چاہ رہا۔

”کل آ جاؤ گی ناں شہزادہ؟“ چلتے وقت اس نے یقین دہانی چاہی۔

”جی میں شام کو خود ہی آ جاؤں گی گھر۔“ اس

ہلدی سے گھر آؤ..... میں یہاں آئی ہوں۔ ابو اسپتال میں ایڈمٹ ہیں۔“ وہ روٹے ہوئے بات کر رہی تھی۔

اس کے اوسان خطا ہو گئے اس نے فوراً روانگی کا ارادہ کیا۔ شیراز کو فون ملانے کی کوشش کی مگر خدا جانے وہ کہاں مصروف تھا کہ فون نہ اٹھایا۔ آپریٹر نے اطلاع دی کہ وہ اس وقت آفس میں نہیں ہے۔ اس نے سوچا کہ گھر پہنچ کر اسے فون کر دے گی۔ وہ اپنا ہینڈ بیگ اٹھا کر تیزی سے باہر نکل رہی تھی کہ خلاف توقع فرخندہ نے اس کی راہ روک لی۔

”شیراز کی اجازت کے بغیر کہاں جا رہی ہو؟ اسے بتائے بغیر کہیں مت جاؤ۔ ورنہ پھر مجھے بتاؤ کہ کہاں جا رہی ہو اور کیوں جا رہی ہو؟ تمہارا ایسے جانا مناسب نہیں۔“ وہ دیوار بن کر سامنے کھڑی تھیں۔

اسے ان سے شدید نفرت محسوس ہوئی۔ ان کی دوغلی شخصیت اور منافقانہ طرز عمل سے کراہت محسوس ہوئی۔ اس وقت وہ ایسے فکر مند کی ظاہر کر رہی تھیں جیسے اس کے بہت قریب ہوں۔

”شکریہ..... میں شیراز سے خود بات کر لوں گی۔“ اس نے رکھائی سے جواب دیا۔ گھر پہنچی تو سہانہ کا رو، رو کر برا حال تھا۔ اس کے والد سراج احمد کو ایک ہوا تھا تاہم اب حالت خطرے سے باہر تھی۔ دیگر افراد خانہ اسپتال میں ہی تھے۔ اس نے سب سے پہلے فون کر کے باپ کی خیر خیریت دریافت کی۔ سارا گھر بکھرا ہوا تھا اور کھانا بھی تیار نہیں تھا۔ وہ ذتے داری سے بچنے میں چلی آئی۔ سہانہ نے سراج احمد کا بیڈ ٹھیک کیا اور پریشانی کے عالم میں بکھر جانے والے سامان کو سمیٹا۔ کچھ دیر بعد مریم پچھو اور باہر حسن چلے آئے۔ کچھ وقفے کے بعد تائی امی اور امی، واصف کے ساتھ چلی آئیں۔ سراج احمد کے پاس حسن احمد تھے۔ وہ اپنی امی کے گلے لگ کر سسک پڑی۔ اس وقت تائی امی بھی پچھلی تکیوں کو بھلا کر اسے تسلی دینے لگیں۔ ان سب باتوں میں اسے شیراز کو فون کرنا یاد نہیں رہا۔ کھانا کھا کر

شہزادہ کے آنسوؤں میں روانی آگئی۔ مگر شیراز نے اتنے پار بھرے انداز میں منایا کہ وہ زیادہ دیر تک انکار نہیں کر سکی۔ وہ اسے اپنے ہاتھوں سے لٹے بنا، بنا کر کھلا تارہا۔ اس کے دل پر چھائی کلفت دور ہوگئی۔ صبح بیدار ہوئی تو طبیعت بھاری سی تھی۔ شیراز کمرے میں موجود نہیں تھا۔ شاید وہ آفس جا چکا تھا۔ وہ ناشتے کے ارادے سے کچن میں چلی آئی۔ گلابو نے اس کی شکل دیکھتے ہی جھٹ سلام کیا اور مستعدی سے چائے کا پانی چلے پر رکھ دیا۔

اسی اثنا میں شیراز جانے کہاں سے چلا آیا۔ ”تم یہاں کیوں آئی ہو؟ کیا تم پھر مجھے چھوڑ کر جا رہی ہو۔ دیکھو آخری بار وارن کر رہا ہوں کہ آئندہ مجھ سے پوچھتے بغیر تم کہیں نہیں جاؤ گی۔ اے گلابو..... چلو جا کر گیٹ پر تالا ڈالو۔ دیکھتا ہوں یہ کیسے جاتی ہے یہاں سے۔“ اس نے بد مزاجی سے گلابو کو حکم دیا۔ غصے اور رنج سے شہزادہ کا برا حال ہو گیا۔ وہ اسے دل کے اوپر نچے سگھائیں پر بٹھا کر دیوانہ وار اس کی پرستش کر رہی تھی اور وہ بھی عام سا شکی اور تنگ نظر مرد نکلا۔ ”بس کرو شیراز، حد ہوتی ہے تنگ نظری کی بھی..... میرے باپ کو ہارٹ ایک ہوا تھا اس لیے گئی تھی میں وہاں اور یہ بات تم کو بھی معلوم ہے پھر بھی تم میرے ساتھ یہ سلوک کر رہے ہو۔“ غصے کی آخری حدوں پر پہنچ کر وہ چیخ پڑی۔

”زبان چلاتی ہو میرے سامنے۔“ وہ اس بری طرح دھاڑا کہ وہ دہل کر رہ گئی۔ اس نے آگے بڑھ کر اس پر ہاتھ اٹھانا چاہا مگر اسی وقت فرخندہ چلی آئیں۔ ”کیا ہو رہا ہے یہاں، شیراز تمہارے بابا تمہیں بلارہے ہیں۔“ فرخندہ نے بروقت مداخلت کر کے اسے وہاں سے ہٹایا۔

اور وہ فرخندہ کے ایک اشارے پر ان کے کندھے سے لگ کر سکنے لگی۔ وہ کسی دھڑلے سے سبیل کی طرح اسے اپنے ہمراہ اپنے کمرے میں لے گئیں۔ ”آرام سے یہاں بیٹھو اور سکون سے میری

نہ جواب دیا۔

رات گئے اس کا فون چلا آیا۔ وہ اس کے بغیر بے قرار تھا۔ اس کی تڑپ محسوس کر کے شہزادہ کا غصہ بھی اتر گیا۔

”تم کل آ جاؤ گی ناں.....؟“ وہ فون پر بھی بار، بار پوچھ رہا تھا۔

اگلا دن کافی مصروف گزرا۔ چونکہ ایک معمولی نوعیت کا تھا اس لیے شام تک سراج احمد ڈسچارج ہو کر گھر آ گئے۔ ابھی وہ گھر جانے کی تیاری کر رہی تھی کہ شیراز کا فون چلا آیا۔

”شہزادہ کہاں ہو تم، خیریت سے پہنچ گئیں گھر؟“ اس نے بے تابانہ پوچھا۔ لگ رہا تھا کہ آفس میں بھی وہ صرف اسی کو سوچ رہا تھا۔ اس احساس نے اسے سرشار کر دیا۔

اس نے شیراز سے کہہ دیا کہ وہ کچھ ہی دیر میں گھر کے لیے نکلے والی ہے مگر جب وہ جانے کے لیے اٹھی تو اس وقت کچھ لوگ سراج احمد کی عیادت کے لیے آگئے لامحالہ اسے بھی رکنا پڑا۔ گہری شام اتر آئی، وہ رات کو دیر سے گھر پہنچی۔ راستے میں بار، بار شیراز کا خیال آتا رہا۔ وہ گھر پہنچی تو وہ بے تابی سے اس کا منتظر تھا۔ اس نے جب دیر سے لوٹنے کی وجہ بتائی تو وہ غصہ سے بھر گیا۔

”یہاں میری جان پر بنی ہوئی تھی اور تم وہاں مہمانداری میں لگی ہوئی تھیں۔ گھر میں اور لوگ نہیں تھے کیا؟“ وہ بری طرح سے بول رہا تھا۔

شہزادہ پریشان اور خوفزدہ ہونے کے ساتھ روکھی بھی ہوگئی۔ پہلے ہی باپ کی طرف سے پریشان تھی، ذہنی اور اعصابی تناؤ نے اسے نیم جان کر دیا۔ وہ بیڈ پر نیم دراز آنسو بہاتی رہی۔

کافی دیر بعد وہ کھانے کی ٹرے سجائے چلا آیا۔

”چلو اٹھو، پہلے ہی اتنی تھک رہی ہو، کھانا کھاؤ

میرے ساتھ۔“ اس نے بعد اصرار اسے بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔

گئی۔ ان انکشافات نے اس کے نازک دل کو بری طرح مجروح کر دیا تھا۔

”یہ سب کچھ تمہیں پہلے نہیں بتا سکی اس کے لیے معذرت کیونکہ جب تم میرا یقین نہیں کرتیں۔ جب تم صرف شیراز کا یقین کرتیں۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے کہ میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکی۔ میں پہلے تمہیں حقیقت نہیں بتا سکتی تھی کیونکہ میری حیثیت معتبر نہیں تھی۔“ دکھ کے گہیرا احساس سے شہزادہ کے ماند چہرے پر دھواں سا اڑ گیا۔ اس کے نازک جذباتوں کو بری طرح چھین پھینچتی تھی۔ عزیز احمد نے بڑی جالاکی سے پرانے رشتے کو استوار کر کے اسے استعمال کر لیا تھا۔ اس کے دل کو کھلوانا بنایا گیا تھا۔ لیکن اب وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی کیونکہ شیراز عزیز کو تو اس نے خود دل و جان کی گہرائیوں کے ساتھ اپنے رب سے مانگا تھا۔ شیراز اس کی محبت تھا مگر یہ محبت اب اس کے لیے آزمائش بن گئی تھی اور ... بہر صورت اسے اپنی محبت نبھانی تھی۔

کرب کے ان لمحات میں بابر حسن کا سادہ سا سراپا اس کے خیالوں میں جھلکا۔ اپنی ایک بھولی بری غلطی کے ازالے کا فیصلہ اس نے اسی وقت کر لیا۔ اس نے فرخ کو بابر حسن کی زندگی میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

اسی وقت شیراز اسے ڈھونڈتا اور پکارتا ہوا وہاں چلا آیا۔

”کہاں تھیں تم..... دیکھو پلیز مجھے اکیلا چھوڑ کر مت جانا۔“ اس نے مغبوطی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں بچپن کی محرومی اور جدائی کا خوف جھلک رہا تھا جس نے اسے ڈپریشن کا مریض بنا دیا تھا۔ شہزادہ نے آنسو پی کر حسرت سے اپنی محبت کو دیکھا اور پھر بے اختیار اس کے ہاتھ میں مقید اپنے ہاتھ پر دوسرا ہاتھ بھی رکھ دیا کیونکہ وہی اس اس کا سب کچھ تھا۔

”میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی شیراز.....“ اس کے چہرے پر اطمینان بھری مسکراہٹ تھی۔

”فرماندہ اس سے مخاطب تھیں۔

وہ نام بھی سے انہیں دیکھنے لگی۔ زار انے اسے ٹھنڈا پانی پلایا اور فرخ کسی گہری دوست کی طرح اس کا سر دھاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبانے لگی۔

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کہاں سے بات شروع کروں۔“ انہوں نے بات کا آغاز تو کر دیا مگر پھر کچھ پل کے لیے درمیان میں وقفہ آ گیا جیسے بولنے کے لیے لفظوں کو اکٹھا کر رہی ہوں۔

”شیراز سے تمہاری شادی کرنے میں میری مرضی بالکل نہیں تھی بلکہ میں تو ابھی اس کی شادی ہی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ جب تک کہ وہ سیٹ نہیں ہو جاتا لیکن عزیز کو اکلوتے بیٹے کی نسل دیکھنی تھی انہوں نے میری بات نہیں سنی۔ شیراز نے عمر کے کئی سال اپنی ماں کے پاس گزارے لیکن جب میں بد نصیب عزیز کو بیٹا نہ دے سکی تو وہ سازشی ہتھکنڈوں سے شیراز کو اس کی ماں سے جھین کر دور لے گئے اور اس طرح شیراز کی شخصیت مسخ ہو گئی۔ وہ ہم سب کے درمیان رہ کر بھی الگ تھلک رہتا تھا۔ ماں کو یاد کر کے غمگین رہتا تھا۔ اسے ہم سب سے پڑھتی، وہ ہم سے نفرت کرتا تھا۔ عزیز یہ بات نہیں سمجھتے تھے، ان کا خیال تھا کہ یہاں پیسہ اور عیش دیکھ کر وہ سب کچھ بھول جائے گا مگر ایسا نہ ہوا۔ جب اس کی ذہنی ابتری ہم پر عیاں ہوئی تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ ڈپریشن کا مریض بن چکا تھا۔ وہ ہم سب پر شک کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ ہم اس کے کھانے میں زہر ملا رہے ہیں۔ اسے جلد غصہ آ جاتا ہے لیکن وہ دل کا اچھا ہے۔ اس نے کبھی ہم کو نقصان پہنچانے کی یا تنگ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ دل کا کھلا ہے سارا مگر اسی پر چل رہا ہے۔ بس یہ ایک خرابی ہے اس میں، عزیز نے اسے سائیکارٹسٹ کو دکھا رکھا ہے، علاج چل رہا ہے اس کا وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ اسے تمہارا محبت بھرا ساتھ ملا رہے گا تو وہ جلدی ٹھیک ہو سکتا ہے۔“ فرخندہ دھیرے، دھیرے بتاتی چلی گئیں۔

اور شہزادہ دم بخود، سانس روکے، بت بنی چلی

جھلک شع تفسیر

دولہا صاحب ہمیں پنکھا جھلتے رہے اور کبھی ہم انہیں.....
 ”آئی ایم سوری یار..... دراصل ہمارے علاقے
 میں لائٹ بہت جاتی ہے لیکن ایسا بھی نہیں ہوتا آج تو حد
 ہی ہو گئی ہے۔“ ہمارے دولہا ہمیں پنکھا جھلتے ہوئے کہہ
 رہے تھے۔
 ”تو..... کم سے کم شادی کے دنوں کے لیے تو آپ
 کو جزیئر کا انتظام کر لیتا چاہیے تھا۔“ ہم جھجکتے ہوئے

آف یہ گرمیوں کی شادی..... پہلے پارلر..... پھر
 شادی ہال پورے آٹھ گھنٹے ہم دہن کم اسٹیجوز یادہ بن کر
 بیٹھے رہے۔ جب کمرے میں آنا نصیب ہوا تو ہمارے ری
 قسمت لائٹ چلی گئی..... اور پھر ایمر جنسی لائٹ کی کام
 چلاؤ قسم کی روشنی میں ہمارے دولہانے ہمارا اور ہم نے
 ان کا دیدار کیا..... پوری رات بجلی کی آوت جاوت جاری
 رہی اور یہ خوب صورت رات اس طرح گزری کہ کبھی



شادی کے اولین دن..... ہیٹ اسٹروک والی گرمی اور ہماری ساس امی کا سنگین مطالبہ.....

”دلہن جھلمل کرتے کپڑے پہنو..... کوئی ہمارے گھر آجائے تو اسے پتا تو لگے کہ تم نئی دلہن ہو چلو فوراً یہ سوتی کپڑے بدل کر ذرا چمک دکھ والے کپڑے پہن کر آؤ۔“ انہوں نے پیار بھرے لہجے میں حکم سنایا۔

”سوتی کپڑے.....“ ہم نے روتے ہوئے دل کو سنبھالا۔ ہمارے میکے کے پانچ ہزار والے لان کے سوٹ کو انہوں نے سوتی کپڑے کہہ کر دو ٹکے کا کر دیا تھا۔ ہم خاموشی سے جھلمل کرتے کپڑے پہن کر آئے تو ساس کے ساتھ، ساتھ ندیں بھی خوش ہو گئیں۔

”اللہ بھائی، بہت پیاری لگ رہی ہیں آپ۔“ اسٹروالے کپڑے، دوپہر کا دقت، لائٹ ملتی ہوئی تھی تاہم ہم نے چہرے پر مسکراہٹ سجائی ہوئی تھی۔ ان سب کی محبت کے آگے ہم مجبور تھے اور پھر لحاظ و مروت کا جذبہ بھی ہم میں بدرجہ اتم پایا جاتا تھا پھر میاں صاحب کی ہدایت.....

”سب کا دل رکھنا ماہم جانو.....“ سوہم خاموش۔

☆☆☆

ایک ہفتے کے اندر، اندر کھانا پکانے میں ہمارا ہاتھ لگوادیا گیا، ہم خوش تھے کہ اس روٹین ورک کے ساتھ گوئے کناری اور جھلمل کرتے کپڑوں سے نجات مل جائے گی..... بری میں تو ایک بھی لان کا سوٹ نہیں تھا۔ تاہم ہم جھنڈے میں تین لان کے سوٹ بھی لے کر آئے تھے ارادہ تھا کہ عیسر سے کہہ کر اور بنوائیں گے..... مگر ظلم پر ظلم کہ یہاں تو ہمیں لان کے سوٹ پہننے کی اجازت ہی نہیں تھی۔

ہنڈیا باندھیں تو جھلملاتے کپڑوں میں، چھاڑو پوچا کریں تو جھلمل کرتے کپڑوں میں، حتیٰ کہ روٹی بھی اسی طرح پکاتے..... ہمارا تو جسم گرمی دانوں سے پک کر رہ گیا تھا۔ ہم نے اندازہ لگایا کہ محلے سے آنے والی خواتین بھی ہمیں اور ہمارے کپڑوں کو عجیب نظروں سے دیکھتی ہیں۔ ”شاید ہمیں پاگل سمجھتی ہوں۔“ ہم دل ہی دل میں کس کر رہ جاتے۔

☆☆☆

ہلے ساتھ ہی ان کے ہاتھ سے پٹکھالے کر کہا۔ ”اب ہماری باری ہے، ہم آپ کو پٹکھالیں گے۔“

شاید وہ ہماری اس اداسے گھائل ہو ہی گئے تھے اسی لیے ہمیں پیار بھری نظروں سے دیکھ کر بولے۔ ”میں تمہیں چھوٹا سا ایمر جنسی فین لادوں گا..... ٹھیک۔“

”چھوٹا سا کیوں، بڑا سا کیوں نہیں۔“ اس وقت پسینہ ہمارے سر سے پیر تک چوہنیوں کی طرح رینگ رہا تھا سو چھوٹا پٹکھا ہمیں از حد نا کافی سالگا۔

”تا کہ تم دن میں اسے اپنی الماری میں چھپا کر رکھ لیا کرو..... رات میں جب ہم کمرے میں آیا کریں گے تو چارج کر لیا کریں گے۔ پھر جب بھی رات میں لائٹ جایا کرے گی تو میری ماہم جانو غچھے کی ہوا میں سکون سے سو جایا کرے گی۔“ عیسر بڑے لاڈ سے بولے مگر ہم تو غچھے کو الماری میں چھپانے والی بات پردنگ سے رہ گئے تھے۔

”الماری..... میں..... چھپانا کیوں ہے؟“ ہم نے اس طرح ان کی طرف دیکھا جیسے اُن کے سر پر سینک نکل آئے ہوں۔

”ارے یار..... اب تم سے کیا چھپانا ہماری اماں ذرا الگ..... کفایت شعار ہیں۔“ ہمیں محسوس ہوا کہ وہ کنجوس کہتے، کہتے رک گئے ہیں۔

”تو؟“ ہم نے سوالیہ نگاہوں سے انہیں دیکھا۔ ”جنریٹر، یو پی ایس، ایمر جنسی فین یہ سب ان کی نظر میں پیسے کا زیاں ہے۔“ انہوں نے ہماری حیرت کو صدمے میں بدلتے ہوئے کہا۔ اسی لمحے لائٹ آگئی تو ہم سر جھکا گئے۔

”میں تو تمہاری تعریف بھی نہیں کر سکا..... سوری یار..... چلو اب تمہارے حسن کو خراج تحسین پیش کیے دیتے ہیں۔“ انہوں نے خوب صورت رنگ ہماری انگلی میں پہناتے ہوئے ہمیں محبت پاش نگاہوں سے دیکھا تو ہم..... ہمارے اندازے کے مطابق لالوں لال نہ سہی گلابی سے تو ہو ہی گئے ہوں گے۔

☆☆☆

جھلمل

ہی سے آئی ہوئی تھیں۔ ہم سب مل کر ہی کام کر رہے تھے۔ شام ہونے تک گھر بالکل ششے کی طرح چمک گیا تھا اور کھانے بھی تیار ہو چکے تھے، صرف بریانی کی دیگ باہر سے آئی تھی۔

”چلو دہن اب تم بھی تیار ہو جاؤ نہادھو کے۔“ ہماری ساس نے تمام انتظامات سے مطمئن ہونے کے بعد کہا۔

”سنو ماہم..... اپنا چوتھی والا جوڑا پہن لینا وہ دیے بھی تم نے بہت کم پہنا ہے۔“ بڑی مند بولیں۔

”سینٹ بھی اس کے ساتھ کا ہی پہن لینا، تین لڑی والا۔“ منجلی نندنے بھی حسب توفیق مشورہ دیا۔

”مگر..... وہ سوٹ..... کچھ اور نہیں ہو جائے گا۔“ ہم نے دے، دے، دے لےجے میں نرم سا احتجاج کیا۔ ایک تو پتا نہیں کیوں ان لوگوں کے سامنے بولتی بند ہو جاتی تھی۔

ساتھ ہی خود کو دل ہی دل میں کوسا۔

”ارے دہن یہ کیا بات کی تم نے، اتنا جھلمل کرتا جوڑا ہے کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہو جائیں اور تمہاری نظر میں ہی نہیں ساربا۔“ ساس گویا برامان کر بولیں۔

”نہیں، نہیں، ہائی سوٹ تو بہت خوب صورت ہے، ہمیں پسند بھی ہے، ہم تو بس اس وجہ سے کہہ رہے تھے کہ نرم گرم سا موسم ہے اور پھر تقریب بھی گھر ہی گھر کی ہے۔“

ہم نے ان کی ناراضی سے گھبرا کر کہا۔

”پورے چار ہزار کا لائی تھی میں لالو کھیت کی مارکیٹ سے آج سے دو سال پہلے..... اب تو کوئی چھ ہزار کا بھی نہ دے۔“

وہ فخریہ لہجے میں بولیں تو ہم سر تسلیم خم کرتے ہوئے مذکورہ سوٹ استری کرنے چل دیے۔

☆☆☆

مہمان آچکے تھے، شادی کی تاریخ مقرر ہو چکی تھی اب کھانا لگایا جا رہا تھا ہماری دونوں بڑی ندیں ہمارا...

بھرپور ساتھ دے رہی تھیں، آخر چھوٹی بہن کی سسرال کا معاملہ تھا۔

ہم اسی جھلمل کرتے جوڑے میں ادھر سے ادھر کام کرتے پھر رہے تھے۔ مہمانوں کی نظروں میں عجب سا

☆☆☆

یوں ہی جھلمل کرتے کپڑوں میں ڈیڑھ سال گزر گیا۔ بری جہیز کے جوڑوں کا خوب، خوب استعمال کروادیا گیا۔ اسی دوران پیارا سا عابس بھی ہماری گود میں آ گیا۔

ایک روز ہماری بیسٹ فرینڈ ماہم سے ہماری درد بھری کھانا سن کر کہنے لگی۔

”تم ہی پاگل بنی جا رہی ہو..... بے وقوف اس طرح تمہاری ساس اپنا خرچہ بجا رہی ہیں..... لان کے ڈھنگ کے ایلمبر انڈر ڈسٹ کوئی سستے تو آتے نہیں

ہیں، اسی لیے انہوں نے شروع سے تمہیں جہیز، بری کے جوڑوں پر رکھا ہے تاکہ لان کے سوٹوں کا سلسلہ ہی شروع نہ ہو۔“

”واہ بھی واہ بڑی دور کی کوڑی لائی ہو تم..... کیا بے وقوفوں کی سی باتیں کر رہی ہو ماہم..... اس طرح بھلا وہ کب تک اور کتنا پیسہ بچا پائیں گی.....“ ہم نے اس کی بات کو سرے سے مسترد کر دیا۔

”ہزاروں روپے تو بچا ہی چکی ہیں وہ اب تک اور ہا سوال کب تک کا..... تو جب تک تمہاری چھوٹی نند کی شادی نہیں ہو جاتی۔“ اس نے اتنے دھوکے سے کہا جیسے

ہماری ساس اسے بتا کر ہی ایسا کر رہی ہوں۔ مگر ہمیں بڑا برا لگا کہ ہماری ساس کی سادگی اور اکلوتی بہو سے لگاؤ کو وہ خود غرضی اور چالاکی کا نام دے رہی تھی۔

”ماہم ایک بات کہیں؟“ ہم نے اس سے پوچھا۔

”ہاں، ہاں کہو۔“ اس نے فراخ دلی سے اجازت دی۔

”اپنی مکار اور وہی سسرال کا اثر تم پر بھی ہو گیا ہے، ہر بات کا منہ پہلو دیکھنے لگی ہو تم، ہمیں تو مکار، مکاری لگ رہی ہو اس وقت بھی۔“ ہم نے شرارت آمیز نگاہوں سے اسے دیکھا تو وہ ہمیں گھور کر رہ گئی۔

☆☆☆

ہمارے گھر میں ایک ہنگامہ مسرت پیا تھا کہ ہماری سب سے چھوٹی نند کی شادی ہونا قرار پائی تھی۔ آج شادی کی تاریخ مقرر ہونا تھی۔ صبح سے گھر میں دھواں دھلا نا کھانا پکانا چل رہا تھا۔ بڑی دونوں شادی شدہ ندیں بھی رات

تخرو ہم اپنے لیے محسوس کر رہی رہے تھے تاہم ابھی تک کسی نے کہا کچھ نہیں تھا۔

ہم کولڈ ڈرنکس لے کر ایک بار پھر کچن سے ڈرائنگ روم میں چلے آئے اور سب کو سرو کرنے لگے کہ اچانک ہی ہماری چھوٹی نند نامعہ کی ہونے والی نند نے ہمیں مخاطب کیا۔

”بھابی آپ کو گری نہیں لگ رہی؟“

”نہیں اب کہاں گرمی..... اب تو موسم بدل رہا ہے۔“ ہم بات سمجھ تو گئے تھے لیکن قصداً نارل انداز میں کہا۔

”اصل میں آپ کا سوٹ ہے تو بہت خوب صورت مگر تھوڑا ہیوی ہے اور آپ مسلسل کاموں میں مصروف ہیں ناں اس لیے گڑبانے پوچھا۔“ اس بار نامعہ کی جیشانی مسکراتے ہوئے بولیں۔

”میں بھی ماہم سے یہی کہہ رہی تھیں۔ مگر دراصل ماہم کو اس طرح کے کپڑے بہت پسند ہیں، کہنے لگی بھیا اب تو اکتوبر شروع ہو گیا ہے اب تو ہم اس طرح کے کپڑے پہن سکتے ہیں، اب کیا کریں جو ان کی پسند وہ ہماری پسند.....“ بڑی تند جلدی سے بولیں اور ہم انہیں حیرت سے دیکھتے رہ گئے۔

”بہت کہتے ہیں بہو سے کہ دلہن اب تو بازار میں ایک سے ایک ایبیر انڈری والے کاشن کے سوٹ ملتے ہیں اب ان ہی کا فیشن ہے مگر نہ بھی ہماری دلہن کو تو اب بھی دلہن لگنے کا شوق ہے، یہ کھڑی ہے سامنے خود پوچھ لو.....“ ساس امی پیار بھرے لہجے میں فرائٹ سے جھوٹ بول رہی تھیں اور ہمارا سادہ اور معصوم دل ڈیڑھ برس سے کچلے جانے والے ارمانوں کی دہانیاں دے رہا تھا۔

”بھئی نامعہ کی بری میں تو آپ لوگ ڈیزائنرز لان کے سوٹ بھی ضرور رکھیے گا، ہماری نامعہ میں ڈرینگ سینس بہت زیادہ ہے۔ اسے یہ تمام جھام کچھ زیادہ نہیں بھاتا۔“ جھلی نندنے لگے ہاتھوں موقع سے فائدہ اٹھایا۔

اسی وقت ہمیں محسوس ہوا کہ ہمارے جھمللاتے کپڑوں کے ساتھ، ساتھ ہماری آنکھیں بھی بس جھمللانے ہی والی ہیں، سو عابس کے رونے کا بہانہ کر کے کمرے میں چلے آئے اور ڈیڑھ برس کے آنسو ڈیڑھ

منٹ میں بہا کر بقیہ آدھے سیکنڈ میں ایک فیصلہ کر کے ساس نندوں کو تصویر کی آنکھ سے معاندانہ اور پھر فاتحانہ نگاہوں سے دیکھا اور فیس پاؤڈر سے چہرہ درست کر کے کچن کی طرف چل دیے۔

☆☆☆

ماہ اکتوبر کی اگلی شام ہمارے لیے بڑی خوشگوار اور سہانی تھی..... کہ ہم ہشاش بشاش، تک سب سے تیار، پرس کا ندھے پر ٹانگے، عابس کو گود میں اٹھائے عمیر کے ہمراہ کمرے سے برآمد ہوئے۔

”ارے دلہن کہاں کی تیاری ہے، تم نے بتایا بھی نہیں۔“ حسبِ عادت انہوں نے عمیر کے بجائے ہم سے سوال کیا۔

”اماں شاپنگ مال جا رہے ہیں۔ گزشتہ رات ہونے والی عزت افزائی ہمارے دل و دماغ میں اب تک تروتازہ تھی سو پھر پورا اعتماد سے جواب دیا۔

”وہ کیوں.....؟“ وہ بھونچکی سی ہوئیں، کمک کے لیے بیٹھیاں بھی موجد نہ تھیں۔

”کاشن کے ایبیر انڈر ڈسوٹ لینے۔“ ہم نے ان کی حیرت کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے کہا۔

”مگر دلہن اب تو سردیوں کی آمد، آمد ہے۔ اور سردی کے موسم میں تو ہر طرح کے کپڑے چل جاتے ہیں سردیوں میں تو یوں ہی گزارا ہو جائے گا۔“ وہ جزبہ ہوئیں۔

”ارے اماں رات سب ٹھیک ہی کہہ رہے تھے، اب یہ جھملل کرتے کپڑے اولڈ فیشن ہو گئے ہیں اب تو لان کاشن کا زمانہ ہے اور آپ ہی تو بتا رہی تھیں کہ بازار میں بہترین ایبیر انڈری والے سوٹ آئے ہوئے ہیں تو بس سوچا فوراً جا کر چار پانچ ریڈی میڈ سوٹ ایک ساتھ لے آئیں پوری سردی مزے سے گزر جائے گی ہماری تو..... آپ کے لیے سوٹ کا کپڑا لے آئیں گے..... ٹھیک ہے ناں.....“ جو آدھ چارو ناچار اثبات میں سر ہلاتیں اور ہم خوشی سے جھملل کرتی آنکھوں کے ساتھ میاں جی کے سنگ چل دیے۔

”ندا اٹھو یا رنشتا بنا دو میں لیٹ ہو رہا ہوں۔“ احمر نے
واش روم میں جھپاک سے گھٹتے ہوئے کہا ندا نے ذرا کی ذرا
آنکھیں کھولیں۔ خوابیدہ نگاہوں سے کمرے کی چھت کو گھورا
اور دوبارہ سے کمرے میں اوڑھا اور کروٹ بدل کر سو گئی۔

احمر تو لیے سے بال رگڑتا ہوا کمرے میں آیا تو
ٹھٹک کر رک گیا، ندا بے سدھ سو رہی تھی۔

”ندا یا رکیا ہو گیا ہے۔“ احمر نے اس کے اوپر سے
کمرے کھینچا۔ تو ندانے سردی سے خائف ہو کر اپنی ٹانگوں
کو اکٹھا کر کے پیٹ کے ساتھ لگا لیا، احمر نے ندا کے
گٹھری بنے دھان پان سے وجود کو دیکھا وہ اتنی مضحکہ خیز

احمر نے کسلندی سے کروٹ بدلی اور مندی،
مندی آنکھوں سے اپنے پہلو میں لیٹی ندا کو دیکھا۔ وہ
سوئے میں بھی مسکرا رہی تھی احمر کے لبوں کو بھی ایک مسکور
کنی مسکان نے چھوا۔ چند ٹاپے احمر ایسے ہی جویت
سے ٹھٹکی باندھے ندا کو دیکھتا رہا۔

رات سے اماں کی طبیعت ناساز تھی۔ احمر کے
ذہن میں آیا اور وہ ایک جھٹکے سے کمرے پرے دھکیلا غلجٹ
میں بیڈ سے اترا اور کمرے کے پردے سرکا دیے۔ ملگجا
اندھیرا چھا تو کبراروشنی سے بھر گیا احمر نے سیل فون اٹھا
کر ٹائم دیکھا۔ آفس ٹائم ہونے جا رہا تھا۔

گھر گھر وندنا

فوزیہ احسان رانا



لگ رہی تھی کہ بے ساختہ اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔
 احمر نے ندا کے اوپر کھل ڈال دیا اور خود وہ آفس
 کے لیے تیار ہونے لگا۔ ندا اس سے مس نہیں ہوئی۔ احمر
 مصروف سے انداز میں اسے ایک نظر دیکھتا رہا۔ اسے ندا
 کی ڈھٹائی پر دکھ بھی ہوا۔ وہ بدستور سوئی رہی۔ ندا کو
 چنداں پروا نہیں تھی بس اپنی نیند ہی پیاری تھی۔ احمر نے
 کمرے سے نکلنے ہوئے ایک تاسف بھری نگاہ اس پر
 ڈالی اور آہستگی سے دروازہ بند کر کے باہر نکلا اور بغیر ناشتا
 کیے ہی آفس چلا گیا۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا تھا... شکیلہ بیگم
 ہمیشہ ہی احمر کے لیے اس کی پسند سے ناشتا بنایا کرتی تھیں۔

احمر ان کا اکلوتا بیٹا تھا، بیوہ ماں کا سہارا تھا بہت ہی اچھا
 اور تابعدار بیٹا تھا۔ شکیلہ نے بہت چاؤ اور ارامانوں سے
 احمر کی شادی کی تھی اور شادی کے بعد بھی وہ بیٹے اور بہو
 کے لیے کھانا، ناشتا خود بنایا کرتی تھیں بہت سختی خاتون
 تھیں انہیں بیٹھنے کی عادت تو تھی ہی نہیں اس لیے ہر وقت
 کسی نہ کسی کام میں لگی رہتی تھیں۔ کل رات سے انہیں ہلکا
 سا بخار تھا وہ سو نہیں پاتی تھیں یہی وجہ تھی کہ احمر بھی رات
 بھر ڈھنگ سے آرام نہیں کر سکا تھا اور ندا..... اس نے تو
 شکیلہ کے کمرے میں جھانک کر بھی نہیں دیکھا تھا جلدی
 ہی سو گئی تھی اور اس کی نیند اب بھی نہیں ٹوٹی تھی۔ ان کی
 طبیعت کے پیش نظر احمر نے اپنی ماں کو جگانا مناسب نہیں
 سمجھا اور بنانا شتے کے ہی چلا گیا۔

☆ ☆ ☆
 کوئی گیارہ بجے کے قریب شکیلہ بیگم کی آنکھ کھلی
 تھی۔ اب بھی انہیں بخار تھا، وہ بستر سے اٹھیں اور اپنا
 لحاف تہ کر کے اسٹور روم میں رکھا اور اپنی بیڈ شیٹ جھاڑ کر
 بچھائی۔ یہ ان کی برسوں پرانی عادت تھی کہ بستر اٹھا کر
 فوراً ہی چادر جھاڑ کے سیٹ بھی کر دیتی تھیں وہ کمرے
 سے ٹکلیں صحن میں ہلکی دھوپ پھیلی ہوئی تھی ساتھ میں
 ٹھنڈی ہوا بھی چل رہی تھی۔

ندا اب بھی سو رہی تھی۔ شکیلہ نے اپنے لیے دو
 توس سینکے اور ایک کپ چائے کا بنایا۔ ایک چھوٹی ٹرے
 میں رکھ کر وہ صحن میں آ گئیں وہیں تخت پر بیٹھ کر انہوں

نے ناشتا کیا مگر ہوا کافی ٹھنڈی تھی اس لیے انہیں کچی
 طاری ہو گئی تو وہ اٹھ گئیں اور دوبارہ اپنے کمرے میں آ
 گئیں۔ انہیں بدن میں درد محسوس ہو رہا تھا۔ وہ لیٹ گئیں
 کافی دیر کروٹیں بدلتی رہیں۔ لگتا تھا ان کو پھر سے بخار ہو
 رہا تھا۔ وہ کراہ رہی تھیں ان کے بدن پہ لرزہ طاری تھا
 انہیں لیٹے چند ٹاپے گزرے تھے۔ بھی احمر کی کال آ گئی۔
 شکیلہ نے اپنی دھکتی ہوئی آنکھوں کو بہ مشکل کھول
 کر موبائل فون دیکھا احمر کی کال تھی۔

”السلام علیکم امی جی۔“ احمر نے سلام کیا۔
 ”وعلیکم السلام بیٹا، کیسے ہو؟“ شکیلہ نے اپنی
 نقاہت کو چھپاتے ہوئے پوچھا۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ جب میں آفس آ رہا تھا تو
 آپ کے کمرے میں گیا، آپ تو سو رہی تھیں اس لیے
 آپ کو بے آرام نہیں کیا۔“ احمر نے فکر مندی سے کہا
 شکیلہ اپنے بیٹے کی سعادت مندی پر رٹا رہ گئیں۔
 ”بس بیٹا میں ٹھیک ہوں تم فکر نہ کرو۔“

”میں ندا کو کال کر رہا تھا مگر شاید وہ ابھی تک سو
 رہی ہے۔“

”ندا جاگ رہی تھی۔ ابھی میرے کمرے میں مجھے
 ناشتا دے رکھی ہے۔ کسی کام میں لگ گئی ہو گئی۔“ شکیلہ
 ایسی ہی تھیں پردہ رکھنے والی۔

”بیٹا تم نے ناشتا کیا تھا کہ نہیں۔ مجھے جگا لیا
 ہوتا۔“ شکیلہ اب بھی اسی غم میں تھیں کہ کہیں وہ بنانا شتے
 کے تو نہیں چلا گیا۔

”ارے نہیں امی، آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی
 اس لیے ندانے مجھے ناشتا بنادیا تھا۔“
 وہ خوش ہو گئیں۔ وہ بھی تو ان کا ہی بیٹا تھا دل
 رکھنے والا، احساس کرنے والا۔ کیسے ندا کی برائی کرتا اپنی
 ماں سے۔

”چلیں امی آپ آرام کریں۔“ احمر دھیرے سے
 بولا اس کے لہجے میں فکر کھلی ہوئی تھی۔
 ”جیتے رہو۔“ شکیلہ خوش تھیں کہ ندانے احمر کو ناشتا
 دے دیا اور احمر اپنی جگہ خوش کہ کیا ہوا جو ندانے مجھے ناشتا

آئی۔ وہ بتا بھی کب رہی تھی ابھی تو وہ اسی ہی مٹی جس
جان بخشی کروانے کے لیے اس نے کہہ دیا مگر یہ بات بھی
اسی کے حق میں گئی تھی۔ اب احمر خوش تھا اور سچ بھی باہر
سے آرہا تھا۔ ندانے مستی کے عالم میں ایک انگڑائی لی اور
واش روم میں گھس گئی۔ منہ ہاتھ دھو کر ندانے اپنے لیے
ایک کپ چائے بنائی۔ اور اپنے کمرے میں آ کر ٹی وی لگا
کر بیٹھ گئی۔ چینل سرچنگ کرتے ہوئے اس نے فٹکٹ
چائے میں ڈبو، ڈبو کر کھائے چائے پی اور کبل لے کر
لیٹ گئی۔ اور ٹی وی دیکھتے، دیکھتے اسے پتا بھی نہیں چلا
کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

احمر نے ہوٹل سے کھانا پیک کر دیا اور گاڑی میں آ کر
بیٹھ گیا۔ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے احمر مسکرا رہا تھا ندا کا
خوب صورت چہرہ اس کی نگاہوں میں سانس لگا۔ ندا اس کی
محبت تھی، اس کی اولین چاہت تھی اور محبت کا تو ہر روپ ہی
دلکش لگا کرتا ہے۔ محبت کی ہر ادا نشین ہوا کرتی ہے۔

چھ ماہ پہلے ان دونوں کی شادی ہوئی تھی۔ احمر کی
شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ ایک، ایک ایونٹ
کو احمر نے ندا کے سنگھ پایا دگار بنانے کی کوشش کی تھی۔ وہ
ایک کمپنی میں اکاؤنٹنٹ تھا۔ وہ ندا کا تب سے دیوانہ تھا
جب سے اس نے محبت کو جانا تھا محسوس کیا تھا تب سے
ہی احمر نے صرف ندا کو ہی چاہا تھا وہ اس کے دوست حسن
کی بہن تھی۔ شادی طے ہونے میں تھوڑے سے مسئلے
مسائل ہوئے تو احمر اتنا حواس باختہ ہوا کہ وہ جو کبھی
مزاروں پر نہیں جایا کرتا تھا۔ اب ندا کو حاصل کرنے کی
لگن میں وہ مزاروں پر جا، جا کر مٹیس مانگنے لگا۔ ندا، احمر
کی آنکھ میں سجنے والا پہلا خواب تھا جس کی تعبیر میں وہ سر
دھڑکی بازی لگانے کو تیار تھا۔ وہ اللہ کے حضور سر جھکا کر
سجدوں میں ندا کو مانگا کرتا تھا۔ اور پھر اس کی ساری
دعائیں رنگ لائی تھیں۔ احمر نے ندا کو پایا تو اس کی....
پتر قرار روح سیراب ہو گئی۔ وہ اسے دیکھ، دیکھ کر جیتا
تھا۔ اسے ندا کی ہر ادا کو محسوس دکھائی دیتی تھی۔ وہ اس کی
من چاہی لادائی بیوی تھی اس کے من آنگن میں مہکتی تھی۔
شکیلہ بیوہ تھیں، وہ احمر کی پسند کے مطابق ندا کو بہت

ہٹا کے نہیں دیا میری امی کا تو خیال کیا ہی ہے ناں۔ احمر،
ندا سے بہت محبت کرتا تھا جو ہلکی سی خشکی احمر کے دل میں
ندا کے لیے تھی وہ اب دھل چکی تھی، اس نے مسکراتے
ہوئے ندا کو کال کی صد شکر کہ کال پک بھی کر لی گئی تھی۔

”کیا چل رہا ہے؟“ احمر کے لہجے میں محبت چھلک
رہی تھی۔

”سو کے اٹھی ہوں۔“ وہ جمائی روک کر بولی۔

”نداتم نے میرا اور امی کا احساس کیا۔ امی کو ناشتا
بتا کے دلیہ پار میں تمہارا شکر گزار ہوں۔“ احمر نے کہا تو
ندا کا منہ کھل گیا وہ منمنانے لگی، اس سے کوئی بات ہی
نہیں ہو رہی تھی اور احمر سمجھ رہا تھا کہ ندا انکساری میں بول
نہیں پارہی ہے۔

”رشتوں کو احساس سے ہی مضبوط کیا جاسکتا
ہے۔ یہی وہ واحد جذبہ ہے جو دلوں کو جوڑ کے رکھتا ہے
اور میرا تو دنیا میں امی کے سوا کوئی اور ہے بھی نہیں۔“ احمر
کی آواز میں خوشی جھلک رہی تھی۔

”جی.....“ ندا آستنی سے بولی ہلکی سی شرمساری
کے احساس نے اسے اپنے حصار میں لے لیا۔

”انسان کی عزت اس کے کام اور محنت کی وجہ سے
ہوتی ہے ندا اور اپنی عزت خود بنانا پڑتی ہے۔ میرے
معاظے میں غفلت بر تو گئی تو کوئی بات نہیں مگر امی.....

میری امی نے میرے لیے بہت قربانیاں دی ہیں۔“ احمر
کی بات پر ندا کا منہ بن گیا ذرا دیر پہلے کی ندامت کہیں
ہوا میں تحلیل ہو گئی۔ ایک تو احمر کا یہ امی نامہ ندا کو بہت

ناگوار گزرتا تھا۔ ندا کا منہ بن گیا وہ ہوں، ہاں کرتی رہی۔

”اوکے احمر میں ذرا امی کو دیکھ لوں۔ پھر بچ کی بھی

تیاری کرنی ہے۔“ ندا نے جان چھڑائی چاہی۔ اور

دوسری طرف احمر کو اس پڑوٹ کے پیار آیا تھا۔ ندا کی

آج کی کیئر نے اسے خوشگوار حیرت میں مبتلا کر دیا

تھا۔ ندا اس کا انتخاب تھی اور وہ امی کے سامنے اپنی بیوی

کے حوالے سے شرمندہ نہیں ہونا چاہتا تھا۔

”اچھا بات سنو ندا، میں کھانا بازار سے لے کر گھر آ

رہا ہوں۔ تم مت بتانا۔“ ندا کی اب جان میں جان

چاہا اور ارمائوں سے بیاہ کر لائی تھی۔ چھ ماہ میں شکلیہ بیگم نے ندا کو۔ کوئی کام نہیں کرنے دیا وہ خود ہر وقت گھر کے کام کاج میں لگی رہتی تھیں۔ احمر، ندا کو کونسا رہتا کہ امی کے ساتھ مدد کروایا کرو، امی کے پاس جا کر بیٹھا کرو مگر وہ سنی ان سنی کر دیتی۔ پھر شکلیہ بھی روایتی ساس نہیں تھیں کہ کوئی روک ٹوک کرتیں یا بیٹے سے شکایتیں لگا، لگا کر اس کا دل خراب کرتیں۔ شکلیہ صبح، صبح اٹھ جاتی تھیں۔ نماز کے بعد قرآن پڑھتیں۔ پھر کچن میں چلی جاتی تھیں احمر نے آفس جانا ہوتا تھا، شکلیہ اسے ناشتا دیتیں وہ ندا کو آوازیں دیتا رہتا مگر وہ ہشتی نہیں تھی وہ اسے سوتا چھوڑ کر چلا جاتا۔ ندا گیارہ بجے اٹھتی اور ندا کو بھی شکلیہ ہی ناشتا بنا کر دیتیں۔ ناشتے کے بعد ندائی وی دیکھتی رہتی یا کبھی، کبھی شکلیہ کے پاس بھی بیٹھ جاتی تھی۔ شکلیہ لُچ کی تیاری کر رہی ہوتی تھی اور ندائی وی دیکھتی رہتی۔ شکلیہ کو دکھ ہوتا تھا کہ ندا کو ان کے بڑھاپے کا احساس نہیں اور نہ ہی وہ یہ جانتی تھی کہ اس گھر کی بہو ہونے کے ناتے اس کی کیا ذمہ داریاں ہیں۔ شکلیہ اسے کیا سمجھاتیں جب اسے خود کوئی احساس نہیں تھا۔ وہ اسے گھر میں کوئی... بزم کی نہیں چاہتی تھیں۔ روک ٹوک سے گھر کی فضا میں ایک بوجھل پن پیدا ہو جاتا ہے جو گھر کے ہر فرد کے اعصاب کو کشیدہ رکھتا ہے، وہ زمانہ شاس عورت تھیں۔ زندگی کی تلخیوں، نرمیاں، جھیلے بیٹھی تھیں۔ کبھی بیٹے کو پریشان نہیں کرتی تھیں۔ شکلیہ کا لاکھل کرنا کہ وہ بھوکھیا نہیں کہ یہ گھر اسی کا ہی ہے وہ اپنی ذمہ داریاں پہچانے اور انہیں خوش اسلوبی سے نبھائے مگر ان کی اسے کہنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی مبادا وہ اسے تنبیہ کرے اور ندا ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دے یا بدتمیزی کرے تو ان کی کیا عزت رہ جائے گی ایسی باتیں سوچ کر وہ چپکی رہ جاتیں۔ ویسے بھی ندا کا رویہ اتنا لیے دیے والا ہوتا کہ شکلیہ اپنے خول میں سمٹ کر رہ جاتیں۔

☆☆☆

احمر نے گاڑی گھر کے باہر ہی کھڑی کر دی تھی۔ وہ کھانے والے شاپرز اٹھائے گھر میں داخل ہوا تھا۔ گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ ٹھٹکا۔ روز وہ تیل دیتا تھا تو شکلیہ

بیگم دروازہ کھولنے آیا کرتی تھیں اور آج دروازہ بند ہی نہیں تھا۔ جیسے وہ چھوڑ گیا ویسا ہی تھا۔

احمر کچن میں آیا۔ کھانے کے شاپرز سلیپ پر رکھے۔ ایک بلی تیزی سے کچن سے بھاگ کر باہر نکلے۔ احمر نے حیرت سے دیکھا چوہے کے پاس نہ جانے کب کا دودھ رکھا ہوا تھا۔ جسے کچھ بلی نے پی لیا تھا اور کچھ گر دیا تھا۔ چوہے پر چائے کا ساس پین بھی الٹا پڑا تھا۔ یہ بھی کارنامہ بلی کا ہی تھا۔ اسے پھو پھو پین کا مظاہرہ اپنی زندگی میں احمر نے اپنے گھر میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ غصے کی ایک لہر اس کے اندر سے اٹھی اعصاب تن سے گئے۔ احمر تنٹنا تا ہوا کچن سے نکلا اور ندا کی تلاش میں بیڈ روم میں چلا گیا وہاں کے منظر نے احمر کو اور غصہ دلایا تھا۔ ٹی وی ٹل والیوم میں چل رہا تھا اور ندا بے خبر سو رہی تھی۔ اور اس کے پاس ہی بیڈ پر چائے کا کپ اوندھا پڑا تھا احمر کو کچھ بھر کر کراہیت آئی تھی۔ اس نے چلے دل کے ساتھ ٹی وی بند کیا۔ کپ وہاں سے اٹھایا اور سوئی ہوئی ندا کو تاسف سے دیکھا۔ اس کی نفاست پسند طبیعت پر یہ سب بہت گراں گزرا۔ احمر کو شدید رنج کا جھٹکا لگا تھا ایسی اکثر حالات گھر میں دیکھنے کا وہ عادی نہیں تھا۔ احمر ماں کو آوازیں دیتا ان کے کمرے میں گیا تو وہ بخار میں بری طرح چپک رہی تھیں۔ احمر کے اندر ایک گہرا لالہ اترتا چلا گیا اور صحیح معنوں میں آج پہلی بار اسے ندا کی بے پروائی اور بے حسی نے دھکی کیا تھا۔ وہ تیز، تیز سانس لیتا غلٹ میں ڈاکٹر کو فون کر رہا تھا۔ اس کی آئی جانی ہر سانس میں دھواں سا بھر رہا تھا۔ اس کی ماں اتنی بری حالت میں بے یار و مددگار پڑی ہوئی تھی اور ندا..... وہ جی بھر کر بدول ہوا تھا۔

☆☆☆

احمر ماں کی پٹی سے لگ کر بیٹھا تھا۔ دوائی کھا کے وہ سو رہی تھیں۔ ندا بھی وہیں تھی مگر احمر اس سے بات نہیں کر رہا تھا، احمر کا منہ پھولا ہوا تھا۔ اور وہ ندا کو جب بھی دیکھتا، اس کی نگاہوں میں ایک شعلہ سا لپکتا جس میں شکوہ تھا، دکھ تھا، خنکی تھی، خاموشی لگ رہی تھی۔ ندا نے احمر کا کب ایسا روپ دیکھا تھا وہ تو کبھی ناراض ہی نہیں ہوتا تھا ہر وقت اندر پر نار ہوتا مگر تجھتیں نکھار کر تار ہوتا اور اب کتنا بے مہر

بھڑاس نکال رہی تھی اور دوسری ہاں... حیرت میں ڈوبی سوچ رہی تھیں کہ یہ ندا بول رہی... ”شرم کرو ندا۔ کوئی اپنے بڑوں کے لیے ایسی زبان استعمال کرتا ہے اور تمہیں اس وقت شکلیہ باجی کی تیار داری کے لیے ان کے پاس ہونا چاہیے تھا اور تم فون پر بیکار کی ہانک رہی ہو۔ بہت افسوس ہوا مجھے تم پر۔ فون بند کرو اور ان کے پاس جاؤ، اپنی احمقانہ حرکتیں چھوڑ دو۔ اب تم ایک کھلندری لڑکی نہیں ہو شادی شدہ ہو خود کی ذمہ داری پچھانو۔ جاؤ ان کے پاس اور اپنے ہونے کا ثبوت دو بیٹا۔ اپنے ساتھ رہنے والوں کو اپنے وجود کا احساس اپنی محبت سے دلانا پڑتا ہے، بند کرو فون۔“

یہ وقف۔ میں ابھی آتی ہوں شکلیہ باجی کی خیریت معلوم کرنے کے لیے۔ ”نہب نے کھڑا ک سے فون بند کر دیا اور ندا ایل کو گھورتے ہوئے ایک بار پھر بے رودی۔ اس کی ماں نے اس کی ہاں میں ہاں نہیں ملائی تھی ندا کی اپنی ماں بھی اس کی بات نہیں سن رہی تھیں۔ وہ سلجھی ہوئی خاتون ہونے کے ناتے رشتوں کی نزاکتوں کو سمجھتی تھیں۔ اس لیے انہوں نے ندا کو ڈپٹ کر رکھ دیا تھا۔ اکثر ماں نے اپنی بیٹیوں کا گھر خود اجاڑا کرتی ہیں، اپنی بیٹی کو۔ سرزنش کرنے کے بجائے اس کی ہر اوٹ پٹانگ اور غلط بات میں اس کا ساتھ دینا بھلا یہ کہاں کی دانشمندی ہے یہ سب کم از کم نہب تو نہیں کر سکتی تھیں۔

☆☆☆

نہب اور ان کا بیٹا حسن شکلیہ کی تیار داری کے لیے آئے تھے۔ شکلیہ اتنی وضع دار خاتون تھیں کہ وہ اتنی خراب طبیعت میں بھی ان دونوں سے بہت اچھے سے ملیں البتہ احمر کا موڈ کچھ بگڑا سا تھا۔ نہب جھینپ سی گئیں انہیں شرمندگی ہو رہی تھی۔ ندا نے چائے بنائی تھی وہ دونوں کچھ دیر بیٹھے رہے پھر اجازت لے کر جانے لگے تو ندان کو دروازے تک چھوڑنے آئی حسن گاڑی میں جا بیٹھے تھے نہب نے شکوہ بھری نگاہوں سے ندا کو دیکھا ان کی نگاہ بڑی کاٹ دار تھی ندا بے ساختہ نظریں چرائے لگی۔

”گھر کے بزرگ روشنی ہوتے ہیں بیٹا ان چرائوں کو

ما ہو گیا تھا احمر کا اتنا سر درویشہ ندا سے سہا نہیں جا رہا تھا۔ احمر، ندا کے لیوں سے نکلی بات کو حرف آخر کی طرح اہمیت دیتا تھا وہ کڑی دوپہروں میں ندا کی ایک جھلک اکھٹے کے لیے گھنٹوں کھڑا رہتا اور اب اس سے کتنا اجنبی لگ رہا تھا۔ ندا نے شکوہ کناں نظروں سے اسے دیکھا مگر وہ اسے دیکھ ہی کب رہا تھا۔ ندا کا دل دکھ سے بھرنے لگا وہ اپنے ہونٹ کھیلنے ہوئے اٹھی اور ڈبڈبائی آنکھوں سے امنڈتے آنسو لیے بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں جا کر اندھے منہ لیٹ گئی اور چہکوں، ہسکوں رونے لگی، اس کی سسکیاں کمرے میں ارتعاش برپا کر رہی تھیں۔ کچھ دیر وہ ایسے ہی روتی رہی۔ اسے بہت غصہ آ رہا تھا جب وہ رو، رو کے تھک گئی تو بیڈ پر پڑا اپنا سیل اٹھا کر اپنی امی کا نمبر ملائے لگی۔ اسی اثنا میں گیراج سے گاڑی اشارٹ ہونے کی آواز آئی۔ احمر اپنی امی کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جا رہا تھا، ندا نے ناک سکڑی۔ میری بلا ہے۔

”السلام علیکم امی۔“ کہتے ہی وہ زار زار رونے لگی۔ دوسری طرف زینت کے ہاتھ پاؤں کا پھینکے۔ ”کیا ہوا ہے، رو کیوں رہی ہو بیٹی۔“ زینت پوچھا۔ ”یہ پوچھیں کیا نہیں ہوا۔“ ندا ایسے چلائے لگی جیسے اس گھر میں اس پر کسی نے بہت مظالم ڈھائے ہوں۔

”ارے بیٹا چپ ہو جاؤ اور اطمینان سے مجھے بتاؤ کہ ہوا کیا ہے، میرا دل ہول رہا ہے۔“ نہب دہل گئی

فیس الٹا خبر کرے ایسا کیا ہو گیا۔

”امی وہ احمر جو اتنا چاہنے والا بنا پھرتا تھا، اب دل گیا ہے میری طرف دیکھ بھی نہیں رہا، مجھ سے...“

داشت نہیں ہو رہا۔“ ندا نے سسکیوں کے دوران کہا تھا، اس کی ہچکیاں بلند ہو رہی تھیں۔ نہب کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا اول فول بول رہی تھی۔

”میرے کچھ پلے نہیں پڑ رہا بچے۔ اچھا یہ بتاؤ شکلیہ امی کہاں ہیں۔“ نہب کو کچھ نہیں سوچھا تو کہہ دیا۔

”وہی تو ہیں فساد کی جڑ۔۔۔۔۔۔ ذرا سا بخار کیا ہوا ہارپائی ہی پکڑ کر لیٹ گئیں اور احمر ماں کی پٹی سے لگا بیٹھا ہے۔ چونچلے ہی ختم نہیں ہو رہے۔“ ندا اپنے دل کی

میں۔ ہالہ نالی دانشمندی ہے ورنہ گھر ہی نہیں دل بھی
 لیے اندھیروں میں ڈوب جاتے ہیں۔
 میں بزرگ منوں مٹی تلے جا سوتے ہیں،
 دعا جو ایک ڈھال ہوتی ہے گھر
 کے لیے لوٹ دعا میں دیتے ہیں، بچے خود کو اس دعا
 سے نہ کرو، اس سچائی کو سمجھو ابھی وقت تمہارے ہاتھ
 میں ہے۔ لیلیٰ باجی کا خیال رکھو، ہم تو بھتے ہوئے چراغ
 اب آگمہ بند ہوئی کب گھر سے باہر۔ پھر جودل کرے
 لانا۔ ”نہب کا چہرہ ستا ہوا تھا کسی گہری سوچ میں تھیں
 اس و لگرتے، ٹوٹی سی چال چلتی گاڑی میں بیٹھیں اور
 عجیب سی خالی، خالی نظروں سے ندا کو دیکھا اور اپنے ہاتھ
 چہرے پر رکھ لیے۔ گاڑی چلی گئی اور ندا وہیں تا دیر کھڑی
 رہی۔ خالی الذہنی کی کیفیت تھی اور ندا کا رنگ فق تھا۔ کچھ
 لمعے وہ شرمساری تھی۔

☆☆☆

شکیلہ کی طرح ہی نہب بھی ایک بوہ عورت تھیں
 حسن اور ندا ان کے دو ہی بچے تھے مالی حالات زیادہ
 اچھے نہیں تھے۔ نہب لوگوں کے کپڑے سلائی کیا کرتی
 تھیں کچھ شوہر کی پشن کا آسرا تھا گزر بسر بہ مشکل ہوتی
 تھی۔ وہ بہت خوددار اور نیک دل عورت تھیں دو بچوں
 کے ساتھ بوزی ساس کی خدمت بھی دل و جان سے
 کی۔ ندا ابھی پڑھائی سے فارغ ہی ہوئی تھی کہ شکیلہ اپنے
 اکلوتے خوبرو بیٹے احمر کا رشتہ لے کر آئیں، احمر محلے کا
 لڑکا تھا دیکھا بھالا نیک، کماد، حسن اور احمر کی مشقت کا
 سفر ساتھ، ساتھ تھا رشتہ ہر لحاظ سے اچھا تھا اس لیے فوراً
 قبول کر لیا گیا۔ شکیلہ بھی بہت اچھی عورت تھیں معاملہ فہم،
 صابر، سمجھدار اور دانشمند اتنی کہ جہیز لینے سے انکار کر
 دیا یعنی در پردہ نہب اور حسن کی عزت رکھ لی۔ ان کا بھرم
 رہ گیا ورنہ ان میں اتنی مالی سکت تھی بھی نہیں کہ وہ زمانے
 کے بدلتے رجحانات کے مطابق جہیز دے سکتے۔ شکیلہ
 نے خود کمرے میں فرنیچر خرید کر رکھا تھا۔ نہب نے بیٹی
 تین کپڑوں میں رخصت کر دی تھی اور ندا اتنی کم عقل اور
 خوش فہم..... یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ وہ چاہی گئی ہے تو ہمیشہ

چاہی ہی جائے گی۔ اسے کوئی محنت مشقت کرنے کی لگن
 ضرورت نہیں۔ مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ مرد چاہے جتنا بھی
 جاں نثار کرنے والا ہو، اپنی ماں سے زیادہ بیوی سے محبت
 کبھی نہیں کر سکتا اور ماں بھی شکیلہ جیسی بے ضرراہ
 محنتی۔ نہب قدر دان تھیں وہ شکیلہ کی اچھی عادات کو
 جانتی تھیں اس لیے ان دونوں ماں بیٹی کی دل سے عزت
 بھی کرتی تھیں۔ شادی کے چھ ماہ تک شکیلہ گھر کی ساری
 ذمے داریاں نبھاتی رہیں اور ندا محبت، محبت کھیتی رہی۔
 احمر دے، دے لفظوں میں ندا کو کہتا رہتا تھا کہ امی کا ہاتھ
 بنایا کرو مگر وہ ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتی
 اس نے اپنی پسند کی روش ہی اپنائی ہوئی تھی۔

وہ خود کو کوئی شہزادی سمجھ رہی تھی۔ نادان یہ نہیں جانتی
 تھی کہ محبت پالینا کمال کی بات نہیں ہے، اس محبت کو
 سنبھال کر رکھنا عقلمندی ہے۔ رشتوں کو پوری ایمان داری
 کے ساتھ احساس کی لڑی میں پرو کر رکھنا پڑتا ہے، اپنے
 خلوص سے، اپنے رویتے سے تمام رشتوں کو اس لڑی میں
 پھولوں کے مانند پرو کر سینت، سینت کر رکھنا پڑتا ہے مگر ندا
 اپنے نام کی ہی ایک بے پروا تھی جسے سمجھ ہی نہیں آتی تھی۔

☆☆☆

شکیلہ کی طبیعت بہتر تھی، وہ حسب معمول ناشتا بنا
 رہی تھیں۔ احمر نے سیل پر الارم سیٹ کیا ہوا تھا جیسے ہی
 الارم بجنا احمر جلدی سے اٹھا اس کی نظر ندا پر پڑی۔ ندا
 حسب عادت بے خبر سو رہی تھی، احمر کو بہت غصہ آیا تھا۔
 ”ندا اٹھو اور کچن میں جاؤ۔“ احمر نے سختی سے اسے
 بلایا ندا نے ذرا کی ذرا آنکھیں کھولیں۔ مندی، مندی
 آنکھوں سے احمر کو دیکھا۔

”آئی بنا رہی ہوں گی ناشتا۔“ اس نے کہا اور
 کدوٹ بدل گئی۔ احمر کے اندر اشتعال کی ایک لہر اٹھی
 اور اس نے اسے سلگا کر رکھ دیا۔

”تم جانتی ہو امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور
 ویسے بھی میں اور یہ گھربا تمہاری ذمے داری ہے ندا۔“
 احمر باوجود کوشش کے اپنے لہجے کو تلخ ہونے سے نہیں
 روک پایا۔ ندا نے سر گھا کر حیرت سے احمر کو دیکھا۔ وہ

دیوار کعبہ میں حاضری

جس سمت نظر اٹھے بس تو نظر آتا ہے
کعبہ نظر آتا ہے، جلوہ نظر آتا ہے
مُر کیف نظاروں کو محسوس میں کرتی ہوں
آنکھیں ہیں کھلی لیکن سینا نظر آتا ہے
ہے ہوش کہاں مجھ کو دربار میں آئی ہوں
اب جلوہ جاناں ہر جا نظر آتا ہے
از: فریدہ افتخار، اسلام آباد

ان کا حق

کہتے ہیں کہ جہنم دینے والی ماں سے زیادہ حق
پالنے والی ماں کا ہوتا ہے بالکل صحیح بات ہے کیونکہ
شادی کے بعد ساس صاحبہ کو بھی پالنا پڑتا ہے۔ اس
لیے ان کا حق زیادہ ہونا!.....
مرسلہ: زمکس نسیم، صابہ موہڑہ

”میں نہیں کر سکتی یہ سب۔“ ندانے دو ٹوک انداز

میں کہا۔

”کیا تمہیں میری خوشی کا کوئی خیال نہیں۔ یہ میری
خوشی ہے۔“ احمر کی بات پر ندا چپ سی ہو گئی۔
”کل سے میرے لیے ناشتا تم بناؤ گی امی نہیں۔

ان کو اب آرام کی ضرورت ہے۔ یہ تمہارا گھر ہے اب تم
سننا لو۔“ احمر کہتا ہوا تیار ہونے چل دیا ندانے سفر سے
اسے جاتا دیکھا اسے احمر کا دھونس جمانا بالکل اچھا نہیں لگا
تھا۔ وہ برے، برے منہ بناتی کمرے میں چکر کاٹتی رہی
اس کا غصہ کم نہیں ہو رہا تھا۔ احمر تیار ہو کر گھر سے باہر جا
چکا تھا۔ کچھ دیر کڑھنے کے بعد ندا دوبارہ سونے کے لیے
لیٹ گئی، وہ کروٹ یہ کروٹ بدلتی رہی مگر اسے نیند نہیں
آئی تو وہ کھل پرے دھکیلتی بیڈ سے اترتی اور کمرے سے
باہر آ گئی۔ صبح اٹھنے اور اس بد مزگی کی وجہ سے اس کے
سر میں درد ہونے لگا۔ شکلیہ سامنے ہی تخت پر بیٹھی تھیں ندا
کا انہیں دیکھ کر حلق تک کڑوا ہو گیا جبکہ وہ ندا کو دیکھ کر
مسکرائی تھیں۔ احمر جا چکا تھا۔

”ناشتا بنا دوں بیٹا بڑ“

تو کبھی بات نہیں کیا کرتا تھا۔

”احمر مجھ سے صبح، صبح نہیں اٹھا جاتا، مجھے عادت
س ہے۔“ ندانے اپنے تئیں شاید اسے جتلا یا تھا۔
”شادی کے بعد اپنی عادتیں لڑکیوں کو بدلنا پڑتی
اور نہ.....“

”ورنہ کیا.....؟“ ندا جھٹکے سے اٹھ بیٹھی، اس کی
مٹوں سے غصے کی پیش احمر کے چہرے کو چھونے لگی مگر
نہیں چنداں پروا نہیں کی۔

”میرے لیے ناشتا تمہیں خود بنانا ہوگا، میں اپنی
کواں عمر میں بچن میں کام کرتا نہیں دیکھ سکتا، مناسبت
ہے۔“ احمر نے دانت کچکا۔

”مجھ سے نہیں ہوتے یہ گھر کے کام..... ملازمہ
لو۔“ ندانے آواز بہت اونچی تھی۔

”اپنی آواز نیچی کرو۔“ واش روم کی طرف جاتے،
تے وہ ہلٹ کر اس کے پاس آیا تھا۔ وہ دونوں ایک
مرے کو خونخوار نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

”کیوں نہ بولوں۔ تم نے ہی مجھے پسند کیا تھا اور
مے محبت کے دعوے دار تھے اتنی جلدی بدل گئے۔“ ندا
دل پرے دھکیلتی بیڈ سے اتر کے احمر کے رو برو کھڑی
ہوئی اور اسے جتاتی ہوئی گھور رہی تھی۔

”میں نہیں بدلانہ ہی کبھی بدلوں گا ندانے، تم اس بات
مجھو کہ اس گھر میں اور میرے دل میں تمہاری کیا
سیت ہے.....“

”مجھے نوکرائی بنا کے رکھنا چاہتے ہو۔ یہ ہے
ارمی محبت.....؟“ ندا اسکی۔

”گھر کی صفائی کے لیے ملازمہ آتی ہے، اب
میں نے..... کپڑوں اور برتن دھونے کے لیے بھی ملازمہ
لی ہے ایسا کون سا کام ہے جو تم کرتی ہو اور اس میں
ملازمہ والی کیا بات ہے۔ تم میری بیوی ہو اور میرا دل کرتا
ہے کہ جب میں آفس جاؤں تو تم مجھے تیار ہونے میں مدد
میرے لیے ناشتا بناؤ مجھے گیٹ تک چھوڑنے جاؤ، کیا
واہش میرا حق نہیں ہے ندانے۔“ احمر نے اپنا لہجہ کنٹرول
کے نرمی سے کہا۔

”آپ مجھ سے اتنی محبت کیوں جتاتی ہیں؟“ ندا نے کڑے تیوروں سے ان سے پوچھا تو وہ شیشا نکلیں اور ان کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔

”یہ کیا کہہ رہی ہو بیٹا، تم بیٹی ہو میری۔“ وہ لالچت سے کہہ رہی تھیں کہ ندا نے ان کی بات کاٹ دی شکیلہ جہاں کی تہاں رہ گئیں۔

”ایک بات تو بتائیں آٹھی، کیا میں شکل سے آپ کو اتنی بدحوہ دکھائی دیتی ہوں۔“ ندا کی ناک غصے سے پھول رہی تھی اس نے اپنے لب بھیج کر اپنی آنکھیں شکیلہ پر گویا گاڑ دی تھیں انہوں نے ناہمی سے اچھے کر ندا کو دیکھا۔

”احمر کو میرے خلاف بھڑکانی ہیں اور خود میرے سامنے معصوم بن جاتی ہیں اور شایہ کرتی ہیں جیسے آپ مجھ سے بہت محبت کرتی ہیں۔“ ندا نے ہجک اور شرم کو بالائے طاق رکھ کر کہا تو شکیلہ کا منہ کھل گیا وہ ندا کو دیکھے جا رہی تھیں اور جیسے ہی انہوں نے کچھ کہنا چاہا ندا ہاتھ کے اشارے سے منع کر کے پاؤں جٹختے ہوئے دوبارہ کمرے میں چلی گئی وہ آنسو بھری آنکھوں سے اپنی اکلوتی بہو کو جاتا دیکھتی رہیں، ان کو ندا سے اس بدتمیزی کی توقع بالکل نہ تھی۔ احمر ان کی عمر بھر کی پونجی تھا اور وہ ندا کو بہت چاؤ سے بیاہ کر لائی تھی۔ ان کو دونوں کی خوشی عزیمتی اور ندا کیا کہہ کر گئی تھی۔ شکیلہ کی حیرت دکھ اور صدمے میں بدلی تو وہ وہیں بیٹھی روتی رہیں، رونے کی وجہ سے اور ٹینشن لینے کی وجہ سے ان کے سر میں درد ہونے لگا تھا۔ اندر کمرے میں ندائی وی لگے چٹیمپی تھی ٹی وی کی آواز بہت تیز تھی۔ شکیلہ کا درد بڑھتا جا رہا تھا، انہوں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام رکھا تھا انہیں اپنا سر گھومتا ہوا سا محسوس ہونے لگا، دل میں درد کی ٹیمیں اٹھ رہی تھیں، انہیں سانس لینے دو بھر ہو رہی تھی انہوں نے اپنی دھندلی ہوئی آنکھوں سے ندا کو گھر سے باہر جاتے دیکھا تھا شکیلہ نے اسے آواز دینا چاہی مگر ان کی آواز گلے میں ہی دب کر رہ گئی۔ ندا نے شکیلہ کو دونوں ہاتھوں سے سر تھامے روتے دیکھا اس نے سر کو تھارت سے جھٹکا۔

”ہونہ ڈراے بازی؟“ کہتی وہ باہر نکل گئی۔

ندا محلے میں کسی کے گھر گئی تھی تھوڑی دیر وہ وہاں بیٹھی گپیں مارتی رہی جب واپس آئی تو اس نے شکیلہ دیکھا وہ محن میں گری پڑی تھیں ندا کو کچھ غیر معمولی پہا احساس ہوا وہ لپک کر گئی، وہ بے ہوش تھیں۔ ندا ایک ا کے لیے ڈر گئی اسے بہت شرمندگی ہوئی تھی وہ جلدی۔ احمر کو فون کرنے لگی۔ شکیلہ بے ہوش تھیں ندا ان کا سر سر زنی تھی جب احمر گھر آیا۔ وہ دونوں انہیں اسپتال لے گئے تھے ڈاکٹر زکا کہتا تھا کہ شکیلہ نے کوئی ٹینشن لی۔ جس کی وجہ سے ان کا بلڈ پریشر شوٹ کر گیا تھا ڈاکٹر شکیلہ بی بی نازل کرنے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے انہیں ایڈمٹ کر لیا گیا تھا۔ احمر پاگل ہوا پھر رہا تھا۔ کافی مگ بعد وہ مکمل ہوش میں آئی تھیں۔ انہیں دو دن اسپتال میں رکھا گیا تھا مگر سارا وقت وہ فکر نگر احمر اور ندا کو دیکھتی رہیں منہ سے کچھ نہ بولتیں۔ ندا بھی سر جھکائے رہتی۔ احمر شد پریشان تھا ماں اگرچہ گھر آگئی تھیں مگر وہ خاموش تھیں۔ اپنی سوچوں میں غلطان رہتا کہاں اس سے غلطی ہوئی۔

☆☆☆

شکیلہ نے اسے ماں باپ بن کر پالا تھا۔ کہ مشقت سے زندگی گزاری اور اب ندا نے اس کی ا کے ساتھ اچھا نہیں کیا تھا۔

احمر بی بی باتیں سوچ سوچ کر سلگ رہا تھا۔ ندا کا انتخاب تھی اور اسے بچپن تو وہیں نے آن گھیرا تھا وہ اگ بیوی اور بہو ثابت نہیں ہوئی تھی احمر کو اس نے جی بھرنا مایوس کیا تھا۔ وہ شوہر کی دیکھ بھال کیا کرتی وہ تو اس ا ماں کا بھی خیال نہیں رکھ سکتی تھی بجائے یہ کہ وہ گھر کی گھر میں رہنے والوں کی دیکھ بھال کرتی ندا نے تو اٹالیاں بوجھ بھی ان پر ڈال دیا تھا۔ احمر بری طرح بدول ہوا تھا۔ احمر کے سر میں درد ہو رہا تھا وہ اپنے لیے چاما بنانے کے لیے کچن میں گیا۔ کچن کے ساتھ ہی ان کا کمرہ تھا ندا کے سیل پر کال آ رہی تھی۔ اتنی رات گئے کہ کال آگئی نیل مکسل ہو رہی تھی مگر ندا کال ریسیو ہی نہ کر رہی تھی احمر کو کوفت ہو رہی تھی، وہ اپنا چائے کا کپ وین چھوڑ کر اپنے بیڈ روم میں آیا ندا بے سادہ ۱۳

”آئی اب میں ندا کو اپنے ساتھ نہیں رکھنا چاہتا کیونکہ اسے دلوں میں رہنے کا ہنر نہیں آتا۔ میں اپنی ماں کے لیے ندا جیسی ہزار بیویاں چھوڑ سکتا ہوں کاش ندا باسٹر ڈگری ہولڈر نہ ہوتی کاش ندا خوب صورت نہ ہوتی مگر ایک خوب صورت دل ضرور رکھتی ہوتی احساس سے بھرا دل جو اپنے تو کیا غیروں کے دکھ پر بھی تڑپ اٹھے ایسا دل جو جھکتا جانتا ہوتا، جو رشتوں کی قدر و قیمت کو جانتا سمجھتا اور مانتا ہوتا کاش آئی میں نے ندا سے شادی نہ کی ہوتی کاش.....“ وہ بے کسی سے رو دیا۔ احمد واپس چلا گیا تھا نذیب نے روتی ہوئی ندا کو دیکھا دنیا بیوقوفوں سے بھری ہوئی ہے جو اپنے اعمال ٹھیک کے بغیر جنت کے خواب دیکھتے ہیں۔ نذیب گھر کے اندر گئیں تو ندا بھی ٹوٹی پھوٹی چال چلتی ماں کے پیچھے چل پڑی اب کچھ اچھا نہیں ہونے والا تھا۔ ندا جان لئی تھی۔

☆☆☆
 ندا ساری رات روتی رہی، کبھی وہ شرمندہ ہوتی
 کبھی اسے وہ تھپڑ یاد آتا جو احمر نے اسے مارا تھا۔ وہ
 ساری رات چھتاؤں میں گھر گئی کاش کہ وہ باتیں احمر نہ جانتا۔ وہ
 کون سا وقت تھا جب ندا کی آنکھ تھلی تھی وہ اٹھ بیٹھی وہ
 اپنے بیڈ پر نہیں تھی اس نے اپنے بال اکٹھے کر کے کچر
 میں کیے اسے سب یاد آتا گیا کہ رات کو کیا ہوا تھا ندا
 چارپائی پر بیٹھی دونوں ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھی رہی۔
 ”نماز کا ناتم ہو گیا سے بٹا حسن۔“ نندب کی آواز

قصی - احمر کو اس کی اس بے خبری پر تاؤ آیا اور وہ کلس کر رہ گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر فون اٹھایا اندا کی نیورسٹی کی دوست فارحہ کی کال تھی احمر نے ریسپونڈ کی وہ اسے بتانا چاہا تھا کہ وہ سو رہی ہے۔ مگر وہ یہی بولے چلی گئی۔

”ندامت میجر کا جواب کیوں نہیں دے رہی ہو کہیں تمہاری ساس مر رہی تو نہیں گئیں، اچھا ہے یا مر رہی جاؤں تو ہاں چھوٹے۔ امر تو تمہارا دیوانہ ہے ہی۔ عیش کرنا۔“ وہ اپنی رو میں بہتی چلی گئی امر کی غصے سے بری حالت تھی اس کی سانس بڑھتی منہس معتدل نہیں رہا۔

”سٹ اپ، جسٹ سٹ اپ۔“ وہ دھاڑا
 دوسری طرف سے ٹون بند ہو گیا۔ ہر سیل ہاتھ میں لیے ندا
 کو دکھ سے دیکھتا رہا ندا اس میسج کرتے، کرتے سوئی تھی
 ہر جیسے، جیسے سارے میسج سننا گیا اس کے پیروں تلے
 سے زمین نکلتی گئی۔ اس نے سوئی ہوئی ندا کو بازو سے پکڑ
 کر اٹھایا اور پوری طاقت سے اس کے چہرے پر ایک تھپڑ
 رسید کیا تھا ندا کے پھول سے چہرے پر نشان ابھر آیا وہ
 ساکت سی آنکھیں پھاڑے امر کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی
 آنکھوں میں آنسو اور چہرے پر حزن و ملال چھا گیا۔

”اٹھو ابھی میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ کر آتا۔“ وہ ابھی ایک دکھ کی شدت میں تھی۔ امر نے دوسرا ہلکا دے ڈالا۔

”تم نے مجھے تھپڑ مارا احمر۔“ ندا کی آواز پھٹ،
ہٹ کر نکلی۔

”میرا دل کر رہا ہے ندا کے تمہیں جان سے ہی مار
 وں، تم نے میری امی سے بد تمیزی کی اور ان کو اس
 حالت میں پہنچایا اور اپنا کارنامہ اپنی دوست کو فحش، ہنس
 گرتاری ہو۔“ ”خیر آن پوند۔“ تمہیں میرے دل کا ذرا بھی
 ظلم ہوتا تو تم ایسا کبھی نہیں کرتے۔ میں اب تمہاری شکل
 مٹی نہیں دیکھنا چاہتا، چلی جاؤ یہاں سے ابھی اور اسی
 وقت۔“ ”اگر نے ندا کو بازو سے پکڑ کر کھڑا کیا وہ کوئی اپنی
 ملائی دینے کے قابل ہی نہیں رہی تھی وہ مضحکہ خیز و اُس
 بھور فارحہ سے کر رہی تھی، اسے اپنی کارکردگی بتا رہی تھی
 اور دونوں شکیلہ کا مذاق اڑا رہی تھیں رشتوں کا تقدس باطل

ندا کے کانوں میں آئی۔
 ”امی جی میں وضو کر رہا ہوں۔“ یہ آواز حسن بھائی کی تھی۔

”جویریہ کیا کر رہی ہو؟“ حسن بھائی نے جویریہ بھابی سے پوچھا تھا۔

”میں دادو کے لیے چائے بنا رہی ہوں، چائے بنا کے نماز پڑھتی ہوں آپ اسامہ اور حذیفہ کو بھی اپنے ساتھ مسجد لے کر جائے گا نماز کے لیے۔“ جویریہ بھابی نے کہا تھا چھوٹے سے گھر میں آوازیں گونج رہی تھیں اور ندا چوری سی بنی کمرے میں دبی بیٹھی تھی۔ وہ اچانک سب کے سامنے کیسے جانے لگی۔ امی کیسے بتائیں گی۔ ندا یہی باتیں سوچ رہی تھی۔ آج اس نے بہت مہینوں بعد نماز پڑھی تھی بھابی، بچے، بھائی اور دادو سب ندا کو پہلے جیسی گرم جوشی سے ملے کسی نے اسے کچھ بھی محسوس نہیں ہونے دیا مگر ندا نے کچھ ہی دنوں میں اندازہ لگا لیا کہ جویریہ بھابی گھر کو کتنے اچھے سے سنبھالتی ہیں نہ صرف امی کی عزت کرتی ہیں۔ ان کا خیال رکھتی ہیں بلکہ دادو کی بھی بہت دیکھ بھال کرتی ہیں۔ اپنے بچوں کو بڑوں کی عزت کرنا سکھا رہی ہیں ندا کو بہت شرم آئی وہ اب روٹی تھی اسے ندامت ہوئی جب وہ عام سے ستے سے سوٹ میں بھابی کو خوش دیکھتی۔ بھابی صبح سب سے پہلے اٹھتی تھیں اور سب سے بعد میں سوئی تھیں سب کا بہت خیال رکھتیں۔ گھر کا سارا کام خود کرتیں اور قناعت پسنداتی کہ ہر حال میں خوش اور مگن رہتی تھیں اور اسامہ اور حذیفہ کتنے تابعدار بچے تھے۔ بزرگوں کے زیر سایہ پل رہے تھے دادو کے ساتھ لیٹتے تو دادو بچوں کو گلے پڑھایا کرتیں۔ اچھی، اچھی باتیں بتاتیں۔ حسن بھائی آتے تو سیدھا دادو کے پاس جاتے اور ان کے ساتھ لیٹ جاتے وہ دو دو ماؤں کا پیار سمیٹ رہے تھے۔ حسن بھائی، امی اور دادو کے ساتھ ہی کھانا کھاتے تھے۔ جویریہ بھابی کے چہرے پر کیسی الوہی سی چمک تھی اور حسن بھائی جویریہ بھابی سے ہنسی محبت کرتے تھے۔ جویریہ، حسن کو اس کے سارے رشتوں سے جوڑ کر رکھتی تھی وہ عام سی شکل

صورت کی مالک تھی کچھ خاص پڑھی لکھی بھی نہیں تھی مگر دلوں میں بسنے کا فن جانتی تھی کسی نے بھی ندا کو کچھ نہیں جتلا یا تھا سب اسے ہاتھوں ہاتھ لے رہے تھے جیسے ہمیشہ لیا تھا مگر نہ سب اس کی طرف دیکھتی بھی نہیں تھیں۔

ندا نے ہمیشہ اچھا پہنا تھا اچھا کھایا تھا ماں اور بھائی نے اسے کبھی کوئی کی نہیں ہونے دی تھی کالج کے بعد وہ یونیورسٹی چلی گئی تب بھی اس کو حسن نے کوئی کی نہیں ہونے دی۔ ان کے مالی حالات کبھی اچھے نہیں رہے تھے۔ ندا یونیورسٹی سے فارغ ہوئی تو اس کی شادی ہو گئی اسے گھر گرہستی کا کچھ پتا نہیں تھا اس نے ہمیشہ لیا ہی لیا تھا کبھی بدلے میں کسی کو کچھ دیا نہیں تھا۔

☆☆☆

اس دن بھابی اور بھابی دادو کو ڈاکٹر کے پاس لے کر گئے ہوئے تھے۔ ندا ماں کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ وہ سبزی بنا رہی تھیں۔

”امی مجھے معاف کر دیں، میرے دل پر بہت بوجھ ہے۔“ ندا پھوٹ، پھوٹ کر رو دی۔

”کیوں معاف کر دوں تمہیں..... میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔“ ندا نے منہ موڑ لیا۔

”آپ میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتی ہیں امی آپ تو مجھ سے بہت محبت کرتی ہیں۔“ ندا نے بیچارگی سے کہا تو انہوں نے اسے گھور کر دیکھا۔

”جب تم اپنی ماں کی ساری زندگی کی محنت ایسے ضائع کر سکتی ہو تو میں ناراض ہونے کا حق بھی نہیں رکھتی کیا؟“

”امی مجھے معاف کر دیں۔“

”کیوں معاف کر دوں تمہیں۔ کبھی معاف نہیں کروں گی تم اتنی خود غرض کیسے ہو سکتی ہو ندا۔ میرا سر جھکا دیا مجھے شرمندہ کر دیا، میری تربیت پر ایسے انگلی اٹھے گی میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔“ وہ اپنا چہرہ ڈھانپ کر رونے لگیں۔

”امی مت روئیں۔“ ندا نے ان کے ہاتھ چہرے سے ہٹانے چاہے نہ سب بھگ گئیں۔

میرے سامنے سے درندہ میں تمہارا گلہ دبا دوں گی۔ زینب نے ندا کو دکھا دیا تھا۔ وہ روتی رہی زینب بھی روتی رہیں مگر نہ ان کا ملال کم ہوا نہ ہی ندا پر غصہ۔

☆☆☆

زینب، ندا کو اس کے گھر چھوڑنے لگی تھیں۔ انہوں نے جاتے ہی شکیلہ اور احمر کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے ندا نے بھی اپنی ساس کے پاؤں پکڑ کے معافی مانگی تھی، وہ دل سے شرمندہ تھی، احمر چپ تھا۔

”شکیلہ باجی مجھے معاف کر دیں، میرا سر شرم کے مارے آپ کے آگے جھکا ہوا ہے، ندا کا جرم بہت بڑا ہے مگر آپ اسے ایک موقع دیں تاکہ یہ خود کو سدھار سکے۔ ہر بار سسرال والوں پر ہی الزام رکھا جاتا ہے اور مائیں اپنی بیٹیوں کا ہی ساتھ دیتی ہیں جبکہ بہت ساری ندا جیسی لڑکیاں بھی ہوتی ہیں جو نئے گھر میں جا کر ان کے مطابق خود کو ڈھالنے کی کوشش نہیں کرتیں، اپنی ڈتے دار یوں خوش اسلوبی سے بھانے کے بجائے بے پروائی برتی ہیں اور اپنی عاقبت نا اندیشی کی بدولت اپنا گھر خراب کر لیتی ہیں میں مانتی ہوں ایسے سسرال بھی ہوتے ہیں جو اپنی بہوؤں کا جینا محال کر دیتے ہیں مگر ندا خوش نصیب ہے کہ اسے آپ جیسی ساس ملی اور احمر جیسا سلجھا ہوا شوہر ملا۔“

”یہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں زینب بہن۔ ندا نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا، آپ معافی کیوں مانگ رہی ہیں۔ مجھے احمر نے بتایا تھا کہ ندا کی طبیعت ٹھیک نہیں میں اس لیے اس کی امی کے پاس اسے چھوڑ آیا ہوں، میں نے کافی دفعہ کہا کہ مجھے اپنی بیٹی سے ملنا ہے، مجھے لے چلو مگر احمر کو کہتا رہا کہ ابھی تو میں مصروف ہوں۔“ شکیلہ کی بات پر زینب نے پہلے احمر پھر ندا کو دیکھا۔ ندا پر گھڑوں پانی پڑ گیا دونوں ماں بیٹا کتنے اچھے تھے۔ بیٹے نے ماں سے اور ماں نے بیٹے سے ندا کا پردہ رکھا ہوا تھا۔ ندا کا دل گریہ سے لرزنے لگا۔ وہ ایک بار پھر شکیلہ کی گود میں سر رکھ کر رو دی۔ ندا دل سے نادم تھی۔

”کیوں نہ روؤں میں، میں اتنی کم ظرف بیٹی کی ماں ہوں جو اپنی ساس کے لیے اپنے دل میں جگہ نہیں بنا سکی۔ مجھے بتاؤ تم نے کبھی بچپن سے آج تک دیکھا کبھی کہ میں نے تمہاری دادی کے ساتھ ایسا ناروا سلوک کیا ہو؟ میں نے ان کی ہمیشہ عزت کی ان سے اللہ کی رضا کے لیے محبت کی، محبت کرنا پڑتی ہے یہ جو رشتوں کا جال ہوتا ہے ناں اس کی حفاظت عورت کو ہی کرنا ہوتی ہے۔ سب رشتوں کو اس محبت کے جال میں سمیٹ کر رکھنا قربانیاں دینا، صلاحی کرنا اور بہت سی عورتیں تو ایسی بھی ہوتی ہیں جو ساری زندگی گھر بناتی رہتی ہیں، رشتے نبھاتی رہتی ہیں اور پھر بھی انہیں کوئی صلہ بھی نہیں ملتا تم تو خوش نصیب ہو کہ تمہیں اتنی اچھی ساس ملی مگر تم نے اس عورت کی قدر نہیں کی۔ تف ہے تم پر۔ کاش تم میری بیٹی نہ ہوتیں۔۔۔ سوچو اب اکیلے میں بیٹھ کے۔۔۔ بائیس سال تک تمہارا خیال رکھنے والی ماں نے بدلے میں تم سے کیا مانگا تھا جب تم رخصت ہو رہی تھیں تو میں نے کیا کہا تھا؟“ زینب کی رو، رو کے بچکی بندھ گئی تھی ان کا انداز سوالیہ تھا۔

”امی آپ نے کہا تھا کہ ندا اپنی ماں کی تربیت کی لاج رکھنا اور اپنی تعلیم کی بھی عزت رکھنا۔“

”اور تم نے کیا، کیا ندا۔ ماں کو ایک خوشی بھی نہیں دے سکیں تم اپنی ماں کا احساس نہیں کر پائیں تو اپنے شوہر کی ماں کا کیا خیال کرتیں۔۔۔ کوئی لحاظ ہوتا ہے کوئی حروت ہوتی ہے ندا تم نے تو حد کر دی۔ پہلے اسکول پھر کالج، یونیورسٹی جالی رہیں۔ تمہارے گیلے تو لیے کون سمیٹا تھا، تمہارا کرا کون سیٹ کرتا تھا کوئی جن نہیں رہتا تھا گھر میں۔ وہ میں ہی تھی جو ہر گزرتے دن کے ساتھ اپنے بدن میں جھکن بھر رہی تھی شاید وہ میری ہی غلطی تھی کہ تم پر کوئی ڈتے داری نہیں ڈالی خود ساری زندگی سستے کپڑے پہنے اور تمہیں فیشن کے مطابق پہنایا کہ تم اپنی دوستوں میں خود کو کم تر نہ سمجھو تمہاری تعلیم پر اپنی اوقات سے بڑھ کر خرچ کیا۔ اس لیے کہ تم انسان اور انسانیت کو سمجھ سکو جینے کا شعور مل سکے۔ ساری عمر میں نے صرف تمہیں دیکھا، تمہیں چاہا اور تم سے ایک چیز ہی مانگی تھی، وہ بھی تم ماں کو نہیں دے پائیں۔ چلی جاؤ

اشک، جگنو اور ستارے

عالیہ حسا



جہاں سے ابھی، ابھی سعد بن رضا..... رضا گیلانی کا ہونہار سپوت گیا تھا۔
 ”وہ میرے پاس کیوں آیا؟“ سعد سے تیسری ملاقات نے یہ سوچ میرے دماغ میں بھر دی..... رضا گیلانی سے میری اچھی دعا سلام تھی کتنی دفعہ انہیں باہمی مشاورت کی ضرورت پڑی، انہوں نے مجھے بلوالیا یا میرے کلینک چلے آئے..... مگر ان کا بیٹا..... وہ کیوں آ رہا تھا؟ یہ ابھی واضح نہیں ہوا تھا۔ میں اپنی چیز کو ادھر ادھر گھمانے لگا۔

سعد بن رضا..... مشہور و معروف بزنس مین رضا گیلانی کا بیٹا میرے پاس مسلسل کیوں آ رہا تھا۔ آج تیسری بار وہ مجھ سے ملنے آیا تھا۔ سعد کی شادی کو ایک ماہ ہوا تھا۔ میرے حساب سے تو اسے سنی مون کے لیے کسی پُر فضا مقام پر کسی حسین لینڈ اسکیپ کا حصہ ہونا چاہیے تھا۔ شمالی علاقہ جات کے بجائے سوئٹزر لینڈ، آسٹریلیا یا پھر آئی لینڈ میں..... مگر..... ایک انٹلی سے اپنی پیشانی سمجھاتے ہوئے میں پُرسوج بلکہ پُر تفکر انداز میں کمرے کے بند دروازے کو دیکھ رہا تھا۔



آخر کیوں.....؟

میرے سامنے بیٹھا سعد بن رضا مکمل خاموش تھا۔ آنکھیں گہری یاسیت لیے تھیں۔ وہ خاصا بے چین سا بھی لگا تھا۔ میں اپنے آخری مریض کو الوداعی جملے کہتا اس کی جانب متوجہ ہوا تھا، اس نے دو مرتبہ پہلو بدلا تھا اور.....

میں حیران ہوا.....

مریض کے جانے کے بعد وہ بھی اٹھا اور۔ ”خدا حافظ مہران بھائی۔“ کہتا ہوا نکل گیا۔

جب سننے کا وقت آیا تو سنائے بغیر چلا گیا۔ اور مہمان نوازی میرے ہونٹوں پر ہی رہ گئی۔

”کیوں.....“ میں اپنی چیئر گھماتا سعد بن رضا پر غور کر رہا تھا۔ سارے مریض جا چکے تھے۔ میری ٹیبل پر تمام فائلیں بند تھیں۔

”جی دروازہ کھلا اور اقبال (میرا سیکرٹری) اندر آ گیا۔

”سہ تمام مریض جا چکے ہیں۔“ فائلیں سمیٹ کر ایک پر ایک نمبر سے رکھیں۔

”ہوں۔“

”سرگھر سے دو بار فون آچکا ہے۔“

”ہوں.....“ میں غائب دماغی سے اسے دیکھنے لگا۔ ایک مسٹری، ایک آنکھیں، ایک سپنس، ایک الجھاؤ تھا۔ جو مجھے از خود خود ہی سمجھنا تھا۔

میرے پاس بہت سے مریض، بہت سے کیس آتے ہیں اپنا مسئلہ بتاتے ہیں۔ باہمی مشاورت، تحلیل نفسی، ذہنی علاج کو باہمی روابط سے حل کر لیتے ہیں۔

پر ہر مریض ایسا نہیں ہوتا۔ ہر مریض میں اتنی صلاحیت یا اتنی جرأت نہیں ہوتی کہ خود کو مریض سمجھے اپنے مسئلے کو مسئلہ سمجھے۔

بعض مریضوں کو مجھے بڑے طریقے سے ہینڈل کرنا ہوتا ہے۔

”تو.....“ میں گہری سانس لے کر سیدھا ہوا۔ اقبال کچھ فائلیں، میری پانی کی بوتل، گلاس لے کر باہر

سعد سے میری ملاقات رضا گیلانی کے آفس میں ہوئی تھی۔ باپ کے تعارف کروانے پر بڑی خوش دلی سے پورا ہاتھ پھیلا کر گرجوٹی سے اس نے مصافحہ کیا تھا۔

”سعد بیٹا ان سے ملو، یہ ہیں مشہور و معروف اور بے انتہا مصروف سائیکا ٹرسٹ مہران غزنوی۔“ انہوں نے کچھ انہی الفاظ میں میرا تعارف کرایا تھا۔

اپنی شادی میں وہ بہت حسین لگ رہا تھا، آف وہائٹ شیروانی اور میرون کلاہ میں وہ بہت وجیہ لگ رہا تھا۔ اس کی دلہن بہت پیاری تھی۔ سی گرین اور رائل بلو کے کنٹراسٹ میں غضب ڈھا رہی تھی۔ دونوں کی جوڑی شاندار تھی۔ میں اور فضا بلوریں جام پکڑے۔

قد بے الگ تھلگ کھڑے تھمرہ کر رہے تھے، تھمرہ تو فضا ہی کر رہی تھی، میں فقط جائزہ لے رہا تھا مگر دیکھ اپنی دلہن کو ہی رہا تھا۔ اس نے آج میری فرمائش پر رائل بلیو کا مدرساڑی باندھی تھی۔ اس کے ہموار دراز سلکی ہال کھلے ہوئے تھے۔ کانوں کے جھمکے نمایاں تھے۔

شگرفنی گداز ہونٹوں پر میرا پسندیدہ مکر حسن کو لو دے رہا تھا۔ میں قدرے فرصت سے کم ہی تقریبات میں جاتا تھا اور جب جاتا تو اندر تک ایک بھر پور طمانیت کے ساتھ شامل ہوتا تھا۔ بچے، امی جان کے پاس ہوتے تھے۔ اور میرا سارا وقت بھر پورا انداز میں فضا کے لیے ہی ہوتا اور وہ میری قربت سے سرشار، سارے گلے، شکوے، شکایتیں، حکایتیں بھول جاتی۔

سعد بن رضا کی شادی اس لیے بھی مجھے یاد رہ گئی کہ فضا کو دلہن کا حسن، سادگی بھر اسٹھار اور با حیا روپ بہت ہی اچھا لگا تھا۔

سعد بن رضا کا میرے پاس میرے کلینک پر کیا کام..... اسے تو ابھی اپنی زوجہ محترمہ کے حسن کے قسیدے پڑھنا چاہیے تھے۔ اور وہ سائیکا ٹرسٹ مہران غزنوی کے کلینک کے چکر لگا رہا تھا۔

چلو پہلا اتفاق ہو سکتا تھا..... دوسری مرتبہ بھی آتا۔ ”ادھر سے گزر رہا تھا سوچا آپ سے ملتا چلوں۔“ تیسری مرتبہ..... اخلاقاً..... چوتھی مرتبہ..... مروتا.....

میں نے ان کے لئے دعا کی ہے کہ وہ اپنی زندگی میں

وہ اٹھا اور سوئمنگ پول کے کنارے، کنارے چلنے لگا۔ میں وائٹ کین کی کرسی پر بیٹھا دور سے ہی اس کا جائزہ لیتا رہا اور پھر اٹھ کر پارکنگ ایریا تک چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ مجھے آتا نظر آیا۔ میں ٹھیک فون آن کرتے ہوئے جان بوجھ کر منظر پر واپس آیا..... مجھے یقین تھا وہ چونک کر میری جانب دیکھ رہا ہوگا اور میرا اندازہ درست نکلا۔ وہ میری جانب آ رہا تھا۔ میں فون پر نصیحت سے بات کر رہا تھا، وہ میرے پاس ٹھہر گیا۔

”سر آپ یہاں.....؟“ وہ سنجیدہ تھا۔
 ”میں تو روز ہی یہاں آتا ہوں اور آج تو ذرا
 فارغ تھا تو کافی دیر سے ہوں۔ سوئمنگ بھی کی ہے۔“
 میں گاڑی کا دروازہ کھولنے لگا۔ اس کے چہرے پر
 تاسف سا ابھرا۔

وہ میری ہی جانب دیکھ رہا تھا۔ چہرے پر کوئی سوچ تھی۔

سپتمبر 2017ء

☆☆☆

اس کے قدموں کی رفتار سست تھی۔ میں نے پیچھے سے
آواز دینا مناسب نہیں سمجھا۔ میں دونوں ہاتھ کمر پر
رکھے اسے جاتا دیکھتا رہا۔

☆☆☆

کوئی نفسانی الجھن تھی..... مجھے یقین تھا۔

”آیا تھا.....“ دھیرے سے کہا گیا۔

میں اسے بغور دیکھتا رہا۔

”سعد.....“ دھیرے سے ہاتھ دیا۔

”کیا کوئی مسٹری ہے؟“ وہ میری شکل دیکھنے لگا۔

”ہاں.....“

”کیا.....؟“ میں گاڑی سے نکل کر اس کے

سامنے کھڑا ہوا۔

”میں یا تو اسے مار دوں گا..... یا اسے طلاق

دے دوں گا۔“ اس کے لبوں سے دھیرے سے نکلا۔

اور میں دنگ رہ گیا۔

اس کے چہرے کا رنگ بدل رہا تھا۔

”چلو ابھی میرے آفس چلو اور اپنا مسئلہ بتاؤ.....

کیا ہوا..... اتنے ہرٹ کیوں ہو، اتنی پیاری ہے تمہاری

دلہن..... فضا تو بہت تعریف کر رہی تھی۔ اور تمہاری تو

لو میرج ہے ناں..... فضا بتا رہی تھی، وہ دراصل فضا

میری بیگم ہے۔“ سعد رضا میری شکل دیکھنے لگا۔ سورج

ڈھل چکا تھا اور شام کے سائے دیواروں پر اتر کر ایک

ٹھنڈا سا احساس دے رہے تھے۔ سبک ہواؤں نے

بیرا کر لیا تھا۔

”میں کل آؤں گا۔“ اس نے دھیرے سے میرا ہاتھ

چھوا اور بڑے، بڑے ڈگ بھرتا اندر کی جانب چلا گیا۔

ابھی اس کی مردانگی کو یقین کرنا تھا کہ اس نے اپنے

مسئلے کو کسی سائیکالٹرسٹ سے شیئر بھی کرنا ہے یا نہیں.....

اگر وہ کل نہیں آیا تو مجھے خود اس سے ملنا ہوگا اس کی دلہن

بہت خوب صورت نازک تھی اور پھر لو میرج.....

ایسا کیا ہوا؟ جو سعد اسے طلاق دے گا..... یا مار

ہی ڈالے گا۔ میں پارکنگ ایریا کی طرف بڑھ گیا۔ میرا

ذہن الجھ گیا تھا۔ تصور میں سعد اور اس کی دلہن کا خوب

صورت روپ ابھرا جو چاند سورج کی جوڑی اور مثالی

جوڑا کہلایا جا رہا تھا۔

☆☆☆

اگلے دن وہ نہیں آیا۔ اس سے اگلے دن آگیا۔ اس

کا حلیہ نکھر ہوا تھا شیو بڑھی ہوئی تھی۔ وہ ٹراؤزر اور بیو

ٹی شرٹ میں ملبوس تھا۔ تک سب سے تیار دو لہا سے الٹ۔

اس کی آنکھیں شب بیداری کی غماز تھیں.....

چہرے پر ایک تھکان تھی اسے سکون کی ضرورت تھی۔

میں نے اسے کچھ ٹریگولائزر دیں اور اسے آرام دہ

نشت برلا دیا۔

”مکنتے دن سے نہیں سوئے.....؟“ اس کے

ہاتھ سے بال ہٹا کر میں نے اپنی نشت سنبھال لی۔

”بہت دنوں سے..... جب سے شادی ہوئی ہے

جب سے اور اب تو سلپنگ پلو بھی سکون نہیں دیتیں۔“

”ایسا کیوں ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”میری شادی غلط ہوئی ہے، مجھے اس سے

شادی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ وہ مجھے اچھی لگی میں نے

اسے محبت سمجھ لیا۔ محض اچھا لگنا تو محبت نہیں ہوتی

ناں۔ حالانکہ مئی کہتی تھیں رشتے اپنی برابری میں ہی

اچھے لگتے ہیں۔ اپنی سوسائٹی میں شادی کرلو..... مگر

مجھے صبا اچھی لگی، میں اسے اپنی زندگی میں لانا چاہتا

تھا۔ اس کی طبیعت میں احتیاط پسندی تھی۔ اسے

مردوں سے بے تکلفی اچھی نہیں لگتی تھی۔ اس نے میری

پزیرائی کو قبول نہیں کیا۔ اور میں اس کی چاہ میں ڈوبتا

چلا گیا۔“ راک لمبے کو رک کر سعد بن رضوانے آنکھیں

موند کر گہری سانس لی اور پھر گویا ہوا۔

”ممی اور بابا میری پسند پر مان گئے مگر انہیں

متوسط گھرانے پر اعتراض تھا۔ مگر صبا کی خوب صورتی

نے انہیں متاثر کر دیا۔ میری بارات سادگی سے گئی مگر

میرا ولیمہ خوب دھوم دھام سے ہوا۔ آپ بھی تو آئے

تھے ناں.....“

”ہاں بہت خوب صورت جوڑی ہے تمہاری۔“

سعد چپ کر کے چھت کو دیکھتا رہا۔

”مگر..... صبا اس رشتے سے اس..... ساتھ سے

خوش نہیں، میری موجودگی میں وہ ڈری، یہی گھبرائی ہوئی

رہتی ہے ایسے جیسے میں غیر ہوں۔“ میرا متحرک قلم کاغذ

کی سطح پر ٹھک گیا۔ میں اسے دیکھنے لگا۔

”ہلکی آہٹ بھی اسے چونکا دیتی ہے میرا لیس

وہ چپ سا ہو گیا۔

”میں تمہارا مسئلہ حل کر دوں گا۔ مجھے کچھ اور بتاؤ؟“
”بتانے کے لیے میرے پاس کچھ اور نہیں ہے
بس اس کا گریز اس کا فرار..... اس کا خوف و ہراس،
اس کا ڈر..... یہی تو مسئلہ ہے۔“

”تم نے وجہ جاننے کی کوشش نہیں کی؟“

”سر میں نے پوچھا تھا بہت پوچھا مگر وہ.....“

”جاننے کی کوشش..... اس کے لہروالے، بہن،

بھائی اس کی کوئی دوست..... کسی کو اعتماد میں لیا؟“ میں
نے کہا۔ سعد میری شکل دیکھنے لگا۔

”ہو سکتا ہے کوئی ایسی وجہ ہو جو وہ بتا نہ پا رہی ہو

یا کسی نے اسے دھمکایا ہو..... یا پھر وہ تمہارے گھر کے

سیٹ اپ میں شمولیت نہ کر پا رہی ہو۔ اس حد اس

فاصلے کو قبض اوقات لمحوں میں طے کر لیا جاتا ہے اور

بعض دفعہ عمر بے بیت جاتی ہیں سعد.....“ میں نے

رسان بھرے انداز میں اسے دیکھا۔

سعد..... چونک کر میری جانب دیکھنے لگا۔

”اور تم جعفریات میں آکر کچھ اور سوچ رہے ہو۔“

”سر میں کوئی کجیجز بوٹڈ تو نہیں ہوں..... مجھے

آفس بھی جانا ہوتا ہے۔“

”ایسی صورت حال میں بننا پڑتا ہے جیجز بانڈ.....

واچ کرنا پڑتا ہے اگر زیادتی ہو جائے تو کفارے کی

کوئی صورت نہیں ہوتی۔ انسان کے خوف کی ایک ہی

صورت نہیں ہوتی جو تم سوچ رہے ہو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ

اس رشتے سے ہی خوفزدہ ہو..... تمہیں پہلے اسے

دوست بنانا چاہیے۔“ وہ تذبذب سے مجھے دیکھنے لگا۔

”سر میرے کزنز کی شادی بھی تو میرے ساتھ

ہوئی ہے، وہ ہنی مون پر گیا ہوا ہے۔ ابھی پچھلے

دنوں میرے دوست وقار کی شادی ہوئی ہے وہ تو بہت

خوش ہے۔“

سعد نے اپنی مٹھیاں بند کر لیں۔

اس کے دل میں جو اندیشہ بیٹھ گیا تھا وہ زیادہ مضبوط تھا

اور گزرتے دنوں کے ساتھ اور مضبوط ہو رہا تھا۔

اسے ڈرا دیتا ہے۔ پہلے دن ہی وہ بدک کر سہم گئی تھی۔
اس کے دل کا چور اس کے چہرے پر تھا۔ میں کمرے
میں موجود ہوں تو وہ باہر ہوتی ہے، دعو توں میں جاتے
ہوئے اس کے چہرے پر ہراس اور سہم ہوتا ہے۔
خوفزدگی کا شکار رہتی ہے جیسے میں نامحرم ہوں اس کے
لیے۔ ناپسندیدہ ہوں۔ میں نے اس سے پیار سے،
محبت سے، سختی سے پوچھا کہ وہ اتنی خوفزدہ، اتنی ڈری
سہمی کیوں رہتی ہے۔ کیا مسئلہ ہے؟ میری محبت اس
کے لیے اہمیت ہی نہیں رکھتی۔ میری کشش اسے نہیں
اکساتی۔ میرا وجود اسے نظر نہیں آتا۔ میری آمد اسے
ڈرا کیوں دیتی ہے؟“

”تم نے پوچھا نہیں کہ ایسا کیوں ہے؟“

”پوچھا تھا، وہ کہتی ہے ایسی کوئی بات نہیں، آپ
کا وہم ہے۔“

”تم نے زبردستی اپنا حق تو نہیں لیا؟“

”نہیں، لیکن تو دور کی بات ہے ایسا سوچنا بھی محال

ہے۔ میں نے کہاں ناں اسے مجھ سے خوف آتا ہے۔

کسی دہشت کا شکار رہتی ہے۔ اک ہراس اسے ہر

وقت گھیرے رہتا ہے، وہ..... وہ شاید کسی اور سے

محبت کرتی تھی.....“ دھیرے، دھیرے اس کی آواز

مدم ہوتی گئی۔

”مجھے بھی تو وہ اچھی لگتی ہے، میں اس پر شب خون

نہیں مارنا چاہتا۔“ وہ بولتے، بولتے شاید تھک گیا تھا۔

اور میں دم بخود اسے آنکھیں موندے دیکھتا رہا۔

کتنا عجیب مسئلہ تھا۔

اس کے لیے صبا اس کی دلہن سے بھی ملنا ضروری

تھا۔ بہت لمبیہر کیس تھا۔

☆☆☆

”سر جو میں نے کل ٹیلیٹ کھائی تھا اتنا سکون ملا تھا،

میں خود کو بہت اچھا اور فریش محسوس کر رہا تھا۔ مجھے

میڈیسن لکھ دیں میں خریدوں گا۔“ وہ آج پھر آ گیا تھا۔

”مگر میڈیسن تو کسی مسئلے کا حل نہیں ہوتی۔“

میں نے دونوں کہنیاں ٹیبل کی سطح پر رکھ کر اسے دیکھا،

”مجھے یہاں صرف سعد سے ہی نہیں بلکہ صبا اس کی دلہن سے بھی بات کرنی چاہیے۔“ پیپر ویٹ گھماتے ہوئے میں نے سوچا۔
 ”کوئی اور بات ہے جو تم اپنی مسز کے بارے میں جانتے ہو؟“

”وہ فون کی آواز پر ڈر جاتی ہے۔“
 ”وہ اپنے میکے کتنی بار گئی ہے؟“
 ”دو مہینے میں چار، پانچ بار گئی ہے مگر وہ جانا نہیں چاہتی، اس کی نانی اسے زبردستی لے گئی تھیں۔“
 ”نانی.....؟“ میں چونکا۔

”ہاں، اس کی والدہ نہیں ہیں ناں.....“ وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ اور میں اس کی شکل دیکھتا رہ گیا۔

اچانک ہی اس کا سیل فون بجنے لگا، سعد فون سننے لگا، میں برابر اسے واچ کر رہا تھا۔
 ”اوکے سر.....“ فون بند کر کے وہ اٹھ کھڑا ہو گیا۔

”میں چلتا ہوں بابا کا فون ہے۔“ اس نے ہاتھ بڑھایا۔

”شاید یہ مسئلہ آپ کے بس کا نہیں ہے، اس کا حل وہی ہے جو میں نے سوچ لیا ہے۔“
 میں نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔
 ”مایوسی گناہ ہے۔ دو ملاقاتوں میں مسئلہ حل نہیں ہوا کرتے۔“

”آپ مجھے میڈیسن کا نام لکھ دیں۔“
 ”تم صرف ایک کام کرنا جب رات کو اپنے بستر پر لیٹو تو آنکھیں بند کر کے اپنے تڑوئل کے متعلق سوچو، سلوک کے متعلق جانچو۔ اپنی غلطی، اپنی کوتاہی پر غور کرو اور پھر اسے لکھو۔ اگر لکھ نہ سکو تو یاد کر لو پھر مجھے بتانا۔“ اسے مشورہ دیتا اس کا ہاتھ تھامے، تھامے باہر آ گیا۔

”سراسر سارے قے میں میرا کوئی تصور نہیں ہے۔“
 ”تم صرف سوچنا اور غور کرنا..... بانی میرا کام ہے۔“
 اس نے چند لمحوں تک رک کر مجھے دیکھا اور

سیڑھیاں اتر کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔
 میں واپس اپنے کمرے میں آ بیٹھا۔ اس میں زیادہ تصور اس کی دلہن کا تھا جو کسی ڈر، خوف کا شکار تھی۔ اور سعد کا رعب و دبدبہ اس کے ڈر کو بڑھا رہا تھا۔ مجھے اسی کے لیے فضا کی مدد لینا تھی۔

فضہ اکثر میرے کام کر دیتی تھی۔ وہ میری رائٹ ہینڈ بن جاتی تھی مگر اپنے کام کی پوری ”وصولی“ کرتی تھی اور میں ہنستے ہوئے اس کی باتوں میں آ جاتا تھا۔

☆☆☆

”فضہ تمہیں وہ شادی یاد ہے جس میں تم بہت زیادہ پیاری لگ رہی تھیں۔“ میں بیڈ پر لیٹا اس سے مخاطب تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل کے آگے کھڑی فضہ مجھے دیکھنے لگی۔

”کیا میں صرف شادیوں میں ہی پیاری لگتی ہوں؟“ مصنوعی غصے سے مجھے دیکھا۔

”ہاں..... کیونکہ تم شادیوں میں ہی لگن سے تیار ہوتی ہو۔“ وہ اپنا کام مکمل کر کے بیڈ پر آ گئی۔

”میں پیاری ہوں، اچھی ہوں، خوب صورت ہوں اس لیے کہ آپ کے ساتھ ہوں۔“

”اس میں کیا شک ہے۔“ میں نے سر کھچایا۔

”تم واقعی حسین ہو اور اس وقت اور زیادہ حسین لگتی ہو جب میرے پاس ہوتی ہو۔“ میں نے اس کی کلائی پکڑ کر کہنے لگی۔

”کیا بات ہے ڈاکٹر مہراں غزنوی، کوئی کام ہے جو مابودلت کے حسن کے قصیدے پڑھے جا رہے ہیں۔“ اس کی چھٹی حس الٹ تھی۔ میں ہنس دیا۔ اس نے بکھرے بالوں کو سمیٹا۔

”مہنگائی بہت زیادہ ہو گئی ہے ڈیل فیس لوں گی۔“ چتون تھیکے ہوئے۔ بڑے آرام سے میرے گھٹنے سے ٹیک لگا کر میرا مسئلہ سننے بغیر اپنی فیس کا تعین کر لیا۔

”خرم کی شادی ہونے والی ہے اور.....“
 ”اور بس.....“ میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ

اشک، جگنو اور ستارے

کے درمیان دوستی کا رشتہ استوار ہو گیا تھا۔ فضا یہ کام بہت اچھے طریقے سے کرتی تھی۔

”تم نے وہ کام کیا جو میں نے کہا تھا؟“ میں نے بغور اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”جی..... مگر مجھے اپنا کہیں کوئی قصور نظر نہیں آیا۔“

”کوئی زیادتی؟“

”میں اسی سے محبت کرتا ہوں۔ میں زور زبردستی تو نہیں کر سکتا اگر مجھے کرنی ہوتی تو اب تک کر چکا ہوتا..... آپ کے پاس نہیں آتا۔“

”تمہارے گھر والوں سے اس کے تعلقات کیسے ہیں؟“

”ٹھیک ہیں۔“

”تمہاری ماما اس رشتے سے خوش تھیں ناں.....؟“

سعد میری جانب دیکھنے لگا۔

”پہلے تو ہمیں عمر میری ضد کی وجہ سے مان گئی تھیں۔ بعد میں انہیں صابند آگئی تھی۔“

صابا اور فضا اٹھ کر باہر نکل گئیں۔ کچھ دیر بعد وہ مجھے سوئمنگ پول کے کنارے نظر آئیں.....

”ہوں.....“ میں نے مشروب اٹھالیا۔ میں بہت کچھ سوچ رہا تھا۔

”تم اکیلے رہتے ہو؟“

”نہیں سب ہیں مگر اس وقت سب اپنی، اپنی مصروفیات کے سلسلے میں گھر سے باہر ہیں۔ میں بھی نکل رہا تھا۔“

”تمہاری مز کی کوئی مصروفیات نہیں ہیں؟“

شفاف شیشے کی اوٹ سے اسے دیکھتے ہوئے میں نے کہا۔

”شادی سے پہلے اسکول میں جاب کرتی تھی، بی بی اے کیا ہے۔“

”تو اسے گھر میں کیوں بٹھا رکھا ہے، اپنے آفس میں جگہ دو تاں.....“

”اسے شوق نہیں ہے۔“

”ہوں..... کچھ حل نکلا؟“

”نہیں..... بس چپ رہتی ہے گہری خاموشی.....“

”کچھ دنوں کے لیے اسے اس کے میکے چھوڑ

دیا۔“ پہلے سن تو لو..... اپنے ترانے مت شروع کرو.....“

”ہوں.....“ اپنے کھلے بالوں کو پیچھے کر کے توجہ کا ارتکا زکیا۔

”ہم سعد بن رضا کی شادی میں گئے تھے ناں..... تو مسئلہ اس کے ساتھ ہے۔“ میں دھیرے، دھیرے اسے بتانے لگا۔

اور وہ توجہ سے تمام پہلوؤں کو سن رہی تھی۔

☆☆☆

”ارے آپ سر یہاں؟“ سعد بن رضا اپنے گھر کے آگے میری گاڑی دیکھ کر حیران ہوا۔ وہ گیٹ کے اندر ہی جا رہا تھا۔

”مجھے فون کر لیتے۔“

”تمہارا فون بند تھا، تم کلینک بھی نہیں آئے۔ میں سمجھا تمہارا مسئلہ حل ہو گیا ہے، تمہیں مبارک باد دے آؤں۔“ میں گاڑی سے نکل آیا۔

”میرا مسئلہ.....؟“ وہ بالوں میں ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔

فضا اسے مسلسل واضح کر رہی تھی۔ مسئلہ گویا جوں کا توں تھا۔

”آئیے ناں اندر.....“

”ہاں میری مز بھی ساتھ ہیں۔“ وہ مجھے اندر لے آیا۔ فل گٹھری ہاؤس، شاہانہ ڈرائنگ روم، ڈرائنگ روم کی مرمر وال سے نظر آتا سوئمنگ پول..... پولکپس کے قطار در قطار کھڑے درخت، ہموار گھاس اور پھولوں کے قطعات بہت خوب صورت منظر تھا۔ فضا بے ہوش تھی۔ ویٹر ٹرائی لے آیا۔

اور کچھ دیر میں سعد اپنی بیگم کو لے آیا۔ نکھری، نکھری سادہ سی اپنے لمبے بالوں کی چوٹی بتائے، بالوں کی اک لٹ چہرے کو چھو رہی تھی۔ کسی بھی قسم کے میک اپ سے پاک میں نے اپنے انداز سے اور فضا نے اپنے انداز سے اس کا جائزہ لیا۔

اس کیس کا اصل کردار صبا تھی اور صبا کی مسٹری جاننا بہت ضروری تھی۔ فضا کو یہ کام کرنا تھا اور وہ بخوبی کر رہی تھی۔ دونوں کسی بات پر ہنس رہی تھیں۔ دونوں

۱۱ میں فاضلہ کو اس لیے ادھر لے کر آیا ہوں مگر روز، روز یہاں آنا ممکن نہیں ہے تمہارا گھر بہت دور ہے۔“
سعد میری شکل دیکھنے لگا۔

”میں ایک سائیکائرسٹ ہوں اور اس حیثیت سے سامنے نہیں آنا چاہتا بجائے کھلے کے وہ اور سٹ جائے گی۔“

”ہوں.....“ بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔
”سنو..... ان گزرتے دنوں میں اس صورت حال میں، اس ماحول میں تمہاری محبت کیسی ہے؟ بڑھی ہے یا وقت کے ساتھ، ساتھ گھٹ رہی ہے؟“
”رک گئی ہے۔“ مجھے دیکھ کر گہری سانس لی۔
”تمہاری محبت اتنی کمزور تھی؟“

”محبت ماند پڑ جاتی ہے جب اگلا کوئی پیش قدمی نہیں کرے اور میں زبردستی کا قائل نہیں ہوں۔“
”ہوں.....“ میں اپنی پیشانی کھجاتے ہوئے اسے دیکھ کر شیشے کے پار دیکھنے لگا۔ فاضلہ شاید صبا کے بالوں کی تعریف کر رہی تھی کیونکہ وہ اس کے بالوں کو چھو رہی تھی۔ صبا کے چہرے پر بہت معصومی مسکراہٹ تھی۔ ایسی لڑکیاں یا تو واقعی معصوم ہوتی ہیں یا پھر..... یا پھر بہت گہری..... کوئی کمند نہ ڈال سکے۔ کوئی گہرائی نہ ناپ سکے..... کوئی راز نہ پالے۔

میرے سہل پر کلائنٹ کے میسج آنے لگے۔
”اوکے ڈیز! جب بیگم میکے جائیں تو مجھے آگاہ کر دینا۔“

”مگر آپ..... آپ کیا کریں گے وہاں، اس کے گھر کا ماحول.....“ وہ تذبذب کا شکار ہوا۔
”ہاں.....“ مجھے علم ہے مگر میری بیگم میرے ہر معاملے میری رائٹ اینڈ، میری نصف بہتر ہے اور یہ رشتہ باہمی اعتماد کا ہی ہوتا ہے۔ وہ دیکھو.....“ میں نے شیشے کے پار اشارہ کیا اور کھڑا ہو گیا۔

دونوں گہری سہیلیوں کی طرح ایک دوسرے سے لگی ہوئی تھیں۔ سعد بھی ادھر ہی دیکھنے لگا۔
”تمہارا مسئلہ حل ہو جائے گا تھوڑا ٹائم لگے گا۔“

اسے لے کر میں باہر لان میں نکل آیا تھا۔ فاضلہ مجھے دیکھ کر میری جانب آگئی جبکہ صبا ادھر ہی کھڑی رہی۔

سعد کو خدا حافظ کہہ کر میں گاڑی میں بیٹھا، فاضلہ میرے برابر میں آ بیٹھی۔ چوکیدار نے گیٹ کھولا اور ہم مین روڈ پر آ گئے۔

گاڑی میں گہری خاموشی اور ایر فریشر کی خوشبو باہم مدغم تھیں۔
”کیسا رہا.....؟“

”یار..... وہ بہت ناکس، کیوٹ اور پیاری ہے۔ بولتی ہے تو لگتا ہے لہجے سے پھول جھڑ رہے ہو، سنتے رہو بڑا پیارا لہجہ ہے اس کا۔“
”اور تمہیں اس سے محبت ہوگئی۔“
”ہاں.....“ وہ ہنسی۔

اور میں اسی اعتماد کا اظہار چاہتا تھا۔
”وہ تمہیں کوئی نفسیاتی کردار لگی؟“ گردن گھما کر اسے دیکھا۔ لہجہ بھری خاموشی.....

”نہیں..... شاید ابھی ہم دو اجنبی تھے اور وہ مجھے کہنی دے رہی تھی۔ اگلی ملاقات میں محفل جم سکتی ہے۔“
”اگلی ملاقات مجھے نہیں صرف تمہیں کرنی ہے، یہ اس کا سیل نمبر ہے۔ میں نے سعد کو کہا ہے کہ تم صبا کو اس کے میکے بھجوا دو..... تم اس سے ادھر ہی ملاقات کرو گی اور.....“ میں نے گہری سانس لی۔

”مجھے فالودہ کھانا ہے۔“ تیزی سے گزرتے آکس کریم پارک کو دیکھ کر فاضلہ نے مجھے یاد دلایا۔

”راستے میں اور بھی ہیں فلاں جگہ سے کھلا دوں گا۔“ میں نے مشہور پارک کا نام لیا۔
”وہ بہت دور ہے۔“ وہ ہنسی۔

”میرے ساتھ لانگ ڈرائیونگ پر ہو۔“
”تو ایک وہاں سے دلا دیجئے وہاں تک پہنچتے پہنچتے یہ والا ختم ہو جاتا۔“

میں نے گاڑی سائڈ میں کرتے، کرتے اسے دیکھا اس کے چہرے پر بڑی دلاویز شرارتی سی مسکان تھی۔ میں اسے دیکھ گیا۔ اور یہی وہ چاہتی تھی۔

اشک، جگنو اور ستارے

”تم ریلیکس کرو۔ گھومو پھرو..... پریشان مت ہو، جلد ہی مسئلہ حل ہو جائے گا۔“

”جی..... اسی لیے تو آپ کے پاس آیا تھا۔“
”اس اعتماد کا شکریہ“ پاک فین“ ہمیشہ آپ کے ساتھ رہے گا۔“ اس کی ہنسی ابھری اور میں نے خدا حافظ کہہ کر ٹیل آف کر دیا۔

☆☆☆

فضہ نے بڑے شوق سے فون نمبر اور ایڈریس لیا۔
”ایڈریس کی فکر مت کرو، میں خود تمہیں پہنچاؤں گا۔“

”میں جانتی ہوں آپ کا جو مسئلہ ہے مجھے تو میری دوستوں کے گھر لے کر نہیں جائیں گے اور.....“
”بھئی میرے دوست جو ان کے گھر پر نہیں ہوتے ناں.....“ میں ہنسا۔ لب بھینچ کر اس نے مجھے گھورا۔ ہاتھ بڑھا کر میں نے اس کی لٹ کھینچی۔ جواب میں استحقاق بھرے انداز میں اس نے میری پاکٹ میں سے سیل فون نکالا اور کارڈ پر لکھا نمبر ملانے لگی۔
”میں ادھر ہی اس کے گھنے پر سر رکھ کر لیٹا اور ٹیل سے ریسیٹ اٹھا کر خاموش سرچنگ کرنے لگا۔ نمبر بڑی تھا۔ چند لمحوں بعد پھر کیا..... اٹھا لیا گیا۔“
”ہیلو..... صبا..... میں فضہ مہران، ہم ملے تھے ناں.....“
”ہاں بس..... مل گیا تمہارا نمبر..... تم تو بھول گئیں ناں.....“

”میں بس دل چاہ رہا تھا تم سے ملنے کو..... آ جاؤں..... بھئی میں نے تمہیں دوست بنا لیا ہے۔ میں تمہاری جان نہیں چھوڑوں گی۔“ وہ ہنسی۔
”اچھا کہاں آؤں.....؟“

”اوہ، امی کے گھر ہو۔“

”تو تانی کے گھر کون، کون ہے؟“

”اوکے..... شادی سے فارغ ہو جاؤ پھر ملتے ہیں۔“

”ایسے کیسے..... مہران نہیں مانیں گے۔ تم

آنا ناں کارڈ دینے۔“

”اوکے جب بھی آؤ اس نمبر پر کال کر لیتا،

”میں رپورٹ مانگ رہا ہوں شاید.....“

”فیس.....“ وہ شرارت پر آمادہ تھی۔

”سوچ لو..... بڑی فیس لوگی یا چھوٹی؟“

دروازہ کھولا۔

”ڈاکٹر مہران غزنوی..... بڑی فیس دینے سے پہلے چھوٹی فیس دینی پڑتی ہے۔ اور میں نے ابھی فیس کا تعین نہیں کیا مگر ماسٹڈ بنالیں۔ بڑی پارٹی..... بھگڑی فیس۔“ اس کی ہنسی جاندار تھی۔

میں اترتے، اترتے اسے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں جگنو اور چہرے پر غزل تھی۔ دل چاہ رہا تھا رک کر پڑھوں مگر..... ”آہ“ میں اتر گیا۔ میری قربت میں سرشار وہ ایسے ہی راہ چلتے میرے استحقاق لیتی تھی اور میں ایک ہی دفعہ میں اسے سارے نتیجے سنا دیا کرتا تھا۔ اس کے لیے میں انٹیکل فالوہ لے آیا تھا۔

”اگر صبا مجھے کہیں اور بھی ملتی تو میں اسے دوست بنا لیتی۔ دوستی کا رشتہ بڑا پائدار ہوتا ہے۔ انشاء اللہ میں جلد ہی گڈ نیوز دوں گی۔“ فالوہ کھا کر اس نے مجھے اپنا تجزیہ بتایا۔

”اے.....“ میں نے انگلی اٹھا کر اسے دیکھا۔

”میرا سوئزر لینڈ جانے کا ارادہ ہے اس کیس کے بعد میں کوئی گڈ نیوز نہیں سنوں گا۔“

اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اسے مجھ سے ایسے مزاح کی توقع نہیں تھی۔ میں نے گنگنا تے ہوئے گاڑی اشارت کر کے اپنے رستے پر ڈال دی۔

بات سمجھ میں آئی تو اس کے چہرے پر بڑے شرمیلے سے گلاب کھلے تھے۔ مجھ پر کئے برسائے لگی۔ میں ٹھٹھکا کر ہنسا۔

اس کے ترنم نے ماحول کے ردھم میں اضافہ کر دیا تھا..... پھر ہمارے درمیان موسم رہتا ہی خوشگوار تھا یہ ہماری باہمی محبت کا نتیجہ تھا۔

چند دن بعد سعد کا فون آیا۔ ”صبا بکے گئی ہے اس کے کسی کزن کی شادی ہے۔“ اس کا فون نمبر، ایڈریس اس نے مجھے دیا۔

”ہیں ایڈریس سمجھا دیں گے۔“

”او کے۔۔۔۔۔“

اب مجھے تجسس ہو گیا کہ صبا کس کے ساتھ جاتی ہے، فضا کا کہنا تھا کہ وہ میکے میں ہے وہاں سے کسی کے ساتھ آئے گی۔ اور میرا خیال تھا کہ وہ سعد کے ساتھ جائے گی اگر اسے کسی اور سے محبت نہ ہوئی تو۔۔۔۔۔

”نہیں آئے ابھی۔۔۔۔۔“

اگلے چار گھنٹوں بعد میں گھر چلا گیا۔ سادگی سے تیار فضا بہت پیاری لگ رہی تھی۔

”کیا آئی۔۔۔۔۔؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ بس آنے والی ہے۔“

”اوہ۔۔۔۔۔“ میں نے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”اتنی بے چینی؟“ فضا نہی۔

میں نے ہنس کر اس کے بال کھینچے۔۔۔۔۔ اس نے میرا بازو تھام لیا۔

”بچے کہاں ہیں؟“

”امی کے ساتھ پارک گئے ہیں۔“

”واؤ۔۔۔۔۔“ میں نے اس کا شانہ دبایا۔

”کرن آئی ہوئی ہے۔“ میرے جذبوں کو تو چٹکیوں میں اڑاتی ہے یہ۔

”کہاں ہے؟“

”اندرا اپنے منے کے ساتھ ہے۔“

”فیصل بھی ہے۔“

”نہیں دو دن کے لیے آئی ہے، وہ فیصل آباد گئے ہیں۔“ ہم دونوں اندر آ گئے۔

فضا کچن میں جانے لگی، میں سیڑھیاں چڑھ کر اس کے روم تک گیا باہر ہارن بجا۔۔۔۔۔ میرے اندر کی بے چینی باہر متوجہ ہو کر بھاگی۔۔۔۔۔ میں کمرے میں داخل ہوا۔۔۔۔۔ اور ٹیس کا دروازہ کھول کر باہر گرل سے نیچے جھانکا۔ اور گہری سانس لے کر مسکرایا۔

میں نے پہلے دیکھ لیا تھا۔ اور فضا گیٹ کھول کر باہر جھانک رہی تھی۔

صبا۔۔۔۔۔ سعد کے ساتھ آئی تھی۔ یعنی اسے شادی

”او کے بائے۔۔۔۔۔“ میل فون آف کر کے فضا

ہالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ بڑا سکون سا

آنکھیں بند ہونے لگیں۔ میرا کام ذہنی مکان کا

ہا تھا ایسی لگاؤ ایسی بزرگائی سکون دیتی تھی۔ اور

مجھے جانتی تھی ایسی خوشی اکثر مجھے دیتی رہتی تھی۔

”صبا میکے گئی ہوئی ہے۔ اس کے کزن کی شادی

ہو بلارہی تھی، میں نے کہا کارڈ دو۔۔۔۔۔ مہراں ایسے

نہیں لائیں گے۔ تو وہ آئے گی کارڈ دینے۔“

”رہنے دیتیں، ہم چلے جاتے کام تو ہمارا ہے ناں۔۔۔۔۔“

اسی سے تو ایک پوائنٹ ملے گا وہ پلس ہو گا یا انس۔“

”کیا مطلب۔۔۔۔۔؟“ میں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”وہ میکے میں ہے، ظاہر ہے کارڈ لے کر کسی نہ

کسی کے ساتھ تو آئے گی ناں۔۔۔۔۔ وہ کون ہو گا؟ اس کا

بھائی، اس کا کزن۔۔۔۔۔ یا پھر وہ۔۔۔۔۔ وہ ذومعنی انداز

میں نہی۔۔۔۔۔ میں چونکا۔

”یا پھر وہ جسے وہ چاہتی ہوگی۔ اس سے شادی

نہیں ہو سکی ہو احساس محرومی یا پھر۔۔۔۔۔“

میں نے گہری سانس لی اور فضا کا ہاتھ تھام کر

اس پر اپنا چہرہ رکھ کر آنکھیں موند لیں۔ ایسے ہی تو مجھے

اس کی صلاحیتوں پر ناز نہیں تھا۔

”کیوں۔۔۔۔۔؟ بیویوں کی صلاحیتوں کو آزمانا

نہیں چاہیے، جانچنا چاہیے۔ زندگی میں بہترین جیون

ساتھی بننے کے لیے یہ تجرباتی نظریہ اپنانا بے حد ضروری

ہوتا ہے۔“

”بہت سکون مل رہا ہے یار۔۔۔۔۔؟“

”میں جانتی ہوں اس طرح سر رکھ کر آپ بالکل

رافع بن جاتے ہیں۔“ اس نے ہمارے بیٹے کا نام لیا۔

میرے بال ہلکے سے کھینچنے اور میں نے ہنس کر

آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

میں نے گھر کا مل ملا کر فضا کو بتایا کہ ”صبا کا فون

آیا ہے وہ کارڈ دینے آرہی ہے۔ ریسور کر لینا اسے۔“

”یہ مسئلہ ہی تو تلاش کرنا ہے۔“

ستمبر 2017ء

ماہنامہ پاکیزہ

لینڈ جانا ہے مجھے۔“
 ”منہ دھو رکھیں۔“ فضا نے سر گھما کر میری
 آنکھوں کی چمک کو دیکھا اور ہنس دی۔
 ”جی نہا نے جارہا ہوں۔“ آیان کو اس کی گود

میں دیا۔

”سنیں، مجھے سعد کے بارے میں کچھ پوچھنا
 تھا۔ اس کے بارے میں کچھ اور بتائیں۔“
 ”رات کو.....“ میں آگے بڑھنے لگا۔
 ”نہیں، میں بھول جاؤں گی۔“ میں نے رک کر
 اسے دیکھا..... اور گہری سانس لی۔
 ”اچھا پوچھو.....“ میں چپڑ پر بیٹھا۔

”صبا..... سعد کے ساتھ ادھر آئی وہ خوش تھی۔ مگر
 ایسا اطمینان اس وقت اس کے چہرے پر نہیں تھا جب
 میں وہاں اس گھر میں اس سے ملی تھی۔ جب.....
 خاموش..... ڈری، ڈری سی تھی۔ میں اس کے گھر جا کر
 اس کے نیلی ممبر سے بھی ملنا چاہوں گی اس کا ماحول
 دیکھوں گی۔ وہ کسی ذہنی اختلاج میں مبتلا ہے۔ بات یقینی
 ہے، آپ نے سعد سے یہ پوچھنا ہے کہ گھر کے اندر اور
 گھر کے باہر..... صبا کا رویہ، اس کا انداز کیسا ہوتا ہے۔
 یہ شادی پسندی ہے یا مکمل ارتخ یا لوارخ کے ساتھ۔“
 ”ہوں.....“ بات کافی گہری تھی مگر گرہ مکمل کئی تھی۔
 ”سعد سے ملاقات کریں اور یہ ملاقات ایسی ہو
 کہ صبا ساتھ ہو۔“

”ہوں.....“ میرے اندر کے جہاز اڑان لے
 رہے تھے۔

”اور یہ کہ میں نے صبا کے گھر ہر فنکشن میں جانا ہے۔“
 میں چونکا..... ہر فنکشن میں جانے کا مطلب تھا
 شاپنگ اور شاپنگ میں فی الوقت کرا نہیں سکتا تھا۔ آج
 کل میں ایک دوسرے کیس میں الجھا ہوا تھا۔

”فکر نہیں کریں، میں پرانے کپڑوں سے کام
 چلاؤں گی وہاں کون مجھے جانے گا کہ میں معروف
 ڈاکٹر مہراں غزنوی کی زوجہ ہوں۔“ اس کی مسکین
 صورت پر میں دل ہی دل میں ہنسا۔

”ہاں تمہیں لگنا بھی نہیں چاہیے خواہ خواہ میں
 لوگوں کو شک ہو جائے گا۔ پرانے ڈریسز جو اتنے بھی
 پرانے نہیں ہیں ان سے کام چلاؤ.....“ وہ مجھے گھورنے
 میں مصروف تھی۔

☆☆☆

بلوکلر کا بے حد خوب صورت گھیر والا ڈریس،
 چوڑی دار پاجامے کے ساتھ کانوں میں ہلکے سے
 آویزے، کھلے بال شانوں پر بکھرے تھے۔ محور کن
 پرنیوم اس کے وجود کو ہکا بکا رہا تھا۔ لائٹ میک اپ کے
 ساتھ وہ بیڑھیاں اترتی، روش پر چلتی، مالی سے کچھ کہتی
 گاڑی کے قریب آئی۔

”ٹھیک.....“ کجرااری آنکھوں میں شرارت سی
 چمک تھی۔ خدا کسی بیوی کو یہ احساس نہ دے کہ اس کا
 شوہر اسے کتنا چاہتا ہے۔ مہراں غزنوی نے گہری
 سانس لی۔
 ”ناکس.....“

”بس.....!“ کھلے فرنٹ ڈور سے میرے پہلو
 میں بیٹھ کر دروازہ بند کیا۔
 ”جی.....“ میں شوخ ہوا۔

”آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے، ابھی مہندی،
 شادی، ولیمہ باقی ہے اور تمہاری اقساط پر کمیشن اور.....“
 میں نے گاڑی اشارت کر کے گیٹ سے باہر نکالی.....
 چوکیدار کو ہدایت دیں اور مین روڈ پر آ گیا۔

میں گنگنا نے لگا۔ مجھے تیار ہوئی فضا بہت اچھی
 لگتی تھی۔ دل چاہتا تھا اس کے نکھار کو بس نکھارتا
 رہوں۔ مگر ابھی وقت تھا نہ ماحول.....

”اور سنو..... جس کام کے لیے جا رہی ہوں ناں
 وہی کام کرنا۔ میج مت کرتی رہنا۔ میں مصروف ہوں
 گا اور میرا تیل.....“

”میرے پاس ہے.....“ وہ شوخ ہوئی اور میرا
 ہاتھ جیب میں جاتا رہ گیا۔

”کمال کرتی ہوا گھر میں بھول جاتا..... تو.....“
 ”مگر میں نہیں بھولتی۔“ میری جانب سب بڑھایا۔

فصہ نے لمحہ بھر کو سوچا۔
 ”نہیں، ایسا کچھ تو میں نے محسوس نہیں کیا۔
 ویسے میں نے پوچھا تھا کہ سعد کیوں نہیں آئے تو بس
 مسکرا دی تھی۔ میں نے پھر پوچھا تو بس اتنا ہی کہا کہ پتا
 نہیں، شادی میں آئیں گے۔ بس اتنا ہی کہا۔“
 ”یہ کیا بات ہوئی بھلا..... میرے خیال
 میں تمہاری شادی کے بعد یہ پہلی تقریب ہوگی خاندان
 میں..... تمہیں تو آپیشل ڈریس لینا چاہیے تھا۔“ میں نے
 فوراً کہا تھا۔ مگر وہ ہوں کہہ کر خاموش ہو گئی۔ فصہ بڑی
 تفصیل سے بتا رہی تھی۔

”ہوں.....“ وہ لفظ بھر کو مسکائی تھی۔
 ”آپ نے سعد کو جانچا، پڑھا، اسٹڈی کیا۔“
 ”نہیں، وہ آیا نہیں..... کچھ میں بھی مصروف
 تھا۔“ مہراں بولے۔
 ”میرے خیال میں..... میں شادی کی تقریب
 میں یہ مسئلہ کچھ نہ کچھ تو حل کر لوں گی۔“ فصہ نے بڑے
 خلوص سے کہا۔

”کیسے؟“ سرگمما کر مہراں نے اسے دیکھا۔
 ”یہی تو سسٹمز ہے..... بتاؤں گی بعد
 میں.....“ وہ ہنستے ہوئے وہاں سے اٹھ گئی تھی۔ اور
 مہراں اسے دیکھتے رہ گئے۔
 ”اچھا جی ہماری بی بی ہمیں ہی میاؤں۔“
 ”جی نہیں، میں سسر شراک ہو مزہ ہوں۔“
 ”او..... اوہو۔“ مہراں کا قہقہہ بڑا جاندار تھا۔

☆☆☆

فصہ بے وقور بنے ہال میں داخل ہوئی۔ مٹلاشی
 نظروں سے اطراف کا جائزہ لیا۔ مہراں گیٹ پر چھوڑ
 کر چلے گئے تھے۔ دیرے، دیرے چلتی ادھر ادھر
 دیکھتی وہ اسٹیج سے قافلے پر ایک گول میز کی سائڈ پر جا
 بیٹھی یہاں سے ہر منظر صاف نظر آ رہا تھا۔
 تجھی صبا براہنڈل روم سے باہر آتی نظر آئی۔
 پنک اور سلور کنٹراسٹ کی لانگ شرٹ، پنک ہی دوپٹا
 اور چوڑی دار پا جامہ ہلکا، ہلکا میک اپ بالوں کی چٹیا گندمی

میں نے تھام لیا۔ روشن اسکرین جھگمگا رہی تھی۔
 اس کا عکس میرے ہاتھوں میں تھا۔ اسکرین پر
 اس کا کھلکھلاتا کلوز اپ لودے رہا تھا۔ وہ یہی کرتی
 تھی۔ جب میں اس کے ساتھ کسی تقریب میں نہیں جاتا
 تھا تو وہ سیل اسکرین پر خود کو براجمان کر دیتی تھی۔ ادھر
 سے مس کال دیتی..... یامیری کال آتی لازماً مجھے دیدار
 یار کر کے سیل آ کر پڑتا۔
 میرے دل میں محبت کے دیے بڑھتے جاتے،
 وہ گانے لگانے لگی تھی۔

☆☆☆

”کافی اچھی فیملی ہے صبا کی اس کی نانو کی
 پر سیٹلی ذرا دبنگ ٹائپ ہے۔ شادی میں آپ چلیے گا،
 صبا بہت محبت سے ملی۔ اسے یقین نہیں تھا کہ میں مایوں
 میں آ سکتی ہوں۔ بہت سادہ سی تھی آنکھوں میں کابل
 تک نہیں لگا۔ پھر بھی بہت حسین لگ رہی تھی۔“ رات
 فضی، مہراں غزنوی کو مایوں سے واپسی پر رپورٹ دے
 رہی تھی۔

اور وہ توجہ اور یکسوئی سے اسکرین کی جانب
 دیکھتے ہوئے اس کی باتیں سن رہے تھے۔
 ”صبا کی آنکھوں میں مجھے ہلکا سا انتظار لگا.....
 بار، بار پہلو بدلتی اور باہر کی جانب نگاہ کرتی دو بار تو وہ
 گیٹ کی جانب بھی گئی۔ مگر اداسی لوٹ آئی۔“
 ”سعد آیا تھا۔“ مہراں غزنوی چونکے۔
 ”پتا نہیں، مجھے نظر نہیں آیا۔“ وہ ہاتھوں کی
 کلیننگ کر رہی تھی۔

”پھر اسے سعد کا ہی انتظار ہوگا۔“

فصہ اس کی جانب دیکھنے لگی۔ پھر گہری سانس
 لی۔ اس کے سارے کزنز بہت اچھے اور اسماٹ
 تھے۔ اس کی نانو نے ہی صبا کو پالا ہے۔ اس کی امی کے
 انتقال کے بعد پاپا باہر چلے گئے ادھر ہی دوسری شادی
 کر لی تھی۔ اپنے کزنز کے درمیان وہ بہت خوش لگ
 رہی تھی۔ ”فصہ اب بیڑ پآ بیٹھی تھی۔
 ”اپنے کسی کزنز میں انوالو کی؟“

”لی آگے پڑی تھی۔
فضہ اسے فوکس کیے رہی۔ ابھی سامنے جانا نہیں
چاہتی تھی۔ اسے صبا کے انداز، حرکات، گید رنگ نوٹ
کرتی تھی۔ اس کی نظریں آنے والے رستے پر تھیں، وہ
ادھر ادھر گھوم کر پھر براہِ منزل روم میں چلی گئی۔ پھر
گفتگو اٹھاتی نظر آئی۔

ابھی بارش نہیں آئی تھی۔
فضہ، مہران کو کس کال دینے لگی مسکراتے ہوئے
اپنی سیلی لی..... مہران بھی ہنس رہے ہوں گے۔ انہیں
ذوقی ٹیکسٹ کیا۔
اکیلی آکر وہ اسی طرح کی شرارتیں کرتی تھی۔
بہت دیر ہو گئی..... اب کے وہ ادھر سے گزری تو
ہیلو کہہ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”آپ.....“ حیرانی سے اسے دیکھا۔
”آپ کب آئیں، میں سمجھی آپ نہیں آئیں
گی.....“ وہ اس کے سامنے آ بیٹھی۔

”مجھے آنا تھا۔“
”کیوں.....؟“ حیرانہ انداز میں آنکھیں پھیل گئیں۔
”تم مجھے بہت اچھی لگی ہو۔“
”اوہ.....“ ہلکی سی مسکان صبا کے چہرے پر ابھری۔
”تم نے اپنا براہِ منزل ڈریس کیوں نہیں پہنا؟“
مسکان معدوم ہوئی۔

”تم بڑے شوق سے بتا رہی تھیں ناں کہ میں اپنا
حسین براہِ منزل ڈریس پہنوں گی..... تو بس وہی عروسی
جوڑا دیکھنے میں خاص طور پر آئی ہوں۔“
”اوہو.....“ مسکان میں اداسی کا رنگ حلول
کرنے لگا۔

اس کی نظریں آنے والے رستے پر جاٹھنہیں۔
”مسکان نہیں آئے ناں۔“
”کیوں نہیں آئے؟“
”مجھ سے ناراض ہیں ناں.....“ اس کی نظریں
کسی غیر مرئی نقطے پر تھیں۔

”کیوں؟“ فضہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”شاید میں غلط ہوں، نا سمجھ ہوں..... یا پھر میری
قسمت خراب ہے..... مگر پھر بھی میں انہیں منانا چاہتی
ہوں مگر میرے اندر کا خوف..... کوئی نہیں سمجھ سکتا۔“ اس
کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے فوراً نظریں چرائیں۔
آنسو شاید اس کے اندر گر رہے تھے۔

”مجھ سے اپنا دکھ شیر نہیں کرو گی؟“
”میرا مسئلہ کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ نا تو کہتی ہیں تم
بہت خوش قسمت ہو، تمہیں ایسا امیر سسرال ملا ہے بنا کر
رکھنا وہاں..... میری زندگی ہے جب تک، تمہاری
عزت ہے اس کے بعد تم یہاں مہمان بن کر آنا۔“ فضہ
الٹ ہو کر سن رہی تھی اِک، اِک حرف متاثرِ جاں کی
طرح سنچال رہی تھی۔

”تمہارا مسئلہ سعد ہے؟“ دھیرے سے ہاتھ دبا
کر پوچھا۔

فضہ کی جانب نگاہ کی۔ شدتِ ضبط سے اس کی
آنکھیں گلابی ہو رہی تھیں۔ جس نے اس کے حسن میں
اضافہ کر دیا تھا۔

”نہیں، وہ تو بہت اچھے ہیں بس میں بری ہوں،
ان کی محبت کی پزیرائی نہیں کر رہی.....“

”کیوں؟“ فضہ کے اندر تجسس بھر گیا۔
صبا نے اس کی جانب یوں دیکھا اعتماد کرے نہ کرے۔

”تم اپنا دوست سمجھ کر مجھ پر اعتبار کر سکتی ہو۔“
اس نے نگاہ جھکا کر تھیلیوں کو دیکھا۔

”زندگی اصل میں ویسی کیوں نہیں ہوتی جیسی
ہمیں نظر آتی ہے۔“ اس کا لہجہ بھرا ہوا تھا۔

حسن جہاں سوز ہو کر لوہے رہا تھا۔ سعد اس مکمل
حسن و خوب صورتی کی دیوی سے کیسے دور تھا۔

”نانو کا اصرار نہ ہوتا تو میں آتی بھی نہیں۔“
”صبا اس شادی میں تمہاری مرضی شامل نہیں تھی کیا؟“

”مجھے پسند کی شادی نہیں کرنا تھی۔ زندگی اذیت
ناک ہو جاتی ہے۔ ایسی شادی میں محبت یوں ختم

ہو جاتی ہے جیسے ہم ایک گھونٹ میں شربت کا گلاس خالی
کر دیں۔ پھر ابھی تو میرا بی بی اسے ہوا تھا میں تو شوقیہ

اداس تھا۔

فضہ نے اطراف میں نگاہ کی..... سعد نہیں آیا تھا۔ اس کا آنا اہم تھا۔ یہ مسٹری جب ہی حل ہو سکتی تھی۔ کھانے کے دوران صبا کی دفعہ فضہ کو پوچھنے آئی تھی۔
”سعد آئے؟“

”نہیں..... وہ نہیں آئیں گے..... کہہ دیا تھا۔“

”اوہو..... کیا بہت شدید جنگ ہے؟“

”نہیں..... ایسا بھی نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔

”بس خوف اور دہشت کے آکٹوپس نے مجھے جکڑ لیا ہے، نہ پزیرائی کر سکتی ہوں نہ پسپائی کا اختیار ہے۔“

”ہوں.....“

”میں تمہارا مسئلہ حل کر سکتی ہوں اگر تم چاہو.....“

”نہیں، میرا مسئلہ کوئی حل نہیں کر سکتا۔“ اس کا

لہجہ دھیمہ ہو گیا۔ آگے بڑھ کر گلاس میں پانی ڈالا اور دوکھنٹ پیا۔

”جی فضہ کا سیل منگنٹا یا..... مہراں اسے لینے آرہے تھے۔ رخ موڑ کر پیچھے دیکھا تو صبا ستون سے ٹیک لگائے اسٹیج پر بیٹھے دوکھا، وہاں کو دیکھ رہی تھی۔“

ادھوری کہانی، شوہری داستان، خوب صورت اپہرا..... اداس، اکیلی اور تنہا.....

گہری سانس لے کر اس الجھن کو سلجھانے کا عہد کرتی صبا کو خدا حافظ کہتی فضہ گیٹ کی جانب بڑھ گئی۔

☆☆☆

”کچھ پتا چلا.....؟“

”نہیں.....“

”پھر یہ اداسی کیوں.....؟“ گاڑی آہستہ

کی۔ ”اچھا کالودہ کھانا ہے۔“

”نہیں ابھی کھانا کھایا ہے۔ سنیں، آپ کی سعد سے ملاقات ہوئی؟“

”سعد شادی میں نہیں آیا؟“ چونک کر اسے دیکھا۔

”نہیں..... میں بھی سعد آپ کے ساتھ ہے۔“

”نہیں، میں تو اپنے کلائنٹس کے ساتھ تھا۔“

”اوہو..... ہم سعد کے کیس پر کام کر رہے ہیں

اسکول میں چاب کر رہی تھی۔ میں ابھی شادی بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ایم بی اے میرا خواب ہے۔ اور سعد کہتے ہیں تم ایم بی اے ضرور کرنا..... میں تمہارے ساتھ ہوں..... مجھے بڑھی لکھی لڑکیاں بہت اچھی لگتی ہیں۔“ وہ کسی اندرونی احساس سے مسکرائی۔

”جس کا پیالہ بالاب بھر کر بھٹکنے لگا۔“

”پھر اتنی محبت پر اس بے رخی کی وجہ تم اپنی نہیں

دوسرے کی چاہت ہو..... میں سعد سے ملی ہوں ایک

مکمل وجہہ انسان ہے، کسی بھی لڑکی کا آئیڈیل.....“

”ہوں.....“ اپنی تھیلیاں مسلیں۔ ”پتا نہیں یہ

میرا نصیب ہے، سعد کی ضد ہے..... نقدیر کا فیصلہ ہے یا

پھر کوئی ڈراؤنا خواب ہے۔“

ان کی نگاہ پھر آنے والے رستے پر اٹھی۔ تبھی

باہر شور ہوا۔ بارات آگئی، بارات آگئی۔ لڑکیاں باہر

بھاگیں، آتش بازی کا شور مچ رہا تھا۔ صبا کھڑی ہو گئی۔

”میں چلوں نا تو ناراض ہوں گی۔“ فضہ نے

بے اختیار اس کا ہاتھ تھام لیا۔ سارے اندر کے سوال

باہر آنے لگے۔

”تم.....“

”فضہ.....“ دھیرے سے مڑتی وہ ٹھہر گئی۔

”ایسا کیوں ہوتا ہے۔ ہماری زندگی دوسرے

گزاریں.....“ اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

پھر وہ رکی نہیں..... رک جاتی تو بھرم ٹوٹ جاتا۔

گہری سانس فضہ کے اندر ہی اترنے لگی تھی۔

”دوسرے.....؟ ہماری زندگی دوسرے کیوں

گزارتے ہیں؟“ ساری حیات چوکس ہو گئیں۔

”دوسرے کون.....؟ کون ہے جو ان کی زندگی

گزار رہا ہے۔ ان کی خوشیوں کا چور..... ان کی خوشیوں

کا دشمن ہے۔“

اب صبا رینڈل روم میں چلی گئی۔

فضہ اُدھر ہی بیٹھی رہی۔

بارات اندر آگئی تھی۔ سب نے نقشیں سنبھال لیں۔

صبا اب اپنی نانوں کے ساتھ کھڑی نظر آئی، چہرہ

ابھی اس کی نگاہیں اطراف کا جائزہ لے رہی تھیں کہ ایک لڑکی جو شاید صبا کی کزن بھی اس کی طرف پرتپاک انداز میں بڑھی۔

”آپ صبا کی دوست ہیں ناں، میں نے کل اس کے ساتھ آپ کو دیکھا تھا۔“ فضا نے اثبات میں سر ہلایا اور اس کے ساتھ چلتی ہوئی ایک میز کی طرف آگئی۔

”صبا ابھی آنے والی ہے۔“ اس نے خود ہی بتا دیا۔

”اچھا ایک بات بتاؤ..... صبا خوش ہے ناں اپنی سرال میں.....“ فضا کو اپنا سوال بے لگا سا لگا تھا مگر پوچھنا ضروری تھا۔

”ہاں بہت خوش ہے مگر مجھے لگتا ہے اس کی ساس اور چھوٹی نند خوش نہیں ہیں جب بھی جاؤ منہ ہی بتا رہا ہے ان کا۔ کل شادی میں بھی نہیں آئیں۔ سعد بھائی کو بھی آنے نہیں دیا۔“ وہ تماشائی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے خاصی گہری بات کہہ گئی تھی۔

”تم نے محسوس کیا یا اس نے بتایا؟“

”وہ کیا بتائے گی، ہمارے بھی یہ بال دھوپ میں کالے نہیں..... میرا مطلب ہے سفید ہو رہے ہیں تجزیہ کاروں کو ہی اندر کی بات چلتی ہے۔“ اس نے خاصی شوخی سے کہا۔

”اصل میں میرا اور صبا کا بچپن کا ساتھ ہے، میری دعا تھی کہ آئندہ زندگی میں بھی ہم دونوں ساتھ رہیں۔ مگر بھلا ہومیری قسمت کا..... سعد بھائی کا چھوٹا بھائی نہیں تھا اور فراز نے مجھے کہیں اور جانے نہیں دینا تھا۔ نکاح کر کے ہی چھوڑا..... اگلے ماہ رخصتی ہے میری..... آپ بھی آئیے گا۔“ خاصی باتونی، شوخ و شرارتی سی لگی اسے راہ میں۔

”اچھا یہ بتاؤ، صبا اور سعد کا رشتہ کیسے ہوا؟“ فضا نے اچانک ہی پوچھ لیا۔

”سعد بھائی کو صبا بک فیئر میں پسند آگئی تھی۔ لائن مارنے لگے، صبا تو سدا کی ڈرپوک..... ہر اسان ہو کر

ایک لوبیا ہوتا جوڑے کا کیس ہے جو آپ کو کہہ چکا ہے کہ وہ خود کشتی کر سکتا ہے، اس کے معمولات پر نگاہ رکھتی ہے آپ کو.....“ فضا بردباری سے سمجھاتی اسے بہت اچھی لگی۔

”ہوں..... سوری مادام.....“ سر تسلیم خم کیا۔

”تمہاری صبا سے تفصیلی ملاقات ہوئی؟“

”ہاں ہوئی تو..... لیکن صبا سے ملاقات کے دوران مجھے کہیں یہ محسوس نہیں ہوا کہ وہ کسی اور میں دلچسپی رکھتی ہے۔ اس نے سعد کی بہت باتیں کیں..... کہیں بے رخی، نا پسندیدگی محسوس نہیں ہوئی۔ بلکہ اس کی توجہ کا محور ہی سعد تھا۔“

”ہوں.....“

”ابھی کل کا دن باقی ہے، ولیمہ ہے کل..... میں چاہتی ہوں کہ آپ سعد کو ملے کر آئیں۔ ان کی ملاقات اور گفتگو میں خود دیکھنا اور سننا چاہتی ہوں..... ارد گرد کے لوگوں کا رویہ جانچوں گی۔ وہ خود کو بہت خوش ظاہر کرتی ہے پر اندر سے اداس ہے۔ اس کی کزنز اس کی نانو، صبا کی خوش قسمتی پر فخر کرتی ہیں۔“

”ہو سکتا ہے کوئی ان کی خوشیوں سے جلتا ہو۔ اور انہیں بلیک میل کر رہا ہو؟“ موڈ کا نٹے ہوئے اس نے کہا۔

”ہاں..... اور اسی ”کوئی“ کا تو پتا کرنا ہے۔“

”میرے خیال میں سعد کے گھر والوں یا صبا کے گھر والوں میں سے کوئی ہے جو ان دونوں میں سے کسی سے شادی کرنا چاہتا تھا اور ناکامی کی صورت میں یہ گل کھلا رہا ہے۔“ مہران غزنوی سنجیدگی سے کہانی کے ہر رخ کا جائزہ لے رہا تھا۔ فضا بھی اتنی ہی سنجیدہ تھی۔

”کل ہمیں بہت کچھ پتا چل سکتا ہے اگر آپ سعد کو لے آئیں۔“

”اوکے، میں کوشش کرتا ہوں۔“ انہی باتوں کے دوران وہ گھر پہنچ چکے تھے۔

☆☆☆

فضا کو ویسے کے لان میں چھوڑ کر مہران سعد کو لینے چلا گیا تھا۔ صبا کو تو ظاہر ہے میکے سے ہی آنا تھا۔

”نہیں، ہم ابھی دوست بنے ہیں۔“
 ”اوہو.....“

فضہ نے اطراف میں نگاہ کی لوگ آنا شروع ہو گئے تھے۔ مہراں اور سعد کا دور، وور تک پہنچیں تھا۔ وہ راہن کی جانب متوجہ ہوئی معلومات کا خزانہ تھا۔ اس کے پاس..... ”صبا“ اس کا پندریہ موضوع تھا۔
”پھر.....؟“

”پھر..... یہ کہ میں چاہتی تھی کہ یہ رشتہ نہ ہو..... صبا کو ہر لمحہ میری ضرورت تھی، میں اسے جانتی، محبتی ہوں، میں چاہتی تھی کہ کفرائے بڑے بھائی اعتراف سے اس کا رشتہ ہو مگر ممانی کو صبا پسند نہیں تھی اس کی زندگی کے حالات، والدین کے تعلقات، جھگڑے وہ سمجھتی تھیں کہ صبا میں ایک اچھی بہو بننے کی صلاحیت نہیں ہے۔ پھر نانو بھی چاہتی تھیں کہ اس کا رشتہ باہر ہو، سعد کا رشتہ اچھا لگا..... انہوں نے قبول کر لیا۔ یوں اس کی شادی ہو گئی۔ اور میرے خیال میں یہ شادی خالصتاً سعد بھائی کی پسند ہے۔ ان کی مٹی اور گھر والوں کی دلچسپی نہ ہونے کے برابر ہے۔“ فاضلہ کی ساری حیات راین کے لفظوں پر تھی، کہانی کا تانا بانا شروع ہو گیا تھا۔

”اگر آج فرا نہیں آئے تاش تو میں اپنا سیل توڑ دوں گی۔ نہ ہوگا بانس نہ بچے گی بانسری.....“ منہ بسورا فضہ ہنس دی۔ رامین کے پیچھے کھڑا شخص بھی ہنس رہا تھا۔

”صبا بھی نہیں آئی ابھی تک۔“ تبھی فضا شرارت

تے ہئی۔

”راہین.....“

”جی..... اس کی جانب دیکھا تاہم نظریں اطراف میں تھیں۔

”فراز کیسے ہیں، کس منہ پر ہیں؟“ راہین ہنس دی۔ فضا کے سوال پر پیچھے کھڑا لڑکا ذرا سا آگے ہوا۔ وہ یقیناً فرازی تھا۔

”بہت اچھے، لوگ، کیرنگ، مجھے بہت اہمیت دیتے ہیں، سوٹ منہ پر ہے ان کی..... وہ تو میں ہی جھگڑا کرتی ہوں، صبا مجھے لڑا کا کہتی ہے۔“

”ہوں..... اور تم کہتی ہو میں لڑا کا ہوں.....“ وہ سامنے آگیا تھا۔ جی کر راہین نے منہ پر ہاتھ رکھا۔ اظہار اور اتنا اظہار، شرارت اور ہنس فراز کی آنکھوں اور چہرے سے پھوٹ رہی تھی۔

”شکریہ..... مادام.....“ اس کی جانب جھکا..... راہین ہلش ہو رہی تھی۔ فضا دپچی سے اس پیارے پہل کود کھ رہی تھی۔

لان بھر گیا تھا، دولہا، دلہن سامنے سے آرہے تھے۔ صبا، نانوکا ہاتھ تھام کر چلی آ رہی تھی۔ اس نے گولڈن سلور احتراج کا بے حد خوب صورت انگرکھا..... اسٹائل کا خوب صورت گھیر دار ڈریس زیب تن کیا ہوا تھا مگر وہ براؤنڈ ڈریس نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی اداسی تھی۔ ہونٹوں پر مسکان..... سعد نہیں آیا تھا شاید.....

صبا نے ابھی تک اسے نہیں دیکھا تھا۔ نانوکے ساتھ اسٹینج کے سامنے رکھے صوفوں پر بیٹھ گئی۔ دولہا، دلہن سے لوگ مل رہے تھے۔ اسٹینج خالی ہوا تو وہ نانوکے ساتھ اسٹینج پر چلی گئی۔ رسمی ملاقات اور منہ دکھائی ہوئی۔ سووی کی لائٹس میں صبا بے حد چمک رہی تھی۔ بھی فضا نے سرگھمایا مہراں اور سعد آرہے تھے، سعد نے پنک شرٹ کے ساتھ نیوی بلیو سوٹ پہنا ہوا تھا۔ اور..... اور اس کی نظریں اسٹینج پر کھڑی صبا پر لگ گئی تھیں۔ ”چلو.....!“ مہراں اسے دیکھ کر اس کی جانب

گیا اور اس کا ہاتھ تھاما.....

”مہراں آپ سعد کو نوٹ کریں، میں صبا کو وایج کر رہی ہوں۔“ مہراں کا ہاتھ تھام لیا۔

صبا نانوکے لے کر اسٹینج سے اتر رہی تھی، وہ کوئی مغلیہ حور کی شہزادی لگ رہی تھی۔

سعد کی نگاہ نہیں ہٹ رہی تھی۔ محبت آمیز وارننگ نگاہوں سے عیاں تھی۔ صبا گھوم کر گئی اور نانوکے گلاس میں پانی لا کر پلایا۔ گلاس رکھنے لگی تو اُدھر ہی کزنز سے ملنے لگی۔ سعد اور پیچھے ذرا سا انڈ میں ہوا..... بھی گھومتے ہوئے صبا کی نگاہ اطراف میں دیکھتے ہوئے سعد پر پڑی اور وہ دم بخود تھی۔ اسے شاید سعد کے آنے کی امید نہیں تھی۔ بے ساختہ کرسیوں سے لگراتی فراک سنبھالتی وہ اس کے قریب آئی۔

سعد تھوڑا پیچھے ہو گیا تھا۔ مہراں اور فضا انہیں بغور دیکھ رہے تھے۔

”آپ.....“ بے حد قریب آکے ٹھہری۔ اس کی آنکھوں میں تخیل آمیز خوشی تھی۔ کانوں میں جھکے گنگنا رہے تھے۔

”کیسی ہو؟“ سعد نے بے ساختہ اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

”ٹھیک..... آپ کل کیوں نہیں آئے؟“ اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

”کیوں آتا..... کیا فائدہ تھا؟“

”میں کل اپنا براؤنڈ ڈریس پہننا چاہ رہی تھی۔“

”کیوں.....؟“

صبا کا سر جھک گیا۔ ہونٹوں پر مسکان تھی۔

”میں آج بہن لیتی اگر مجھے پتا ہوتا کہ آپ نے آنا ہے۔“

”کیوں بھی.....؟“

”آپ کو وہ ڈریس پسند ہے ناں۔“ وہ ہلش ہو رہی تھی۔

”سب پتا ہے پسندنا پسند کا پھر بھی.....“ وہ بڑبڑایا۔

”تم آج بھی ایسا لگ رہی ہو۔“

”ساری توجہ ہی آپ کے لیے ہے جناب۔“
مہران غزنوی کی قربت میں سرشار رہتی تھی وہ.....
قریب سے گزرتے ویٹر سے پائن اپل فریش جوس
کے دو گلاس اٹھا لیے۔

”تم نے سیلفی تو زبردست بھیجی تھی۔“ فضلہ ہنس
دی۔ تبھی میسج ٹون بجی۔

فضلہ نے میسج چیک کر کے سیل ٹیبل پر رکھ
دیا۔ جوس پیتے ہوئے مہران نے سیل فون اٹھایا۔ اور
ہنس کر فضلہ کو دیکھا۔ سیل پر مہران کا پوز بجمگار ہاتھا۔

”اچھی ہے ناں.....“

”ہاں..... کب لی!“

”جب آپ مصروف تھے۔“ وہ ہنسی۔

تبھی مہران نے فضلہ کے شانوں پر ہاتھ پھیلا یا
اور دوسرے ہاتھ سے سیل آن کر کے سیلفی لینے لگا۔ ارد گرد
کے لوگ واؤ کہتے گزرے۔ دو تین تصویریں
لیں۔ تبھی کھانا لگ گیا۔ سامنے سے صبا اور سعد آرہے
تھے۔ خوب صورت جوڑا..... آتے ہوئے صین لگ رہا
تھا۔ فضلہ نے کیرا آؤن کر لیا۔

”یار ہمیں لائے تھے، ہمیں بھی بھول گئے۔“

ہنستا ہوا وہ ان کے سامنے بیٹھ گیا۔

صبا کے چہرے پر مسکان تھی۔ وہ فضلہ کی جانب
آگئی۔

”ہو گئی تمہاری مصروفیت ختم.....“ ہاتھ تھا۔

”آئی ایم سوری..... میں دراصل.....“

”پتا ہے سب..... اب طبیعت کیسی ہے
تمہاری.....؟“

”ارے تمہاری طبیعت خراب تھی بتایا کیوں نہیں،
میڈیسن لیں تم نے؟“ سعد سنجیدگی سے اس کی طرف
متوجہ ہوا۔

”بس فلو اور بخار تھا..... اب ٹھیک ہے۔“

”دکھاؤ.....“ کلائی تھام لی۔

”ابھی ہے فیور.....“

یہ دونوں توجہ سے ان کا آپس کا انہماک دیکھ

”فضلہ یہ غیر اخلاقی حرکت ہے، وہ کپل ہے اور
ہم ان کی گفتگو سن رہے ہیں۔“ قریب کھڑے مہران کو
ہوش آیا۔

”نہیں، یہ گفتگو سننا ان کے علاج کا حصہ ہے۔
دونوں میں محبت و چاہت ہے، کشش ہے مگر درمیان میں
ہے کوئی جو ان کی خوشیوں کا رس کشید رہا ہے۔“

”ہوں.....“ پھر دونوں نے ایک ٹیبل سنبھال
لی۔ پھر دونوں اٹھے اور باہر نکل گئے۔ فضلہ اور مہران
ان کی ٹیبل پر آ کے بیٹھ گئے۔

”یہ پیچھی تو گئے.....“

”سعد کل کیوں نہیں آیا تھا؟“ فضلہ نے مہران
سے پوچھا۔

”اس کی ماما کو سعد کے ساتھ ڈاکٹر کی جانب جانا تھا۔“
”اور آج.....“

”آج یہ میرے ساتھ ہے اور انہیں خبر نہیں کہ
میں اسے یہاں شادی میں لے کر آیا ہوں۔ وہ نہیں
چاہتیں کہ سعد اس شادی میں جائے۔“
”پر کیوں.....؟“ فضلہ کو اچنچھا سا ہوا۔

”ان کا رویہ عجیب سا لگا مجھے ایسے جیسے وہ سعد
کے سسرال والوں کو پسند نہیں کرتی ہوں۔“
”کیوں.....؟“

”اس کیوں کا ہی تو جواب ڈھونڈنا ہے۔“
”آپ نے دیکھا یہ دونوں کتنی خوشی اور بے
ساختگی سے ملے ہیں۔“

”ہاں.....“ فضلہ، مہران کو رامين سے ہونے
والی گفتگو بتانے لگی۔

”میرے خیال میں دونوں کی الگ، الگ،
psychoanalysis (تحلیل نفسی) کیا
جائے اور مجھے سعد کے گھر والوں سے ملنا چاہیے۔“

”بذرا غرور ہے ان میں، نہیں ملنے اپنی کلاس کے سوا.....“
”ہماری کلاس بھی کم ہے کیا۔“ فخر سے اس نے
مہران کو دیکھا۔

”شکر ہے آپ نے ہماری جانب بھی توجہ کی۔“

اچھا نہیں لگتا۔“

”دراصل ہماری ابھی حال ہی میں ملاقات ہوئی ہے، میں ایم بی اے کر رہی ہوں اور اسے ایم بی اے کا شوق ہے تو میں نے سوچا ذرا گائڈی کر دوں۔“

”بیکے میں جا کر کرو یہاں تو وہ رہتی نہیں.....“
خاصی بے رحمی سے کہا۔

فضہ کو فرق صاف نظر آ رہا تھا۔

جیسی اندر سے خاصی ماؤرن ہی لڑکی آئی۔

”ماما، سعد، صبا کو لینے جا رہا ہے؟“

”ہاں مگر میں منع کر دوں گی۔“

”تھینکس اور اسے مایا کے گھر لے کر آئیے گا اپنے ساتھ میں وہیں جا رہی ہوں۔“

”اوکے جانو.....“

فضہ زیرک نگاہی سے دیکھ اور سن رہی تھی۔

ایک عورت کے انداز میں پیسے کا نشہ..... امارت کا زعم.....
”تم اس سے فون پر بات کر لینا۔“

”گویا کہہ رہی ہوں جاؤ تم۔“

”جی دراصل میں.....“

جیسی ان کا سیل فون بجا..... اسے اگنور کر کے سیل آن کیا۔

”ہاں زہرہ، ٹھیک ہو..... ہاں میری بات نہیں ہوئی، مانتا نہیں ہے، تمہارے بابا سے بھی بات کی تھی۔“

وہ تو سعد کو ہی لے رہے ہیں۔“

”ہوں..... میں شام میں کلب آؤں گی اُدھر ہی بات کرتے ہیں۔“

”نہیں، نہیں آئی وہ بیکے سے نہ آئے تو بہتر ہے آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل.....“

”مائی گاڈ.....!“ فضہ نے ایک جھرجھری سی لی۔

”یہ شادی ہوئی کیسے؟ محض سعد کی ضد کی وجہ سے۔“

”میں نے کہا ناں لی لی جاؤ..... وہ یہاں نہیں رہتی۔“ انہوں نے بات ختم کر کے اس سے کہا۔

”جی میں دراصل.....“

ہے۔ دونوں کی محبت گرجوٹی، احساس، توجہ ایک دوسرے کے لیے تھی۔ اک دوسرے میں گم تھے۔ ایک دوسرے میں ہی جینا چاہتے تھے۔

فضہ اور مہراں نے ایک دوسرے کو دیکھ کر گہری سانس لی۔ یہ کیس حل کر کے انہیں ذاتی خوشی ہوتی۔

محبت کو محبت کے پاس ہی رہنا چاہیے۔

☆☆☆

گیٹ کھلا اور چوکیدار نے اسے لان میں بیٹھی خاصی فریہ بائل خاتون تک پہنچا دیا۔ آج وہ صبا کی سرال آئی تھی۔ اسے معلوم تھا وہ نہیں ہے مگر پھر بھی مہراں نے اس کے کہنے پر اسے یہاں چھوڑ دیا تھا۔ انہوں نے سر سے لے کر پاؤں تک اس کا جائزہ لیا۔ خاصا غرور اور نخوت بھر انداز تھا۔

”کون.....؟“

”میں فضہ ہوں، صبا کی دوست۔“ تنقیدی نگاہ سے انہوں نے دیکھا۔

”وہ تو میکے گئی ہوئی ہے۔“

”اچھا..... وہ تو کہہ رہی تھی کہ میں آ جاؤں گی۔“
”جن لڑکیوں کا میکے میں دل لگتا ہے وہ گھر نہیں

باتیں۔ اس کے تو طور طریقے ہی مجھے اچھے نہیں لگتے..... آئے دن میکے کی دوڑ.....“ خاصی تیز طرار، خاتون لگیں اسے۔

”صبا آپ کی بہت تعریف کرتی ہے۔“ وہ اب کرسی پر بیٹھ چکی تھی۔

”ظاہر ہے اتنا اچھا امیر کبیر سرال ہے، تعریف بھی نہ کرے میرا معصوم سا بیٹا پھانس لیا۔ سعد نے

جانے کیا دیکھا اس میں..... خیر اب تو وہ سعد کے دل سے اترتی جا رہی ہے۔ عقل آرہی ہے اس میں.....

میاں کو چھوڑ کر میکے جانے کا مطلب اب سعد کو بھی سمجھ آنے لگا ہے۔“

فضہ اندر ہی اندر جڑ بڑھ رہی تھی۔ یہ تو گویا ادھار کھائے بیٹھی تھیں۔

”تم اس کی کون سی دوست ہو اس کو دوست بنانا

”کوئی مسئلہ ہے تو کہہ سکتی ہو۔“
 ”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ دھیمی آواز ابھری۔
 فضہ کی چھٹی حس متحرک ہو گئی۔

”تمہاری ساس نندوں کا رویہ تمہارے ساتھ ٹھیک ہے؟“
 ”ہاں.....“ کئی لمحوں کی خاموشی کے بعد پیکا سا جواب دیا گیا۔
 ”پھر تم اتنے دن سے میکے میں ہو، سعد کی خبر نہیں تمہیں۔“

”فضہ میں فون بند کرتی ہوں، نانو بلا رہی ہیں۔“ فون بند ہو گیا تھا۔

فضہ نے گہری سانس لی۔
 ”تو دوسرے جو اس کی زندگی خراب کر رہے ہیں۔ وہ اس کے سرال والے ہیں۔“

موضوع سے فرار ہو، خوفزدہ انداز مگر کیوں.....
 ولیمہ تو بہت دھوم دھام سے ہوا تھا۔ سعد کے گھر والے ایسا کیا کر سکتے ہیں کہ سعد مرنے مارنے پر اتر آئے۔ خود کشی کی دھمکی دے ڈالے..... اتنی شدت پسندی اختیار کر لے۔

بالکونی میں ٹہلتے ہوئے فضہ ان دونوں کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

☆☆☆
 ”تم سسرال کب تک جاؤ گی؟“ آج پھر وہ اس سے بات کر رہی تھی۔

”کیوں.....؟“
 ”دل چاہ رہا ہے تم سے ملنے کو.....“
 ”نانو کے گھر آ جاؤ ناں!“

”اچھا نہیں لگتا روز، روز آنا، تم آؤ ناں ویسے بھی خاصے دن ہو گئے ہیں تمہیں میکے میں رہتے، سعد غصہ نہیں ہوتا؟“ دوسری جانب ٹھگی ہوئی خاموشی تھی۔

”اور تمہارا خود دل نہیں چاہتا سعد کے قریب رہنے کو آخر تم بھی تو چند ماہ کی دلہن ہو۔“ ہنوز خاموشی برقرار تھی۔

مکروہ کچھ کہنے سننے کے موڈ میں نہیں تھیں اسے اکتور کر رہی تھی۔ سبیل پھر بجا..... فضہ اٹھی اور خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آئی۔

ایسی دولت کا کیا فائدہ جو دوسروں کی عزت نفس بھروسہ کر کے صبا کا گریز و فرار بھی شاید اسی لیے ہے۔ تکبرانہ انداز اسے غلام بنارہا تھا۔ جبکہ سعد اسے چاہتا تھا صبا بھی محبت کرتی ہے۔ درمیان..... یہ درمیان کے لوگ، تکبرانہ خیالات..... حاسدانہ انداز اور ناپسندیدگی ان کے درمیان خلش تھی۔ فضہ کڑی سے کڑی ملارہی تھی۔

صبا سے ملنا ضروری تھا۔ اس سے زیادہ ضروری مہران کا سعد سے۔

☆☆☆
 وہ گیٹ سے نکل کر چلتی ہوئی روڈ تک آ گئی تھی۔
 ”پتا نہیں کیوں صبا، مجھے لگتا ہے تم سعد کے ساتھ خوش نہیں ہو، تمہارا رویہ، تمہارا گریز، تم اتنے دن سے نانو کے گھر ہو۔“ فون پر بہت ساری کپ شپ کے بعد اچانک ہی فضہ نے کہہ دیا۔
 ”نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔“

”ہو سکتا ہے میرا وہم ہے..... مگر مجھے وہم نہیں لگتا۔ ایک مکمل انسان تمہارے پاس ہے اور اس سے دور رہ کر اسے اکتور کرنا جبکہ تمہاری شادی کو بھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔“ انتہائی نازک موضوع اٹھایا تھا اس نے۔

”دراصل نانو بیمار ہے ناں؟“
 ”تمہارا گھر بھی تو ہے ناں.....“
 ”سعد کا فون آ جاتا ہے۔“

”اسے تمہاری محبت، تمہاری قربت کی ضرورت ہے۔ شروع دنوں کا ساتھ ساری عمر یاد رہتا ہے بہت دیر لے لے ہوتے ہیں، تم لوگ ہنی مون پہ بھی نہیں گئے۔“ دوسری جانب خاموشی تھی۔

”یار میں تو دوست سمجھ کر بات کر رہی ہوں، برا نہیں۔“
 ”نہیں.....“

شکار..... اس کی بیوی میکے میں ہے اور.....“ مہراں نے گہری سانس لی۔
”اور.....“

”اور یہ کہ سعد باہر جا رہا ہے بزنس کے سلسلے میں اس کے پاپا بھیج رہے ہیں ساتھ ہی کوئی کورس کرنا ہے اسے وہاں۔“

”اور صبا.....؟“
”تم نے کیا نتیجہ اخذ کیا اس سے ملاقات اور کالز پر۔“
”وہ نہیں کھلتی..... میرے خیال میں ایک میٹنگ آفس میں رکھ لیں۔“
”ہوں.....“

”کچھ ٹیسٹ لیں، تحلیل نفسی کریں، کچھ پزل کروائیں۔“ مہراں غزنوی نے اسے دیکھا اور فحش دیے۔
”میری جاشین.....“ اس کے شانوں پر ہاتھ پھیلانے۔
”دھڑکی سنو، تنخواہ لیا کرو گی.....“
”کچھ کام فی ٹیمیل اللہ بھی کر لیا کرو.....“ اپنے ساتھ لگا کر اس نے ہنستے ہوئے کہا۔
”وہ بھی کھلکھلا کر فحش دی۔“

☆☆☆

”سعد تم مجھے جب تک خود اپنے بارے میں نہیں بتاؤ گے کچھ نہیں ہو سکتا۔ صبا بھی کچھ نہیں بولتی۔ مگر تم دونوں کے درمیان کوئی بات ہے ضرور۔ مگر ایک بات یاد رکھنا صبا کی زندگی میں تمہارے سوا کوئی دوسرا نہیں ہے۔ اور تمہاری زندگی میں بھی میرے سامنے ہے..... بات کچھ اور ہے اور یہ تم سے بہتر کوئی دوسرا نہیں جانتا..... اگر تم اس ڈپریشن سے باہر نکلنا چاہتے ہو تو تم خود بتاؤ۔“

سعد غور سے مہراں غزنوی کی باتیں سن رہا تھا۔
”آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اسے کسی دوسرے سے محبت نہیں ہے۔“

”اس بارے میں تم کیا جانتے ہو؟“
”بہت کچھ مطلب..... وہ میرے ساتھ خوش نہیں ہے۔“ اس نے سخت لہجے میں کہا۔

”چلو تمہاری نانو سے بات کرتی ہوں اسے گھر بھرا میں بہت ہو گیا۔“

”وہ ضرب یہ ضرب دے رہی تھی۔“
”لگتا ہے، تمہیں میری باتیں بری لگتی ہیں۔“
”نہیں..... ایسا نہیں ہے۔“
”کچھ پریشان ہو یا سسرال میں الجھنیں ہیں۔“
”میری الجھنیں کوئی نہیں سلجھا سکتا۔“ ویسی سی سرگوشی.....

”کیوں..... تم مجھے بتاؤ، میں ہوں، میرے شوہر نفسیاتی ڈاکٹر ہیں۔“
”مجھے سسرال میں ہی رہنا ہے، سعد مجھے عزیز ہیں۔ فضا میں انہیں اور ہرٹ نہیں کر سکتی۔“

”ایک بیوی تو شوہر کو خوشیاں دیتی ہیں، نئی امیدیں ہوتی ہیں، وصل یار کا تھما ہوتا ہے، ایسی کون سی بات ہے جو ہرٹ کر سکتی ہے؟“
”زندگی میں بہت ساری چیزیں ہوتی ہیں جو ہماری تابع نہیں ہوتیں۔ ہمیں اتفاقاً قلمی ہیں اور انہیں کھونے کا بھی ڈر رہتا ہے۔ اور نانو کے بعد میں اپنی زندگی میں بہت اکیلی ہوں۔ میں سعد کی خوشی کھونا نہیں چاہتی۔“

”کون چھینے گا تمہاری خوشی.....؟“ فضا نے کیرا۔
”فون یک دم ہی بند ہو گیا تھا۔“
”ہیلو، ہیلو صبا۔“

دوبارہ رنگ کیا، جواب نہ ارد..... سوچوں کے درواہ ہو گئے۔ ایسی کون سی بات ہے جس نے دونوں کو پریشان کر رکھا ہے، زندگی ویسی کیوں نہیں ہوتی جیسی ہمیں نظر آتی ہے۔ یقیناً صبا کی ساس اس کی تندیس اس کے لیے دکھ کا باعث ہیں مگر کیوں.....؟ ولیمہ کتنا شاندار تھا، فضا اندر ہی اندر سوچتی رہی۔

رات میں مہراں سے بات ہوئی۔
”سعد کلینک آیا تھا؟“

”ہاں.....“
”کوئی بات آگے بڑھی؟“
”نہیں..... وہ خاموش رہتا ہے، تذبذب کا

جگہ کی جاسکتی ہے۔“ وہ اپنی انگلیاں مروڑتی رہی، بے چینی سے پاؤں کا انگوٹھا مسکتی رہی۔

”زندگی گزارنے کا سلیقہ سیکھو صبا۔“ وہ سر جھکائے سنتی رہیں۔

”تمہاری زندگی میں کوئی دوسرا ہے۔“

”نہیں۔۔۔۔۔“

”تمہاری شادی خاندان میں کیوں نہیں ہوئی؟“

زیر لب ہونٹ کاٹتی رہی۔

”جن کے ماں، باپ اپنی جگہ لڑتے رہیں،

ان کی اولادوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔“

”کوئی تم سے محبت تو کرتا ہوگا؟“

”محبت حاصل نہیں ہوتی۔“

صبا کی نظریں غیر مرئی نقطے پر تھیں، سامنے درخت پر پرندے بسیرا کرنے کے لیے اتر رہے تھے۔

”شاید وقت خود میرے مسئلے کا حل کر دے۔“

”مسئلے کا حل تلاش کیا جاتا ہے۔ اسے حل کرنے

کے لیے وقت کا انتظار نہیں ہوتا۔“

صبا چپ رہی، وہ کسی ذہنی کشاکش کا شکار تھی۔

اندرونی انتشار اسے شدید غصے سے گزار رہا تھا۔ اور زندگی

میں اس نے سب سے زیادہ مبرا کرنا ہی سیکھا تھا۔

دھیرے سے فضا نے اس کا ہاتھ تھام لیا جو ٹھنڈا

برف ایسا ہو رہا تھا۔ فضا کو نظر آ رہا تھا کہ جہاں کچھ نہیں

بولے گی۔ اسے عزت نفس بہت عزیز تھی۔ اور اسے

صرف اپنے لیے ہی جینا نہیں آتا تھا باقی سب کے لیے

وہ جیتی تھی۔

”تمہیں جینا میں سکھاؤں گی۔ زندگی پر تمہارا بھی

اتنا ہی حق ہے جتنا دوسروں کا تم پر۔“ فضا نے دھیرے

سے اٹھ کر اس کا ہاتھ دبایا۔

وہ کسی گہری سوچ میں گم تھی۔

”میں اک راؤنڈ لگا کر آتی ہوں۔“ اسے یونہی

چھوڑ کر وہ آگے بڑھی تھی۔

☆☆☆

کمرے میں مخصوص ہلکا سا اندھیرا تھا۔ صبا

”مگر میں اس کا رویہ بگائوں والا ہے۔ میرا قرب، میری خلوت اسے ڈراتی، سہاتی ہے۔ مجھ سے فرار کے

راستے تلاش کرتی ہے، وہ میری چیزوں کو میرے سامنے استعمال نہیں کرتی۔ میری موجودگی میں خود کو مصروف رکھتی

ہے۔ اور۔۔۔۔۔ اس سے زیادہ کیا بتاؤں۔“

”مگر ہم نے تو تم دونوں کو ایک ساتھ خوش دیکھا ہے۔ اس کی آنکھوں میں چمک ہوئی ہے۔“

”شاید۔۔۔۔۔“

”ہوں۔۔۔۔۔“

”کوئی نہ کوئی مسٹری ہے۔“

”اور یہ مسٹری آپ نہیں سلجھا سکتے۔ میرا خیال

ہے مجھے چلنا چاہیے۔ مایوس ہو جانا چاہیے۔ ہماری

قسمت میں ملن نہیں ہے۔ مجھ سے بھاگنے کے لیے اس

کے پاس ایک سو ایک بھانے ہیں تو پھر ہمیں ایک

دوسرے سے دور ہی بھاگ جانا چاہیے۔“ بہت تلخ

ہو رہا تھا وہ۔

”ہوں۔۔۔۔۔“

مہراں غزنی کی آنکھیں اسے پڑھ رہی تھیں

جانچ رہی تھیں۔ تجزیہ کر رہی تھیں۔

ادھر۔۔۔۔۔ پارک میں صبا کے ساتھ واک کرتے

ہوئے فضا اسے سمجھا رہی تھی۔ زندگی اس طرح سے

نہیں گزرتی جس طرح سے وہ گزارنا چاہتی تھی۔ ”میں

تمہاری ہم راز ہوں، اعتبار کرو یا۔۔۔۔۔“ چپ چاپ

چلتے ہوئے تھک کر وہ سنگی بیچ پر بیٹھ گئی۔

”بولو صبا۔۔۔۔۔“

”فضا۔۔۔۔۔“ اس کی جانب دیکھا اور اس کی آنکھوں

سے بے بسی کی تصویر بنے آنسو رخساروں پر پھسل

گئے۔ ”میرے پاس بولنے کے لیے لفظ نہیں ہیں۔“

”تمہارا گھر ٹوٹ جائے گا۔“

”شاید ٹوٹنے کے لیے ہی بنا ہے۔“ اس کے

انداز میں خود ترستی تھی۔

”رشتے اتنے معمولی نہیں ہوتے کہ انہیں یوں

ٹوڑ دیا جائے۔ اپنی خوشیوں کے لیے آخری وقت تک

میڈیسن کے زیر اثر کلینک کے بیڈ پر نیم دراز تھی۔
مہران غزنوی سائڈ چیر پر بیٹھے تھے۔ فضا کھڑی تھی۔
بہت مشکل سے اس تیسری کوشش میں وہ بولی تھی
اور اس طرح سے بول رہی تھی کہ فضا دم بخود تھی۔

ماہر سائیکاٹرسٹ مہران غزنوی نے اپنے طریقہ
علاج سے اسے بولنے پر مجبور کیا تھا۔

”مجھے نانو بہت عزیز ہیں، مجھے سعد بہت عزیز
ہے، میں ان کے لیے اپنی جان بھی دے سکتی ہوں۔
شاید میری زندگی کے لیے خوشیاں اتنی دیر کے لیے ہی
آتی ہیں۔“

”کیا تم اپنی زندگی سے خوش ہو؟“

”خوش..... ہاں میں اپنی زندگی سے خوش ہوں.....
اگر، اگر سعد کی ماما درمیان میں نہ ہوں۔ ماما جو مجھے نہیں
چاہتیں..... میری غربت انہیں اچھی نہیں لگتی، وہ کہتی
ہیں میں..... میں یہ رک کر گھرے سانس لینے لگی۔“ میں
نتہیں سعد سے الگ کر دوں گی اگر تم اس سے دور نہ
ہوئیں تو..... مجھے تمہارے، وجود سے سعد کی نسل نہیں
چاہیے۔ وہ، وہ کہتی ہیں کہ..... کہ.....“ صبا کے چہرے
پر شدید کرب تھا۔ جانے اذیت و درد کی کس، کس منزل
سے گزر رہی تھی وہ۔ فضا دم بخود تھی۔

”وہ کہتی ہیں کہ میں تمہیں زہر دے دوں گی۔
سعد کو تم..... تم سے نفرت ہے مجبور کر دوں گی؟“ بے چینی
اور سیمابی انداز اس کی رگ و پے سے ظاہر تھا۔
اندرونی خلفشار اسے مضطرب کیے دے رہا تھا۔

”تم زیادہ سے زیادہ میسے میں رہو..... نانو کہتی
ہیں تم گھر کب جاؤ گی؟ سعد کہتے ہیں کب لینے آؤں؟
میں..... میں.....“ گہری سانس بھری۔

”میں سوچتی ہوں، میں کب مروں گی؟ میرے
ہونے کا مقصد کیا ہے؟ میں کیوں ہوں؟ کیوں.....
ہوں؟“ اس کا سارا وجود کپکپا رہا تھا۔

شدید اذیت کا شکار تھی وہ۔ فضا نے آگے بڑھ کر
اس کا ہاتھ تھام لیا جسے صبا نے مضیوں میں بھینچ لیا۔
میڈیسن کے زیر اثر وہ غودگی میں جانے لگی۔

مہران شدید دکھ کا شکار ہو رہے تھے۔

یہ رشتے، اتنے قریبی رشتے، اتنے بھیاں ک بھی
ہو سکتے ہیں۔

اور جب انہیں اپنی انتہا سے گزرنا ہوتا ہے تو پھر
رشتے بناتے کیوں ہیں؟

”دولت پہ اتنا غرور..... اُف..... لوگ خدا کو
کیوں بھول جاتے ہیں۔“

فضا کی آنکھوں سے آنسو نہ ٹھہر رہے تھے۔ صبا کی
آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔

☆☆☆

سعد دم بخود ریکارڈ باتیں سن رہا تھا۔ دونوں
ہاتھوں میں سر گرائے بیٹھا تھا۔ ماما سے اس درجہ گری
ہوئی حرکت کی امید نہیں تھی۔

مانا کہ وہ اس رشتے کے خلاف تھیں مگر اس کی ضد
کے آگے مجبور ہو گئی تھیں۔

سب خوشی، خوشی اس کے ویسے میں شریک
ہوئے تھے۔ پھر..... پھر یہ، یہ سب..... وہ حد درجہ
ٹینس ہو رہا تھا۔

”وہ ایسا کیوں چاہتی ہیں۔“ مہران نے سعد کو
مخاطب کیا۔

”شاید اس لیے کہ وہ امیر کبیر بہو لاسکیں..... ہا
شاید اس لیے کہ وہ مجھے بھی مایوس نہیں کرنا چاہتی تھیں۔“

”مگر..... مگر یہ مسئلے کا تو حل تو نہیں ہوا ناں
دوسرے شخص کو زندہ درگور کر دیا جائے۔“ اس کی
آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

”تمہاری والدہ یہ چاہتی تھیں کہ سانپ بھی
مر جائے اور لاش بھی نہ ٹوٹے۔“

”صبا کیسی ہے؟“

”بہتر ہے؟ فضا اسے کہنی دیتی ہے۔“

”میں اس سے ملنے جاؤں؟“

”نہیں ابھی نہیں۔ ابھی اس مسئلے کا فائنل حل
نکالنے دو۔“

”فائنل حل تو نکل آیا، مجھے صبا کا اصل مسئلہ سمجھ

اشک، جگنو اور ستارے

”معذرت کے ساتھ سعد، تمہاری ماما ایک لاپچی عورت ہیں، ان کے اندر امیری، غریبی کا فرق بہت ہے۔ اسی حوالے سے وہ احساس برتری میں مبتلا ہیں اور یہ بھی ایک بیماری ہے دراصل علاج کی انہیں ضرورت ہے۔“

سعد چپ چاپ سا بیٹھا تھا۔
محبت دکھ میں مبتلا ہو تو دل کیسے سکون پاسکتا ہے۔
”ماما.....“ دل گریہ کنناں تھا۔
احترام بھی مانع تھا اور احتجاج بھی ضروری تھی۔
تحفظ بھی دینا تھا اور احترام بھی کرتا تھا۔

☆☆☆

فضہ بہت غور سے صبا کو دیکھ رہی تھی بظاہر وہ مسکرا رہی تھی۔ چھوٹی، چھوٹی بات پر خوشی کا اظہار کر رہی تھی۔ چہرہ پھر بھی چٹلی کھا رہا تھا۔ وہ بات سے بات نکالتی اور راستی جاتی۔
فضہ ترم نگاہی سے دیکھتی رہی۔ دل میں آنسو گرتے رہے۔

”کیا چھپا رہی ہو؟“ اس کی ہنسی رک گئی۔
”کیا مطلب.....؟“ اس کی جانب دیکھا۔
”مطلب تم اچھی طرح سے جانتی ہو۔“ صبا چپ ہو گئی۔

تم اتنا جو مسکرا رہے ہو
کیا غم ہے جس کو چھپا رہے ہو
غم.....

”پتا نہیں صبا مجھے کیوں لگتا ہے کہ تمہارے اور سعد کے درمیان بے نامی دوری ہے، تمہارے رشتے میں ایک جھجک مانع ہے جبکہ نئی زندگی کی یہ پہلی اسٹیج میاں بیوی کے درمیان باہمی توازن، اعتماد، اعتبار و پختگی کو پروان چڑھاتی ہے اور گزرتا ہوا وقت اسے مضبوط کرتا ہے۔“

صبا سر جھکائے اپنی انگلیاں مسلتی رہی۔
”اور ہمیں اس بات کی اجازت دوسروں کو نہیں دینی چاہیے کہ دوسرے ہماری زندگی بسر کریں۔“

آگیا ہے، میں اس کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں۔
مجھے نہیں معلوم تھا کہ سب مار آئیں ہیں۔ میں صبا کو لے کر دور چلا جاتا ہوں..... وہ..... وہ کتنی مجبور و مظلوم ہے۔ تنہا اکیلی لڑ رہی ہے ہر محاذ پر..... ماما کی بے انتہائی اور اس کے ساتھ میری ناراضی برداشت کر رہی ہے۔ زندگی نے اسے دیایہ کیا ہے۔“

”صبا..... کو یہ سب ابھی نہیں پتا..... اس کا زورس پر یک ڈاؤن ہو سکتا ہے، تمہاری ماما نے اسے ٹارچہ میں رکھا ہوا ہے۔“
سعد نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”ذہنی اذیت نے اسے نفسیاتی کر دیا ہے اور شاید کچھ میڈیسن بھی دے رہی ہیں وہ اسے۔“

”کیا مطلب.....؟“
”تا کہ وہ کبھی ماں نہ بن سکے۔“
”کیا..... مطلب؟“
”انہوں نے دھمکی دی تھی کہ اگر تم نہیں لوگی تو سعد کو دے دوں گی۔“

”اوہ مائی گاڈ.....“ سعد کے اعصاب شل ہو گئے۔
”اور وہ معصوم لڑکی تمہاری محبت میں مبتلا تمہیں تیز دھوپ سے بچا لینا چاہتی ہے۔ میں نے اس کی دوسری گفتگو بھی ریکارڈ کی ہے۔ وہ تمہیں سنو اتا ہوں۔ وہ کہتی ہے ماما مجھے جو چاہیں کر لیں، کہہ دیں بے شک سعد کی دوسری شادی کریں مگر مجھے ان کی زندگی سے بے دخل نہ کریں، میں ان کی زندگی سے خود ہی نکل جاتی ہوں۔ بس انہیں خوش رہنے دیں۔“
”پاگل کہیں کی۔“

سعد نے دونوں گھٹنوں پر کہنیاں ٹکا کر تھیلیوں پر چہرہ رکھ لیا۔

”سعد..... صبا کے بغیر کچھ نہیں ہے۔ ایک بار..... بس ایک بار..... زندگی میں خوشیوں کا در کھلنے تو دو.....“

شدت ضبط سے آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ تسلی آمیز انداز میں مہران نے سعد کے شانے پر ہاتھ رکھا۔
”میں، میں کیا کروں مہران بھائی۔“ وہ رو دیا۔

صبا سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔

”میاں، بیوی ایک نئے خاندان کی بنیاد ہوتے ہیں، باہمی اعتماد ان بنیادوں کو مضبوط کرتا ہے۔ محبت پروان چڑھاتی ہے، محبت تمہیں بھی ہے۔ محبت سعد کو بھی ہے پھر تم لوگوں میں وہ بات کیوں نہیں جو ہونی چاہیے۔“
فضہ سب جانتی تھی مگر صبا کے منہ سے سننا چاہتی تھی۔ اور..... صبا..... صبا زندگی کے شیرازے کو بکھرتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ دھیرے سے اس کا ہاتھ تھاما جو سرد اور برف سا ہو رہا تھا۔
”تمہاری نانوتھیں نہیں سمجھاتیں؟“ اور اس نے سب سچ فتنہ کے سامنے اگل دیا تھا جو وہ نیم غنودگی کے عالم میں کہہ چکی تھی کیتھارسس ضروری تھا۔
”تمہیں پتا ہے تمہارا یہ رد عمل سعد کو غلط فہمی کا شکار کر سکتا ہے۔“

صبا نے ٹھٹھک کر اسے دیکھا۔

”تمہیں یہ سب سعد کو بتانا چاہیے تھا۔“

”کیسے ہمت کروں، ماما مجھے جھٹلا دیں گی.....“

بے کی تفسیر بنی وہ کہ یہ کنال تھی۔

”محبت سچ، جھوٹ کا کھون لگا لیتی ہے، اگر تمہیں اپنا گھر بچانا ہے سعد جیسے پرفیکٹ آدمی کے ساتھ زندگی چاہیے تو تمہیں اسٹینڈ لینا ہوگا، ورنہ آج کی سستی زندگی کو تم اپنا مقدر بنا لو گی۔“
آنسو پھر سے پھسلنے لگے۔

”میں اتنی بہادر نہیں ہوں فضہ، ماما، سعد کو مجھ سے اور دور کر رہی ہیں۔ انہیں باہر بھیج رہی ہیں۔ کل ہی انہوں نے فون کر کے مجھے بتایا ہے اگر تم اپنی نانوتھیں کے ساتھ فیصل آباد جانا چاہتی ہو تو چلی جاؤ سعد بزنس کے سلسلے میں باہر جا رہا ہے۔“

”مائی گاڈ.....“ فضہ نے سر ہاتھوں میں تھام لیا۔

”سعد نے تمہیں یہ سب بتایا؟“

”نہیں.....“

”کیوں.....؟“

”وہ مجھ سے ناراض ہیں؟“

”کیوں.....؟“

”میں راجیل کی شادی کے بعد گھر نہیں گئی.....“

فضہ..... میں، میں کیا کروں.....“ وہ پھوٹ، پھوٹ کر رو دی تھی۔

”تم خواہ مخواہ کی دھمکیوں سے سہم کر اپنے جائز حق سے ہی دستبردار ہو گئیں۔“

”فضہ..... ایسا نہیں ہے، میں بہت بہادر نہیں ہوں، میں نے تمہیں بتایا ناں کہ میں اپنے جیسی زندگی اپنے بچوں کو نہیں دے سکتی۔ میں بروکن فیملی سے تھی تو میرے بچے بھی اسی کا شکار ہوتے۔ دوری، روگ سہا آنے والا مستقبل تو محفوظ ہے ناں۔“

”تم پاگل ہو..... تمہارا مستقبل محفوظ نہیں، غیر محفوظ ہے جس شخص کو محبت نہ ملے وہ شکی ہو جاتا ہے۔ اور شک سے بڑا خوشیوں کا دشمن کوئی نہیں ہے۔“

”فضہ.....“ صبا نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”ماما نے کوئی انتہائی قدم اٹھالیا تو؟“ خوفزدہ انداز تھا۔

”تمہارا ساتھ دینے کے لیے سعد ہے ناں، اس پر اعتبار کرو جو بے اعتباری کی فضا میں ٹریکولائر کے سہارے جی رہا ہے۔“

صبا دم بخود تھی۔ فضہ کی باتیں صبا کے دل میں ترازو ہو رہی تھیں۔ سوچ کے دروازے کھلے تھے۔ محبت کے بادبان کھلے اور کھلتے چلے گئے۔

”مکنہ خوف کے ڈر سے ہم خود پر خوشیوں کے در بند نہیں کر سکتے، ہماری زندگی دوسروں کے تابع نہیں ہونی چاہیے۔ ہماری زندگی پر ہمارا تنا ہی حق ہے جتنا دوسروں کی زندگی پر ان کا..... دولت کی خودی انسان کو غرق کر دیتی ہے۔ ایمان کی چٹنگی کے لیے یقین پہلی شرط ہے صبا۔“

”فضہ.....“ دھیرے سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”وہ مجھ سے بہت خفا ہوں گے؟“

”خٹکی اور ناراضی کا عمل اپنی جگہ مگر جو مزہ روٹھ

کر منانے کا ہے ناں اس کا اپنا الگ ہی رنگ

”تم واقعی میری رات بیٹھ ہو۔ کیا خیال ہے، اقبال کی چھٹی کرا دوں.....“ ذوقی شراہت سے دیکھا۔
 ”جی نہیں۔“ نظریں چرائیں۔
 ”لیکن فضا یہ چوری زیادہ عرصہ تک نہیں چھپ سکتی۔“
 ”ہاں..... جب تک چھپ سکتی ہیں چھپائیں۔“
 گزرتا وقت درد کا دریا بن سکتا ہے دن پھر سکتے ہیں، دل بدل سکتے ہیں، وقت بدل سکتا ہے۔ تقدیر مہربان ہو جاتی ہے۔“

”واؤ..... کیا فلنے بھرا لکچر ہے۔ ادھر آؤ میں دیکھوں تو یہ تم ہی ہو یا کوئی اور ہے۔“ اس نے ہاتھ بڑھایا۔
 ”میں چلوں..... امی جان نے آتا ہے، جگن دیکھ لوں۔“ انتہائی سنجیدگی سے کہتی وہ اٹھی اور باہر نکل گئی۔
 ”اسے کیا ہوا؟ یہ وقت تو اس کا دبنگ سی فیر مانگنے کا تھا۔ اور بوس الگ.....“ اچنبھے کے سے انداز میں اسے جاتے دیکھا۔

پھر کھلے ہوئے لپ ٹاپ پر نظر ڈالی ٹیبل پر ہاتھ کے نیچے دبے پیچر ہلائے پھر مرکز دروازے کو دیکھا۔ دل چملا کے پیچھے جائے اسے کیا ہوا ہے۔ کام زیادہ ضروری تھا۔ ”ابھی جاتا ہوں کہہ کر پیچہ کی جانب متوجہ ہوا۔ تاہم دھیان..... فضا کی جانب ہی تھا۔

☆☆☆

”خیریت اس وقت فون کیا؟“
 ”ہاں..... فضا، سعد میرا فون نہیں اٹھا رہے۔“
 ”تم نے بھی تو کچھ کم کل نہیں کھلائے۔“
 ”اب کیا کروں.....“ روہانسا انداز تھا۔
 ”وہ چلے تو نہیں گئے۔“

”نہیں، جانے سے پہلے تمہارا فیصلہ کر کے جائیں گے، آریا پار.....“
 ”فضا.....“

”یار وہ ناراض ہیں، کیسے تمہارا فون اٹھائیں گے، تم خود اسے مناؤ۔“

”کیسے.....؟“
 ”کل ویک اینڈ ہے گھر چلی جاؤ تا نو کے ساتھ

”فضا کسی شوخ سے منظر کا سوچ کر مسکائی، مہربان سے نکل اسے بڑا مزہ دیتی تھی۔

”اچھا میں رات کو سعد سے بات کروں گی مجھے لے جائیں۔“ پل بھر میں فیصلہ ہو گیا۔

فضا نے صبا کو اپنے ساتھ لگا لیا..... اس اپنائیت بھرے انداز پر صبا کے آنسو ٹوٹ کر گر گئے۔

☆☆☆

”یہ لیں.....“

بلیو ٹکری فائل مہربان غزنوی کے سامنے میو پر رکھی۔

”یہ کیا ہے؟“ فائل پر نظر ڈال کر پیچر پر نظر ڈالی۔

”صبا، سعد کی مکمل فائل..... مسئلہ حل ہو گیا ہے،

صبا کو قتل آ سکتی ہے، میرے لکچر اس کے لیے مفید ثابت ہوئے ہیں۔“ وہ ہنوز سنجیدہ تھی۔

”ہوں..... ویل ڈن..... یعنی کہ یہ کیس مکمل طور پر تم نے حل کیا ہے۔“

فضا نے جواب نہیں دیا۔ سامنے چیئر پر بیٹھ گئی۔

”کیا ہوا؟“ نظر اٹھا کر خاموشی کو نوٹ کیا اور سر تا پا تک جاچتی نظر ڈالی۔

”اب آپ سعد سے ملاقات کریں..... اسے

سمجھائیں کوئی انتہائی قدم نہ اٹھائے۔ اپنی ماما سے

بات کرنے کا مطلب ہے کہ ضد اور ہٹ دھرمی کا

مقابلہ..... اس جنگ میں نہ کوئی فاتح ہوتا ہے اور نہ

مفتوح..... نہ ماں ہارنی اچھی لگتی ہے نہ بیٹا جیتتا.....“

”تو.....؟“

”تو یہ کہ سعد باہر چلا جائے..... وہ بھی اکیلا.....“

”اکیلا.....؟“

”ہاں..... صبا تا نو کے پاس رہے..... وہاں جا

کر چیکے سے اسے بلا لے سعد کی ماما خوش فہمی میں جتلا

رہیں گی کہ سعد اور صبا کو الگ کر دیا۔ صبا ان سے کہہ

چکی ہے کہ مجھے طلاق نہیں چاہیے میں تا عمر تا نو کے

ساتھ رہوں گی۔“

”واؤ..... تم کتنی عقل مند ہو۔“

فضا سنجیدگی سے بیٹھی انگلی کی انگوٹھی کھاتی رہی۔

”گزر رہا ہوا وقت فیصلوں کو بدلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ انسان کو اتنا جذباتی نہیں ہونا چاہیے۔ اب کے مرد بنو.....“ اس کے شانے پر ہاتھ مارا..... ”اور اس کا ہاتھ تھام لو۔ مجھے یقین ہے تمہیں مایوسی نہیں ہوگی۔“ سعد مسکرا دیا۔

”میں جانتا ہوں..... یہ سب مجھے معلوم نہیں تھا، ورنہ مایوس تو میں پہلے بھی نہیں ہوتا۔ بس میں زبردستی نہیں کرنا چاہتا تھا۔“ مسکراہٹ گہری ہوئی۔ کہاں تھکا ہوا مرجھایا ہوا سعد..... کہاں یہ جھللاتے جگنوؤں والا سعد..... زور سے شانے دبائے۔

”بیٹ آف لک..... یار اس کو بھی تو خوشخبری دو جو لکھ روگ پال رہی ہے۔ پلاننگ تمہیں آگئی ہے ناں.....“

”بس اب تم دونوں خوش رہو۔ تمہاری ماما مطمئن رہیں گی، جیت ان کی ہے۔ ماؤں کو بھی ناراض نہیں کرتے۔ دس بارہ سال بعد تمہارے چھ سات بچے ہو جائیں تو تینا نا..... جب کچھ نہیں ہو سکتا۔ فضا..... صبا بن کر ان سے راپٹے میں رہنے کی اور گاہے لگا ہے سعد کے بارے میں پوچھتی رہے گی۔ اور انہیں بھی اطمینان رہے گا کہ صبا کو سعد کی زندگی سے نکال دیا ہے۔ بس اس سے زیادہ اس کا کوئی حل نہیں ہے اگر تم صبا اور اپنی ماما کو خوش دیکھنا چاہتے ہو تو.....“

”اوکے باس.....“ سر تسلیم خم کیا۔

”مجھے یہی کرنا ہے، لڑائی جھگڑا..... معاملے کو طول دے گا۔“

”اور اگر تم یہ سب جان کر اسی گھر میں رہتے ہو تو تمہاری ماما اور صبا کے درمیان نارچر سیل قائم ہو جائے گا۔ زندگی کی خوشیاں حرام ہو جائیں گی۔ بہتر ہے کہ مفاہمت کی صورت رہے اور.....“

”ہوں.....“

”کوئی حساب، کوئی باز پرس، کوئی سوال جواب نہیں ماؤں کو بیٹوں کا غرور مار ڈالتا ہے سعد..... یہ نفسیاتی گریہیں انہیں اور پیچیدہ کرتی جاتی ہیں، ماؤں

پھر انہیں بلو الو۔“

”وہ فون ہی نہیں اٹھا رہے ہیں۔“

”اچھا..... ایسا کرو کہ ابھی رہنے دو، صبح میں کال کر کے بلوائی ہوں، فیصلہ حل ہو جائے گا۔“

”فضہ..... وہ کچھ اور نہ کر لیں۔“

”اب بڑی فکر ہے۔“ فضا ہنسی۔

”ہاں ہے اور بہت ہے، انسان بار، بار خوش قسمت نہیں بنتا۔“

”اوہو..... یہ آپ فرما رہی ہیں۔“

”ہاں، میں۔“ اس کی ہنسی ابھری۔

فضہ اسے چھیڑنے لگی۔

☆☆☆

”ادھر آؤ تم..... کیا ہوا ہے تمہیں؟“ صبح وہ

بینک جا رہا تھا۔ فضا کی خاموشی کو دیکھ کر رک گیا۔

”کچھ نہیں.....“

”کوئی بات ہے ضرور.....؟“

”کہا ناں کوئی بات نہیں ہے۔“ وہ جگن کی

نب گھوم گئی۔ مہران دیکھتا رہ گیا۔

”مہران میری دعا ختم ہو گئی ہے لیتے آتا.....“

سارے آواز دی۔

”پاپا میری اسٹرا میری۔“

”اوکے بیٹا۔“

”اور تمہارے لیے.....“ جگن کے دروازے پر کے۔

”کچھ نہیں.....“ اس کے پاس سے گزر کر وہ باہر نکل

لی۔ فکریہ..... نہ قریب آئی، نہ ٹائی کی ٹانگ ٹھیک کی، نہ

خفی ہنسی..... نہ جسارت کا موقع..... اور نہ فالوے کا

..... ”کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہے صاحب.....“ سر کھجایا۔ مگر یہ

ان باتوں کا نہیں تھا۔

☆☆☆

مہران غزنوی بول رہے تھے سمجھا رہے تھے، سعد

بھکائے بیٹھنا رہا تھا۔ ماما کی کمزوریاں، صبا کا

..... مستقبل کی حکمت عملی..... سکون سعد کے اندر

بہا تھا۔

”جی.....“

”او کے..... بیسٹ آف لک۔“ خدا حافظ کہہ کر چمکتی آنکھوں سے سعد بن رضا باہر نکل گیا۔

سکون بھرے انداز میں مہران غزنوی اسے ہاتھ دیکھتا رہا۔ دھیرے سے اپنا سیل اٹھا کر آن کیا دوسرے لمحے چونکا۔ سیل اسکرین سادہ تھی۔ چار بج رہے تھے اور اور فضا مہران غزنوی کا کوئی کلوز اپ اسکرین پر نہیں تھا، لمحہ فکریہ.....

”اوہ..... مائی گاڈ.....“ ہڑ بڑا کر اٹھا اور غلٹ بھرے انداز میں باہر نکلا۔

☆☆☆

آج دو ماہ بعد اس کے سامنے تھا۔ نانو کا غصہ اسے دیکھ کر بیٹھنے لگا۔ گھر والوں کی تیکھی نظریں تنکے چتون رخ بدلنے لگے۔ ماموں امیر احمد نے بڑھ کر مصافحہ کیا۔

نانو اسے اپنے کمرے میں لے آئیں، اس کا بازو یوں پکڑا تھا گویا اب آئے ہو تو جانا نہیں..... یوزھی آنکھیں جھلملا رہی تھیں۔

سامنے ان کے بیڈ پر صبا گول تنکے سے ٹیک لگائے نڈھال سی بیٹھی تھی۔ ملگجھا جلیہ، بٹھرے بال، زرد چہرہ، پانی پیتے ہوئے ہاتھ کپکپا گئے۔ نانو لائے قدموں مڑ گئیں۔

”آپ.....“ یہ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ کیسی ہو..... حالت زار سامنے تھی۔

بیڈ کے کنارے بیٹھ کر کلائی تھامی..... اسے تیز بخار تھا۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ نظر چرائیں۔ ہاتھ کھینچ لیا۔

”میں دالائی ہوں۔“ نظر چرائی۔

”کس قدر کمزور اور پیلی ہو رہی ہو۔“ دھیرے سے رخسار چھوا۔

”ہاں، موسیٰ بخار ہے۔“

”کیا ہم ساری عمر غیر رہیں گے۔“ نگاہیں اس

کے بغیر رہا بھی نہیں جاتا۔ انہوں نے تمہارا من پسند کھلونا تمہیں دلا دیا ہے۔ اب وہ چاہتی ہیں کہ تم سے یہ کھلونا چھین کر دوسرا اٹھادیں۔ اب یہ تمہارا فیصلہ..... تمہاری احتیاط پسندی ہے کہ تم من پسند چیز کی حفاظت کس طرح کرتے ہو۔“ شائے پر ہاتھ رکھا۔

”جی.....“ وہ مسکرایا۔

”چلو اٹھو اور فتح کے جھنڈے لگا دو۔ اور سنو..... تمہاری ماما تم سے ملنے تمہارے پاس آئیں تو تم نے کیا کرتا ہے؟“ مہران غزنوی کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

”کیا.....؟“

”بے وقوف اسے میکے بھجوا دینا۔“ وہ زور سے ہنسا..... سعد بھی ہنسنے لگا۔

”چلو، صبا کو فون کرو، اسے لمبی ڈرائیو کی نوید دو..... اس کے ڈر، خوف، خدشے دور کرو، ان تمام اوہام سے اسے نکالو جس میں وہ جی رہی ہے۔“

سعد نے مسکرا کر اسے دیکھا اور سیل نکالنے لگا۔ صبا کا نمبر ملا یا..... چند رنگ ٹیون کے بعد اس نے اٹھالیا۔

”ہیلو صبا میں تمہیں لینے آ رہا ہوں، تیار رہو.....“

”یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ کہاں جانا ہے؟ تمہارے لیے یہ کافی نہیں ہے میں تمہارے ساتھ ہوں۔“

”او کے..... میں آ رہا ہوں.....“ وہ کھڑا ہوا۔

”کیا ہوا.....؟“ مہران غزنوی اسی کی جانب متوجہ تھے۔

”اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”جاؤ اسے محبت کی ڈوز دو خوف کا بخار اتر جائے گا۔“

”او کے سر.....“ اس کی جانب ہاتھ بڑھایا جس کو اس نے محبت سے تھام لیا۔

”سنو زندگی کی الجھنیں زندگی گزارنے کا حسن ہوتی ہیں، اظہار بہت سی الجھنوں کو سلجھا دیتا ہے۔ نیبل ٹاک، باہمی مشاورت اور مثبت رویہ ہمیں بہت سی پیچیدگیوں سے بچا لیتا ہے۔“

پرنس کیس۔

صبا کا دل پھوٹ، پھوٹ کر رونے کو بے چین ہوا۔
”تم میری محبت میں دکھ سہہ رہی تھیں یا..... اپنا
گھر بچانے کے لیے؟“
صبا کی نظر ابھی اور ٹھہر گئی..... آنسو بیچ کے دانے
ایسے تھے۔

”تم نے اپنا کیوں نہیں سمجھا..... تم سے محبت کر
کے تمہیں پالیا تو..... کیا..... تمہیں تحفظ نہیں دیتا۔“
اس کا سر جھک گیا۔

”اتنا خود غرض بے مروت سمجھا تھا یا..... تمہیں
بے اعتنائی برتی تھی۔“ آنسوؤں کا کنارہ نہیں تھا۔
رونا بھی کتنا رُس ہوتا ہے۔

”یا پھر میرے جیسے محبت کرنے والے شخص سے
محبت ہی نہیں ہوئی۔“ اس نے ہتھیلیوں میں منہ چھپالیا۔
سعد بن رضانے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

”ازدواجی بندھن میں، محبت، اعتبار نہ ہو تو
زندگی کا سفر کتنا نہیں ہے مگر ہمیں سفر کا ٹٹا نہیں ہے
ساتھ، ساتھ چلنا ہے بھر دوسے کے ساتھ۔“
اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

”ماما بہت مضبوط ہیں پاپا کی سپورٹ کے ساتھ
ان کے اختیار میں سب کچھ ہے مگر تمہارے لیے میں
اختیار ہوں، تمہاری ڈھال، تمہارا مان، تمہارا سب
کچھ..... مجھے دونوں ہی عزیز ہیں..... مائی ڈئیر۔“ اس
کا بھگیا ہوا چہرہ اونچا کیا۔

شدت گریہ و زاری نے اس کو کیا بنا دیا تھا۔
”اب بولو.....؟“

”مجھے ماما سے ڈر لگتا تھا، خوفزدہ تھی ان سے.....
آپ کو کھونے کا ڈر تھا۔ ورنہ..... محبت تو مجھے بھی ہوئی
تھی۔“ سر اٹھا کر دیکھا

”خود کو..... سزا دیتی رہیں۔“ بال سنوارے۔

”مگر اب نہیں حالات کا مقابلہ ہم دونوں
کریں گے، محبت اور ایک دوسرے کے اعتبار کے
ساتھ۔“ گرجوٹی سے اس کا ہاتھ تھا۔ اور بھیگی

پلکوں سے وہ بھی مسکرا دی۔

”تم نے تو نفسیاتی مریض بنا کر چھوڑا تھا۔ مہراں
بھائی نہ ہوتے ناں تو.....“ مسکرا کر اسے دیکھا۔ ”یہ جو
آنسو ہیں ناں.....“ رخسار صاف کیے۔ ”میری موت
کے سوگ میں ہوتے۔“

”ہائے..... اللہ نہ کرے۔“ اس کے منہ پر ہاتھ رکھا۔
صبا کی اس ادا پر وہ ٹار ہو گیا۔
زندگی نئے سفر پر گامزن ہوئی۔
☆☆☆

”تمہیں اچانک ہوا کیا ہے؟“ مہراں غزنوی
نے باہر جاتی فضا کا ہاتھ تھام لیا۔
”کچھ نہیں.....؟“ نظر جھکالی۔

”تم پریشان ہو؟“
”نہیں تو.....“ ہونٹ دبا کر ہنسی روکی۔
”خفا ہو.....“

”اونہوں.....“
”پھر.....؟ پھر کیوں دور، دور رہندے ہو، حضور
میرے کولوں مینوں دلی دیو ہو یا کی قصور میرے
کولوں.....“

شرارتی سا انداز تھا۔
ہاتھ کھینچ کر اپنے پہلو میں گر لیا۔
”کہاناں کچھ نہیں.....“
”قالودہ کھانا ہے؟“
”نہیں.....“

”بہت مزے کا ہے..... شاپنگ کرنی ہے؟“
”نہیں.....“

”پھر تو تمہیں کیس پر کام کرنے کی فیس بھی
نہیں چاہیے۔“
نہیں کہتے، کہتے رکی۔

نظر اٹھا کر دیکھا..... آنکھوں میں پوری شرارت تھی۔
”وہ میرا حق ہے۔“

”میں نے کب انکار کیا۔ مگر ناراضی کی وجہ تو
بتا دو.....“

باد صبا کے نرم جھوکوں نے انہیں چھوا اور تجدہ کی نوید دیتے گزرتے چلے گئے۔

”مہراں.....“

”ہوں.....“

”مجھے آپ کے ساتھ صبا اور سعد کا کس مل کرنے میں بہت مزہ آیا ہے۔ بس ایسے کیسوں پر کام کروں گی آپ کے ساتھ بھی اور اپنے ارد گرد بھی ایسی کتنی عورتیں جو بے موت مر رہی ہیں۔ کل لڑکیاں ہیں جو اذیت کا شکار ہیں جو ہمارے علم میں ہیں جنہیں ہم جانتے ہیں، ان کو تو خوشیوں سے ہمکا کر سکتے ہیں ناں.....“ فضا سنجیدہ تھی۔

”ہوں..... رائٹ..... میں تمہارے ہم قدم ہوں۔“
”اپنے حق، اپنے حقوق سے آگہی بہت ضرور ہے، ذرا سی ہمت، بہت سے مسائل کا حل ہے۔“
”اوہو..... بڑی سمجھدار ہو گئی ہو۔“

”ہاں..... آپ کی سنگت میں، آپ جاننا ہیں مجھے سعد اور صبا کی اتنی خوشی ہے کہ میں بتا نہیں سکتی.....“ فضا کا چہرہ چمک رہا تھا۔
”میں ہمیشہ آپ کے ساتھ کام کروں گی بلکہ اسٹڈی کر کے آپ کے ہم قدم رہوں گی۔“
”او کے میری..... جانشین۔“ شانہ دہایا۔
”ایسے ہی تو میں تمہارا قدر دان نہیں ہوں ناں.....“
”اچھا.....“ فضا اتر آئی۔

”یقین نہیں ہے۔“

”ہے..... نہیں۔“

”بس یہ ہے کہ.....“ شرارتی انداز ہوا۔

”کیا.....“

”پھر سے کہو.....“

”کیا.....؟“

”اچھی لگتی ہو۔“ کھلکھلا کر ہنسی۔

اور اس کی شرارت سمجھ کر مہراں غزنوی بھی کھلکھلا کر ہنس دیا۔

”آپ کو کیسے پتا کہ میں ناراض ہوں۔“ نظراٹھا کر دیکھا۔

”پانچ دن سے دور..... دور ہو، کتنی اکیلی ہو، نہ سنگھار، نہ موتیا، نہ پرفیوم کی مہک، میں بھی بغیر ٹائی کے جا رہا ہوں، لیپ ٹاپ بھی خود ہی اٹھا لیتا ہوں، جب تک ناراض ہوتی ہو تو اپنی پسند کا کھانا بناتی ہو..... وہ جو اس کو حیرانی سے دیکھ رہی تھی سب پتا تھا اسے کہ وہ ناراض ہے۔“

”کیا مطلب.....؟“

”اور کیا تو ری، بھنڈی، ٹنڈے، کریلے پر ٹرخا رہی تھیں۔“ فضا ہنس دی۔ کتنا جانتے تھے وہ اسے۔

”اچھا ناراض کس بات پر ہو.....“ بازو پھیلا کر اپنے ساتھ لگا لیا۔ دھیرے سے بالوں کو چھوا۔

”میں ناراض نہیں تھی، خفگی کا ڈراما کر رہی تھی، کتنے دن ہو گئے تھے ناراض ہوئے۔ ناراضی کے بعد منانے کا مزہ ہی اور ہے۔“

”یو چیٹ.....“ وہ کھلکھلا کر ہنسی۔
”آپ کو کیسے پتا چلا کہ میں ناراض ہوں۔“

”میرے سیل سے تمہارا روپ اور لیپ ٹاپ سے تمہاری تصویر عیاں تھی۔“

”اوہو..... صحیحی.....“
”اور یہ کیسے ہو سکتا تھا آپ ناراض ہوں اور ہمیں پتا ہی نہیں چلے۔“ اس کی جانب جھکا۔

”مگر ناراض کیوں تھیں؟“
تجدید وفا، تجدید محبت اور تجدید یقین کے لیے۔

”اوہو میرے خدا..... میں سمجھا کہ صبا اور سعد کا کیس حل ہو گیا، تمہیں فیس نہیں دی اس لیے.....“

”مہراں.....“ آنکھیں پھیلائیں۔
وہ ہنس دیا۔

”دیکھ لیں۔“
”دیکھ رہا ہوں.....“ ذومعنی ہوا۔

فضا ہنس دی..... اور مسکراتے ہوئے سر اس کے شانے پر رکھ دیا۔



حج..... بندگی الہی

بیوی اور بچے کو لے کر نکل کھڑے ہوئے۔

جب آپ کی عمر 86 سال ہو گئی تو اولاد سے مایوس ہو چکے تھے مگر اللہ نے آپ کو اولاد سے نوازا، آپ نے اپنی اولاد سے بھی یہی چاہا کہ وہ لوگوں کو ایک خدا کا بندہ بنائیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی ایک کامل انسان اور ایک سچے اور اصل مسلمان کی زندگی تھی..... اپنے رب کی خاطر صدیوں کے آبائی مذہب اور اس کی رسوم اور عقیدوں کو چھوڑا۔ جلا وطنی کی مصیبتیں سہیں۔ ملک، ملک کی خاک چھانی اور اپنی زندگی کا ہر لمحہ اپنے رب العالمین کی اطاعت اور اس کے دین کی تبلیغ میں صرف کر دیا..... جب بڑھاپے میں اولاد نصیب ہوئی تو اس کے لیے بھی دین اور یہی کام پسند کیا۔

تاریخ کعبہ کے سلسلے میں مختلف روایات ہیں، کعبہ کو سب سے پہلے فرشتوں نے تعمیر کیا۔ اس کے بعد حضرت آدم علیہ السلام نے تعمیر کیا۔ ان کے بیٹے حضرت شیث علیہ السلام نے اور پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے حضرت اسمعیل علیہ السلام کے ساتھ از سر نو اسے تعمیر کیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں کعبہ کے ابتدائی آثار تو مٹ چکے تھے مگر فرشتوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو وہ مقام بتا دیا تھا جہاں تعمیر ہوئی تھی۔ ہزاروں سال کے حوادث نے اس کو بے نشان کر دیا تھا۔ البتہ اب بھی وہ ایک ٹیلہ یا بھری ہوئی زمین کی شکل میں موجود تھا۔ انہوں نے حضرت اسمعیل علیہ السلام کی مدد سے کھودنا شروع کیا تو سابقہ تعمیر کی بنیادیں نظر آنے لگیں ان ہی بنیادوں پر از سر نو بیت اللہ کی تعمیر کی گئی۔

☆☆☆

تمام تر حمد و ثناء اور تمام تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔
ہوا کیلا ہے جس کا کوئی شریک نہیں جس کا کوئی ہمسر نہیں۔

اے اللہ! ہمارے دلوں میں ایسا شکر ڈال دے اور اپنی نظر عنایت سے اطاعت، عبادت کی پابندی کرنے میں ہماری مدد فرما۔ اے رحم کرنے والوں میں سب سے زیادہ رحم کرنے والے ہمارے رب! تو اپنے عبد خاص حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اور ان کی آل پر رحمت نازل فرما۔ درود و سلام ہوا قاصی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر.....

اسلام کے دین کے ستونوں میں آخری ستون حج ہے..... جو ہماری عبادات کا اہم رکن ہے اور ہمارا آج کا موضوع بھی حج ہے۔ حج کے معنی عربی زبان میں زیارت کرنے کے ہیں۔ اور لغوی معنی مقررہ وقت پر بیت اللہ شریف کی زیارت کرنا ہے۔

تمام مسلمان، عیسائی، یہودی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا پیشوا مانتے ہیں..... چار ہزار سال سے زیادہ مدت گزری جب وہ عراق کی سر زمین پر پیدا ہوئے۔

اس وقت ساری دنیا گمراہی کا شکار تھی ایسے ہی بت پرست گھرانے میں آپ پیدا ہوئے۔ مگر آپ نے سب سے پہلے موز کر اس رب عظیم اللہ تعالیٰ کو عبادت اور بندگی کے لیے غامض کر لیا..... اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام پر معاصب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ والدین، پوری قوم سب آپ کے پیچھے پڑ گئے۔ آپ کا مقدمہ بادشاہ کے سامنے پیش ہوا اور فیصلہ ہوا کہ آپ کو زندہ جلا دیا جائے آپ اپنے اللہ پر ایمان لا چکے تھے، یہ سزا بھگتنے کے لیے تیار ہو گئے۔ مگر اللہ رب العزت نے اپنی قدرت سے آپ کو جلنے سے بچالیا.....

مگر آپ اپنا گھریا، اپنی قوم اور اپنا وطن چھوڑ کر صرف اپنی

حضرت ابراہیم علیہ السلام جب الانبیا ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی آپ ہی کی ملت کی پیروی کا حکم دیا گیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام دین اسلام کے داعی تھے..... ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ

”یاد کرو وہ وقت جب ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کے لیے اس گھر (خانہ کعبہ) کی جگہ تجویز کی تھی اس ہدایت کے ساتھ کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو۔ میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام و رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھو اور لوگوں کو حج کے لیے اذن عام دے دو کہ وہ تمہارے پاس ہر دروازہ مقام سے پیدل اور دبلے پتلے اونٹوں پر سوار ہو کر آئیں۔“ (سورہ حج)

ایک اور جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ”اور یہ کہ ہم نے اس گھر (خانہ کعبہ) کو لوگوں کے لیے مرکز اور امن کی جگہ قرار دیا تھا اور لوگوں کو حکم دیا تھا کہ ابراہیم (علیہ السلام) جہاں عبادت کے لیے کھڑا ہوتا ہے۔ اس مقام کو متصل جائے نماز بنالو۔ (یعنی حرم پاک) اور ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو تاکید کی تھی کہ میرے اس گھر کو طواف اور اعکاف اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھو۔“ (سورہ بقرہ)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے باوجود استطاعت کے حج نہ کرنے والوں کے لیے ارشاد فرمایا۔ ”جو شخص حج کے لیے زارِ راہ اور سواری رکھتا ہو۔ جس سے بیت اللہ تک پہنچ سکے اور پھر بھی حج نہ کرے تو اس کا اس حالت میں مرنا یہودی یا عیسائی ہو کر صراحتاً برابر ہے۔“ یہ عبادت کنسی عظیم ہے کہ یہ نہ ہو تو دین کامل نہیں ہوتا، اس عبادت سے اعراض کرنے والا گمراہی میں یہود و نصاریٰ کے برابر ہے۔

حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے ابراہیم علیہ السلام کو یہ حکم دیا کہ وہ لوگوں کو حج بیت اللہ کے لیے بلا میں تو انہوں نے اعلان کیا..... ”اے لوگو!..... اللہ تعالیٰ نے ایک گھر بنایا ہے تم اس کا حج کرو.....“ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ اعلان بنی نوع انسان کے ان تمام افراد نے سنا جنہیں حج بیت اللہ کی

سعادت حاصل ہو چکی ہے یا قیامت تک حاصل ہوگی۔ دنیا میں سب سے پہلے جس نبی کو اسلام کی عالمگیر دعوت پھیلانے پر مامور کیا گیا تھا مکہ اس مشن کا صدر مقام تھا۔ کعبہ وہ مرکز تھا جہاں سے یہ تبلیغ دنیا کے مختلف گوشوں میں پہنچائی جاتی تھی۔ اور حج کا طریقہ اس لیے مقرر کیا گیا تھا کہ جو لوگ خدائے واحد کی بندگی کا اقرار کریں اور اس کی اطاعت میں داخل ہوں خواہ وہ کسی قوم اور کسی ملک سے تعلق رکھتے ہوں یہ سب اس ایک مرکز سے وابستہ ہو جائیں اور ہر سال جمع ہو کر اس کے گرد طواف کریں.....

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد ہے کہ ”مکانات تو اس سے پہلے بھی تھے لیکن عبادت کے لیے سب سے پہلے یہی مکان موزوں ہوا۔“ متعدد صحابہ کرام سے نقل کیا گیا ہے کہ تمام زمین کے پیدا ہونے سے پہلے یہ جگہ پانی پر بلبلے کی طرح تھی پھر اس کو پھیلا کر ساری زمین اسی سے بنائی گئی جیسا کہ آٹے کے بیڑے سے پھیلا کر روٹی بنائی جاتی ہے۔ دو وجہ سے یہ مقام امن ہے کہ ایک آخرت کی وجہ سے کہ اس میں نماز و حج وغیرہ کرنے سے جہنم کے عذاب سے امن ہو جاتا ہے۔

حج و عمرہ کرنے والے اللہ تعالیٰ کے وفد اور اس کے مہمان ہیں اگر وہ اس سے مانگتے ہیں تو وہ انہیں عطا کرتا ہے اس سے مغفرت چاہتے ہیں تو ان کی مغفرت کرتا ہے اگر دعا مانگتے ہیں تو ان کی دعا قبول فرماتا ہے اور اگر سفارش کرتے ہیں تو ان کی سفارش قبول کی جاتی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مبارک فرمان ہے ”لوگوں میں بڑا گناہ گار وہ ہے جو عرفہ کے دن وقوف کرے اور خیال کرے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت نہیں کی۔“ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے ”غزوہ بدر کا دن تو ششستر ہے اس کو چھوڑ کر کوئی دن عرفہ کے دن کے علاوہ ایسا نہیں ہے جس میں شیطان بہت ذلیل ہو رہا ہو۔ بہت راندہ پھر رہا ہو بہت حقیر ہو رہا ہو بہت زیادہ غصے میں پھر رہا ہو اور یہ سب کچھ اس وجہ سے کہ عرفہ کے دن اللہ کی رحمتوں کا کثرت سے نازل ہوتا بندوں کے بڑے بڑے گناہوں کا معاف ہونا دیکھتا ہے۔ شیطان کو اس دن

بھی اپنے آپ سے دور کیا یا نہیں؟“ آپ کے سوالات سن کر اس شخص کی حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ ”نہیں میں اپنی کسی ایسی کمزوری پر قابو نہیں پاسکا۔“ تب حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔ ”پھر تم نے احرام ہی نہیں باندھا۔“ پھر آپ نے مزید سوال کیا۔ ”جب تم نے عرفات کے میدان میں وقوف کیا تو مراقبہ ذات باری کیا؟“ اس شخص نے انکار میں جواب دیا۔ آپ نے فرمایا۔ ”پھر تم نے وقوف ہی نہیں کیا۔“ پھر آپ نے مسلسل اس شخص سے کئی سوالات کیے۔ ”جب تم مزدلفہ پہنچے تو تمام نفسانی خواہشات سے قطع تعلق کیا؟ جب تم نے خانہ کعبہ کا طواف کیا تو جمال ذات باری تعالیٰ کا مشاہدہ کیا؟ جب تم نے صفا و مروہ کی سعی کی تو مقام صفا و مروہ حاصل کیا یا نہیں؟ پھر جب تم مٹی میں آئے تو تم نے اپنی نفسانی خواہشات کو قربان کیا؟ جب تم نے رمی حمرات کی تو اپنی حیوانی حسرتوں اور آرزوؤں کو بھی دل سے نکال کر دور پھینکا یا نہیں؟

وہ شخص ہر سوال کا نفی ہی جواب دیتا رہا۔ تب حضرت جنیدؒ نے بغیر کسی تکلف کے کہا۔ ”میرے بھائی! تم نے سرے سے حج کیا ہی نہیں..... واپس جاؤ اور دوبارہ اسی طرح حج کرو جیسے میں نے تمہیں بتایا ہے تاکہ تم مقام ابراہیمی تک پہنچنے کی سعادت حاصل کر سکو۔“

☆☆☆

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں مٹی کی مسجد میں حاضر تھا کہ دو شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام کے بعد عرض کیا۔

حضور ہم کچھ دریافت کرنے آئے ہیں۔ آقا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا..... ”تم کیا دریافت کرنا چاہتے ہو؟“ انہوں نے عرض کیا کہ آپ ہی ارشاد فرمادیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ”تم حج کے متعلق دریافت کرنے آئے ہو کہ حج کے ارادے سے گھر سے نکلنے کا کیا ثواب ہے؟ اور طواف کے بعد دو رکعت پڑھنے کا کیا فائدہ اور صفا و مروہ کے درمیان دوڑنے

میں جتنا بھی غصہ ہو جتنا بھی اس پر رنج و ملال کا اثر ہو جتنا بھی وہ پریشان حال ہو کیونکہ اس کی عمر بھر کی کمائی یعنی اس کی محنت کہ اس نے بڑے، بڑے گناہ لوگوں سے کرائے، وہ آج ایک رحمت کے جھونکے میں سب صاف ہو گئے اس سے جتنا بھی اسے غصہ اور رنج ہو ظاہر ہے۔

☆☆☆

شہر بغداد میں حضرت جنید بغدادیؒ کی خانقاہ میں ایک شخص آپ کی بارگاہ میں حاضر ہوا..... آپ نے حسب معمول مہمان کی تواضع کی اور پھر پوچھا۔ ”میرے بھائی تم کہاں سے آرہے ہو؟“ اس شخص نے جواب دیا کہ ”میں حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کر کے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں تاکہ شیخ کی روحانی برکات سے فیضیاب ہو سکوں۔“

”جو شخص اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہو چکا ہو اسے ایک انسان کے پاس آنے کی کیا ضرورت ہے؟ جو ذات اپنے ایک، ایک بندے کی کفیل ہو اس نے تمہیں بھی محروم نہیں رکھا ہوگا۔“ حضرت جنید بغدادیؒ نے اس کو ٹوکتے ہوئے کہا..... اس شخص نے آپ کی بات سنی مگر اپنی ضد پر قائم رہا۔ ”شیخ مجھے آپ کا فیض محبت درکار ہے، بڑی توقعات لے کر حاضر ہوا ہوں برائے خدا مجھے مایوس نہیں کریں۔“

تب حضرت جنید بغدادیؒ نے کچھ دیر سکوت اختیار کیا پھر آپ اس شخص سے مخاطب ہوئے..... ”تم حج کے لیے گھر سے نکلے ہو تو کیا تم نے گناہوں سے بھی اجتناب کیا ہے؟“ اس شخص نے نفی میں جواب دیا..... آپ نے پھر فرمایا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ تم سفر میں نہیں تھے۔“ پھر آپ نے پوچھا۔ ”سفر کے دوران جب تم رات گزارنے کے لیے کسی سرائے میں ٹھہرے تو کیا تم نے کوئی مقام قرب طے کیا؟“ اس شخص نے بڑی حیرت سے آپ کو دیکھا اور نفی میں سر ہلایا۔ ”آپ نے بڑے تاسف آمیز لہجے میں کہا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ تم نے منزل بہ منزل سفر طے نہیں کیا۔“ پھر آپ نے اس سے پوچھا کہ ”جب تم نے احرام باندھا تو اپنے سابقہ لباس کے ساتھ، ساتھ انسانی کمزوریوں مثلاً خود بینی، بغض، حسد اور حرص و طمع کو

جل شانہ کے حکم سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمائی تھی اس لیے جیسا کہ حاکم کی پکار پر دربار کی حاضری میں امید و خوف کی حالت ہوئی ہے ایسا ہی حال ہونا چاہیے، اس سے ڈرتے رہنا چاہیے کہ ایسا نہ ہو کہ کہیں اپنی بد اعمالیوں کے سبب حاضری ہی قبول نہ ہو۔

حضرت زین العابدینؑ نے جب حج کے لیے احرام باندھا تو چہرہ زرد ہو گیا اور بدن پر کچلی آگئی اور لبیک نہ کہہ سکے۔ کسی نے عرض کیا آپ نے احرام کے شروع میں لبیک نہیں کہی تو آپؑ نے فرمایا کہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں اس کے جواب میں لا لبیک نہ کہا جائے یعنی تیری حاضری معتبر نہیں اس کے بعد بڑی مشکل سے لبیک کہا تو غشی آئی اور اونٹنی سے گر گئے..... اس کے بعد جب لبیک کہتے یہی حال ہوتا۔ ساراج اسی طرح پورا کیا۔

☆☆☆

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ جل شانہ کی ایک سو بیس رحمتیں روزانہ اس گھر پر نازل ہوتی ہیں جن میں سے 60 طواف کرنے والوں پر اور 40 وہاں پر نماز پڑھنے والوں پر اور 20 بیت اللہ کو دیکھنے والوں پر ہوتی ہیں۔ حضرت موسیٰ بن محمد کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک عجمی شخص طواف کر رہا تھا۔ نیک دیندار آدمی تھا طواف کرتے ہوئے ایک خوب صورت عورت کی پازیب کی آواز جو طواف کر رہی تھی اس کے کان میں پڑی۔ یہ شخص اس عورت کو کھورنے لگا۔ رکن یمانی سے ایک ہاتھ نکلا اور اس زور سے اس کے تھپڑ مارا کہ آنکھ نکل گئی اور بیت اللہ شریف کی دیوار سے ایک آواز آئی۔ ”ہمارے گھر کا طواف کرتا ہے اور ہمارے غیر کو دیکھتا ہے۔ یہ تھپڑ اس نظر کے بدلے ہے اور اگر آئندہ کوئی اور حرکت کرے گا تو ہم بھی زیادہ بدلہ دیں گے۔“ تو یہ سفر جس کا نام حج ہے تمام دوسرے سفروں سے مختلف ہے کیونکہ یہ سفر اپنی کسی غرض کے لیے نہیں یا اپنے نفس کی کسی خواہش کی تکمیل کے لیے نہیں ہے بلکہ صرف اور صرف اللہ رب العزت کے لیے ہے تو پھر اس سفر پر لازم ہے کہ اللہ کا خوف اور محبت دونوں ہوں..... 8 ذی الحج سے 12 ذی الحج تک کے دن جا

کا کیا ثواب ہے اور عرفات پر ٹھہرنے اور شیطانوں کو کنکریاں مارنے کا اور قربانی کرنے کا طواف زیارت کرنے کا کیا ثواب ہے؟“ انہوں نے عرض کیا..... اس پاک ذات کی قسم جس نے آپؐ کو نبی بنا کر بھیجا ہے یہی سوالات ہمارے ذہن میں تھے..... حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ”کریح کا ارادہ کر کے گھر سے نکلنے کے بعد تمہاری سواری اونٹنی جو ایک قدم رکھتی ہے یا اٹھاتی ہے وہ تمہارے اعمال میں ایک نیکی لکھی جاتی ہے اور ایک گناہ معاف ہوتا ہے اور طواف کے بعد دو رکعتوں کا ثواب ایسا ہے جیسا ایک عربی غلام کو آزاد کیا ہو۔ صفا اور مردہ کے دھیان سنی کرنے کا ثواب ستر 70 غلاموں کو آزاد کرنے کے برابر ہے۔ اور عرفات کے میدان میں جب لوگ جمع ہوتے ہیں تو حق تعالیٰ شانہ فرشتوں سے فخر کے طور پر فرماتا ہے کہ میرے بندے دور، دور سے پراگندہ پال آئے ہوتے ہیں اور میری رحمت کے امیدوار ہیں اگر تم لوگوں کے گناہ ریت کے ذروں کے برابر ہوں یا بارش کے قطرہوں کے برابر ہوں یا سمندر کے جھاگوں کے برابر ہوں تب بھی میں نے معاف کر دیے۔ میرے بندو! جاؤ بخشے بخشائے چلے جاؤ تمہارے بھی گناہ معاف ہیں اور جن کی تم سفارش کرو ان کے گناہ بھی معاف ہیں۔“ اس کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ”شیطانوں کے کنکریاں مارنے کا یہ حال ہے کہ ہر کنکری کے بدلے ایک بڑا گناہ جو ہلاک کر دینے والا ہو معاف ہوتا ہے اور قربانی کا بدلہ اللہ کے یہاں تمہارے لیے ذخیرہ ہے اور احرام کھولنے کے وقت سر منڈانے میں ہر بال کے بدلے میں ایک نیکی ہے۔ اور ایک گناہ معاف ہوتا ہے۔ اس سب کے بعد آدمی جب طواف زیارت کرتا ہے تو ایسے حال میں طواف کرتا ہے کہ اس پر کوئی گناہ نہیں ہوتا اور ایک فرشتہ مونڈھوں کے درمیان ہاتھ رکھ کر کہتا ہے کہ آئندہ از سر نو اعمال کر تیرے پچھلے سب گناہ تو معاف ہو چکے۔“

لیکن یہ ضروری ہے کہ حج وہی حج مبرور ہو جو حقیقتاً حج کہلانے کا حق ہے۔ لبیک اس ندا کا جواب ہے جو اللہ

کے دن کہلاتے ہیں۔

☆☆☆

حج کے مبارک فریضے سے ... سبکدوش ہونے کے بعد زندگی کی سب سے بڑی اور عظیم الشان سعادت سرور کو نین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روضۂ اقدس کی زیارت کے لیے مدینہ منورہ کی روانگی ہے۔

اس مبارک دربار رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حاضری کی برکتوں اور فضیلتوں کا کیا کہنا..... اس مقدس مقام پر اگر ہم سر کے بل بھی جائیں تو بھی گناہ گار غلام اپنے اشتیاق کو کم نہیں کر سکتے۔ ان جگہوں پر اولیائے اکرام نے مدتوں تک جوتے نہیں پہنے..... تمام مسلمانوں کے نزدیک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت اہم ترین نیکیوں میں سے ایک ہے۔ ایک افضل ترین عبادات میں ہے اور اعلیٰ درجات تک پہنچنے کے لیے کامیاب ذریعہ اور پُر امید وسیلہ ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جتنے احسانات امت پر ہیں اور جو توقعات موت کے بعد آپ سے وابستہ ہیں ان کے لحاظ سے وسعت اور طاقت کے بعد حاضری نہ نصیب ہو تو بے حد محرومی ہے۔

جب حج سے فارغ ہو جائیں تو چاہیے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر مبارک کی زیارت کی نیت سے مدینہ منورہ کا ارادہ کرے کہ حضور کی قبر کی زیارت اہم ترین قربات میں سے ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر شریف کی زیارت مستحب ہے۔ حضرت ابن عمرؓ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ

”جو شخص حج کرے پھر میری قبر کی زیارت کرے اس نے گویا میری زندگی میں میری زیارت کی۔“

اور ایک حدیث رسولؐ میں ہے کہ ”جس نے میری قبر کی زیارت کی اس کے لیے میری شفاعت واجب ہوگئی۔“ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس نے میری وفات کے بعد میری زیارت کی تو ایسا ہے گویا میری زندگی میں زیارت کی۔“ (اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہ صحابی ہو گیا)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ”جس شخص نے حج کیا اور میری زیارت نہ کی اس نے مجھ پر ظلم کیا۔“ کتنی سخت وعید ہے اور بالکل ظاہر ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جو احسانات امت پر ہیں ان کے لحاظ سے وسعت کے باوجود حاضری ہونا سراسر ظلم و جفا ہے۔ جب حج سے فارغ ہو جائیں تو اس پر توجہ رہے رنج و غم اور خوف کے ساتھ یہ سوچے کہ معلوم نہیں کہ میرا حج قبول ہوا یا نہیں؟ مجھے مقبولین میں شامل کیا گیا یا پھر ان لوگوں میں جنہیں ٹھکرا دیا گیا ہو..... پھر اپنے دل پر نظر ڈالے اور دیکھے کہ اس کا دل دنیا کی رنگینی سے کنارہ کش ہو گیا ہے اور عبادات میں لذت محسوس ہونے لگی ہے تو سمجھے کہ اس کی محنت بار آور ہوئی اور حج قبول کر لیا گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اس شخص کا حج قبول کرتا ہے جس سے وہ محبت رکھتا ہے اور جس سے وہ رب محبت رکھتا ہے تو اس کے دل میں اپنی محبت ڈال دیتا ہے۔ اور شیطان کو اس پر غالب نہیں ہونے دیتا لیکن اگر معاملہ اس کے برخلاف ہو کہ دل میں دنیا کی محبت بڑھ گئی۔ عبادت کی رغبت کم ہوگئی تو یہ سمجھے کہ اس کا حج ٹھکرا دیا گیا ہے اور وہ تمام محنت جو اس نے اس راہ میں کی سب ضائع ہوگئی..... جو کہ انتہائی دکھ اور افسوسناک بات ہے..... اللہ تعالیٰ ہمیں حج مبرور عطا فرمائے، آمین۔

☆☆☆

حرف آخر: ہر مضمون کے مکمل ہونے پر ہمیشہ ایک کرب کی کیفیت سے دوچار ہوتی ہوں۔ اور اپنے عظیم الشان رب سے بے حد شرمندہ ہوں کہ اس مضمون کی تیاری میں مجھ سے جتنی کوتاہیاں ہوئی ہوں پروردگار مجھے معاف فرمادے۔ اور مجھے وہ توفیق عطا فرمائے کہ جو کچھ وہ مجھ سے لکھوانا چاہ رہا ہے، میرا قلم وہی تحریر کرے جو میرے رب کی رضا ہو۔ یہی میری خواہش ہے پروردگار قبول فرمائے..... آمین۔

اس مضمون کی تیاری میں جن عظیم الشان مسیحوں کی کتب سے میں نے مضامین منتخب کیے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ اہل بیت! آمین!

☆☆☆



متانت و وقار کا مرقع.....

سنجیدہ و سبق آموز تحریروں کی خالق

پاکیزہ کی دیرینہ مصنفہ حبیبہ شاہ کی دلچسپ حقائق کو سے پر گفتگو

عید الاضحیٰ کے پر مسرت موقع کا... لطف اٹھاتے اور اسے روایتی انداز میں مناتے ہمارے پیارے قارئین کو بہت، بہت سلام اور مبارک باد..... کہیے گوشت کھاتے، کھاتے دل بھرا کر نہیں تو بس اب آپ لوگ

سلاد اور سبزی پر گزارہ کریں اور آرام سے اپنی بزم کا مطالعہ کریں کہ آج ہمارے درمیان پاکیزہ کے ابتدائی زمانے کی بہترین تحریر نگار حبیبہ شاہ موجود ہیں جن کی کہانیوں سے جہاں تک میں واقف ہوں کافی کچھ سیکھنے کو

بات ہے۔ (جی یہ تو ہے)

پاکیزہ۔ اس قلم، کاغذ کی کہانی، ہمیں بھی بتائیں کہ کب اور کیسے پہلی تحریر منظر عام پر آئی؟

صبیحہ شاہ۔ قلم کاغذ سے رشتہ کب جڑا؟ سوچوں تو سچی بات ہے کہ یاد کی گرفت میں کچھ نہیں آتا۔ میں نے شاید۔۔۔۔۔ جب قلم تھا تاب ہی سے لکھ رہی ہوں۔ اب سننے اور پڑھنے والے کہیں گے کہ یہ کیا بات ہوئی بھلا۔۔۔۔۔ تو۔۔۔۔۔ کہانی کچھ یوں ہے کہ میرے والد کا انتقال میرے بہت بچپن میں ہی ہو گیا تھا۔ میرا دھیال دراصل (مرحوم مشر فی پاکستان) میں تھا اور ان سے تعلق کا ذریعہ خطوط تھے۔ کہانیوں سے پہلے میں خطوط لکھنے شروع کیے، شاید میری تحریر اور انداز تحریر میں کوئی بات ایسی ہوگی، جو میری مرحومہ امی نے مجھے باقاعدہ لکھنے کی ترغیب دی اور تربیت کی۔۔۔۔۔ پہلی تحریر کب اور کہاں شائع ہوئی؟ یہ بھی کچھ صحیح سے یاد نہیں، ان دنوں اخبارات میں طلبہ میگزین کے نام الگ سے صفحات مخصوص ہوتے تھے، میرا خیال ہے میں نے کسی طلبہ میگزین میں ہی لکھنا شروع کیا۔ روزنامہ کلیم سکھر، ماہنامہ طلبہ میگزین فیصل آباد۔۔۔۔۔ ان سب میں دیگر رسالوں اور ڈائجسٹوں میں لکھنے سے پہلے لکھا، یہ میرے کالج کے اولین دنوں کی بات ہے۔ پاکیزہ کا اجراء ہوا تو یہاں بھی میں نے لکھنا شروع کیا بلکہ یوں کہہ لیں آپ نے مجھے شائع کرنا شروع کیا۔۔۔۔۔ جی ہمارا آپ کا نانا اتنا ہی پرانا ہے۔ (بہت خوب)

پاکیزہ۔ مطالعے میں آپ کی کیا ترجیحات رہیں، آج بھی نئے لکھاریوں کی کاوشیں زیرِ مطالعہ رہتی ہیں؟ یا مصروفیات آڑے آتی ہیں؟

صبیحہ شاہ۔ مطالعے میں میری ترجیحات۔۔۔۔۔؟ بھی مجھے جو کچھ ملتا ہے، پڑھ ذاتی ہوں پڑھے بغیر سونے کا تصور ہو نہیں سکتا۔ تو ظاہر ہے سب کچھ پڑھنا مجبوری بھی ٹھہری۔ ہاں سبھی نے لکھنے والے بہت اچھا لکھ رہے ہیں۔ میں نے کہا ناں۔۔۔۔۔ میں پڑھے بغیر سو نہیں سکتی۔ میں نیا پرانا، سب پڑھ لیتی

ملتا ہے، ان کا انداز تو اگرچہ ٹیکھا لگتا ہے مگر بڑی، بڑی باتیں، بڑی خوب صورتی سے لکھ جاتی ہیں، ہاں سوچ کا در ضرور وا ہو جاتا ہے جو ایک لکھاری کا اصل مقصد ہوتا ہے۔ ایک بھی مثبت سوچ کو عملی شکل مل گئی تو کڑی سے کڑی جڑتی جاتی ہے اس لیے کہ سوچیں نسل در نسل منتقل ہوتی ہیں اور اگر مثبت پہلو منتقل ہوتے رہیں تو کیا ہی اچھی بات ہے۔

صبیحہ شاہ نے کم کم لکھا مگر خوب صورت لکھا اور با مقصد لکھا۔ آج ہماری بزم انہی سینئر ترین رائٹر کی دلچسپ چٹکھی مگر ٹر لطف باتوں سے سچی ہے تو آئیں قارئین صبیحہ آبی سے گفتگو کا آغاز کرتے رہیں۔

☆☆☆

پاکیزہ۔ آپ کو خوش آمدید کہتے ہوئے نہایت شکر گزار بھی ہیں کہ آپ نے ہماری اس بزم کو رونق بخشی۔۔۔۔۔ اس بارے میں اپنے تاثرات سے آگاہ کریں۔

صبیحہ شاہ۔ بہت شکریہ آپ کی اس عزت افزائی کا۔ پاکیزہ سے صدیوں، قرونوں پرانا تعلق ہے بھی۔۔۔۔۔ تجھے یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔۔۔۔۔ (واہ قرونوں کی کیا بات کہہ دی) درمیان میں بوجہ ایک دوری، ایک وقفہ، ایک سکوت ضرور آ گیا تھا مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ تعلق ٹوٹ گیا تھا۔ آج آپ کو لوگوں کے درمیان اپنے آپ کو پا کر مسرت ہو رہی ہے۔ (چلیں اچھی بات ہے)

پاکیزہ۔ آج کل آپ کی کیا مصروفیات ہیں؟ لکھنے سے کیوں کنارہ کشی اختیار کی ہوئی ہے؟

صبیحہ شاہ۔ میں آج کل ایک inclusive اسکول چلانے میں اپنی بیٹی کی معاونت کر رہی ہوں اور لکھنا پڑھنا تو ہے ہی زندگی کی روشین، لکھنے سے کنارہ کشی کبھی نہیں ہوئی، یہ الگ بات ہے کہ ہر لکھا ہوا چھپنا بھی ضروری ہو، ہاں کبھی کبھی وقفہ ضرور آ جاتا ہے تو ظاہر ہے بھی، لکھنے والی عورت صرف لکھاری نہیں ہوتی وہ زندگی کے سچ پر بہت سے رول بہ یک وقت پلے کر رہی ہوئی ہے تو لکھنے میں وقفہ آ جانا معمول کی

ہوں اور یہ پڑھنے کی ہی ہوس ہے جو لکھنے کا موقع کم ہے دیتی ہے۔

پاکیزہ ♦..... پاکیزہ سے تعارف کب، کیسے ہوا؟
صبیحہ شاہ ♦..... اس کا تو جواب بھی ہو سکتا ہے کہ جیسے سورج اور چاند سے آگاہی ہوئی۔ وہی معاملہ پاکیزہ یا اس دور میں چھپنے والے دوسرے پرچوں، میگزینز کا بھی رہا۔ دراصل ہم نے جب پڑھنا اور لکھنا شروع کیا وہ دور الیکٹرانک کا نہیں، برنٹ میڈیا کا تھا..... نیٹ تھا نہیں..... موبائل اور ٹی وی نے بھی زندگی میں بے وجہ کی مصروفیات نہیں بھری تھیں۔ آج جس طرح لوگوں کو پتا ہوتا ہے کہ کس چینل پر کیا آرہا ہے، موبائل کا کون سا نیا ورژن، کون سا نیا ایپ متعارف ہوا، اسی طرح تب پڑھنے والوں کو پتا ہوتا تھا کہ کب اور کہاں کسی نئے پرچے کا اجرا ہو رہا ہے؟ کب اور کہاں کسی کی نئی کتاب شائع ہوئی ہے؟ کتابوں کی دکانیں پڑھنے والوں کی آسان پہنچ میں تھیں اور گھر میں..... پڑھنے پڑھانے والا ہی نہیں لکھنے لکھانے والا بھی ماحول تھا۔ میری امی بہت اچھی لکھاری اور شاعرہ تھیں۔ آج میرے ماموں، میری خالہ اور ایک خالہ زاد لکھنے اور پڑھنے والوں میں جانا پہچانا نام ہیں اور میرے شو بہر بھی بہت اچھے شاعر تھے۔ (اچھا خاندانی ادبی ماحول تھا، جیسی تو شوق پروان چڑھا)

پاکیزہ ♦..... اپنی بہترین تحریر آپ کی نظر میں کون سی ہے؟ پاکیزہ کے حوالے سے بھی؟
صبیحہ شاہ ♦..... بہترین جب لکھ سکی تھی تب ہی سنا ڈگی۔ ابھی تک تو کچھ ایسا نہیں لکھ پائی..... ہر نئی لکھی چیز مکمل ہونے کے بعد بچکانہ اور کمتر لگنے لگتی ہے۔ (اوہ کیا کسبھی ہے)

پاکیزہ ♦..... ماہنامہ پاکیزہ کو کیا پایا؟ آج اس لی مزید بہتری کے لیے کیا تجاویز دیں گی؟
صبیحہ شاہ ♦..... معاف کرنا مجھے صرف پاکیزہ میں ہی نہیں، تمام پرچوں میں یکسانیت کا عالم ہے، جس امرے پر ان پرچوں نے پاؤں پاؤں چلنا سیکھا اور پھر اڑنا سیکھا آج تک اسی ڈھڑے پر دوڑے چلے جا رہے

ہیں۔ کچھ تبدیلی اور کچھ نیا ہوتے رہنا چاہیے۔ (اسی لیے تو پوچھا ہے تجویز بھی تو دیں ناں کچھ نئے پن کی)

پاکیزہ ♦..... اب تو رائٹرز ٹی وی، جیو ٹی وی کے حوالے سے پہچانی جاتی ہیں، آپ نے بھی کیا ڈراما اسکرپٹ لکھا؟

صبیحہ شاہ ♦..... نہیں ڈراما اسکرپٹ میں نے نہیں لکھا..... شاید اس لیے کہ میں نے کوشش ہی نہیں کی یا شاید اس لیے کہ میں اتنی محنت نہیں ہوں جتنا ایک اسکرپٹ رائٹر کو ہونا چاہیے اور شاید اس لیے بھی کہ میں فرماؤں گی چیزیں نہیں لکھ سکتی..... یہ میری خامی ہے۔
پاکیزہ ♦..... اپنے سینئرز اور ہم عصروں بلکہ آج کے بھی چند نام جو آپ کو متاثر کرتے ہو؟

صبیحہ شاہ ♦..... مختلف اوقات میں مختلف تحریروں دل کو چھو لیتی ہیں۔ ایسا تو کبھی ہو نہیں سکتا کہ کوئی لکھاری ہمیشہ ہی بہترین لکھ سکے، لہذا کسی ایک یا دو تین پسندیدہ رائٹرز کا نام نہیں لے سکتی۔ (دوستیاں بھی خطرے میں پڑ سکتی ہیں) کہاں ڈاکٹر شیر شاہ سید کی تحریر کا خلوص اور گداز دل پر ضرور اثر کرتا ہے..... ہاں ان لکھاری دوستوں کا اکثر خیال ضرور آتا ہے جن سے تحریری رابطہ بذریعہ خطوط رہتا تھا..... بڑا ہوا سیل فون کا، اس وائس ایپ کا، اس فیس بک کا جس نے ڈاک ملنے کی مصحوم سی خوشی بھی چھین لی ہے۔ مرحومہ لبنی عروج، جس کے لیے مرحومہ لکھنے اور بولتے ہوئے دل کتنا ہے مجھے بہت یاد آتی ہے، اس سے بڑا پیار و ستانہ رہا اللہ اسے جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے، آمین۔ بہت نیک اور مصحوم روح تھی۔ نگہت سیما سے خط کتابت رہتی تھی، میری نالائق اور گونا گوں مصروفیات کی وجہ سے اس کا خیال آنے کے باوجود رابطہ بحال نہیں ہو پاتا۔ اللہ اسے خوش باش رکھے۔ افسر سلطانہ کو اس کی ذاتی مصروفیات نے قریب ہوتے ہوئے بھی دور کر دیا۔ مہناز عرفان سے کافی عرصے سے رابطہ نہیں ہوا۔ (آواز دو کہاں ہو) اختر شجاعت بہت پیاری دوست ہے، سالوں بعد بھی ہم ملیں تو یوں ملتے ہیں جیسے پچھلے ہفتے تو ملے تھے، سیما مناف



نیگم ریڈمرل سے صبیحہ شاہ نیول ویلفیئر کلب کا سونیر وصول کرتے ہوئے

ہوتی عورت کے لیے وہ زندگی اور موت کا مسئلہ ہو سکتی ہے (جی بالکل) گوکہ عورت اب ہر میدان میں سرگرم عمل ہے لیکن پھر بھی کچھ چیزیں مرد کے ہی تجربے میں ہوتی ہیں اور وہ ہی ان کے بارے میں زیادہ اچھا لکھتا ہے ہاں..... یہ الگ بات کہ سیٹ کے استعمال کے باعث ہر فرد، ہر چیز کے بارے میں آگاہی حاصل کر سکتا ہے لیکن پھر بھی انداز تحریر چٹلی کھا جاتا ہے کہ زنانہ نام کے پردے میں مرد ہے یا مرد کا ماسک پہنے کوئی عورت (جی ہاں بالکل)

مہینوں بعد ملے تو اس کی گرمجوشی اور اپنائیت ایسی ہوتی ہے جیسے کل نہ ملے تو مر جائیں گے..... غزالہ رشید سے بہت اپنائیت والا رشتہ ہے، میرے لکھے ہوئے میں خامیاں اور کمزوریاں وہ پنا کسی ہچکچاہٹ کے نکال سکتی ہے اور میں اس کی..... دراصل یہ سب لکھاری ستارے ہیں، ہم سب کی زندگیاں ایک دوسرے کے ہونے سے روشن ہیں..... اور زندہ رہنے کو اتنی ہی روشنی، اتنی ہی آکسیجن بہت ہے۔ (بہت خوب صبیحہ کن کن ہنر مندوں کے نام لیے آپ نے سب ہی بہترین تحریر نگار ہیں)

پاکیزہ..... اپنی تحریری مصروفیات کے دوران کوئی دلچسپ یا ناقابل فراموش واقعہ بتائیں؟

پاکیزہ..... مرد راسخ اور خواتین تحریر نگاروں کی تحریروں میں کوئی نمایاں فرق؟

صبیحہ شاہ..... لکھنے والے کے لیے اس سے بڑا انعام اور کوئی نہیں ہو سکتا ہے کہ اس کی تحریر کا نوٹس لیا جائے اور سراہا جائے۔ میں نے ابھی لکھنا شروع ہی کیا تھا کہ پاکیزہ میں ہی شائع شدہ ایک کہانی سفید خون کے حوالے سے بہت سے خطوط ملے۔ مدیرہ نے وہ خطوط یہ کہہ کر میرے حوالے کر دیے کہ یہ ہماری پالیسی تو نہیں لیکن اتنے اور ایسے خطوط کبھی کسی کے لیے نہیں آئے۔ اور ان خطوط میں کیا تھا بھلا..... آج بھی وہ خطوط میرے پاس محفوظ ہیں۔ سوچتی ہوں تو ہنسی آتی ہے۔ ایک خط تھا

صبیحہ شاہ..... مرد اور عورت کو اللہ تعالیٰ نے صرف شکل و جسم میں مختلف نہیں بنایا۔ دونوں اصناف کی صلاحیتیں مختلف، عادتیں اور فطرتیں مختلف، انداز گفتگو اور سوچنے کے انداز اور زندگی کے معاملات میں دونوں کے روئے مختلف تو تحریر کا کوئی نمایاں فرق کیا بتایا جاسکتا ہے! میرا خیال ہے یہ تو محسوس کرنے کی بات ہے، عورت عموماً جس چیز کا نوٹس نہیں لیتی، مرد کی پہلی نگاہ ہی اس کو نوٹ کرتی ہے یا مرد کی نظر میں جس چیز کی اہمیت ہی نہیں

پاکیزہ؟..... ٹی وی بنی کس حد تک ہے؟ کیا مطالعہ وقت گزاری کے لیے ہوتا ہے یا طلب ہوتی ہے پڑھنے کی؟

صبیحہ شاہ؟..... ٹی وی دیکھتی ہوں مگر خبریں اور ٹاک شوز نہیں..... کوئی ایک دو اچھے ڈرامے، فیشن شوز اور بس..... اور مطالعہ تو میں نے کہا ناں کہ وقت گزاری بھی ہے، طلب بھی اور عادت بھی..... اکثر گھروں میں، میں دیکھتی ہوں کہ نصابی کتب کے علاوہ کوئی کتاب، رسالہ..... اخبار نظر نہیں آتا، حیرت ہوتی ہے کہ یہ سب صحیح الدماغ کیسے اور کیوں ہیں؟ بغیر کچھ پڑھے..... (ہاہا) کیا بات کی ہے، جی تو ان کی فکر بھی سٹی ہوتی ہے)

پاکیزہ؟..... اچھا! آج کل آپ کی کیا روٹین ہے جبکہ بچے ماشاء اللہ اپنی، اپنی زندگیوں میں مگن ہوں گے..... کچھ تفصیل بتائیے؟

صبیحہ شاہ؟..... یکے بعد دیگرے تین بیٹیوں کی شادیوں کے سلسلے رہے۔ اس میں مصروف رہی..... دوسری بیٹی کی شادی کے بعد میرے شوہر بہت بیمار رہے، وہ ایک الگ مصروفیت رہی۔ ان کے انتقال کے بعد بیٹے کے پاس ملک سے باہر چلی گئی..... پھر یہ آنے اور جانے کے سلسلے رہے..... یہ وہی دور تھا جب میرے لکھنے میں ایک وقفہ آ گیا۔ اب آج کل میں بیٹی کے ساتھ اس کے اسکول میں ہوتی ہوں..... دس بجے تک اسکول جاتی ہوں، کبھی بارہ، کبھی دو ڈھائی بجے تک واپس ہوتی ہوں۔ اسکول کے ساتھ ہی ایک ٹھہرائی سینٹر ہے جہاں اسٹیج سینوری آکوپیشنل اور ریڈیو سٹیل وغیرہ پر کام ہوتا ہے اور پھر گھر آ کر کوئی خاص کام نہیں ہوتا، کھانا پکانے کا شوق مجھے بھی نہیں رہا، ضرورت ہی پکایا جب بھی پکایا۔ (ارے یہ کیا بات کہی ضرورت ہی سہی پکانا تو پڑاناں.....)

پاکیزہ؟..... کہتے ہیں شادی کے بعد لڑکیوں کی مصروفیت شوق، مشاغل اور ہنر دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں، آپ کے سلسلے میں کیا صورت حال تھی؟

صبیحہ شاہ؟..... میں الحمد للہ اس معاملے میں بڑی

پاکیزہ؟..... ہاں! مانا ہے بھلا؟ ہمیں تو کوئی فیک پر سٹالٹی لائی ہے۔ اس نام کے پردے میں کوئی مرو لگتا ہے۔“

ٹی وی ملوط میں سفید خون کے مرکزی کردار ”حزمت“ کی ہر دی میں اس کی مالی معاونت کرنے کو تیار تھے۔ دو ملوط میں شادی کی پیشکش تھی۔ ایک وکیل صاحب نے ای کو میج بھجوا دیا کہ (میری ای ڈپٹی ایجوکیشن آفیسر نہیں) ”میں آپ کی بیٹی پر مقدمہ دائر کر رہا ہوں ہتک عزت کا.....“ ان کے خیال میں وہ ان کی کہانی تھی ای نے جواب بھجوا دیا۔ ”ضرور..... اپنا شوق ضرور پورا کیجیے.....“ بس کئی ماہ ایک بالکل بچی رہی۔ لاہور میں ایک کتاب کی تقریب رونمائی میں ایک لڑکی ملی اس نے میرے افسانے شمشے کا چراغ کا حوالہ دے کر کہا آپ ہماری محسن ہیں اس نے بتایا کہ ہم تین بیٹیاں ہیں اور ہم لڑکی دیکھنے آنے والوں سے پریشان اور والدین سے شرمندہ رہتے تھے لیکن یقین کریں آپ کا افسانہ ہماری ای نے اور ہم نے جب پڑھا تو دل کو ایک سکون اور بے غلری سی ہو گئی اپنے اوپر اعتماد بحال ہوا۔ آج ہم سب بیٹیاں شادی شدہ اور اپنے اپنے گھروں میں خوش اور بیٹیوں کی مائیں ہیں لیکن شمشے کا چراغ آج بھی ہمارے انہوں میں روشن ہے۔ میرے اس افسانے کا مرکزی خیال تھا کہ لڑکیوں کے رشتوں کے حصول میں والدین اس قدر پریشان اور زیر بار ہوتے ہیں لیکن بیٹیاں ہم نے منت مان، مان کر تو نہیں مانگی ہوتیں، یہ تو اللہ رب العزت کی عطا ہیں تو یقیناً ان کے نصیب بھی اس رحیم و کریم نے لکھے تو ضرور ہوں گے۔ ان کے مستقبل بھی اس نے ہی تحریر کیے ہیں اور وہ ہمیں ہماری ماں سے ستر گنا زیادہ چاہنے والا ہے، تو ہم کیوں پریشان ہوتے ہیں؟ اس پیاری سی لڑکی، خاتون کی بات سن کر دل بڑا مطمئن ہوا کہ میرا لکھارا لگاں نہیں گیا۔ کہیں تو کسی دل کا سکون، کسی دل کا مرہم بنا..... (واہ بہت حیران کن واقعات سنائے بالکل درست کہا غلطی نہ ہو لکھارا لگاں نہیں جاتا اور ایک ذمے دار لکھاری بہت سوچ کر ہی لکھتا ہے محض تفریح طبع تو مقصد نہیں ہونا چاہیے ناں)

پاکیزہ ♦..... آپ کے بچے آپ کی اس صلاحیت میں کس حد تک معاون رہے اور کس نے آپ کی یہ صلاحیت اپنائی؟

صبیحہ شاہ ♦..... ایمان کی بات ہے کہ میرے بچے ماشاء اللہ بڑے نیک، راضی بہ رضا اور قناعت پسند بچے رہے ہیں جبکہ میرے بچوں کے بچے ایسے نہیں ہیں، گو ابھی بہت چھوٹے ہیں مگر پوت کے پاؤں پالنے میں نظر آنے والی بات ہے۔ جب میرے بچے چھوٹے تھے تب بھی مجھے لکھنے کے دوران ڈسٹرب نہیں کرتے تھے، اب تو بڑے ہو گئے ہیں اور خود بچوں والے ہیں، رہی بات یہ کہ کس نے یہ صلاحیت اپنائی..... تو مزے کی بات ہے کہ چاروں میں یہ صلاحیت ہے..... کسی نہ کسی سطح پر اسکول، کالج میں انہوں نے لکھا بھی..... لیکن میری طرح باقاعدہ کوئی اس طرف نہیں آسکا۔ چھوٹی بچی کے تین چار ریر سرج آرٹیکل انٹرنیشنل جرنل، ایجیشنل انجیکشن میں شائع ہو چکے ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے لیکن ظاہر ہے ان کی نوعیت افسانہ نگاری سے قطعاً مختلف ہے۔

پاکیزہ ♦..... زندگی کے چار دور..... بچپن، لڑکپن، جوانی، بڑھاپا، کون سا دور اچھا؟ چاروں کی خاص، خاص باتیں بتائیں؟ وہ بھی اپنے حوالے سے؟

صبیحہ شاہ ♦..... زندگی کے ہر دور کا اپنا ایک حسن، ایک چارم ہوتا ہے۔ بچپن کو بادشاہت کا دور کہہ لیں..... لڑکپن حماقتوں کے لیے مخصوص ہے اور جوانی..... لیکن سنو.....! یہ چار کبھی ہوا کرتے تھے، اب تو مجھے لگتا ہے بچپن کے بعد یک دم جوانی ٹوٹ کر آتی ہے اور بڑھاپے کو اس وقت تک قبول اور منظور نہیں کیا جاتا جب تک توئی بالکل ہی جواب نہ دے دیں، آج کے تیسری چوتھی کے بچوں کو دیکھیں یوں لگتا ہے چھوٹے، چھوٹے مرد اور عورتیں، بچپن کی معصومیت بے ساختگی اور بے خبری میڈیا کھا گیا..... جوانیاں دیکھیں..... ایسی بے دھڑک کہ الاماں..... بڑھاپے دیکھیں..... ایسے چھپھورے کہ الفاظ گنگ ہو جائیں..... سارے معاملات الٹ پلٹ ہو گئے ہیں، مجھے تو بچی بات ہے اپنی

خوش قسمت رہی کہ میں نے اپنے سارے شوق پورے کیے۔ شادی سے پہلے تو سب ہی اپنے شوق پورے کرتے ہیں میں نے شادی کے بعد بھی سب شوق پورے کیے۔ میری ساس ایک نیک اور بے ضرر خاتون تھیں۔ اللہ انہیں غریقِ رحمت کرے، (آمین) وہ علم کی بڑی قدردان تھیں، میں نے شادی کے بعد تین بچوں کی پیدائش کے بعد ایم اے کیا۔ (بہت خوب صبیحہ) ظاہر ہے شوہر کا تعاون بھی حاصل تھا اور ساس کا بھی..... میری سسرال بھری پُری تھی، چھ بھائی تھے اور میں سب سے بڑی بھائی، ہندکوئی نہیں تھی۔ جوائنٹ فمیلی میں انیس برس رہی لیکن شوق سب پورے کیے۔ اسی بھرے پرے گھر میں اور مصروفیات کے دوران پہلی کتاب سائبان خشے کا شائع ہوئی۔ وہ نعتیں جو اللہ نے عطا کیں ان کا شکر ادا کرنے کے الفاظ ہی نہیں میرے پاس..... (جی بے ملک)

پاکیزہ ♦..... یہ سوال اس لیے پوچھا کہ رائٹرز کیاریاں بھی اپنی صلاحیت کا گلا بھی گھونٹ دیکھی گئی ہیں کبھی آرٹسٹ لڑکیاں رنگ اور پرش تک فراموش کر گئیں رجناب دیگر مشغلے بھی کچھ ایسے ہی رہ گئے..... آپ کا یا خیال ہے؟

صبیحہ شاہ ♦..... ہاں صحیح کہہ رہی ہیں آپ..... وہ ن کو اپنا گھر بسانا ہوتا ہے وہ تو اپنے آپ کو مادیاتی..... بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ شادی سے پہلے کے شوق مشغلے بعد میں بھی جاری رہیں..... یہ جو لوگ کہتے ہیں ناں کہ بہترین لک مرد ہوتا ہے، بہترین ٹیلر مرد ہوتا ہے، مرد ہی بہترین آرٹسٹ ہوتا ہے، قابل ذکر افسانہ نگار ناصر بھی مرد ہی ہیں۔ تو اس کی وجہ یہی ہے کہ انہیں سسرال اس طرح نہیں بھگتنی پڑتی جس طرح ہمارے شرے میں عورت کو بھگتنی پڑتی ہے، عورت۔ حجابی صلاحیتوں کے دم ختم تو گھر داری، بچے پالنے اور بچوں کو پالنے میں ختم ہو جاتے ہیں..... ایسا ہی ہے لیکن کوئی فارمولہ نہیں ہے، (وہ آپ نے پیشتر عورتوں کے حالات کی عکاسی کر دی)

م (تم بڑھاپا کہہ لو) انجوائے کرنے میں مزہ آرہا ہے،
 دل چاہا تو تیار ہو لیے، نہیں تو یوں ہی سہی..... ابرپ آئی
 بروز بخوائیں تو بخوائیں نہ تو یوں ہی سہی..... کوئی نظر بھر کر
 دیکھنا چاہے تو بیٹا کہہ لو..... ہاہا..... ہاہا ویسے میرے
 حوالے سے اگر ان ادوار کو دیکھو تو میرا بچپن، بہت دیر
 بچپن نہیں رہا..... ابا کے انتقال نے شاید مجھے جلدی
 سمجھدار اور بڑا کر دیا تھا۔ لڑکپن اور جوانی کب آئی اور
 کب گئی بتائی نہیں چلا، دور طالب علمی میں اتنے کام کیے
 کہ جوانی کو انجوائے کرنے کا تصور ہی نہیں رہا۔ اب
 پوچھ رہی ہو تو یاد آرہا ہے اور افسوس ہو رہا ہے۔ میں
 اسکول و کالج میں بیسٹ ڈیٹر، بیسٹ انٹیلیٹ، بیسٹ
 ڈراماٹیکسٹر، یونین کی ہر سال کی عہدیدار رہی راسٹر تو تھی
 ہی..... تو بس جی جوانی ان چکروں میں بیت گئی.....
 جو اب پلٹ کر نہیں آئی۔ اب بڑھاپا ہے، فرصت ہے،
 کوشش کرتی ہوں شعوری طور پر کہ ایک اچھی بزرگ بن
 سکوں۔ (ہاں بھی آج کل تو لوگ بزرگ بننا ہی
 نہیں چاہتے چاہے جتنے بھی بڑے ہو جائیں)

پاکیزہ:..... آج کل کی نوجوان نسل، آپ کے
 خیال میں کس طرف جا رہی ہے، آپ اپنے وقت سے
 کس طرح تقابل کریں گی؟

صبیحہ شاہ:..... دیکھو بھی..... نوجوان نسل جہاں
 بھی جا رہی ہے اس میں ہمارا، ہم ماؤں کا بھی ہاتھ ہے،
 ایسا تو نہیں ہے ناں کہ ایک دن صبح ہوئی اور نوجوان نسل
 کسی خاص راستے پر چل پڑی، قطرہ، قطرہ دریا بنتا ہے، تو
 لمحہ لمحہ ایک نسل تیار ہوتی ہے اور ان لمحوں کو ماؤں نے،
 باپوں نے کیسے کشید کیا؟ جن گھروں میں ماؤں کی
 آنکھیں کھلی ہیں ان گھروں میں نئی نسل آج بھی سنبھلی
 ہوئی ہے۔ ہماری نسل کی اکثر ماؤں نے جدید ایجادات
 سے آگاہی حاصل نہیں کی، روٹیاں ہی توہیتی، ہانڈیاں
 ہی بھونتی رہیں، سرال کے منٹے ہی بناتی رہیں اور
 جنہوں نے آگاہی حاصل کر لی وہ اس آگاہ ہونے کے
 زعم میں کم ہو گئیں..... سیلفیاں اور ان کا فیس بک پر جانا
 اور پھر مٹس در مٹس (اور لائکس ڈس لائکس اور پھر

موزانہ کس کی کتنی لائکس بنیں؟ واہ کیا ترقی کی ہے) دیکھو
 تو کیسی گاڑھی مصروفیت ہے جس میں آج کی ماں
 مصروف ہے..... اور بیچہ پارہ باپ کمانے کی
 مشین..... ویسے تو میرا ایک افسانہ ہے اسی موضوع پر
 بے بی اور باربی..... بس ہمارا یہ غیر متوازن رویہ ہماری
 نسل کو تباہ کر رہا ہے..... سب فرشتے تو ہمارے وقت
 میں بھی نہیں ہوتے تھے..... چور دروازے ڈھونڈ ہی لیے
 جاتے تھے..... لیکن اب..... سر سے دوپٹا لپیٹے، ماں کے
 پہلو میں بیٹھی ہوئی بیٹی کن جہانوں کی سیر کر آتی ہے
 ماں بیچہ پاری کو کبھی پتا نہیں چلتا اور ہاں میرے زمانے
 اور آج کے زمانے کی بات نہ کرو بھی..... یہ بھی ہمارا ہی
 وقت، ہمارا ہی زمانہ ہے، ہاں بس یہ ہے کہ ہماری جوانی
 کے دور میں اور میری بیٹی کی جوانی کے دور میں ایک بچ
 اسکرین کا فرق ہے۔ اور یہ فرق زمین آسمان کا فرق
 ہے۔ (جی ہاں صبیحہ! مادیت پرستی کی اور مقابلے کی دوڑ
 ہے، اخلاقی اقدار تو بہت پیچھے ہی رہ گئیں)

پاکیزہ:..... لڑکیوں کے لیے کوئی خاص نصیحتیں،
 مشورے؟

صبیحہ شاہ:..... میں نے ہمیشہ اپنی بیٹیوں سے کہا
 ہے اور آج آپ کے توسط سے سب بیٹیوں، سب
 لڑکیوں سے کہوں گی کہ اپنے ہونے کی عزت کریں،
 اپنے عورت ہونے پر فخر کریں، آپ اپنی عزت خود کرنا
 سیکھیں گی تو دنیا آپ کی عزت کرے گی۔ اور یہ کہ شادی
 ہونے، نہ ہونے کو زندگی موت کا مسئلہ نہ بنائیں یہ تو
 جب ہونی ہوگی، ہو جائے گی کیونکہ پیدائش، شادی اور
 موت ان پر کسی انسان کا بس نہیں..... جب خالق کا حکم
 ہوگا تب ہی ہوگی، آپ فارغ رہنے کے بجائے
 مصروفیات ڈھونڈیں..... مثبت مصروفیات اور یہ کہ
 شادی صرف خوشی کا نام نہیں، یہ آزمائش کا نام ہے،
 آزمائش آپ کے صبر، برداشت اور قناعت کی..... اور
 ان تین عناصر کا فقدان ہی طلاق کی بڑھتی شرح کا سبب
 ہے۔ (بہت دل کو چھو جانے والی نصیحتیں ہیں)

پاکیزہ:..... زمانہ طالب علمی کی دوستیں آج بھی



رابطے میں ہیں؟

صبیحہ شاہ ♦..... ہاں، زمانہ طالب علمی کی چند دوستوں سے آج بھی رابطہ رہتا ہے، اور یہ چند اس لیے کہ میری دوستی ہی چند سے تھی..... میں اتنی ہی دوستیوں کی قائل ہوں جتنی کہ میں نبھاسکوں..... (ہونا بھی یہی چاہیے)

پاکیزہ ♦..... ویسے دوستی آپ کی نظر میں کیا ہے؟ کیسا رشتہ ہے؟ بہترین دوست کون ہوتا ہے؟

صبیحہ شاہ ♦..... دوستی کیا ہے؟ اس کا جواب میری کانج، اسکول فیلو بشریٰ سے سنو..... میری یہ دوست میرے گھر سے دس منٹ کی ڈرائیو پر رہتی ہے، ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ کئی دن تک نہ وہ خود آئی نہ کوئی فون آیا، مجھے خیال آیا تو فون کر کے پوچھا کہ کیا بات ہے، ناراض ہو کیا؟ حسبِ عادت اس نے قہقہہ مارا اور بولی کہ ”لو ناراض ہی ہوتا تھا تو رشتے دار نہ بن جاتی؟“ تو بس..... دوست کا رشتہ غرض سے پاک ہوتا ہے، شکوے، شکایتوں، توقعات سے بالاتر..... (پھر تو رشتے داروں سے دوستی کے یہی رشتے رکھنے چاہئیں نا!)

پاکیزہ ♦..... آج کل تو مخلوط نظام تعلیم ہے تو دوستی بھی اسی حوالے سے ہے، کیا سمجھتی ہیں ایسا ہونا چاہیے؟ بچے کہتے ہیں یہ تو روٹین کی بات ہے اس میں حرج کیا ہے؟

صبیحہ شاہ ♦..... ہاں، روٹین کی اور معمولی بات ہے، مخلوط اداروں میں پڑھیں گے، ساتھ جاہز کریں گے تو دوستیاں بھی ہوں گی..... حرج کیا ہے، بس یہ ہے کہ والدین کو مذہبی تعلیم کا اہتمام ضرور کرنا چاہیے، مذہب کی جڑیں مضبوط ہوں گی تو وہ راہِ راست پر رہیں گے..... اور یہ کہ والدین کو اپنی آنکھیں کھلی رکھنی چاہئیں..... (جی بالکل درست کہا)

پاکیزہ ♦..... محبت کا فلسفہ کیا ہے؟ آپ کی تحریروں میں یہ جذبہ کس حد تک غالب رہا؟

صبیحہ شاہ ♦..... محبت؟ کون سی محبت؟ شیریں فرہاد، لیلیٰ مجنوں، ہیر رانجھا والی محبت کبھی ہوئی

ہوگی..... لیکن ایسی محبت کے بارے میں، میں ہمیشہ مشکوک اور غیر یقینی ہی رہی ہوں..... محبت میں عزت ہونی چاہیے، اخلاص اور وقار ہونا چاہیے..... میں نے زندگی کی حقیقتوں کو رقم کیا ہے، چارمنگ ہیرو، مظلوم لڑکی، غریب ہیرو، امیر ہیرو، حسین لڑکا، معمولی صورت مگر ”پیاری“ لڑکی..... ایسی محبتوں کی کہانیاں میں کبھی نہیں رقم کر پاتی۔

پاکیزہ ♦..... آپ کا نام بہت خوب صورت ہے۔ کبھی مائٹی کی حسین اور باصلاحیت اداکارہ کے حوالے سے آپ کے نام کو لوگوں نے پوائنٹ آؤٹ کیا؟ مطلب آپ کا نام لیتے ہی ان فنکارہ کا تصور ضرور آتا ہے..... ہے ناں؟

صبیحہ شاہ ♦..... ہاں، میرا یہ خوب صورت نام، سنا ہے میرے نانا نے رکھا تھا، اب ان کے ذہن میں اس دور کی وہ حسین فنکارہ تھیں یا صرف نام کا معنوی حسن ان کے پیشِ نظر تھا کہہ نہیں سکتی..... اور عجیب بات یہ ہے کہ یہ نام عام بھی نہیں..... کم کم ہی سنا جاتا ہے۔ (جی ہاں اسی لیے تو پوچھا)

پاکیزہ ♦..... کچھ اپنی فیملی کے بارے میں بھی بتائیں؟

صبیحہ شاہ ❖..... میری پیدائش سی، بلوچستان کی ہے، زندگی کے ابتدائی چار برس سی اور زیارت میں گزرے..... جہاں میرے والد کی جاب تھی۔ والد کے انتقال کے بعد خیر پور میرس سندھ نانا کے گھر آنا ہوا۔ جہاں میں نے خیر پور گرلز ہائی اسکول سے میٹرک اور..... خیر پور کالج فار وینس سے بی اے کیا۔ میری امی نے ابا کے انتقال کے فوراً بعد بطور اسکول ٹیچر ملازمت شروع کی اس وقت وہ صرف میٹرک تھیں، دوران ملازمت انہوں نے انٹر، پھر بی اے، بی ایڈ اور پھر ایم اے کیا اور ڈپٹی ایجوکیشن کے عہدے پر تعینات رہیں، ٹیچر ٹریننگ کالج خیر پور اور پھر کراچی میں بھی پڑھایا، خیر پور کی تاریخ میں اگر کچھ خواتین کا نام روشن حروف میں لکھا جائے تو اس میں ایک نام میری امی، مسز صفیہ شاہ المعروف آپا شاہ کا بھی ہوگا۔ یہ ایک الگ اور تفصیل طلب موضوع ہے۔ (صبیحہ بھی میں تو بے حد متاثر ہوئی ہوں آپ کی والدہ کی کوششوں اور کامیابیوں سے آپ بھی تو انہی کا عکس ہوں گی یقیناً) شادی کے بعد کراچی آنا ہوا، میرے شوہر بینکنگ کی دنیا میں ایک جانا پہچانا اور معتبر نام تھے اور ای کے بعد سید عزیز احمد ہی وہ تھے جن کی بدولت صبیحہ آج صبیحہ شاہ ہے۔ چار لوگ جسے چہرے سے پہچانتے اور نام سے اور کام سے جانتے ہیں، یہ میرے میاں کی وسیع انٹسٹری ہی تھی میں شادی کے بعد بھی صبیحہ شاہ ہی رہی، عام مردوں کی طرح انہوں نے اپنے نام کا لاحقہ لگانے پر مجبور نہیں کیا کیونکہ شادی سے پہلے ہی میں اپنی پہچان بنا چکی تھی۔ بچے میرے چار ہیں، بیٹا بڑا، اور پھر تین بیٹیاں الحمد للہ..... بیٹے نے انجینئرنگ کے بعد ایم بی اے کیا ہے، آج کل بحریں میں برنس کر رہا ہے، بڑی بیٹی ڈیل ماسٹرز اور ایک ملٹی نیشنل نیٹ ورکنگ فرم میں جاب کر رہی ہے، دوسری بیٹی بحریہ کالج کارساز میں پڑھا رہی ہے، چھوٹی پی ایچ ڈی ایڈیشنل ایجوکیشن میں کر رہی ہے، اسی نے SCLD کے نام سے school of cognition Inclusive and language development

and therapy centre قائم کیا ہے۔ بہو میری غیر ملکی (یوکرین سے تعلق ہے) ہے اور بحریں میں ایک مذہبی تعلیم کے ادارے ڈسکور اسلام میں پڑھائی اور پڑھتی بھی ہے۔ (بہت خوب دلی مسرت ہوئی آپ کی فیملی کے متعلق جان کر، اللہ سلامت رکھے)

پاکیزہ ❖..... دیگر کیا مشاغل ہیں؟ شاپنگ کی بلکہ ونڈو شاپنگ کی کس حد تک شوقین ہیں؟

صبیحہ شاہ ❖..... مشاغل کے نام پر آج کل تھوڑی باغبانی، تھوڑی سلائی، کڑھائی تھوڑی سی بچوں یعنی اپنے سود، نواسہ نواسی کی دیکھ بھال بہت ساسونا اور بہت بہت سا پڑھنا ہے، اور بس..... ونڈو شاپنگ اچھی لگتی ہے اور شاپنگ بھی اچھی لگتی ہے، مالز میں سیل لگتی ہے تو ضرور جاتی ہوں، میں مزیل بڑھی نہیں ہوں، نہ بننا چاہتی ہوں (ہاہا)

پاکیزہ ❖..... بھی اکثر دیکھا گیا ہے کہ خواتین کی تفریح تو اب شاپنگ مال گھومنا ہی ہے، آپ کا کیا خیال ہے؟

صبیحہ شاہ ❖..... تو بھی تم ہی بتاؤ، کہاں جائیں تفریح کرنے؟ کچھ گھوم لیے، طرح طرح کے چہرے، چلیے دیکھ لیے، ٹنگ دل شاد کیا تو کیا برا کیا؟ (بالکل برا نہیں مگر سب خواتین آپ جیسی ذتے داریاں بھا کر تو شاپنگ کو نہیں لگتی ناں وہ بیچاریاں تو صرف اور صرف شاپنگ ہی کرتی ہیں)

پاکیزہ ❖..... فلم بینی کا کتنا شوق ہے؟ آخری پاکستانی فلم کون سی دیکھی؟ ویسے آج تو سینما بینی کافی عام ہو گئی ہے؟

صبیحہ شاہ ❖..... فلم دیکھنے کے لیے ٹنگ کر بیٹھنا پڑتا ہے جو مجھ سے ہوتا نہیں۔ آخری فلم بحریں میں ہی دیکھی تھی بیٹے کے ساتھ..... شاید 2012ء تھا فلم کا نام پاکستان میں کبھی سینما نہیں گئی۔

پاکیزہ ❖..... کچھ اپنی نیچر کے بارے میں بھی بتائیں کس حد تک مہمان نواز ہیں؟

صبیحہ شاہ ❖..... اپنی نیچر کے بارے میں کیا بتاؤں؟ ساری اچھی، اچھی باتیں بتائیں تو کیا یقین

پاکیزہ۔۔۔۔۔ کچھ پسند ناپسند بھی گوش گزار کیجیے
..... پسندیدہ موسم، رنگ، ذائقہ، خوشبو، لباس، تفریحی
مقام، رشتہ، کوئی یادگار جملہ، تلخ یا شیریں؟

صبیحہ شاہ۔۔۔۔۔ سردی اچھی لگتی ہے، سردیوں
میں لمبی واک کرنا مکررات کو..... پسند ہے۔ میٹھا بہت
کھاتی ہوں، رنگوں میں پسند بدلتی رہتی ہے۔ آج کل
گرے اور یلو اچھے لگ رہے ہیں، ہر وہ جگہ جہاں خشکی
ہو، سبزہ اور پھول ہوں، پسند ہے۔ لوگوں کی کہی باتوں
کے حوالے سے..... یہ کہوں گی کہ اب لوگوں کی تلخ و
ترش، شیریں یا خوشامدی باتوں اور جملوں کا نوٹس اور اثر
ارادی طور پر کم، کم لینے لگی ہوں..... (اچھا کرتی ہیں) یہ
ایک بہت بڑی حقیقت ہے کہ جب ہمیں زندگی گزارنے
کا، زندگی کو سمجھنے کا ہنر آنے لگتا ہے اس وقت پتا چلتا ہے
کہ لو بھی..... اب تو زندگی کی شام ہونے والی ہے،
سورج غروب ہونے والا ہے، جن چیزوں، جن باتوں کو
میں اب ٹالریٹ (برداشت) کر لیتی ہوں اگر چند برس
پہلے یہ کرنے کا ہنر آجاتا تو شاید تصویر زیادہ حسین ہوتی
لیکن..... وقت رہتا ہے، آخری سانس تک..... بالکل
ایسے ہی..... آج آپ کے فورم میں بیٹھ کر ایک ایسی بات
کی صفائی دینا چاہوں گی جس کی صفائی کی ذمہ داری
میری ہے ہی نہیں..... لیکن ضرورت بہر حال ہے۔
تفصیلات تو خیر کیا تاؤں بس میرے حوالے سے کسی نے
کوئی بات شاید میرے کسی ”خیر خواہ“ نے ایسی مشہور کی کہ
مجھے سن کر انتہائی افسوس ہوا جبکہ اس قصے سے میرا دور،
دور تک کوئی واسطہ نہیں تھا۔ نزہت آپ نے زندگی کے
تجربوں کے حوالوں سے کوئی تلخ و شیریں بات پوچھی تو
میں کچھ ہمت کر کے بس اتنا ہی لکھ بانی تاکہ میں اپنی
صفائی دے سکوں اگرچہ بات پرانی ہو چکی ہے مگر خیر.....
اور میرے لیے اپنا وقار، اپنی عزت، اپنی جان سے زیادہ
اہم ہے۔ معاف کرنا نزہت..... بات ذرا سنجیدہ سمجھ
ہو گئی ہے لیکن تم نے ہی حوصلہ دلایا ہے اپنی بات، کہانیاں
کہنے کا جس کے لیے میں واقعی تمہاری دل سے مشکور
ہوں۔ (ارے صبیحہ دنیا کا کام تو کچھ نہ کچھ کہنا ہی ہوتا

کر لو گی؟ (اب یقین تو کرنا ہی پڑے گا) مہمان نواز کس
حد تک ہوں، یہ پتا کرنے کے لیے غریب خانے پر
تشریف لا کر دیکھو۔ (جی ضرور)
پاکیزہ۔۔۔۔۔ کس قسم کے لوگوں میں جلد گھل
جاتی ہیں؟

صبیحہ شاہ۔۔۔۔۔ سادہ مزاج، بے ریا لوگ شاید
سب کو ہی پسند ہوں گے، مجھے بھی ہیں، ایسے ہی لوگوں
سے جلد گھل جاتی ہوں۔
پاکیزہ۔۔۔۔۔ کسی اجنبی سے گفتگو میں پہل کس
انداز سے کرتی ہیں؟

صبیحہ شاہ۔۔۔۔۔ یہ میری کمزوری ہے، خامی ہے،
برائی ہے کہ میں اجنبیوں سے بہت جلد نہیں گھل سکتی۔
پاکیزہ۔۔۔۔۔ کیسے انسانی رویے ناقابل برداشت
ہو جاتے ہیں؟

صبیحہ شاہ۔۔۔۔۔ میں مغرور، خود پسند، شنی خورے
اور کریدنے والے لوگوں کے ساتھ ایزی نہیں رہتی.....
بدتمیزی، بدتمیزی اور ایسے ہی لطیفہ گو میں بالکل برداشت
نہیں کر سکتی، میں کھانے پکانے کی ترکیبیں ڈکس
کرنے میں کبھی انٹرسٹ نہیں رہی تو اب کیا ہوں گی، (لو)
بھی اب پتا چلا کہ ایک آدھ ہی دوست کیوں ہے آپ
کی، اب آپ کے مطلوبہ خواص کی حامل شخصیت کہاں
سے ملے ڈیرا خیر؟ گھر کو سجانا کر رکھنا پسند ہے مگر اتنا
کہ گھر، گھر ہی رہے، شور و م یا شوکیس نہ بن جائے۔
(اے تو انٹیرنر ڈیکوریرز کا پھر کیا بنے گا)

پاکیزہ۔۔۔۔۔ آپ کی اپنی تین خوبیاں اور تین
خامیاں تھیں؟

صبیحہ شاہ۔۔۔۔۔ خامیاں تو بہت سی ہیں؟ سب
سے بڑی خامی یہ ہے کہ

زمانہ سازیوں سے میں ہمیشہ دور رہتا ہوں
مجھے ہر شخص کے دل میں اتر جانا نہیں آتا
اور..... لیکن بھی..... تمہیں کیوں بتاؤں؟ اور
خوبیاں دوسروں کو پتا ہوں گی..... (ہمیں بھی ایک آدھ تو
معلوم ہی ہے ہا ہا ہا)

ہاں اللہ سب کو نیک ہدایت دے آمین)

پاکیزہ اپنے چھوٹوں کو اکثر کیا دعا دیتی ہیں؟

صبیحہ شاہ اپنے چھوٹوں کو میں ایمان و علم میں، زندگی و صحت میں، خوشحالی، نیک بختی میں فراوانی و کسادگی کی دعا دیتی ہوں۔

پاکیزہ پاکیزہ قارئین کے لیے کوئی خوب صورت، قابل غور باتیں؟

صبیحہ شاہ ارے بھئی، ہم کیا اور ہماری نصیحتیں کیا..... ہم خود عقل میں کل ہو جائیں تو نصیحت کرتے بھی اچھے لگیں۔ (پھر بھی آپ کی باتوں سے بچوں کو کافی آگاہی ملے گی)

پاکیزہ ہاں ہماری یک رائےز کے لیے بھی کوئی کام کی باتیں کوئی کامیابی کے گرتا میں؟

صبیحہ شاہ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ لوگوں کے اپنے عمل، اپنے خیالات ان کے خیال میں اتنے درست ہوتے ہیں کہ وہ تصحیح کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے جبکہ..... بہتری کی گنجائش تو ہمیشہ رہتی ہے ناں..... بس یہ سوچ لیں..... جب تک ہم اپنی غلطیاں، کمزوریاں، ریالائز (یعنی خود احتسابی) نہیں کریں گے ہم بہتری کی جانب نہیں جاسکیں گے۔ (جی بالکل اپنی غلطیوں سے آگاہی ہی خود احتسابی کے عمل کی طرف مثبت قدم ہے)

پاکیزہ ماہنامہ پاکیزہ کے لیے آپ کی رائے..... کوئی تجویز، خواہش؟

صبیحہ شاہ جن سے ایک تعلق خاطر ہو، ان کی ترقی، ان سے متعلق اچھی باتیں اچھی لگتی ہیں..... پاکیزہ، ظاہر ہے پاکیزہ ہے۔ ایک خواہش میری صرف پاکیزہ کے لیے ہی نہیں ہے بلکہ تمام بچوں کے لیے ہے کہ بچوں کو خوابوں کی جنت میں نہم ہونے دیں، سرورق پر ہر مرتبہ دہن، پھولوں و زیوروں اور اعلیٰ کپڑوں میں لدی لپٹی عورتیں نہ سجایا کریں، شوبز کے لیے شخص صفات زندگی کو زندگی کرنی لڑکیوں اور عورتوں کے لیے مخصوص کریں..... اپنے ارد گرد

نظر ڈالیں بے شمار ایسے کردار ملیں گے جن سے متعارف کرانا، ایک مثبت عمل ہوگا، ایک اداکارہ کب اٹھتی ہے، کب سوتی ہے۔ اسے غصہ کس بات پر آتا ہے، کھانا وہ میز کرسی پر کھاتی ہے، بیڈ پر؟ اس کے بجائے اگر لڑکیوں کو یہ بتایا جائے کہ زندگی بڑی مشکل ہے، مگر اس مشکل کو کچھ عورتیں، کچھ لڑکیاں آسان کیسے بناتی ہیں..... تو میرا خیال ہے زیادہ بہتر ہوگا۔ (جی درست کہا شعبہ کوئی بھی ہو محنت و لگن تو مانگتا ہی ہے)

پاکیزہ اچھا آپ اپنی نئی کہانی سے کب ماہنامہ پاکیزہ کے صفحات کو رونق بخش رہی ہیں؟

صبیحہ شاہ بہت جلد انشاء اللہ! بہت شکریہ صبحہ شاہ کہ آپ ہماری بزم میں پورے خلوص اور خیر سگالی جذبے کے ساتھ تشریف لائیں۔

☆☆☆

جی تو پیارے اور باذوق قارئین! صبحہ شاہ کی حقیقت سے بُر باتیں..... کچھ سچ کچھ شہریں اور کچھ نصیحت آموز آپ کو بھی یقیناً بھائی ہوں گی کیونکہ ہم تو بہت محظوظ ہوئے۔ یہاں ایک سے بڑھ کر ایک لکھاری سے گفتگو کرنا ان کے خیالات سے آگاہ ہونا اور آپ جیسے خوش ذوق قارئین کے ذہنوں میں ابھرتے سوالوں کو مطمئن کرنا ہی ہمارا مقصد ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں آپ سب کے بھرپور تعاون کا شکریہ! تبصرے کا انتظار رہے گا۔

اگلے ماہ پھر حاضر ہوں گے تب تک کے لیے اس دعا کے ساتھ اجازت کہ خود بھی خوش رہیں اور اطراف کے لوگوں کو بھی خوش رکھیں۔ یہاں تک کہ اپنی موجودگی سے اللہ تعالیٰ کی دیگر مخلوق کا بھی حق ادا کریں وہ چاہے جاندار ہو یا بے جان..... اللہ ہم سب کا حامی و مددگار ہو.....!

جنوں کے راستے یوں تو ٹھن سے لگتے ہیں مگر یہ راستے منزل تلک نکلتے ہیں زمانہ ہر قدم پہ راہ روکنے والا عزائم پختہ ہوں جن کے وہ کب بھٹکتے ہیں

☆☆☆

شوہر اور سسرال والوں کو کیسے اپنا بنایا جاسکتا ہے؟

شائستہ زریں

تحت پاکیزہ کے ”لہن نمبر“ کے لیے ایک خصوصی سروے رپورٹ کا اہتمام کیا ہے جس میں چند خواتین سے معلوم کیا کہ ”شوہر اور سسرال والوں کو کیسے اپنایا جاسکتا ہے؟“ اور التزام یہ رکھا ہے کہ اس سروے میں دوسلوں کی خواتین یعنی ماں اور بیٹی دونوں کے تاثرات الی کے ذاتی تجربے کی روشنی میں معلوم کیے ہیں۔

شاہینہ یاور

ماں (گھریلو خاتون)

پیار، محبت، عقیدت، ایثار اور قربانی ہی سے اپنایا جاسکتا ہے۔ شادی کے بعد پہلے سب کو سمجھنا پڑتا ہے اور پھر نئے ماحول کے مطابق خود کو ڈھالنا پڑتا ہے۔ خاص طور پر شادی کے پہلے سال اپنی ذات کی نفی کر کے خود کو مکمل طور پر سسرال والوں کے لیے وقف کر دیں تو خود بخود ایک دوسرے کے لیے دل میں جگہ بن جاتی ہے۔ اور لڑکی اس ماحول کا حصہ بن جاتی ہے۔ شوہر کی مرضی اور خواہش کے مطابق رہیں۔ شوہر جب دن بھر کا تھکا ہارا شام کو گھر آئے تو اپنی دن بھر کی تھکاوٹ کو بھلا کر خود بھی صاف ستھری رہیں اور بچوں کو بھی صاف ستھرا رکھیں۔ خوشگوار موڈ میں خوش دلی سے شوہر کا استقبال کریں۔ میں نے ہمیشہ ایسا ہی کیا۔ میرا یہ طرز عمل ان کے لیے باعث راحت بنا۔ میکے والوں کا کردار بھی بہت اہم ہوتا ہے کہ بیٹی کو رخصت کرنے کے بعد اس کے معاملات میں بے جا مداخلت نہ کریں۔ میرے والدین کا انتقال ہو گیا تھا میں تانا کے ہاں پروان چڑھی میری پرورش خالادوں نے کی۔ میری شادی ہوئی اس وقت میری عمر ۱۹ سال تھی۔ میکا راولپنڈی اور سسرال کراچی میں تھی۔ میکے مختلف ماحول میں بیاہ کر آئی تھی۔ میکے میں سسرال سے زیادہ

راشد الخیری“ اپنے ناول ”صبح زندگی“ میں ناول کے مرکزی کردار ”نسیم“ کی رخصتی کے باب میں رقمطراز ہیں.....

”میں تم کو ایک زبردست امتحان میں بھیجتی ہوں اور ایک اجنبی شخص کے ہاتھ میں تمہارا ہاتھ اس امید پر دیتی ہوں کہ تم اپنی خدمت گزاری اور سلیقہ شعاری سے اس کو رضامند رکھو گی، یہ وہ شخص ہے جس کے اوپر تمہاری زندگی کا دار و مدار ہے اور جس کے ساتھ عمر بسر کرنی ہے۔ تم اور وہ دونوں مل کر دنیا میں ایک آدمی سمجھے جاؤ گے کہنے کو دو مکمل اصل میں ایک۔ ہر رنج میں دونوں شریک اور ہر خوشی میں دونوں ساتھی۔ نسیم بیگم میں کہتی ہوں کہ ساس کی اطاعت میں غفلت نہ کی تو سسرال میں بیٹھی حکومت کرو گی۔ ہاں چند نامرادیوں کو ایسی بھی ملیں گی جو ادھر کی ادھر باتیں لگا کر اور بات کا پتھر بنا کر دلوں میں فساد ڈلوانے کی کوشش کریں گی ان سے البتہ ہوشیار رہنا، یاد رکھنا کہ ساس کی رضامندی سسرال کی پہلی منزل ہے یہ ہم جیت لی تو نندوں کا سر کر لینا بڑی بات نہیں، نئے دلوں میں گھر کرنا آسان نہ ہو مگر مشکل بھی نہیں، اطاعت کے میٹھے پھل اور خدمت کے شیریں ثمر تمہارے سامنے موجود ہیں۔“

وقت رخصت نسیم کی پھوپھی اور منہ بولی ماں نے جو نصیحتیں اسے کی تھیں گئے وقتوں میں ان ہی کا رواج تھا لیکن آج بھی بیاہ کر جانے والی بیشر لڑکیاں ”ہیمن“ کے اس قول کی تائید کرتی نظر آتی ہیں کہ ”عورت کی تمام زندگی ایثار، ہمدردی، محبت اور خدمت کی مکمل تاریخ ہے۔“ کیا یہ تاریخ رقم کرنے والی خواتین ہی شوہر اور سسرال والوں کے دل میں گھر کرتی ہیں یا انہیں اپنانے کی اور بھی کوئی صورت ہو سکتی ہے؟ اس سوچ کے

زیادہ وقت نہیں لگا تو ان کی جانب سے مشکلات بھی پیش نہیں آئیں۔ جہاں تک سرال والوں کا تعلق ہے۔ سر نے مجھے بہت پیار دیا۔ میں ایک معلمہ اور ذاکرہ ہوں، اس لیے اپنی تمام مصروفیات کے ساتھ گھر اور بچوں کو توازن کے ساتھ لے کر چلنا مشکل تھا۔ کیونکہ ہم جہاں بھی ہوں سامنے والا ہم سے ہر چیز پر فیکٹ چاہتا ہے۔ اسکول میں ہیڈ کو۔۔۔ پرفیکٹ کام چاہیے۔ گھر میں گھر والے بھی کوئی کمی برداشت نہیں کر سکتے۔ ان سب کے بیچ مجھے بہت سے مسائل کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ شوہر اور بچوں کی ضرورتیں پوری کرنا، ساس سر کا کام وقت پر کرنا اور میں سمجھتی کہ سب بہت بہترین چل رہا ہے کیونکہ میں نے ہر چیز منبج کر لی ہے مگر یکا یک کچھ ایسے حالات ہو جاتے کہ میں خود کو صفر پر کھڑا پاتی اور محسوس یہ ہوتا کہ سب کو مطمئن کرنے کی جتنی بھی کوشش کی تھیں سب ناکارہ رہیں لیکن میں نے کبھی ہمت نہیں ہاری لیکن گزرتے وقت نے احساس دلایا کہ یہ تمام حالات میری زندگی کا حصہ رہیں گے۔ خلوص نیت سے کتنی ہی محنت کیوں نہ کر لوں اس مقام تک نہیں پہنچ سکتی جس کی اصل میں حقدار ہوں۔ لیکن یہ ضرور کہوں گی کہ ایک پرسکون زندگی گزارنے کے لیے صبر، برداشت اور سمجھوتے کو اپنے مزاج کا حصہ بنالیں تو کافی حد تک زندگی بہتر گزاری جاسکتی ہے۔ اللہ نیتوں کا پھل ضرور دیتا ہے۔ اگر شوہر ہم مزاج اور سمجھنے والا اور ساتھ دینے والا ہو تو کسی کے بھی نامناسب رویوں کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ اللہ کا بڑا کریم اور شکر ہے کہ میں اس معاملے میں بہت خوش قسمت ہوں اور یہ سوچ کر خوش اور مطمئن ہوں کہ

یہاں کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا
کہیں زمیں تو کہیں آسمان نہیں ملتا

سیما راشد

ماں (گفریلو خاتون)

نو بیٹا تبارک کے لیے سب سے بڑا اور مشکل مرحلہ شوہر اور سرال والوں کا دل جیتنا ہوتا ہے۔ بزرگوں کے بقول ”دل کا راستہ معدے سے ہو کر گزرتا ہے“، یعنی اچھے اچھے اور خوش ذائقہ کھانے کس کو پسند نہیں؟ جیسے ہی پہلا



آسائشیں تھیں لیکن میں نے کبھی سرال کی بات کیے میں جا کر نہیں بتائی۔ میے میں گیس کا چولہا تھا سرال میں منی کے تیل کے چولھے پر سالن پکائی۔ میری شادی کے دس سال بعد جب میری خالہ میرے گھر آئیں اور مجھے لکڑی پہرونی پکانے دیکھا تو دل تھام کر رہ گئیں کہ ”تم اس طرح رہتی ہو تم نے تو کبھی ہمیں بتایا ہی نہیں۔“ سرال میں سب سے چھوٹی بھینسی۔ میری بڑی جیٹھانی اور نندیں تو مجھے اپنی بیٹی کہتی تھیں۔ بڑی تند کہتی تھیں اللہ کرے میری ساری بہویں تمہاری جیسی آئیں۔ میں نے کبھی کسی کام کو بوجھ نہ سمجھا بل جل کر رہی۔ ہنسی خوشی نے ماحول کے مطابق خود کو ڈھالا اور بہت خوش دلی سے شوہر اور سرال والوں کا اپنا بنالیا۔

سیدہ ناز ظفر کاظمی

بیٹی (معلمہ، ذاکرہ)

محترمہ شاہینہ یاور کی اکلوتی صاحبزادی سیدہ ناز ظفر کاظمی کا تجربہ ان سے یکسر مختلف ہے شادی کے ابتدائی پانچ سال اپنی ذات کو پس پشت ڈال کر ان کے رنگ میں رنگنا پڑتا ہے۔ میں نے بھی یہی رویہ اختیار کیا۔ میری خوش بختی کہ شوہر ہم مزاج نکلے اس لیے ان کے مزاج کو سمجھنے میں

سرورے

اطوار، سلیقے اور ہنر سے محض شوہر ہی کو نہیں سسرال والوں کو بھی اپنا گرویدہ بنایا جاسکتا ہے۔ الحمد للہ میرے سسرال والے بہت اچھے ہیں جن میں گھلنا ملنا اپنے حسن اخلاق کی وجہ سے میرے لیے بہت آسان ہو گیا۔ کبھی کسی الجھن میں پڑنے کے بجائے سلجھے ہوئے دماغ سے اس مسئلے کا حل نکالا۔ میرے شوہر نے بھی میرا بھرپور ساتھ دیا اور میں نے بھی ہر جگہ ان کا مان رکھا۔ ٹیٹھی زبان تو بڑے سے بڑے بادشاہوں کو زیر کر دیتی ہے۔ اس نے مجھے بھی خوشیوں کا خزانہ عطا کیا۔

فریدہ خان

ماں (براڈکاسٹر، معلمہ)

میاں بیوی کے خوب صورت رشتے میں اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت بھی شامل کی ہے۔ پھر ان سے وابستہ دیگر تمام رشتوں کا نچوڑ بھی اسی ایک بندھن میں ہے۔ سو دونوں کو ہی ایک دوسرے کا احترام کرنا چاہیے۔ مرد کی ذات ذمے داری کے حوالے سے کئی خانوں میں بیٹھی ہوئی ہے ایسے میں بیوی کی کوشش ہونی چاہیے کہ مرد کی ذات کا کوئی خانہ اس کی وجہ سے اپ سیٹ نہ ہو۔ بیوی شوہر کو ذہنی و قلبی سہارا دے گی اور ہر طرح کا سکون پہنچائے گی تو وہ اس کا بن کر رہے گا۔ شوہر اور سسرال والوں کا دل جیتنا کوئی مشکل کام نہیں خلوص، نیت، محبت اور ذمے داری سے کام لے کر یہ آسانی دل میں جگہ بنائی جاسکتی ہے۔ لڑکی کو چاہیے کہ پہلے نئے گھر اور اس کے ماحول کو کلی سے سمجھے اگر کہیں الجھن ہے تو میکے والوں سے مشورہ لینے کے بجائے شوہر اور ساس سے بات کرے۔ سسرال کی ہر چھوٹی بڑی بات میکے نہ پہنچائیں۔ بیاہ کر جانے والی لڑکی کو نئے ماحول اور نئے گھر میں دل لگانے اور اس کا حصہ بننے میں کچھ وقت لگتا ہے۔ ایسے میں اگر میکے والے اسے مل جل کر رہنے اور اس ماحول کے مطابق خود کو ڈھالنے کی ترغیب دیں تو نہ اجنبیت باقی رہے گی اور نہ ہی کوئی الجھن۔ اس ضمن میں ماں اور ساس کو اپنا کردار نہایت سمجھداری اور بردباری سے ادا کرنا چاہیے۔ میں

نوالہ منہ میں گیا اور پسند آیا تعریفی الفاظ باہر آتے ہیں۔ الفاظ کے ساتھ، ساتھ دل میں قدر بھی پیدا ہوتی ہے اور یوں دل جیتے جاسکتے ہیں۔ بیاہ کر جانے والی لڑکی اگر ادب و آداب کو ملحوظ رکھے اور خوش ذاتیہ کھانے کھلائے تو کون اتنا کٹھور ہوگا جس کے دل میں وہ جگہ نہ بنا سکے۔ شوہر تو کیا پورا سسرال ہی اس کا گرویدہ ہو جائے گا میری شادی کو پانچ سال ہی ہوئے تھے کہ ایک صبح میرے شوہر کی نانی کا انتقال ہو گیا اور شام کو میری نند کی ساس کا۔ ایک دن میں دو درخیزہ گھروں کو دیکھنا۔ میں نند



کے گھر کھانا پکا کر لے کر گئی۔ اسٹھے اپنے لوگوں کا کھانا میں نے پہلی بار پکایا تھا ان سب کو سنبھالنا تسلی دینا، ساتھ ہی غمزدہ ماحول میں کھانے کی ترغیب دینا، سب کو کھانے کے لیے راضی کرنا بہت مشکل ہوتا ہے اور میں نے یہ تمام مراحل نہایت محبت، خلوص، ذمے داری اور خوش اسلوبی سے طے کیے تو میرے شوہر نے میرے اس اپنائیت بھرے رویے کو بہت سراہا ساس سسر نے بھی بہت تعریف کی اور دعائیں دیں۔

ثنا کامران

بیٹی (گھریلو خاتون)

ثنا کامران محترمہ سیمارشد کی صاحبزادی ہیں۔ ثنا کہتی ہیں کہ نئے گھر نئے ماحول میں جگہ بنانے کے لیے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ حسن اخلاق، سلجھے ہوئے

میرے سامنے تھی۔ انہوں نے میری ضروریات پوری کیں۔ تربیت کی، پیار سے پرورش کی مگر صاف بھی پوری نہیں کی۔ میں سمجھتی ہوں لڑکیوں میں ضد ہونی ہی نہیں چاہیے۔ امی کہتی تھیں عورت میں برداشت ہونی چاہیے ضد نہیں اور ساتھ ہی ایک مسلمان عورت کا کردار ہمیشہ ذہن میں رہنا چاہیے۔ اس سے زندگی ابھرتی نہیں آسان ہو جاتی ہے۔ میں نے ان باتوں پر عمل کر کے شوہر اور سرسرا والوں کو اپنا لیا۔

سیما عامر خان

ماں (ماہر حسن و صحت)

شوہر کی توجہ حاصل کرنے کے لیے بعض خواتین بیماری کا بہانہ بناتی ہیں، بعض شکایتی انداز اختیار کرتی ہیں۔ شوہر اس سے الجھتا ہے۔ اس کے برعکس جب تمہکا ہارا شوہر شام کو گھر میں داخل ہوتا ہے تو مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کریں۔ اس کی دن بھر کی مصروفیت پر ہلکے پھلکے انداز میں گفتگو کریں۔ اپنی کم سنائیں اس کی زیادہ سنیں۔ اگر اس کو کوئی مسئلہ ہے تو اسے حل کرنے کی کوشش کریں۔ جب وہ گھر میں اپنا ہمدرد پائے گا تو وہ بیوی کے ساتھ ہی وقت گزارنے کو ترجیح دے گا۔ اسے یہ اطمینان دلانے کی کوشش کریں کہ دن بھر آپ بہت خوش رہی ہیں۔ یہ اس کے لیے بھی باعث طمانیت ہوگا۔ شوہر پر فرمائشوں کا بوجھ کم سے کم ڈالیں۔ اگر شوہر کے وسائل دیکھتے ہوئے فرمائش کریں گی تو اس کے دل میں آپ کی محبت اور عزت بڑھے گی۔ سرسرا کے معاملات میں زبان کو قابو میں رکھتے ہوئے بغیر کسی ستائش اور صلے کی تمنا کے خدمت گزاری کا رویہ اختیار کریں اور اپنی خدمت کو بار بار نہ جتا لیں۔ جو جذبات اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے لیے ہیں وہی جذبات شوہر سے وابستہ ان رشتوں کے لیے رکھیں گی تو اپنائیت کا رشتہ خود بخود بن جاتا ہے۔ شوہر کے ساتھ بھی اور سرسرا والوں کے ساتھ بھی۔ میرا تجربہ تو یہی ہے۔



اپنے والدین کی اگلی بیٹی تھی۔ میرے والدین کی سخت اہمیت تھی کہ اپنے ساس سر کو ناراض نہ ہونے والی۔ یقین کیجیے میرے ماں باپ میرے لیے انجمنی بن گئے تھے اور ساس سر میرے ماں باپ بن گئے تھے۔ جب چار لوگوں میں ساس سر میرے ماں، باپ اور میری تعریف کرتے تو میں خوشی سے نہال ہو جاتی۔ آج وہ اس دنیا میں نہیں ہیں، میں خود بہو اور داماد امی ہوں مگر میری اطاعت، فرماں برداری اور خدمت کی مثال آج بھی دی جاتی ہے اور بالکل یہی کردار میری بیٹی کا اپنے سرسرا والوں کے ساتھ ہے۔

در اصل عورت ایک باوقار اور مکمل عورت اپنے انہی رویوں سے بنتی ہے۔

ماریہ ہارون

بیٹی (بینکر)

بیوی خواہ آج کے دور کی ہو یا دورِ گزشتہ کی اگر واقعی اپنی زندگی خوشگوار چاہتی ہے اور آخرت میں بھی سرخرو ہونا چاہتی ہے تو شوہر کی فرماں برداری کرے۔ اس کے اس عمل سے خوش ہو کر وہ بھی اس کا ہر طرح سے ساتھ دے گا مگر شرط خلوص نیت ہے۔ میری امی کی زندگی

ہو وصل کا زمانہ، محبت کا ہو فسانہ
غم ہجر ملے جس میں، نہ آئے کبھی وہ کل
میری زندگی ادھوری، تیرا ساتھ ہے ضروری
تیرا ساتھ جو مل جائے، تو ہو جائے یہ مکمل



شاعرہ سعدیہ ہما شیخ، سرگودھا



سیما سراج کراچی

زویا سلیم انصاری

بیٹی (گھریلو خاتون)

سیماء مرخان کی اکلوتی بیٹی زویا سلیم جو سند یافتہ
یونیشن بھی ہیں اب مکمل گھریلو خاتون کا روپ دھار چکی
ہیں زویا کا کہنا ہے۔

میں اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی اور ایک بھائی
چھوٹے سے گھرانے سے رخصت ہو کر ماشاء اللہ
... بڑے گھرانے میں گئی۔ جوائنٹ فیملی ہو تو شوہر یہ توقع
رکھتا ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ اس کے گھر والوں کو بھی
محبت اور عزت دی جائے۔ میں نے گھر میں امی کو دیکھا
تھا کہ وہ کس طرح پیپا اور دادا، دادی کا خیال رکھتی
ہیں۔ میری امی میرے لیے رول ماڈل ہیں سو میں نے
بھی امی کا طریقہ اختیار کیا۔ محبت، عزت، خلوص اور
اپنائیت سے نہ صرف شوہر بلکہ سب گھر والوں کو جواب
میرے بھی گھر والے ہیں اپنا لیا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ
کوشش ضرور کریں کہ ہر معاملے میں دل بڑا اور کھلا رکھیں
تیرا میرا نہ کریں، برداشت سے کام لیں زبان درازی
سے بچیں۔ طبیعت اور زبان کی مٹھاس سے ہر آسانی



شوہر اور سسرال والوں کا اپنایا جاسکتا ہے۔

عظمیٰ عامر

ماں (گھریلو خاتون)

شوہر اور سسرال والوں کو اپنانے کا واحد ذریعہ ”محبت“ ہے۔ شوہر کو اپنانے کے لیے سب سے زیادہ ضروری ہے کہ اس کے والدین کا بہت خیال رکھا جائے۔ ان کو بالکل اپنے والدین جیسی ہی عزت، توجہ اور محبت دی جائے۔ سسرال والوں کو اپنی ٹیلی کی طرح ہی سمجھیں گے تو نہ صرف خود ایڈجسٹ ہونے میں آسانی رہے گی بلکہ گھر کا ماحول بھی خوشگوار رہے گا۔ میں نے ایسا ہی کیا اور الحمد للہ شوہر ہی نہیں سب گھر والے میرے اپنے ہیں۔

سروی تشکیل فاروقی

بیٹی (گھریلو خاتون)

شوہر کو اپنانے کے لیے ان کی چھوٹی، چھوٹی چیزوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ اپنے سارے کام ان کی



پسند ناپسند کے حساب سے کریں، یہاں تک کہ اگر اپنی کوئی عادت بدلتی بھی پڑے تو وہ بدل لیں۔ یہ خوشگوار زندگی کی بنیاد ہے۔ شوہر کا دل جیتنے کا دوسرا طریقہ ان

کے گھر والوں کے ساتھ اچھا رویہ رکھنا ہے۔ آپس میں مل جل کر کام کریں۔ ایک دوسرے کا خیال رکھیں تو کبھی مشکل نہیں ہوگی۔

☆☆☆

قارئین کرام! دلن اپنے اخلاص و محبت اور دانشمندی سے شوہر کے دل میں گھر بنا لیتی ہے تو دراصل یہی اس کی کامیابی کی دلیل ہے۔ بلاشبہ زندگی جن سے وابستہ ہے اگر انہیں خود سے بڑھ کر چاہا جائے، عزت اور اہمیت دی جائے تو وہ خود بخود ہمارے بن جاتے ہیں شرط اخلاص نیت ہے اور جہاں نیت میں کھوٹ ہوتا ہے وہاں ظاہری طور پر بہت کچھ کرنے کے باوجود ہاتھ کچھ بھی نہیں آتا۔ سروے کی شرکاء نے ایک اہم پہلو کی نشاندہی بھی کی ہے اور وہ ہے شادی شدہ بیٹی کی زندگی میں میکے والوں کی بے جا مداخلت۔ بلاشبہ شادی شدہ بیٹیوں کے نجی معاملات میں میکے والوں کو بے جا دخل اندازی نہیں کرنا چاہیے کہ یہ وہ زہر ہے جس کا کوئی تریاق نہیں۔ بیٹی کی شادی کے بعد میکے سے اس کا رشتہ ختم ہوتا ہے اور نہ ہی ماں کی تربیت کا عمل رک جاتا ہے۔ میکے والوں کو چاہیے کہ وہ بیٹی کو سمجھائیں کہ پھر اپنی جگہ پر بھاری ہوتا ہے۔ بیٹی کو مشورے ضرور دیں لیکن ایسے مشورے جن پر عمل کر کے وہ خود کو مظلوم سمجھ کر نفسیاتی مسائل کا شکار نہ ہو بلکہ اس کا گھر حقیقی خوشیوں اور تعلق کی پائنداری کے ساتھ آباد رہے۔ اسی میں ماں کی جیت بھی ہے اور بیٹی کی خوشی بھی۔

سروے میں شریک ماں بیٹی کی آرا کی روشنی میں یہ امر باعث فخر ہے کہ مشرقی عورت خواہ کسی بھی عہد اور عمر کی ہو اپنے شوہر اور سسرال والوں کے دل میں گھر بنانے ہی کو اپنی اصل فتح سمجھتی ہے۔ دراصل ایسی خواتین دلوں پر ہی نہیں گھروں پہ بھی حکمرانی کرتی ہیں لیکن کیا ہی اچھا ہو کہ شوہر اور سسرال والے بھی انہیں اپنائیت کا بھر پور احساس دلائیں جو ان کی بن کر رہتا اور انہیں اپنانا چاہتی ہیں۔

☆☆☆

شادی امبارک

پاکیزہ بہنیں

میرا بھائی بنا دولہا

پاکیزہ رسالے میں اکثر دولہا، دلہن کی تصویریں دیکھتی ہوں جو مجھے بہت اچھی لگتی ہیں اور پھر شادی کے دلچسپ احوال پڑھ کر مزہ آتا ہے۔ آج میں بھی اپنے بھائی کی شادی کا احوال لے کر آئی ہوں۔ میرے سب سے بڑے بھائی ساجد عباس اور



سید ساجد عباس اپنی دلہن جویرہ کے ساتھ

جویرہ بھابی کی شادی اسی سال ماہ فروری میں ہوئی۔ بھائی تو سبھی کے اچھے ہوتے ہیں مگر میرے یہ بھائی بہت اچھے ہیں کہ جن سے سب پاکستانی بھی بہت پیار کرتے ہیں وہ اس لیے کہ

میرے بھائی نے ایک نئی چینل کے موسیقی کے مقابلے ایل جی بنائے ان میں نمایاں پوزیشن لی تھی اور پچھلے سال ہونے والے پاکستان آئیڈل کے پروگرام میں بھی نمایاں تھے۔ اس کے علاوہ پاکستان اور اس کے باہر بھی کئی موسیقی کے پروگراموں میں حصہ لے چکے ہیں..... اور میری بھابی دراصل ان کی آواز اور شخصیت سے بہت متاثر ہوئیں، خیر میں شادی کا احوال بتا رہی تھی جو یہ بھابی کا میکا راول پنڈی میں ہے اس لیے نہیں کراچی سے راول پنڈی بارات لے کر جانا تھا۔ ہماری فیملی بھی ماشاء اللہ... کافی بڑی ہے۔ سب ہی لوگ بارات میں جانے کو تیار تھے کہ سفر میں خوب مزہ آئے گا..... ماہ فروری میں شادی بھی موسم بھی بہت سہانا تھا۔ ہم نے کراچی کے رشتے داروں کے لیے مایوں سبیں رکھا تھا۔ پھر دو دن بعد بارات کی روانگی ہوئی اور پنڈی میں مہندی اور بارات کے فنکشن ہوئے جس میں بہت ہی مزہ آیا۔ ہمیں ایک بہت بڑا گھر دے دیا گیا تھا۔ دن بھر ہم لوگ خوب پنڈی، اسلام آباد دھوئے اور شام میں آکر فنکشن کی تیاری..... ایک ہفتہ ہم لوگ رکے رہے تھے تاہم کبھی نہیں چلا۔ رات دیر تک خوب ہلاکھا رہتا..... میرے دونوں بھائیوں کی ہی آوازیں ماشاء اللہ



بہت اچھی ہیں رات گئے تک خوب محفل جمی رہتی اور کافی، چائے، ڈرائی فروٹس، مٹھائی کے دور چلتے رہتے۔ بزرگ لوگ تو جلدی سو جاتے تھے۔ ہم بچے خوب ابجوائے کرتے۔ بھائی نے بارات میں سرخ رنگ کا کولڈن کا مدار خوب صورت شرارہ پہنا تھا ہم سب لڑکیوں اور عورتوں نے غراے، شرارے پہنے تھے۔ ولیمہ کراچی میں ہونا تھا جس میں بڑوں نے ساریاں اور بیگ لڑکیوں نے لائک ڈریسر پہنے تھے۔ بھائی چونکہ خود گلوکار ہیں اس لیے مایوں اور مہندی پر انہوں نے بھی خود گانے گائے۔ غرضیکہ مجھے بہت مزہ آیا تھا اپنے بھائی کی شادی پر۔ میری بڑی بہن میڈیکل کالج میں پڑھتی ہیں ان دنوں انہوں نے خاص طور پر چھٹیاں لیس آخر کو بڑے بھائی کی شادی بھی کوئی مذاق نہیں تھا۔ ہماری تخیال دوھیال میں یہ پہلی شادی تھی اس لیے سب نے ہی بھرپور حصہ لیا اور خوب انجوائے کیا۔ اللہ میرے بھائی، بھائی کو ہمیشہ شاد و آباور رکھے، آمین۔

تحریر: انمول عباس، کراچی

شادی میرے لاڈلے بھیا کی

بھائیوں کی شادی کا تو سب کو ہی ارمان ہوتا ہے مجھے بھی تھا ابھی بھائی جا ب پہ لگے ہی تھے کہ میں نے اور امی نے لڑکی کی تلاش شروع کر دی۔ میرے والد صاحب کو نہ جانے کیا جلدی تھی کہ وہ بھائی کے سر پر جلد سے جلد سہرا دیکھنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے



سید و جاہت علی اپنی شریک زندگی شایان علی کے ہمراہ

انہوں نے انتظامات بھی کر لیے تھے۔ پھر دو سال پہلے عید کی چھٹیوں کے بعد میرے والد کا اچانک انتقال ہو گیا جو ہم سب کے لیے یقیناً ایک گہرا شاک تھا، اتنا بڑا سناخرا اللہ کی مدد سے ہی ہم نے برداشت کیا۔ ابو بھائی کی جلدی شادی کیوں کرنا چاہتے تھے۔ یہ اب پتا چلتا تھا بہر حال دنیا اسی کا نام ہے انہی غموں کے ساتھ خوشیاں بھی آتی ہیں۔ والد صاحب کی پہلی برسی کے بعد میرے بھائی کی باقاعدہ منگنی ہوئی۔ لڑکی تو والد صاحب پسند کر ہی گئے تھے پھر چند ماہ بعد شادی ہونا قرار پائی۔ میری امی، خالائیں، پھوپھو، ممانی، چچیاں سب مل کر تیاری کرتی رہے تھے مگر بہت اداس بھی



تھے۔ الحمد للہ میری بھائی شایان فاطمہ اور ان کے گھر والے بہت ہی اچھے اور سلجھے ہوئے لوگ ہیں۔ ان لوگوں نے بھی ہمارا غم بانٹنے میں ہمارا مکمل ساتھ دیا۔ 13 جولائی 2017ء کو شادی ہوئی۔ اگرچہ گری تھی لیکن کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ ہفتہ دن مہمان داری چلی۔ ہم سب لوگ مل کر کام کر رہے تھے۔ میں اپنے دو بھائیوں کی اکلونی بہن ہوں اس لیے سب ہی میرا بہت خیال رکھ رہے تھے۔ ابو کی کمی ہر، ہر موقع پر محسوس ہوئی۔ میری امی نے شایان بھائی کی پسند سے ہی تمام جوڑے بنائے تھے۔ مایوں، مہندی اور نکاح ایک ہی دن اور کسانٹھ تھا۔ بہت خوب صورت ٹیکوٹ ہال میں مہندی ہوئی جو نہایت دیدہ زیب تھا۔ بارات میں لڑکی والوں کی طرف سے کھانے کا انتظام بھی بہت عمدہ تھا۔ مزے کی بات کہ بھائی کے ہر فنکشن میں بارش ضرور ہوتی اس لیے کہ وہ دہلی ہی میں زیادہ تر کھاتے ہیں۔ کراچی میں عام طور پر اگست میں

بہایا..... شاید شدت غم سے آنسو ہی سوکھ گئے تھے۔ وہاں سسرال میں تو جیسے صدف مٹم بھئی ہوئی تھی۔ سنا تھا کہ شوہر صاحب کا میری آنٹی سے رشتہ طے ہونے سے پہلے اپنی چچا زاد سے طے تھا جس کو انہوں نے ٹھکرایا تو اللہ نے انہیں ٹھکرا دیا..... میرے شوہر کا تو یہ کہنا ہے کہ میری کوئی سہیلی ہی اللہ کو پسند آگئی جو تم جیسی سونی ملوک اور کم عمر مجھے مل گئی جبکہ اس کے برعکس میں سوچتی نہ جانے کون سے گناہوں کی سزا کی صورت یہ شخص ملا..... رخصتی کے بعد سسرال جاتے ہی سسرال والوں کے رویتے سے مجھے ہچا چل گیا کہ میں ان چاہی بہو ہوں میری بلا سے ادھر کے پروا تھی، ہم تو خود رسیاں تڑوانے کے چکر میں تھے۔ سسرال میں صرف ساس اور نند نے منہ دکھائی دی اور ایک جیٹھانی، بڑی دہلی سے ناراض اور بڑی والی مجھے بٹھا کر یوں بھول گئیں جیسے میرا وجود ہی نہیں..... شادی کے احتجاج میں سیکے میں کھانا سب کے کھینچ پر نہیں کھایا تھا تو اب آنتیں چاروں قل کا ور کر رہی تھیں۔ رات کھانے میں بکے کا گوشت تھا جس سے مجھے الرجی تھی۔ میں نے کھانا کھایا نہیں تو کسی نے پوچھا ہی نہیں..... صبح ناشتے میں ایک پلیٹ بسکٹ مع ایک کپ چائے کا مجھے دو عورتوں کے ساتھ ملا ابھی ایک بسکٹ کھا کر دوسرے کی طرف ہاتھ بڑھا دیا ہی تھا کہ خالی پلیٹ میرا منہ چڑا رہی تھی۔ دوپہر ایک بجے ویسے کا کھانا ملا جسے دیکھتے ہی میری ہموک ختم ہوگئی۔ پھر بکے کا گوشت ساتھ بیٹھے میں حلوہ بھر حال کھانا تو تھا ہی، دو والے توڑ کر حلوے کے ساتھ کھانے چاہے بہ مشکل دو تین نوالے لے سکی اور پھر اٹھ کر خود ہی بے شرموں کی طرح آکر ہار بیٹھ گئی اور منہ سجا کر بیٹھ گئی..... بھون نہ ہاں..... سب مہمانوں کے چلے جانے کے بعد آرام سے اٹھی مکن میں جا کر دیکھا تو ب میں حلوہ پڑا تھا حلوہ دیکھتے ہی ایکا نیاں آنے لگیں مگر پیٹ تو بھرتا ہی تھا سو ایک خالی پلیٹ لی، اور پیڑھی مٹھج کر ب کے پاس بیٹھ گئی اور جن، جن کر ڈرائی فروٹ، کھویا، میوا پلیٹ بھر کے نکالے باہر آکر برآمدے میں بیٹھ کر کھانے لگی۔ سب مذاق اڑانے لگے مگر میں نے پروا نہیں کی اور جب شوہر مجھے دیکھ کر ہنسنے لگے تو میں نے ان کو ایک ساڑھ برلے جا کر کہہ دیا کہ مجھے ابھی اور اسی وقت اپنے گھر لے جائیں نہیں تو کسی ہوں میں تو ان کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا بہر حال رات کو ہم اپنے گھر آ گئے۔ کھانا بھی مل گیا آلیٹ روٹی جو کہ اس وقت مجھے من و سلو ہی سے کم نہیں لگا۔ دوسرے دن شوہر نے اٹھتے ہی جانے کی فرمائش کی جب مکن میں گئی تو میری نفاست پسند طبیعت گر لانے لگی آف ہر برتن پر مٹی کی تھیں دھول جی، دراصل میری ساس بیاتھیں کوئی کام کرنے

برسات ہوتی ہے مگر اسی دفعہ جون کے آخر اور جولائی کے شروع سے ہی بارشیں شروع ہو گئیں۔ ویسے کے دن بھی بارش ہونے کی وجہ سے زیادہ پریشانی تو نہیں ہوئی مگر آنے والوں کو سڑکوں پر پانی، کچھڑ کا سامنا ضرور کرنا پڑا۔ اس طرح یہ شادی یادگار بن گئی۔ ویسے کے دن کا کافی پک کر کا سوٹ تھا اور شادی کا سرخ رنگ کا شرارہ ہم سب کزنز نے ہر نقش کش کے الگ، الگ رنگوں کی عظیم اور اپنی پسند کے حساب سے اپنے، اپنے جوڑے بنائے تھے۔ غرضیکہ وجاہت بھائی کی شادی میں خوب مزہ آیا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ میرے بھائی، بھالی اور ہم سب ہمیشہ خوش و خرم رہیں۔ (الحی آمین)

خریر: ندیمہ رضوی، کراچی

انوکھی شادی

ہر سال جب کہن مہر کا شمارہ نکلتا میں سوچتی کہ اب کی بار میں بھی لازمی شرکت کروں گی مگر ہر بار رہ جاتی لیکن اس دفعہ کا غافل مہنجال کر میں نے ماضی کی پگڈنڈیوں پر قدم دھر ہی دیے۔ آہ زہت کیا کچھ نہیں یاد دلایا۔

اپنی شادی کا آنکھوں دیکھا احوال اگر میں نے یہاں لکھ دیا ناں تو مجھے سو فیصد یقین ہے قارئین نے یہی مشورہ دینا ہے نرم صلابہ آپ اپنے شوہر کے ساتھ دوبارہ شادی کر کے اپنے رہ جانے والے ارمان پورے کر لیں۔ میرے شوہر جن کو میں شادی سے پہلے اپنے ہونے والے خالو اور اکل کہہ کر پکارتی تھی، آنتی کے انکار پر مجھے سولی پر چڑھا دیا گیا۔ وہ شخص جسے شادی سے پہلے اکل کہہ کر پکارتی تھی اس کا نام اسے ساتھ جڑتے دیکھنا اور اپنے آئیڈیل کے بالکل الٹ کہ مجھے فوجی اور کلین شیور مرد پسند تھے جبکہ ان کی یہ ٹی، لمبی زلنس اور سینے تک آتی داڑھی اور جب وہ اپنی سرمہ بھری آنکھوں سے مجھے دیکھتے تو میں بہ مشکل اپنی چیخ روکتی..... مہندی کی رات جب گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا میں بغیر کوئی رسم کروائے ہوئی۔ سب کے چگانے پر بھی میں نہیں اٹھی میرا اپنے آئیڈیل کے الٹ شخص سے شادی پر احتجاج تھا..... میں شاید پہلی کہن تھی جس نے مہندی نہیں لگوائی اور کورے ہاتھوں ہی رخصت ہوگئی۔ شادی پر اللہ جنت نصیب کرے میری جیٹھانی میک اپ کے نام پر تبت کریم، بے بی لوشن، ہاشمی سرمہ اور آئی شیڈولے آئی تھیں۔ ایک سرخی خوب خون، خون رنگ..... میرے ارمانوں کا خون نکالنے کے درپے لٹک رہی تھی..... میں جو پہلے ہی چڑی بیٹھی تھی اپنی بیوٹیشن پلس کزن سے کہہ دیا کہ اس کی بھی ضرورت نہیں مجھے ایسے ہی میج دو..... بہر حال رخصتی ہوئی ناراضی کے طور پر ایک بھی آنسو نہیں

میں بنی دلہن

شادی کے بارے میں ہمیشہ سے کہا جاتا ہے کہ یہ بورے
لہو میں جو کھائے وہ بھی پچھتائے اور جو نہ کھا۔ وہ بھی پچھتائے۔
سو ہم نے سوچا کہ جب پچھتا تا ہی ہے تو کیوں نہ کھا کہ پچھتا
جائے۔ سو ہم نے بھی شادی کے لیے ہاں کر دی۔ اور والدین نے
سوچا کہیں پھر نہ پھر جائے اس لیے ڈاکٹر کرن سے رشتہ طے کر دیا
کہ چلو علاج معاویہ تو مفت ہوگا۔ ہم آزاد کشمیر کے رہنے والے
ہیں۔ ہماری بڑی خوب صورت سی رئیس ہوتی ہیں۔ کیونکہ ہم لوگ
پنڈی رہتے تھے ڈیٹ فکس ہوتے ہی گاؤں روانہ ہو گئے۔ ہمارے
ہاں شادی پر نہ صرف لڑکے بلکہ لڑکی کی بھی کسی سے دوستی کی جاتی
ہے۔ اس کے لیے اپنے خاندان کے علاوہ دوسرے خاندانوں میں
دوستی کی جاتی ہے۔ اور تاحیات اس دوستی کو نبھایا جاتا ہے۔ اور کئی،
کئی دوستیاں کی جاتی ہیں۔ باقاعدہ مگر جا کے ریکوسٹ کی جاتی
ہے کہ ہم اپنے بیٹے یا بیٹی کی دوستی کے لیے آئے ہیں۔ دوستی
ہو جانے کے بعد یہ لوگ باقاعدہ دوست یعنی تحائف لے کر آتے
ہیں۔ اور شادی میں نفٹ بھی ٹھکرا دیے ہیں۔ اپنی حیثیت کے
مطابق۔ کہہ لوگ وجہ، بکرا، اور پیسے دیے ہیں۔ میری بھی دو
دوستیاں کی تھیں۔ جو میرے کپڑے، مہندی کی تمام چیزیں لے کر
آئیں۔ لڑکی کا چہرہ سچی سہلیاں بناتی جا میں کپڑے، جوتے،
چوڑیاں، مہندی تمام میک اپ کا سامان، انگٹھا، کلب، شیشہ تک
دو لکھ کے گھر سے آتا ہے۔ اور بارات میں وہی کپڑے پہنتی ہے جو
دوستی کے دیے جاتے ہیں۔

شادی سے چندہ دن پہلے مجھے ”خورگاہنا“ باندھا گیا۔ یہ کسی کو تھانے نہیں صرف گھر والوں کو پتا ہوتا ہے۔ یہ خوب صورت رنگین دھواکوں سے بنا ہوتا ہے۔ اس کے بخند کھانا پینا بھی خاص ہو جاتا ہے۔ ناشتے میں دیکھی گئی سے بنائی گئی ”مانی“ مکھن میں چوری بنا کے کھلائی جاتی ہے۔ گھر سے باہر لٹکا ہا بکسل بند لوگوں کے سامنے آ جانا کہ تا کر زیادہ دھوپ چڑھے۔ میرا بھی آ جانا بند۔ آزادی ختم کے چورگاہنا باندھ کر باہر لٹکائی تو کوئی جن نہ عاشق ہو جائے۔ اب کیا بتاتے کہ اتنا بڑا دل عاشق ہو گیا ہے تو پتھرے جن کی گنجائش کہاں نکلتی ہے۔

مہندی والے دن کیونکہ میری دو سہیلیاں جی تھیں اس لیے دونوں طرف سے خوب دھوم دھڑکے سے دھوئی آئی۔ مہندی اور خوب صورت ہاتھ کے بنے رنگ برنگے موتیوں اور دھاگوں سے بھلے ہوئے گانے (گینے) اپنی زبان میں مہندی کے گیت گاتی ہوئی خواتین رات کو کانی لیٹ نہیں۔ کیونکہ رات کو سب لوگ دہن کے گھر ہی رہتے ہیں۔ اس لیے آنے جانے کا مسئلہ نہیں ہوتا۔ رسم کے لیے خوب

والا نہیں تھا۔ شادی بڑے بھائی کے گھر ہوئی تھی۔ ان کو جانے بنا کر دی اور خود مجھ سو پرے صفائی میں لگ گئی۔ پورے گھر کی تفصیلی صفائی کر چکی ابھی صحن رہتا تھا کہ میری چھوٹی جیشانی گاڈوں کی دو عورتوں کے ہمراہ آگئی۔ وہ عورتیں دلہن دیکھنے اور مبارک باد دینے کے لیے آئی تھیں اور دلہن صاحبہ پرانا جوڑا پہنے سر پر دو پٹا باندھے دھول مٹی کا میک اپ کیے کھڑی حیرت سے انہیں اور وہ ہلکے ہلکے دلہن کا منہ دیکھنے لگیں بہر حال ان کو اندر جا کر بٹھایا۔ میری جیشانی سیانی بنے ہوئے۔ یہ کیا حال بنایا ہوا ہے۔“ میں تو اپنی نظر میں اس سے بھی زیادہ سیانی تھی ترنت ہوئی۔ ”مجھے سے گندگی میں نہیں رہا جاتا یہ تو آپ لوگوں کا فرض تھا کہ گھر کی صفائی رکھتے ناں اب گھر تو صاف کرنا ہی تھا۔“ میری بات پر اس بیچاری کا منہ دیکھنے کے لائق تھا۔ بہر حال گھر تو صاف ہو گیا تھا خود بھی نہانہی دھوئی اتنے میں چھوٹی جیشانی ناشتا لے آئی۔ ناشتا کر کے بڑی جیشانی کے کمر گئیں تو آگے سے ان کا منہ سوجا ہوا تھا مجھے تو کچھ نہیں کہا مگر میرے شوہر سے لڑنے لگیں کہ پیادہ کر ہم لائے اور جب ہم دوسرے بھائی سے ناراض ہیں تو تم لوگوں نے ان کا ناشتا کیوں کیا۔ مجھی ہمارے لیے تو دونوں برابر تھے گرماں کو کوئن بھجھا، دونوں ایسے تیز و تندرست مارے صدمہ کے بیمار پڑ گئی۔ خوف کے مارے دھڑکتے زدہ کہ سناتو تھا کہ سسرال والے بجبرے وجہ لڑتے ہیں مگر اتنی جلدی یہ نہیں سنا تھا..... شوشادی کے تیسرے دن بھائی ناراض ہو گئے ساتویں دن میکے گئی..... پہلی باقاعدہ ڈش چاول بنائے جو بہت پسند کیے گئے۔ باقی کوکنگ میں، میں اناڑی تھی۔ ساس اللہ کروٹ، کروٹ جنت نصیب کرے، اچھی تھیں بہت کم عرصہ میرے ساتھ رہیں مگر بیٹی سے بڑھ کر پیار دیا۔ ساری کوکنگ انہوں نے ہی سکھائی۔ شوہر کافی اچھے انسان ہیں۔ ہماری عمروں میں 24 سال کا فرق ہے تو مجھے بچوں اور پھولوں کی طرح رکھا..... شادی سے پہلے میں نے اپنے سر میں بھی میل نہیں لگایا کہ مجھے تیل سے نفرت تھی تو میرے شوہر اپنے ہاتھوں سے میرے سر پر تیل لگاتے میری دو جوئیاں گوشت تھیں..... تو قارئین میں جو اینڈیل نہ ملنے کی بنا پر شادی پر اداس تھی اب میں دعا کرتی ہوں کہ ہر کسی کو میرے جیسا شوہر ملے۔ انتہائی اچھے، میرا خیال رکھنے والے..... میری ہر بات ماننے والے تو اب یہ لمبی، لمبی زلفوں اور لمبی داڑھی والا..... یہی میرا اینڈیل ہے..... ہاں تو قارئین میں نے شادی پر کچھ تو رمبیں خود نہیں ہونے دیں اور کچھ سسرال والوں نے کی ہی نہیں تو میں ایسا ہی شادی کا احوال لکھ سکتی تھی۔

تحریر: نرگس نسیم، صابہ موہڑ، چچوال

سب نے خوب مذاق کیا۔ نکاح کے بعد دولہا کو اندر لایا گیا اور ایک گہری ڈش میں چوری ڈال کر اوپر سے خوب گھی لگا کر چھوٹی پلیٹ فکس کر دی گئی کہ دولہا پلیٹ اٹھا کر چوری کھائے۔ چکنی پلیٹ ہاتھ لگانے سے سلب ہو جائے، بار بار سب کا ہنس، ہنس کر برا حال تھا۔ میرے بڑے بہنوئی جو کہ دولہا کے دوست بھی تھے اور اس مرحلے سے پہلے گزر چکے تھے۔ وہ ایک بڑی پن اپنے ساتھ لائے ہوئے تھے۔ انہوں نے اس پن کی مدد سے پلیٹ کو اٹھا کر دور پھینک دیا۔ سب نے خوب شور مچایا کہ یہ بے ایمانی ہے مگر نہ جی کس نے ماننا تھا کہ یہ بے ایمانی ہے۔ پھر رخصتی کے وقت بھائی نے گود میں اٹھا کر ڈولی میں بٹھایا کہ یہ بھی رسم ہے کہ دلہن خود چل کر نہیں جاتی۔ میرے ہاتھ میں کچے چاول دیے کہ وہاں پلیٹ کر گھر کے اندر پھینک دو۔ ڈولی میں بٹھا کر اوپر سے لال رنگ کی چادر سے ڈھانپ دیا گیا۔ اور بھائی، ماسوں، بہنوئی اور چچانے ڈولی اٹھائی سرال پہنچی تو ڈز، ڈز ڈولی پر کچھ لگنا شروع ہو گیا۔ اور میں تو ڈر گئی کہ یہ پتھر اڑکیوں ہو رہا ہے۔ تو ہٹا چلا کہ شیشی چٹکیاں اور بتائے مارتے ہیں پھر دروازے پر ڈولی رکھ کر ڈیمانڈ کی جاتی ہے کہ دلہن کے نام کچھ کریں۔ کیونکہ سچی بڑی سچی اس لیے سب گھر میرے نام کیا گیا کہ سب کچھ اسی کا ہے۔ ہمارے ہاں پہلے دن دلہن کو سب کے ساتھ رہنا پڑتا ہے دوسرے دن دلہن اور دولہا کو آٹھ گھنٹے ساٹنے بٹھا کر کھانا کھلاتے ہیں۔ ایک بڑی ڈش میں دودھ اور پانی ڈال کر انگوٹھی ڈالتے ہیں۔ دونوں کو دھو کر نکالتی ہوتی ہے۔ اب دونوں ڈش میں ہاتھ مارتے ہیں کہ انگوٹھی مل جائے اب جیسے ہی ہاتھ ڈالا۔ ڈاکٹر صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اب مارے شرم کے کچھ بولا بھی نہیں جا رہا۔ سب کزنز نے شور ڈالی دیا۔ چیٹنگ، چیٹنگ پھر ایک دوسرے کا گھانا کھولتے ہیں۔ میری بھائی نے میرے گاہنے میں بہت گہرے لگا دیں کہ ہمارے ڈاکٹر صاحب کو کھولتے، کھولتے بھی ٹائم لگا۔ سب لڑکے دولہا کی طرف اور لڑکیاں دلہن کی طرف ہوتی ہیں۔ ایک ہنگامہ مچا ہوا تھا۔ سب انجوائے کر رہے تھے۔ پھر شام کو دلہن اپنے منیکے جاتی ہے اور دوسرے دن واپسی ہوتی ہے۔ ڈھیر سا سامان کے ساتھ یعنی جھیر کے علاوہ مکھاوے میں کھانے پینے کی چیزیں دی جاتی ہیں خاص کر ہاتھ سے بنے ہوئے گھر کے بیڑے۔ یہ ہمارے علاقے کی خاص چیز ہے۔ آٹا، سوڈا ڈال کر گوند سے ہیں اور پھر چھوٹے، چھوٹے بیڑے بنا کے فرائی کرتے وہ پھول کر گول گول کی طرح ہو جاتے ہیں۔ یہ پھر سب خاندان میں تقسیم کیے جاتے ہیں۔ لوجی اس طرح یہ کسمیری شادی اپنے اختتام کو پہنچی۔

تحریر: نگہانداز، اسلام آباد

صورت پتھر می یارنگین کرسی کا استعمال کیا جاتا ہے۔ دلہن دولہا کو اٹھا کر کرسی پر بٹھایا جاتا ہے۔ مجھے بھائی اٹھا کر لایا پھر ایک کینلی ہندی اور تیل لگا کر گھانا بنا دیتی ہے۔ پھر دوسری کینلی گانے (کہنے) پہلے



سہیلیاں پاندھتی ہیں پھر خاندان کی دوسری خواتین، تقریباً چھٹی خواتین آتی ہوتی ہیں سب گانا (کہنا) پاندھتی ہیں۔ میرے دونوں بازو کہیں تک خوب صورت گانوں سے سجے ہوئے تھے۔ باقی خواتین ہندی کے گیت گاتی ہیں جو کہ پیراڑی زبان میں ہوتے ہیں۔ کھانے کے بعد سب خواتین نے ہاتھوں میں ہندی لگائی۔ بڑے، بڑے قہاروں میں ہندی گھولی جاتی ہے۔ صبح سویرے سب اپنے، اپنے گھر کو چلی گئیں۔ بارات والے دن بھی دونوں سہیلیاں خوب ملے گلے کے ساتھ پہنچی۔ پہلے ایک کینلی آئی پھر سب ل کر دوسری کو لے گئیں۔ دونوں سہیلیاں خوب صورت نقش و نگار سے بنی مٹی کی گاگریں لے کر آئیں جس کے اندر نایاں اور بتائے تھے۔ خوب گیت گاتے ہوئے قہش کی طرف گئیں تاکہ اس گاگر میں پانی لے کر آئیں تو پھر مجھے اس پانی سے نہلیا گیا کہ یہ بھی رسم ہے کہ دلہن اسی پانی سے غسل کرتی ہے جو دوتی والی لے کر آتی ہیں۔ بتائے، نایاں سب لوگوں میں بانٹی جاتی ہیں۔ بارات بھی خوب دھوم دھام سے آئی کیونکہ ہم دونوں ایک ہی خاندان کے تھے اس لیے رشتے داروں کی دوڑ لگی ہوئی تھی، کبھی ایک طرف تو کبھی دوسری طرف۔

سفید شلوار قمیص اور کالی واسکت پہنے ڈاکٹر صاحب اور میرے بڑے بہنوئی جو کہ ڈاکٹر صاحب کے دوست بنے تھے۔ دونوں ایک ہی جیسے کپڑے پہن کر سفید برقع کھوڑوں پر آئے۔ نکاح کے ٹائم مارے گھبراہٹ کے ہر جگہ سائن مختلف کر دیے کہ



نور العین ساحرہ (یو ایس اے)



شیریں حیدر کی بیٹی مہرین اور داماد منصور بارات کے روز



مونارضوان بارات کے دن اپنے ہم سفر رضوان احمد کے ہمراہ



یعنی احمد اپنے شریک حیات محمد امین کے ہمراہ



دلہن عنبرین تبسم (کراچی)



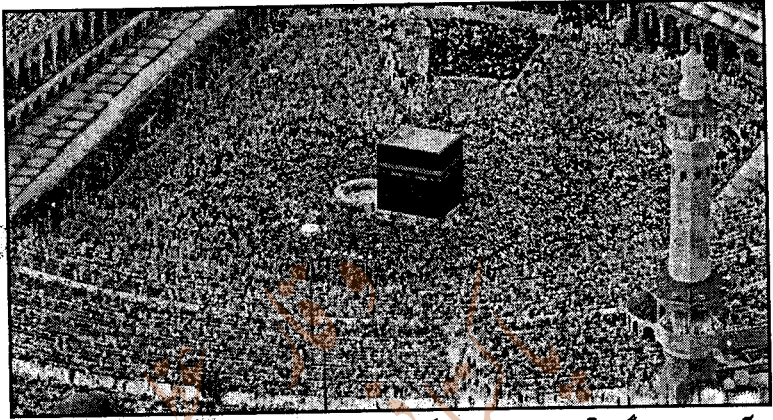
راجہ عمران چوہدری (رحیم یار خان)



فائزہ شہزاد (اسلام آباد)

آیا جے مکہ لاوا

انجمن مشیر



مقدور عروج پر تھا۔ اللہ کے گھر کے صحن میں قدم پڑتے ہی دل کو قرار آ گیا۔ طواف کعبہ شروع ہوا..... مقام ابراہیم، رکن یمانی، حطیم نظروں کے سامنے حجرا سود، اللہ اکبر کیا شان پروردگار ہے۔ طواف مکمل کر کے نوافل ادا کیے زم، زم کے ٹھنڈے پانی سے سیراب ہوئے پھر سعی کے لیے صفا و مروہ کی جانب بڑھے چکر مکمل ہوئے پھر آنکھوں کو سیراب کرتے رہے۔ دل تو یہی چاہتا تھا کہ پانچویں وقت کی نمازیں حرم شریف میں ہی ادا کریں..... دن بیچ کے دانوں کی طرح تیزی سے گرتے رہے اور ذوالحجہ کی پانچ سے آٹھ تاریخ آن پہنچی..... مناسک حج شروع ہوئے سات کی رات ہمیں بذریعہ بس منی پہنچایا گیا تھا۔ چاروں جانب خیموں سے آباد اس شہر میں عجیب سا ساں تھا۔ خیموں ہی میں پانچ وقت کی نمازیں ادا ہوئیں اور پھر عرفات کو رواگی ہو گئی۔ عرفات کا لائق و دق میدان خیموں سے بھر گیا تھا۔ عرفات کے میدان کو محشر کا میدان بھی کہتے ہیں وہاں سب سے نمبر بھی ہے جہاں ہمارے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آخری خطبہ حج دیا اور آپ نے تہی دھوپ میں آسمان کی طرف منہ کر کے دونوں ہاتھ

آج جب سب لوگ حج پر جا رہے تھے تو مجھے بھی اپنا حج کا سفر یاد آ گیا۔ 23 اگست 2016ء ہماری زندگی کا ناقابل فراموش دن تھا کہ جب اس دن ہم جدہ اور پھر مکہ مکرمہ میں شہر عزیزہ حج کی غرض سے اترے۔ جہاں ہماری گورنمنٹ کی حج اسکیم کے تحت آنے والوں کو ہوٹل میں ٹھہرانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ جو بہت اچھا تھا..... صاف ستھرے ہوٹل مستعد عملہ اور کھانے پینے کا مناسب انتظام، رات کچھ آرام کر کے اگلے دن حج ہم مسجد عائشہ احرام باندھنے اور عمرے کی نیت کرنے پہنچے اور وہاں سے لبیک اہم لبیک کہتے حرم کی جانب چلے۔ کیا لٹا رہا تھا، ہر طرف سری سر نظر آرہے تھے احرام میں لمبوس مرد حضرت اور عبا، حجاب اور چادر دن میں لپٹی لڑائیں..... کسی کو کسی جانب دیکھنے کی فرصت نہیں بس صبا کو ایک ہی دھن..... حاضر ہوں اللہ میں حاضر ہوں، پھر سو فرزند گان تو حید تلبیہ پڑھتے قدم بقدم بڑھ رہے تھے۔ دلوں میں ایمان کی روشنی لیے جیسے ہی خانہ کعبہ پر نظر پڑی لگا دل کی دھڑکن رک گئی۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی لگ گئی۔ کہاں میں کہاں یہ مقام اللہ..... آج ہمارا

بلند کر کے ظہر اور عصر کے درمیان اپنی امت کی بخشش کی دعائیں کیں..... اب ظہر کے وقت حج کا خطبہ اسی مسجد منورہ سے دیا جا رہا تھا اس کے بعد سب نے دو نفل پڑھے اور پھر خیموں سے باہر تیز دھوپ میں کھڑے ہو کر اللہ سے اپنی بخشش کی دعائیں، اہل و عیال اور دوست احباب، ملنے جلنے والوں کے لیے دعائیں، پورے عالم اسلام کے مسلمانوں کے لیے دعائیں کیں جو یقیناً میرے رب نے قبول کی ہوں گی پھر رات بھر عرقات میں قیام رہا اور عصر کی نماز پر ختم ہوا۔ اب پھر مزدلفہ کی جانب رخ تھا جہاں وقوف کرنا تھا کہ یہ پیارے نبی پاک کی سنت ہے۔

مزدلفہ کا وقوف نہایت ضروری ہے یہاں کچھ دیر ٹھہرنا، سونا ہوتا ہے اس جگہ چاہے عرفات سے کسی بھی وقت پہنچیں نماز مغرب اور عشاء ملا کر پڑھی جاتی ہے۔ مزدلفہ کا نئی وقوف میدان انسانوں سے اس طرح بھر گیا کہ تل دھرنے کی جگہ نہ بچی مگر لوگ جوق در جوق اپنے ملک کے جھنڈوں کے ساتھ کتب نمبر کے حوالے سے چلے آ رہے تھے، نمازیں ادا کی جا رہی تھیں۔ نہ یہ خیال کہ کانٹے دار جھاڑیاں ہیں نہ مکہ کی ریشمی پتھریلی زمین ہے، ہر کوئی چادر بچھائے اور کوئی ویسے ہی بیٹھا ہے۔ لگتا تھا کہ زندہ انسانوں کا قبرستان ہے، ہنسی نہ مذاق نہ فضول گوئی بس ذکر اللہ ہے۔ ایک خاص بات کہ حج پر یزیدوں اور معذوروں کے علاوہ کمسن بچوں کی بھی ایک بڑی تعداد آئی ہوئی تھی اور بڑے ذوق شوق سے اپنے بڑوں کو دیکھ کر ارکان ادا کرنے میں مگن تھے..... اللہ ان کے جذبوں کو قائم و دائم رکھے آمین۔

رات بھر کے قیام اور فجر کی نماز کی ادائیگی کے بعد اب ہم دوبارہ منی کی طرف روانہ ہوئے۔ حاجی صاحبان کو ابھی غسل کی اجازت نہیں تھی کہ ابھی جرات کی طرف روانہ ہوتے کہ شیطان کو کنکریاں مارنی تھیں۔ بارہ ذی الحج کو حج کے تمام ارکان مکمل ہونے پر اللہ کا شکر ادا کیا، نفل پڑھے اور اب عزیز یہ واپسی کا سفر تھا۔ منی سے مغرب سے پہلے پہلے نکل جانا ہوتا ہے ورنہ پھر اگلے روز.....

اللہ کا لاکھ، لاکھ شکر ادا کیا کہ اس مہربان رب نے

تمام ارکان بخیر و خوبی کروائے آج میرا دل مسرت کے احساسات سے سنبھل نہیں پارہا تھا کہ سنت ابراہیمی کی یاد، اللہ کے گھر کا دیدار..... یہ میرا نصیب مجھے کہاں لے آیا۔ آج خوشی سختوں میں شمار ہو گیا تھا کیسے ایک ماہ گزر رہا تھی نہیں چلا ۱۳ تاریخ کو نبی پاک کے رونے کی زیارت کو مدینہ شریف روانہ ہو گئی تھی۔ ہوٹل اشرفیہ مسجد نبوی سے بہ مشکل پانچ منٹ کی دوری پر ہے وہیں قیام تھا۔ رات میں وہاں پہنچ گئے اور تہجد کے وقت مسجد میں حاضری دینی تھی۔ پہلے جا کر نماز تہجد ادا کی پھر صبح درود پاک و تلاوت کلام پاک میں مشغول ہو گئے پھر اذان فجر کی پرشکوہ صدا گونجی۔ فجر کی نماز ادا کی اور روضہ رسول کا اچھی طرح دیدار کیا۔ کچھ دیر کھڑے رہنے کے بعد بہ مشکل تمام ریاض الجنت کے گرین کارپٹ پر درود رکعت نماز پڑھنے کی مہلت ملی ہزاروں کے مجمع میں جم کر بیٹھنا ویسے بھی مشکل تھا پھر دوسروں کی حق تلفی بھی ہوتی ہے۔ دو نفل پڑھ کر خوب دعائیں مانگیں تمام رشتے داروں، دوست احباب کا سلام عقیدت رسول پاک کے حضور پیش کیا دس دن مدینہ منورہ میں قیام کیا۔ کوشش کی کہ تمام نمازیں مسجد نبوی میں ہی ادا ہوں۔ خوب آب زم زم، پیالہ گنبد خضریٰ کا دیدار دل بھر کر کیا۔ اب آقا کے دربار سے رخصت ہونے کا وقت بھی آن پہنچا تھا۔ آمد جدہ انٹرپورٹ پر تھی اور روانگی مدینہ سے ہوئی چالیس دن کے اس مقدس سفر میں ساری زندگی کی حسرتیں جی بھر کر نکالیں۔ معلوم نہیں بعد میں آنا نصیب ہو نہ ہو..... آخر میں بطور خاص ایک عزیز کا ذکر کروں گی جو مدینے میں رہتے ہیں اور انہیں جب پتا چلا کہ ہم لوگ مدینے آئے ہیں تو روز اپنی گاڑی پر دونوں میاں بیوی آتے تھے اور ہم کو مدینہ منورہ کا پورا شہر، پارک، شاپنگ سینٹر سب دکھائے، خوب، خوب ضیافت کی اللہ انہیں جزائے خیر دے۔ پیاری، بہنو! عقیدت بھری یہ تحریر اگرچہ بے ربط ہے مگر میرا دل چاہ رہا تھا کہ اپنے اس روح پرور سفر کی روداد آپ سے بھی شیئر کروں اللہ ہم سب کو اپنے دربار میں بار، بار بلائے آمین۔

☆☆☆

مزاح نگاری، کمال کی صنفِ ادب ہے کہ جس میں وہ بات بھی بہ آسانی کہہ دی جاتی ہے کہ جسے سوچنے میں زمانے لگیں..... مگر ایسی نشتر زنی بخاطر اصلاح کا فن بھی کسی کسی کو آتا ہے۔ ورنہ مزاح نگاری کو عامیانہ طرزِ تحریر بننے میں دیر نہیں لگتی۔

اپنے پیارے پاکیزہ قارئین کے اس ذوق کی سیرابی کے لیے ہم ہر ماہ ان صفحات پر فکاہیہ ادب کے پُر لطف و یادگار شبہ پاروں سے انتخاب پیش کریں گے۔ اس ماہ آپ کی جانی پہچانی مزاح نگار انجم انصار کے قلم سے منتخب کردہ شبہ پارے نشرِ مکرر کے طور پر پیش کیے جا رہے ہیں۔

لڑاکا بیویوں کے شوہروں کے نام

آپ کو ڈیل، ڈیل عید مبارک کہ یہ عید آپ کے لیے خوشیوں اور دانش مندی کے خزانے ساتھ، ساتھ لے کر آئی ہے۔ بس اب یہ آپ کی اپنی ذہانت ہے کہ ان مواقع سے آپ کتنا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہ تو ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ آپ سب کی بیویاں نہ صرف لڑائی جھگڑے کی رسیا ہیں بلکہ آئے دن اپنی فرمائشوں سے آپ کا حشر بگاڑتی رہتی ہیں۔ مگر کے تمام تر ہنگامے صرف اور صرف انہی کی وجہ سے وجود میں آتے ہیں۔ ان کی آئے دن میکے جانے کی ترغیبات آپ کے "ہارٹ ٹریبلز" کا سبب بھی بنتی رہی ہیں۔ اس ماہ آپ جی داری کا لبادہ اوڑھیں، اپنی بیگمات کی لڑائیوں کا مردانہ وار مقابلہ کیجیے، بیجاوہ اپنے میکے چلی جائیں گی، آپ جانے دیجیے ان کے جانے سے آپ ایک بہت بڑے کراسس سے بچ گئے۔ پریشان نہ ہوں، عید کے بعد آپ سب اپنی، اپنی بیویوں کو منالابیے، چھوٹے موٹے تحائف بھی دیجیے مگر آپ کی یہ دانش مندی آپ کے سرمائے کو تباہ ہونے سے بچالے گی۔ کیا خیال ہے؟ ایک ڈیڑھ ہفتے تو آپ کو آپ کی محلے والیاں بھی کھانا بھجوا سکتی ہیں۔ ہے نا!

چولے.....!

کشور خالہ کی شادی سترہ برس کی عمر میں ہوئی تھی اور اب ان کی شادی کو لگ بھگ پچاس سال تو ضرور ہو گئے تھے۔ ماشاء اللہ وہ بہت سارے بچوں کی نانی اور دادی بھی بن چکی تھیں۔ مگر وہ جب بھی بات کرتیں، اپنی کم عمری، اپنا بھولا پن

اور اپنی شادی کا ذکر بڑے شوق و ذوق سے کیا کرتیں۔

"ارے میں تو کچھ بتا ہی نہیں تھا کہ دو لہا سے بات کیسے کرتے ہیں ان کی شکل دیکھ کر ایسی ہنسی چھوٹی، برابر کے کمرے میں بڑی بچی تنگ سناٹے میں آگئی تھیں۔"

"ہمیں تو پکاتا تنگ نہیں آتا، روزانہ نمک، مرچ کی بوتلیں لے کر پڑوس میں جاتے، وہ مسالا بنا کر دیتیں تو گھر آ کر کھانا پکاتے۔"

"کتنے عرصے تک محلے والوں سے کھانا پکاتا سیکھا۔" ایک دن میں نے جل کر کہا۔

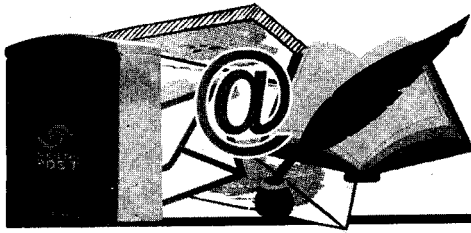
"بہت عرصے تک، ماشاء اللہ چار بچے ہی پی براہ سوسائٹی میں ہوئے۔ سارے محلے کے لوگ رشتے داروں جیسے تھے۔"

بات کہیں کی بھی ہوتی، سیاست، شرافت، قیامت وہ اس میں اپنا بھولا پن، سادگی، کم عمری اور شادی کے دن کا احوال ڈالنا ہرگز نہ بھولتیں۔

"یہ کشور خالہ، کیسی بے نکی باتیں کرتی ہیں، یہ نہیں دیکھتیں کہ ان کی گفتگو کون، کون سن رہا ہے۔" اکثر ان کے داماد تو شرمندہ ہو کر از خود ادا کرتے تھے۔

"ان کی ذہنی عمر شادی کے بعد رک گئی ہے، وہ آج بھی وہیں کھڑی ہیں جہاں آج سے پچاس سال پہلے کھڑی تھیں۔ کشور خالہ تو تعلیم سے نااہل ہیں مگر بہت سی تعلیم یافتہ خواتین بھی از خود معصوم، بھولی اور پگلو کے چولے بڑے شوق سے پہنتی ہیں اور خوش ہوتی ہیں۔ نہ جانے کیوں؟"

☆☆☆



بہنوں کی محفل مدینہ

خط کتابت کے لیے پی او باکس 662 جی پی او کراچی 74200 ای میل: jdpgroup@hotmail.com

پیاری یا کیزہ بہنو! السلام علیکم رحمۃ اللہ وبرکاتہ

تمام تعریفیں اس رب العزت جل شانہ کو زیبا ہیں جو ہمارا اور کل عالین کا پروردگار ہے اور کروڑ ہا درود و سلام رحمت اللعالمین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس پر کہ جن کی آمد سے جہالت و ظلمت کے اندھیرے چھٹے اور دنیا میں حق کا بول بالا ہوا۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ ہم سب کو ایمان کی قوت و پختگی کے ساتھ دونوں جہاں میں سرخرو کی نصیب فرمائے۔ (الہی آمین)

☆☆☆

کچھ باتیں اپنی بہنوں سے

پیاری بہنو! سلام اور پر غلوں دعائیں لیے آپ کی محفل میں حاضر ہوں۔ کہیے آپ کے کیا حال ہیں؟ پہلے تو آپ سب میری جانب سے عید الاضحیٰ کی مبارک باد قبول کریں اور وہ ہمیں جو اس سال حج کی سعادت حاصل کر رہی ہیں ان کو خصوصی مبارک باد..... ان سب بہنوں کے غلوں اور محبت کا شکریہ ادا ہی نہیں کیا جاسکتا جو مسلسل رابطہ کیے ہوئے ہیں اور مزید ارسو غنائیں بھی بھیج رہی ہیں جبکہ آپ سب کا غلوں ہی ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس دفعہ افتخار شوق نے مہاں جنوں سے اصلی کمی کی زبردست مضامیناں بھجوائیں۔ افتخار تمہاری مضامین کی تومنه میں ایسی مضامین چلی کہ اب جو بھی لفظ نگلیں گے وہ ٹھٹھے، ٹھٹھے ہی نکلیں گے اور ڈاکٹر ممتاز ضیاء نے فون پر بتایا کہ تبصرہ کیوں نہیں بھیج سکتیں اس لیے کہ تمہاری آنکھوں کا آپریشن ہوا ہے۔ اللہ تمہاری آنکھوں کی روشنی سلامت رکھے۔ ارے بھئی اگر تمہارے آپریشن کا پتا ہوتا تو ہرگز شکوہ نہیں کرتی کیونکہ تم تو خود ہی بہت خیال رکھتی ہو اور تبصرہ بھیجتی ہو۔ انشاء اللہ ٹھیک ہوتے ہی لکھ بھیجتا اور ملنے کا وعدہ تو کر رہی ہو تو کسی دن آ ہی جاؤ، مجھے خوشی ہوگی اور سب سے بڑھ کر رفاقت تمہاری صحت کے بارے میں تشویش ہے..... اپنا خوب خیال رکھا کرو اللہ تمہیں جلد از جلد صحت یاب کرے تمہارا شکریہ کہ اپنی خیریت سے آگاہ کرتی رہتی ہو..... انشاء اللہ تمام بہنیں بھی تمہارے لیے دعا کریں گی۔ جلد صحت یاب ہو جاؤ گی۔

و لیے تو ہماری تمام سینئر جونیئر رائٹرز بہت اچھا لکھ رہی ہیں اور قارئین انہیں اس کی داد بھی دے رہے ہیں مگر اس دلہ طیبہ غصہ مغل کے افسانے کا سبکیٹ بہت پسند کیا گیا۔ طیبہ ایسے ہی عمدہ موضوعات کا انتخاب کرتی رہنا قارئین نے تمہیں گولڈن اسٹار دے دیا ہے۔

عزیز بہنو! آپ سب کے ہر غلوں جذبات اور دعائیں بذریعہ خطوط و فون کا لڑ مجھے ملتی ہیں تو میں دل سے شکر گزار ہوتی ہوں کہ ہر بہن معراج صاحب کی صحت کے بارے میں اتنی فکر مند کی کا اظہار کرتی ہے جس سے مجھے بہت حوصلہ ملتا ہے، اہ! اس بات کا بہت اچھا احساس ہوتا ہے کہ ان کو سب نے اپنی دعاؤں میں یاد رکھا ہوا ہے۔ چلتے، چلتے آپ سب کو عید قربان کی ایک بار پھر مبارک باد..... ہمیں نت نئی ڈشز بنانے کی منصوبہ بندی میں مصروف ہوں گی اور یہ سلسلہ پورے مہینے چلتا رہے گا۔ اب اجازت.....

اللہ حافظ
دعا گو، عذرا رسول

پیاری بہنو! عید قرباں کی مبارک بادیں تو آپ سب نے وصول کر لیں اب یہ بتائیے کہ آپ نے اپنے پیاروں کے لیے کیا، کیا کیا؟ ہماری بہنیں، بھینا سب ہاشور ہیں۔ آپ نے حفظانِ صحت کے اصولوں کو بھی نظر رکھا ہوگا۔ ویسے تمام بیوی وریڈ یو جینٹلز اور رسائل و اخبارات میں گوشت کو محفوظ رکھنے اور پکانے کے متعلق ہدایات و کارآمد نسخے تو آتے رہتے ہیں جو بھینا ہم سب کی رہنمائی کے لیے ہوتے ہیں۔ آپ نے کس بات کا خیال رکھا اور کیا نیی اور مزید ارڈشز بتائیں؟ ہمیں بھی ضرور بتائیے گا۔ اس بار بھی قربانی کے جانوروں کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ اپنے اپنے جانوروں کی خوب نمائش بلکہ ”فیشن شو“ ہو رہے تھے۔ ان کے خواص اور نگرے بتائے جا رہے تھے، ان کے رہنے سہنے کے بہترین انتظامات ہوئے..... کاش کہ ہم یہ سب ارے عوام کو اتنی ہی اہمیت حاصل ہو جائے مگر عوام تو یہ سب ارے بغیر کسی خاص تیاری کے قربانی دیے چلے جا رہے ہیں اور شاید یوں ہی دیتے چلے جائیں گے حالانکہ قربانی تو ”خواص“، ”گودینی“ چاہیے..... اب عید ارڈشادیوں کے موقع پر کیا جنکشنوں کی باتیں کریں چلیں جانے دیں..... آپ بہنوں کے فون و خطوط کے ذریعے ملنے والے مشورے، تجاویز اور تنقید قابلِ غور ہے۔ آپ سب کے تعاون سے ہی ماہنامہ پاکیزہ ترقی کی مزید راہیں ملے کرے گا ویسے تو تمام بہنیں ہی ہمارے لیے قابلِ احترام ہیں مگر جو مستقل تہرہ نگار ہیں وہ اگر غیر حاضر ہوں تو بھینا تنویش بھی ہوتی ہے اور مگر بھی محسوس ہوتی ہے جیسے ڈاکٹر ممتاز ضیا کی پیاری کا ذکر عذرار رسول صاحب نے کیا۔ لاہور سے عطیٰ خورشید، ہواے ای سے نفیسہ آرا، ویسے نفیسہ تو مراسلات کے ذریعے شرکت کر لیتی ہیں اسی طرح بے شمار اور بھی نام ہیں کوہاٹ سے نسیم قریشی اور صائمہ سجاد بخش، کرپٹی سے ذکیہ ایوب بشاد سے نازنین آفریدی وغیرہ۔ خصوصی خبر یہ ہے کہ پاکیزہ کے صفحات معتریب آپ کی بے حد پسندیدہ اور معروف رائٹرز کی تحریروں سے بننے والے ہیں بس دو تین ماہ انتظار کریں کہ اس کی اپنی ہی لذت ہے۔

آپ کو ہر آن خوش آمدید کہنے کے لیے ہمارے رابطہ نمبر درج ہیں۔ نزہت امین 03316266612 / آفس لینڈ لائن

EXT: 122, 107, 118..... 021-35802552-35895313-35386783

اور حسبِ روایت مختلف خبروں اور سرگرمیوں پر ایک نظر ڈالنے سے قلم ایک بار غلوں دل سے درود ابراہیم کی اور اس کے بعد تین بار آیت کو کریمہ ضرور پڑھ لیں اور اپنی دعاؤں میں اپنے پیاروں کے ساتھ ساتھ تمام اہل وطن کو بھی ضرور یاد رکھیں۔ پروردگار عالم اسلام کی تمام پریشانیوں کو دور کرے اور تمام مسلمانانِ عالم کو کامیابیاں نصیب ہو۔ (الہی آمین)

مصنفات، شاعرات اور قارئین پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ مصنفہ عذرا آفتاب کی کتاب ”کچھ یادیں کچھ باتیں“ شائع ہوئی ہے۔ اس میں مصنفہ نے بہت خوب صورت انداز میں حساس دل پر گزرنے والی کیفیات بہت دل گداز انداز میں نظم کی ہیں۔ کتاب کا انتساب کچھ حقیقتوں، غلطیوں، رشتوں اور یادوں کے نام ہے۔ اس بے حد دلنشین کتاب کی قیمت صرف 350 روپے ہے اور یہ آکسن کنسلٹنٹ لینڈ کے تحت شائع ہوئی ہے۔

☆ نوجوان اور پرجوش مصنفہ ثناء احمد کا نیا ناول ”کالج کی تہلی“ شائع ہو گیا ہے۔ یہ دو گھرانوں کی خوب صورت کہانی ہے جس کے کردار مثنوی اور مثبت دونوں پہلو لیے ہوئے ہیں۔ ناول کی ہیروئن اپنے مضبوط کردار کو نمونہ کی جدوجہد میں ہر آن کو شان نظر آتی ہے۔ خوب صورت سرورق لیے یہ کتاب فیض الاسلام پرنٹرز راول پنڈی نے بڑے اہتمام سے شائع کی ہے کتاب کے ملنے کا پتہ ریل ہاؤس آف پبلی کیشنز اقبال مارکیٹ راول پنڈی ہے اور فون نمبر 0515551519 ہے۔

☆ نادیدہ احمد کا دوسرا ناول وہ ہمیں ملا تو مال کیا کتابی شکل میں چھپ گیا ہے اور القریش پبلشرز لاہور سے دستیاب ہے۔

☆ پاکیزہ سے وابستہ ہماری شاعرہ شگفتہ شفیق، کینیڈا میں اپنی شاعری کی دھوم مچا کر وطن واپس آ چکی ہیں۔

☆ مصنفہ مصباح نوشین کی چوتھی کتاب ”عشق مجذوب“ حال ہی میں القریش پبلی کیشنز نے شائع کی ہے۔

☆ پچھلے دنوں ریڈیو پاکستان کراچی اسٹیشن میں ہونے والے اسپرنگ ڈراما فیسٹول کے سلسلے میں پروڈیوسر سمارضا

راڈ کی پروڈکشن میں تیار کیے گئے ”پلٹن رُت“ بہار کی کو بیٹ رائٹرز ایوارڈ ملا، اور یہ ایوارڈ بیٹ رائٹرز شاہد مسرور نے

حاصل کیا ہے۔ (بہت مبارک باد سیمہ آپ کی پروڈکشن بھی تو اعلیٰ ہی ہوگی)

☆ پچھلے دنوں دلشاد ویم، کراچی تشریف لائیں۔ اور بہت سی رائٹرز سے ملاقاتیں کیں۔

☆ مستقل قاری شائستہ اعجاز کی بیٹی جویریہ کے ہاں بیٹی ہوئی ہے جبکہ شائستہ اعجاز کے چھوٹے بھائی انیس کی بیٹی کے ہاں بیٹا تولد ہوا ہے (بہت، بہت مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی دیرینہ تبصرہ نگار، مصنفہ شاعرہ اور ماہر قانون سعدیہ ہاشمی، سرگودھا کو پاک نوبل ایوارڈ 2017ء رائٹرز ویلفیئر فاؤنڈیشن اینڈ ہیومن رائٹس پاکستان کی جانب سے ان کی شاعری اور ادب کی خدمات پر دیا گیا۔ (مبارک باد) سعدیہ کے حوالے سے دوسری خبر یہ ہے کہ انہوں نے سرگودھا کورٹ بار میں درس قرآن کا اہتمام کیا علاوہ ازیں سعدیہ نے خواتین جیلوں میں جا کر اصلاحی دروس کا اہتمام کیا اور توبہ کے متعلق قرآن و سنت کے حوالے سے درس دیا۔ سعدیہ ہاشمی سرگودھا کے علاوہ پنجاب کے دیگر شہروں میں بھی ایک معروف و فعال قانون دان کی حیثیت سے جانی جاتی ہیں۔

☆ تبصرہ نگار نگینہ ضیاء بخش، کراچی کی پیاری دوست آیت لیاقت کی بہن آمنہ کاشف کی شادی گزشتہ دنوں بخیر و خوی انجام پائی۔ (مبارک باد) نگینہ ضیاء کے حوالے سے دوسری خبر یہ ہے کہ ان کی پیاری بیٹی مہرین ضیاء نے میٹرک اے ون گریڈ سے پاس کر لیا ہے۔ (بے حد مبارک باد)

☆ مستقل تبصرہ نگار منیر باسین، لیہ کے لیے ہمیں ضرور دعا کریں کہ اللہ انہیں پیاری بیٹی سے نوازے۔ (الہی آمین)

☆ مصنفہ طیبہ عنصر مغل کی پیاری بیٹی عنند لیب عنصر مغل نے میٹرک سائنس کے امتحان میں اے گریڈ حاصل کیا ہے۔ (بہت مبارک ہو)

☆ شاعرہ و مصنفہ یحییٰ احمد کے بھائی رضوان احمد کے ہاں دوسرا بیٹا تولد ہوا ہے جس کا نام محمد شاہ زین رضوان رکھا گیا ہے۔ (بہت، بہت مبارک ہو)

☆ مستقل تبصرہ نگار، صائمہ سید، کراچی کے بھائی کے مستقل روزگار کے لیے ہمیں ضرور دعا کریں۔ اگر کوئی خاص وظیفہ ہو تو وہ بھی بتائیں۔ (صائمہ، اکتوبر کے روحانی مشوروں میں ضرور وسعت رزق کی دعائیں شامل ہوں گی۔ اللہ آپ کے مسائل حل کرے)

دعائے صحت کے لیے التماس ہے

☆ جنت زہرا ثانی کی صحت کے لیے خصوصی دعا کی درخواست۔

☆ شاعرہ اور مستقل تبصرہ نگار فریدہ جاوید فری، لاہور کے چھوٹے بھائی کے گلے میں کینسر تشخیص ہوا ہے بھائی کی پریشانی کے باعث فریدہ فری کی خودی شوگر بڑھ گئی ہے۔ (فریدہ پریشان نہ ہوں..... اللہ آپ کو اور بھائی کو صحت دے)

☆ پاکیزہ کی مڑ غلوس ساسھی، مصنفہ رفاقت جاوید کی طبیعت پچھلے دنوں کافی خراب رہی اور اب بھی وہ ڈاکٹرز کے زیر علاج ہیں۔ (رفاقت اللہ آپ کو صحت کاملہ دعا جلعطا فرمائے، آمین)۔

☆ مصنفہ شیریں حیدر کی نکالی کی سرجری حال ہی میں اسلام آباد میں ہوئی وہ کافی عرصے سے درد میں مبتلا تھیں۔

☆ مصنفہ سمبانت عاصم، کراچی کی مکمل صحت پانی کے لیے خصوصی دعا۔

☆ مراسلتہ رو پاکیزہ کی دیرینہ ساسھی امینہ عنند لیب، سلاوا لوی کو آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔

☆ مصنفہ زابدہ بیرونی کی بیٹی اور شوہر کے لیے دعائے صحت۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری مسز سبین، لیہ کے پیچھے کی آنکھوں میں پانی آنے کی شکایت ہے۔ ہمیں دعا کرنے کے ساتھ اگر کوئی نسخہ بتائیں۔

☆ مستقل قاری عصمت، اوکاڑہ کی بڑی بہن کے لیے دعائے صحت۔

☆ رائٹرز سویرا فلک کے شوہر جگر کی کامیاب سرجری کے بعد اب رویہ صحت ہیں۔ (الحمد للہ)

☆ ہماری پیاری رائٹرز نفعت سراج کی پچھلے دنوں کچھ طبیعت ناساز رہی۔ اب الحمد للہ خیریت سے ہیں۔

انتقال پرمال

☆ مصنفہ اسما صدیقہ کے والد ماجد انتقال کر گئے۔

☆ مصنفہ بشری ماہا کی پرفیق دادی جان انتقال کر گئیں۔

☆ پچھلے دنوں مصنفہ صائمہ اکرم کے والد کی پہلی برسی کے سلسلے میں ختم القرآن اور فاتحہ خوانی ہوئی۔ (صائمہ آپ کے غم میں ادارہ وقارین برابر کے شریک ہیں)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری و تمبر نگار عصمت، ادا کاڑہ کے جواں سال بھانج و اما داد کا ایک ٹریفک حادثے میں انتقال ہو گیا۔ مرحوم ادا کاڑہ اور گرد و نواح کی جانی پہچانی شخصیت اور معروف وکیل تھے۔ ادارہ ان کے خاندان کے اس غم میں برابر کا شریک ہے۔

☆☆☆

اب آتے ہیں اپنی بہنوں کے دلچسپ خطوط کی طرف.....

✉ زہرہ جنید، کراچی۔ ”آپ سے بات کر کے بہت اچھا لگا ایک عرصے بعد آوازی۔ ہاں دلکش کا زمانہ یاد آ گیا اب انشاء اللہ پھر ملیں گے آپ سچ میں کافی مصروف ہو گئی تھیں مگر اب تحریر بھی ضرور بھیجیں اور شاعری بھی..... پاکیزہ تو اپنے دیرینہ دوستوں کو جوڑے رکھتا ہے۔

بھ دروازہ نوشین خان، مظفر گڑھ سے۔ ”ماہنامہ پاکیزہ پر یہ اللہ کا کرم ہے کہ اس کی چھپائی پڑھنے پر کمادہ کرتی ہے۔ اس کی ادارتی فضا میں اسلامی مہک ہے۔ (دل سے سراپے پر شکریہ) کبھی وہ دور میرا بھی ہوا کرتا تھا جب، ایک منتخب کردہ شعر کا چھپ جانا یا سوالات جوابات میں چھپ جانا اتنا خوش کرتا تھا کہ دل میں لڈو پھونٹتے رہتے تھے۔ خوشی کا تعاقب سراپے جانے، عزت و توقیر ملنے، شناخت ملنے اور شاباش ملنے سے ہے جو جس طرح کی خوشی ہم چاہتے ہیں۔ ہمیں دوسروں کو دینے میں بھی فراخ دل ہونا چاہیے (جی بے شک)۔ عذرا آفتاب سے خوشگوار ملاقات قابل مطالعہ، قابل داد ہے۔ اختر شجاعت نے غیبت، مذمت الہی بہت اچھی اور مفید ہدایت کی ہے۔ آج کل ہمارے سیاسی ماحول میں بدکرداری کا الزام لگانا اور جی کھول کر غیبت کرنا معمول بن گیا ہے جو بے حد افسوس ناک ہے۔ غیبت اور خصوصاً بدگمانی غیبت کبیرہ گناہ ہے۔ (جی بالکل)۔ منطقی علی کا ناولٹ اب تو کوئی خضر ملے پاکستان کے حوالے سے عمدہ تحریر بھی۔ اب وطن سے محبت کی کہانیاں خصوصاً بڑوں کی سطح پر کم لکھی اور پڑھی جاتی ہیں۔ پاکستان کی تشکیل کی المناک قربانیاں یاد ہوتی رہنا ضروری ہیں۔ (جی بالکل درست کہا) طیبہ عنصر مغل کا افسانہ گولڈن اشار عصر حاضر کے انتہائی حساس موضوع پر ہے۔ اسی موضوع پر میں نے بھی ایک افسانہ لکھا تھا۔ زنجیر غم ہے اس میں نیچر ڈکاتور زیادہ ہے۔ نیچر ڈکاتور طلباء کے ساتھ ضرورت سے زیادہ بے تکلفی اپنالی ہے وہ خود کو تجربے کا رونا پنا پسند نہیں کرتیں۔ وہ استاد کے بالامقام کو اپنانا نہیں چاہتیں کہ وہ مایا بڑی عمر کی لگیں۔ یہ فشن زدہ ہم عمر بننے والی استانیاں کم سن لڑکوں کے اذہان پر برے اثرات مرتب کرتی ہیں۔ نیچر ڈکاتور اپنے اسٹوڈنٹس کے ساتھ میسجور کا جادو وغیرہ تو عام بات ہو گئی ہے۔ (ایسی کہانیاں لکھنے اور چھپانے کا مقصد آگاہی دینا ہوتا ہے اور یہ کریڈٹ رائٹر کو ہی جاتا ہے)۔ ناہید سلطانہ اختر کا افسانہ اپنی تو آگ بھی پیاری سادہ مختصر اور موثر ہے۔ ناہید فاطمہ حسین کا ناولٹ کوہ گراں کچھ سوالات پیدا کرتا ہے۔ ناقابل تلافی صورت حال میں شین کا شاہ میر سے ملوث ہو جانے کے بعد گریز اور فرار غیر حقیقی ہے۔ ایسے حالات میں لڑکی کی مجبوری اسے غرہ دکھانے کا موقع نہیں دیتی مگر شین نے شاہ میر کا نمبر ہی hide کر دیا پھر اس کے بعد وہ کیونکر یہ توقع کر سکتی ہے کہ پیدا ہونے والے بچے کو وہ (own) کرے..... دوسری وہ صورت حال جب بد مزاج ستم گر چھوٹو شین کو حاملہ دیکھ کر غصہ آتا ہے۔ یہ غصہ ہرگز زیادتی نہیں بلکہ برجستہ اور برحق ہے۔ زارا کی ماں کا سکون سے بتانا کہ اس سے زبردستی ہوئی۔ پاکیزہ بہنوں سے اپنے ناولٹ میں عورت ہوں پر رائے دینے کی اتنا س ہے۔“ (جی اس مرتبہ اپنی کہانی پر تبصرے تو آپ نے پڑھ لیے ہوں گے ویسے تفصیلی تبصرے کا شکریہ)

بھ سعدیہ رئیس، کراچی سے۔ ”بیاری نزہت اصغر امید ہے کہ اپنی نئی ڈتے داریوں اور مصروفیات میں دل لگ گیا ہوگا۔ ایڈیٹر شپ کا نیا عہدہ بہت مبارک ہو (بہت شکریہ)۔ انجم انصار کے جانے کا دکھ اپنی جگہ ہے بلاشبہ ان کی قابل تحسین خدمات قارئین کے دل سے بھی فراموش نہیں ہو سکتیں۔ (جی بالکل) ویسے نزہت ہم تو سن رہے تھے کہ عقریب پاکستان کی حکومت بدلنے والی ہے۔ مگر یہاں تو پاکیزہ میں ہی بڑی تبدیلی ہو گئی۔ جس طرح کسی بھی ملک کی حکومت ایک دن ضرور بدلتی ہے اور مقررہ مدت پوری کر کے کرسی پر نئے وزیر اعظم آجاتے ہیں تو ایسا ہی یہاں بھی محسوس ہو رہا ہے۔ صدارت کا عہدہ تو

ہاں لے پاس ہے (جی ہاں بالکل ان ہی کی سربراہی میں سب کام کرتے ہیں)۔ جولائی کے شمارے میں ان کی عید ہار، وصول کر لی گئی۔ معراج صاحب کے لیے بہت سی دعا میں۔ اب نئے وزیر اعظم یعنی پاکیزہ کی نئی ایڈیٹر نے کرسی نبال لی ہے۔ عوام کی کثیر تعداد کی طرح پاکیزہ کے قارئین کی کثیر تعداد کو بھی آپ سے بہت سی امیدیں وابستہ ہوں گی کیونکہ ایڈیٹر شپ بہت ذمے داری کا کام ہے مگر مجھے یقین ہے کہ آپ سنبھال لیں گی۔ (خوش کن توقعات کا شکر یہ سجدہ ہے) مجھے تو آپ کے نام کے ساتھ ہی دلکش کی یاد آگئی۔ بڑا مختصر سا تھرا ہوا دلکش اور مصنفین کا لیکن اس میں خطوط کی محفل میں آخر میں جو راز و نیاز کرتی تھیں وہ بہت خوب صورت لگتا تھا۔ امید ہے کہ پاکیزہ میں بھی اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھا کر سب کو اپنا معتقد کر لیں گی۔ (آپ سب کا تعاون ساتھ رہا تو ضرور) ویسے پاکیزہ اپنے اعتبار سے بہترین ہے کچھ جدت کے رنگ آپ ڈالیں گی تو اور نگر جانے گا۔ (جی ضرور) افسانوں پر لگی تصاویر میں بہتری کی ضرورت ہے۔“ (سجدہ بہت عرصے بعد آپ کی تحریر پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ ڈیر کوئی کسی کی جگہ نہیں لے سکتا بلکہ اپنا مقام خود ہی بنانا ہوتا ہے۔ انجم باجی نے بلاشبہ قارئین اور پاکیزہ کا مضبوط رشتہ نبھایا ہے۔ انشاء اللہ یہ مزید بہتری کی طرف ہی جائے گا آپ لوگوں کا شبت و پرخوس تعاون چاہیے) کچھ عقیدہ حق کراچی سے۔ ”رسالہ ہاتھ میں ہے۔ عذر دار رسول صاحبہ کی محبت بھری شکایت سر آنکھوں پر۔ رسالے میں بہت ساری مثبت تبدیلیاں نظر آ رہی ہیں۔ مخصوص رائٹرز کے حصار سے نکل کر بہت ساری نئی رائٹرز کو موقع دیا جا رہا ہے۔ اچھی بات ہے ویسے کبھی بکھار میری تحریر کو بھی جگہ مل جائے تو عنایت ہوگی (جی ضرور..... جلد لگے گی) طیبہ خضر مثل کا افسانہ کوئلن اسٹار پڑھا، بہت اچھا لکھا ہے۔ رفعت سراج کی تحریر کی تعریف کرنا تو سورج کو چراغ دکھانے کے برابر ہے۔ رفعت سراج کی تحریر کے ساتھ ساتھ مجھے ان کے لہجے کی بے ساختگی، بہت پسند ہے جو ان کی تحریر میں بھی نظر آ رہی ہے۔ ناہید سلطانہ اختر نے ہمیشہ کی طرح بہت اچھا لکھا، شریں حیدر اور سیمارضا ردا کا ناول خوب صورتی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ افسانوں میں زیادہ تر نئے نام تھے لیکن سب نے اچھی کوشتیں کیں لیکن چھوٹا منہ بڑی بات ایک جملہ سمجھ سمیت سب رائٹرز کے لیے ہے کہ پلیز سینئر کو زیادہ سے زیادہ پڑھیں۔ (پڑھنا تو خیر سب کو ہی چاہیے۔ اپنی صلاحیتوں کو بھی جلا لینی ہے)۔ مجھے عذر دار رسول صاحبہ سے کچھ کہنا ہے۔ میں جانتی ہوں آپ بہت بڑی دہتی ہیں۔ انجم باجی کے جانے کے بعد آپ کی ذمے داریوں میں اضافہ ہو گیا۔ میں یہ نہیں کہہ رہی کہ آپ پریشان ہوں گی۔ کیونکہ ہر مسئلے کو چھینچ سمجھ کر قبول کرنا آپ کی خدا داد صلاحیت ہے۔ رسالے کی دنیا سے ہٹ کر میں آپ کی گھریلو زندگی سے بھی واقف ہوں، جس احسن طریقے سے آپ سارے معاملات کو لے کر چلتی ہیں وہ قابل تحسین ہے۔ بہت سی رائٹرز رسالہ جو ان کرنا چاہتی ہیں لیکن قارئین شاید آپ نہیں جانتے میرے اور عذر دار رسول کے درمیان ایک معاہدہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کو تحائف نہیں دیں گے بلکہ تحفے کی قیمت سے کی ضرورت مندی مدد کریں گے۔ میری پیاری بہن اور دوست عذر دار رسول آج میں آپ سے کہنا چاہتی ہوں کہ آپ کو کتابیں سمجھنا، نہ ہی سمجھنے ایڈیٹر کی کرسی چاہیے یا کسی اور قسم کی جاب یا رعایت، نہ ہی رسالے میں اپنا نام نہ کوئی معاوضہ اور نہ ہی معاوضے کا کسی قسم کا فائدہ بلکہ لیکن اگر آپ کو جہاں بھی جس وقت بھی میری ضرورت ہو، کسی افسانے کی ایڈیٹنگ، ریڈنگ یا کوئی بھی رسالے سے وابستہ کام ہو تو بلا جھجک آدمی رات کو بھی آواز دیں گی تو میں حاضر ہوں۔ اگر میری کوئی صلاحیت میرے پاکیزہ کے کام آسکتی ہے، آپ کا بوجھ ہلکا کر سکتی ہے تو میرے لیے اعزاز ہوگا۔ میں جانتی ہوں ماشاء اللہ نہتہ امصر ایک باصلاحیت ایڈیٹر ہیں (بہت شکریہ عقیدہ)۔ آپ کے ارد گرد خیر خواہ لوگ ہیں۔ نہتہ امصر کی صلاحیتیں رسالے کی ہر سطح پر چمک رہی ہوتی ہیں لیکن پھر بھی ایک اور ایک گیارہ کے تحت میری ایک محبت بھری آفر آپ کی میز پر ہے۔ تبصرہ پھر طویل ہو گیا۔ ارے ہاں میری اس آفر پر بہت سارے لوگوں کو اعتراض ہوگا تو برائے مہربانی اعتراضات مجھ سے کیجیے کہ عذر دار رسول صاحبہ کا قیمتی وقت ضائع مت کیجیے گا بلکہ اس وقت آپ اپنے بچوں کے لیے آلو کا مٹھا بنا لینے کا آلومچرے پر راشوں کے ساتھ فیت سے بھی محفوظ اور مایاں بیچ بھی خوش۔“ (ارے عقیدہ بہت پر لطف تبصرے اور باتوں کا شکر یہ۔ آپ کی غلوں بھری دوستی پر کوئی شک نہیں کر سکتا۔ عذر دار صاحبہ بھی آپ کے جذبات کسر رہی ہیں)۔

کچھ افتخار رشوق، میاں چنوں سے۔ ”رفعت سراج کا یہ کہاں بچپن کہ دل ہے ایک خوب صورت تحریر جس میں عورت کی نسوانیت، انا اور تاجور کی مضبوط شخصیت کو دکھایا گیا ہے۔ لیڈی صوفیہ جو ایک تاریخی شخصیت کا تاثر دیتی ہیں۔ ان کی خوب صورت شخصیت بلکہ کلاسیکل شخصیت جو ماضی، حال اور مستقبل کی آئینہ دار ہے۔ پرس کا معصوم عاشق اور احتیاط پسندی..... شریں حیدر کا امرت لاجواب موضوع جس میں تسلسل ہے۔ سماجی اور گھریلو تعلقات اور مزاج کی آئینہ دار تحریر۔ وردان نوشین خان کی تحریر، میں عورت ہوں پڑھ کر عورت کے دکھ کو محسوس کرتے ہوئے آنسو زمین دل پر گرتے رہے! ناہید سلطانہ اختر کی تحریر اپنی تو آگ بھی

بیاری اگر اس کا عنوان یہ ہوتا کہ اپنی تو اولاد بھی پیاری کتنا مزہ آتا۔ (اولاد کی خاطر ہی تو سارے خود ساختہ اصول توڑ دیے گئے جیسی تو اپنی آگ بھی پیاری لگتی ہے) 14 اگست کے حوالے سے دوسرے تحریریں بھی دل کو چھو گئیں۔ پاکیزہ نو جوان نسل کے لیے تاریخی اور تعمیری کردار ادا کر رہا ہے (جی شکر یہ)۔ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی سے ملنے کی شدید خواہش ہے۔ (اس دفعہ آپ سب کی طرف سے ہم نے ملاقات کر لی۔ احوال شروع کے صفحات میں پڑھ لیا ہوگا) عذر دراصل کو ہم احتراماً فون نہیں کرتے وہ تو ازلی اور ابدی محبت کا شاہکار ہیں۔ بہنوں کی محفل میں ان کے ابتدائی لکھات یوں ہیں جیسے صبح صادق کی روشنی۔ (جی بالکل، عذر صاحبہ آپ سب بہنوں کی تسلی کے لیے ہی لکھتی ہیں)۔ میری بہنوں فرحت ناہید، شہر بانو، ماہ نور کی طرف سے عذر دراصل اور آپ کو بہت سلام پیار۔ میرے پیارے بھانجوں جہانزیب، سکینل، شہر یار اور حسنین کی طرف سے محبت بھرے سلام۔ پیارے بھانجوں ماہ نور کے سالار اور یاسر کی طرف سے شکریہ۔ اتراتے پھرتے ہیں کہ ہمارا نام پاکیزہ میں آتا ہے میرا اور میری فیملی کا نام پاکیزہ میں شائع ہونا ہمارے لیے بہت بڑا اعزاز ہے (ہمارا بھی سلام پہنچا دیں یہ سب آپ کی محبت اور خلوص ہے، اللہ آپ سب کو سلامت رکھے)۔ پاکیزہ کے لیے سہیل (بھتیجا) سے میں نے کہا کہ پڑھ کر سنا دیا کرو، ہاتھ کی تکلیف کی وجہ سے میں پڑھ نہیں سکتی تھی۔ فرمایا گیا کہ پاکیزہ سنانے کا ریٹ زیادہ ہوگا دوسری کتابوں کی نسبت کیونکہ یہ آپ کو ہم سے بھی زیادہ پیارا ہے۔ صریحاً بلیک میلنگ۔ میرے میاں فلک شیر کی طرف سے بھی پاکیزہ کو سلام۔ (وہیکم السلام! اللہ آپ کی شگفتہ بیانی سلامت رکھے۔ ہم بھی آپ کی محبتوں کے مقروض ہیں ڈیر)

✉ زیادہ پروین، میر پور خاص۔ اللہ آپ کو بھی سلامت رکھے اور آپ کے شوہر کو بھی عمر طویل دے۔ بہت خوشی ہوئی کہ آپ نے اپنی بچیوں کی ذمہ داری بہ احسن پوری کی۔ آپ کی دعائیں ہمارے ساتھ رہیں تو پاکیزہ ترقی کرتی چلا جائے گا۔ عذر صاحبہ دعاؤں کے لیے شکریہ کہتی ہیں۔

بھ عصمت، اوکاڑہ سے۔ ”میں تو پاکیزہ کی بہت بہت پرانی قاری ہوں، کبھی کبھی فون کر کے تبصرہ کرتی ہوں اس لیے کہ خط لکھتا میرے بس کی بات نہیں۔ میرے تو سارے گھر والے پاکیزہ پڑھتے ہیں اور سب لوگ میری پاکیزہ سے وابستگی کو جانتے ہیں بس رمضان میں ہمارے گھر ایک سانچہ ہو گیا تھا جس کی وجہ سے دل بہت اداس رہا۔ بھانجی کے شوہر کا ایسکی ڈنٹ میں انتقال ہو گیا۔ میں دو مہینے اسی کے پاس تھی۔ میرے اپنے بچے نہیں ہیں مگر بہن، بھائی اور منہ، دیور جیٹھ کے بچے مجھے چھوٹی ناوا اور چھوٹی وادو کہتے ہیں۔ سب نے مجھے بہت پیار دیا۔ پاکیزہ پڑھ کر میں تو آپس میں رشتہ ہے۔ یہاں ہم سب دکھ دکھ بانٹتے ہیں انجمن باہمی سے بھی بہت اچھی دعا سلام تھی۔ آپ کا شکریہ کہ بہت اچھی طرح بات کی۔“ (عصمت بہن سب سے پہلے تو تعزیت قبول کریں اور اگر آپ فون پر تبصرہ لکھوانا چاہتی ہیں تو کوئی بات نہیں۔ پاکیزہ سے آپ کی وابستگی کی دل سے قدر کرتے ہیں۔ آپ سب قارئین کے پُر خلوص ساتھ نے ہی ہمیں حوصلہ دیا ہوا ہے۔ کبھی تو ہمیں یہاں اپنا دکھ، سکھ آرام سے کہہ دیتی ہیں۔ اس لیے کہ دوستوں کے پُر خلوص جملے دل کو تقویت دیا کرتے ہیں۔ اللہ آپ کو اور آپ کی بھانجی اور بچوں کو مہربان عطا فرمائے..... اے الٰہی آمین)

✉ شاہدینہ مبارک، ہالہ۔ آپ کے فون کرنے کا شکریہ، پاکیزہ کے لیے آپ کے جذبات قابل قدر ہیں۔ تفصیلی تبصرہ بھی ضرور بھیجیں

بھ طیبہ عصمت، راول پنڈی سے۔ ”سب سے پہلے تو سرورق کی تعریف نہ کرنا سخت نا انصافی ہوگا اس کے بعد دین کی باتوں اور اساتذہ گرامی نے ایمان کو تازگی بخشی، اس کے بعد ذکیہ بلگرامی کے تو ہم نمون رہیں گے کہ کس قدر عرق ریزی سے دین کی معلومات بانٹ رہی ہیں۔ سلامت رہیں آمین، اب بات کرتے ہیں سلسلے وار تاویز کی تو دونوں ہی بہت خوب صورتی سے آگے بڑھ رہے ہیں لیکن اس بار مجھے شیریں حیدر کا ناول بہت ہی زبردست لگا ہے، رفعت سران بھی مشکل نہیں لکھ رہی ہیں۔ پتا نہیں کچھ قاری بہنوں کو مشکل کیوں لگ رہا ہے (اپنی، اپنی پسند ہے) اپنی تو آگ بھی پیاری ناہید سلطان جی بہت خوب، مبارک باد کی سنی ہیں پیاری دوست سحر ساجد کا سن جاں باز م میرا فوٹو رہا لیکن اس کا اختتام لگتا ہے جلدی میں کیا، کچھ کردار بکھر گئے جیسے تیور کے بارے میں کچھ نہیں لکھا بہر حال موی سے حیدر کی شادی بہت اٹو کا انداز بہت خوب، (ڈیر یہ تین چار قسط پہلے تیور کا قصہ انجام کو پہنچ چکا تھا) ماجرہ رحمان کی اس بار کی کہانی پہلے جیسی نہیں تھی اس کہانی میں کچھ باتیں ہضم نہیں ہوئیں۔ غزالہ عزیز نے اچھے طریقے سے اختتام کیا، بہت مبارک قرۃ العین سکندر ویل ڈن، عید، محبت اور تم میں کچھ نیا نہیں تھا محذرت کے ساتھ مگر اچھا

ہے۔ فرحین الظفر کی خدا جانے، بہت پیاری تحریر، ماشاء اللہ کھتی رہیں ایسی ہی پیاری، پیاری تحاریر، میں عورت ہوں ایک اچھی تحریر لیکن ایک عورت جو بہت بولڈ ہے اور دوسروں کی مدد کے لیے کھڑی ہونے والی اپنے لیے اتنی کمزور کیسے اور بے وقوف بھی اور سب کچھ جانتے بوجھتے کئی سوال اٹھتے ہیں، بہر حال انداز تحریر بہت خوب صورت (عورت کبھی کبھی اسٹن شوہر کے ہاتھوں کمزور بھی پڑ جاتی ہے۔) ضرورت پاکستان وطن کے موضوع پر لکھنے کی اچھی کاوش لیکن تحریر میں کچھ مزہ نہیں آیا۔ سیرا رضا بہت، بہت مبارک باد پیاری آپ نے تو ہم کو عبت بدنام کیا لکھ کر کمال دھمال کر ڈالا واہ سبحان اللہ، ناہید فاطمہ حسنین۔ جی آپ کو ہم یہی کہیں گے کہ عذرا ایسا کے بہت ممنون و مشکور ہیں کہ ان کی وجہ سے آپ نے لکھا اور ہم ایک بہترین تحریر پڑھ سکے میرا پیغام ہے کہ اب کھتی رہیں پلیز ایسا ہی ادب پڑھنے کو دل چاہتا ہے پاکیزہ کے معیار کا تقاضا ہے یہ، مہر و فافرح بھنوا اچھا لکھا لیکن ایک تو اس طرح کی تحریر کا فی دفعہ پڑھ چکے اور دوسرے تھوڑی سی محنت اور بہنا، صبح آرزو، ایک اچھی تحریر ہے، فاشا محسن علی بہت اچھا لکھا لیکن منطقی طور پر آمنہ اور رحمان علی والی کہانیوں کا آپس میں تال میل ہی نہیں ملایا آپ نے فاشا کی سی رہ گئی۔ (دوبارہ پڑھیں فاشا منطقی دور ہو جائے گی) اختر شجاعت جی آپ کو اللہ تعالیٰ بہت ساری راحتوں سے نوازے (آمین) بہت ہی اچھی طرح ہماری دینی تربیت کر رہی ہیں۔ جزاک اللہ عذرا آفتاب سے ملاقات بہت خوب صورت رہی، سلامت رہیں عقیدہ جی کا خصوصی ذکر کروں گی کہ ان کے دونوں افسانے بہت ہی اعلیٰ تھے ماشاء اللہ! باقی پورا کا پورا پاکیزہ ہی پاکیزہ ٹیم کی محنت کا عکاس رہا پاکیزہ ڈائری، بزم پاکیزہ، میں اکثر تنگنائی ہوں اور ہومیو کلیک، خوش ذائقہ ہو یا حسن کھمارے یا کارنرز سب بہترین اب آخر میں بہت شکریہ زہت اصغر جی آپ نے بہت خوبی سے پاکیزہ کو سنبھال لیا۔ بے شک انگریز آپ کی کمی پوری نہیں ہو سکتی لیکن آپ کا کام نہیں رہی ہیں یہ طے شدہ بات ہے بہنوں کی محفل میں عذرا ایسا ہم سے بات کرنے آئیں اس وجہ سے محفل کا رنگ ہی کچھ اور ہو گیا واہ ایسا اب آپ بھی مستقل تھوڑی سی بات کر لیا کریں (جی عذرا صاحبہ ضرور پاکیزہ بہنوں سے باتیں کرنی رہیں انشاء اللہ) اور ادارہ بے مثال تھا میں نے دو تین بار پڑھا سادہ الفاظ میں بہت اچھے پیغام..... (فصلی اور دقیق تبصرے کا شکریہ..... آپ لوگوں کی تجاویز اور تعاون سے ہی ہم اسے مزید بہتر کرتے رہیں گے)

بھہ سنیم کوثر، کراچی سے۔ ”اگست کا شمارہ پڑھا سب سے پہلے من جان بازم کی لاسٹ قسط پڑھی اس کہانی کا اینڈ واقعی بہت اچھا لگا اور آل من جان بازم مناسب تحریر تھی (مبارک ہو عمر)۔ یہ کہاں نہیں کی دل ہے کیا عرض کریں اس کے بارے میں گفتگو کی خوب صورتی کے ساتھ ایک تصوراتی طلسمات کسی اور دنیا کی ماورائی اونچے خوابوں سے جچی تحریر جو ہماری حقیقی دنیا سے بالاتر ہو کر ناول کی صورت میں ہم پڑھ رہے ہیں دل کو نہیں لگ رہی ویری سوری (اپنی، اپنی پسند ہے ڈیر) ہم کو عبت بدنام کیا سیرا رضا ردا کے ناول میں کوئی چارم نہیں رہا۔ ناہید فاطمہ حسنین کا کوہ گراں پڑھا یقیناً نہیں آتا کہ آج کل کے دور میں بھی اپنی غلطی پر پشیمان ہو کر کفارہ ادا کرنے والے بھی لوگ ہوتے ہیں اسے بھی بہتر ناول کہہ سکتے ہیں۔ غزالہ عزیز کا ناول مسافت لا جواب، بے مثال نہایت شاندار لگا۔ افسانوں میں محبت میں ریتجے اسے تو چاکلیٹی افسانہ کہنا چاہیے اتنی زیادہ محبت، لگتا ہے کچھ زیادہ ہی شوگر میں بھگو کر لکھا گیا ہے۔ عید محبت اور تم بالکل بچکانہ تحریر لگی۔ پسند نہیں آئی۔ (چلیں باقی تو پسند آئیں ناں) باقی افسانوں میں صبح آرزو اور بنی اچھے لگے۔ مگر کوئلن اشارہ طیبہ عصر مغفل نے لا جواب لکھا۔ بالکل حقیقت سے فریب آج کل کے ماحول کے مطابق بالکل درست لکھا بہت پسند آیا، طیبہ ذیل ڈن۔ شمع ہدایت میں اختر شجاعت صاحبہ نے غیبت کے بارے میں نہایت تفصیل سے بیان کیا ان کا انداز بیان دل میں اترتا ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس برے عمل سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ باقی تمام سلسلے نہایت عمدہ رہے۔ خاص کر بہنوں کی محفل تو پاکیزہ کی جان ہے اور پیاری دوست زہت آپ نے بھی بہت پیار سے بہنوں کی محفل کو سجا رکھا ہے۔ ہمیشہ خوش رہیے۔ اللہ حافظ۔“ (سنیم فصلی تبصرے کا شکریہ اور آپ کی دعاؤں کے لیے بہت، بہت نوازش آپ سب بھی تو اتنے خلوص سے شرکت کرتے ہیں)

✉ آسیہ مظہر چوہدری، آزاد کشمیر۔ ”آسیہ آپ مطالعہ جاری رکھیں۔ معنفاں کی تحریروں کو باریک بینی سے پڑھیں اور کچھ نیکیاں پھر لکھیں۔ کہانیوں پر تبصرہ بھی ضرور کریں۔ آزاد کشمیر سے قارئین کی ایک بڑی تعداد محفل میں شرکت کرتی ہے۔ آپ اپنا تعارف، علاقے کا تعارف اور کوئی دلچسپ واقعہ، بات ضرور بھیجیں۔ سلسلہ باتیں بہادر خزاں کی میں ضرور شرکت کریں۔

کچھ فریڈہ افتخار، اسلام آباد سے۔ ”عرصہ دراز کی غیر حاضری کے بعد حاضر خدمت ہوں پاکیزہ اور پاکیزہ والوں سے رابطہ قدرے منقطع رہا۔ انٹرنیٹ کے سہارے کچھ شمارے زیر مطالعہ رہے مگر جو مزہ ہاتھ میں رسالہ لے کر پڑھنے کا ہے وہ کہاں (یہ تو بالکل درست کہا) جو جھٹکا میرے دل کو لگا وہ انجم انصار کا رسالہ لے کر چھوڑنے کا ہے۔ ہم تو ان کے اس قدر عادی ہو چکے تھے کہ سب سے پہلے بہنوں کی محفل پڑھتے۔ جولائی کا شمارہ پڑھ رہی ہوں سب کچھ ویسا ہی ہے اگر کی ہے تو وہ انجم انصار صاحبہ کی (جی وہ تو ہے) کس طرح انہوں نے تمام قاری بہنوں لکھاری بہنوں اور ادارے کو جوڑے رکھا تھا۔ قابل صد تعریف ہے۔ مرے پاس ان کے گھر کا جو نمبر ہے کئی بار رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر جواب نہ ارد۔ (ان کا وہی فون نمبر ہے۔ وہ کچھ معروف ہوں گی۔ ویسے وہ خیریت سے ہیں) نہت اصغر صاحبہ خوش آمدید، آپ کا نام نیا نہیں ہے مگر یہ محفل سنانے کی اب آپ کی باری ہے۔“ (جی سر اہنے کا شکریہ..... آپ کا تعاون چاہیے فریڈہ آپ کا نام بھی میرے لیے نیا نہیں خوش آمدید)

کچھ انیلا حمید، پیرس سے۔ ”میرے پسندیدہ میگزین میں پاکیزہ سرفہرست ہے۔ میرا نہیں خیال کہ کوئی بھی مہینہ ایسا ہو کہ پاکیزہ میری لائبریری کی زینت نہ بنا ہو۔ (بہت خوب) اس میں معیاری اور خوب صورت نگہاں لکھی جاتی کہانیاں پڑھنے اور دیکھنے کو ملتی ہیں۔ پاکیزہ میں لکھنے والی بہنیں بھی خواتین کے لیے ایک نگہاں کے مانند ہیں۔ جو اداس دلوں کو جھٹکا دیتی ہیں۔ ان کی حکمت و دانائی کے موتی جیسے الفاظ ہماری زندگی کی گرہیں سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ پاکیزہ ہر لحاظ سے ایک مکمل اور معیاری میگزین ہے جو خواتین کی زندگی کے ہر گوشے کو سنوار رہا ہے۔ کوئی پل ایسا نہیں ہوتا جب دنیا غیر میں اپنے وطن کی یاد نہیں آتی ہو۔ ایسے میں پاکیزہ کی تحریریں شغلی ہوا کے جھونکے کی طرح اپنے لوگوں، اپنے وطن کی یاد تازہ کر دیتی ہیں۔ آپ سب کے لیے ڈھیروں دعائیں۔“ (انیلا آپ کی آمد سر آنکھوں پر رسالے کی پسندیدگی کا شکریہ..... ہماری تو یہی کوشش ہوتی ہے اسے بہتر سے بہتر بنائیں۔ بس آپ لوگوں کا ساتھ چاہیے)

کچھ زرینہ الماس، گوجرہ سے۔ ”مجھے سب رسالوں میں پاکیزہ بہت اچھا لگتا ہے آپ یقین کریں پانچویں جماعت میں تھی تو شروع کیا تھا۔ بڑی بہنوں سے چھپ چھپ کر پڑھتی تھی۔ اب تو ایک عمر گزر گئی۔ پڑھتے پڑھتے۔ پاکیزہ کے سب سلسلے اچھے لگتے ہیں۔ شروع سے لے کر آخر شواہے کلیک تک پڑھتی ہوں۔ آپ کو دیکھنے کے زمانے سے جاتی ہوں۔ انجم باجی کے بعد آپ نے بھی بہت اچھا سنبھالا ہے میں تو اتنے سنبھال کر رسالہ رکھتی ہوں کہ اگر صفحہ مڑ جائے تو اسٹری سے سیدھا کرتی ہوں (واہ بھئی خوب) کچھ بہنوں کو پڑانے رسالے اگر چاہیں تو میرے پاس ہیں اگر کوئی لینا چاہیے کیونکہ میں گھر شفٹ کر رہی ہوں رسالے ردی میں دینے کو دل نہیں چاہتا۔ (بہنیں متوجہ ہوں) اور اپنے ساتھ کسی ایسے ویسے کو دے دوں جو قدر نہیں کرے تو وہ میں دیکھ نہیں سکتی..... میں بچ کہہ رہی ہوں آپ سے..... پہلے تو میں باقاعدگی سے پڑھنے کو اپنی بہن کو بھجواتی تھی اب بیماری کی وجہ سے وہ پڑھ نہیں پاتی ہیں۔ میری طرف سے عذرا رسول صاحبہ کو بہت سلام اور پاکیزہ کے تمام لوگوں کو بھی سلام۔“ (زرینہ آپ کی دلی دعاؤں کی ہم دل سے قدر کرتے ہیں۔ بہت خوشی ہوئی آپ سے بات کر کے..... پاکیزہ کو پسند کرنے کا شکریہ)

کچھ حدیث اختر، حاصل پور سے۔ ”باجی مجھے بہنوں کی محفل میں شامل کرنے کا شکریہ۔ میں بہت چھوٹی عمر سے آپ کا رسالہ پڑھ رہی ہوں اب تو میری لڑکی بھی گیارہ سال کی ہو گئی ہے (ماشاء اللہ) اور اتفاق سے آدھے خاندان کی پیدائش اگست کی ہے (چلیں آپ پھر بھی سالگرہ ہوں کی مبارک باد لے لیں حدیث) باجی اگر بیٹا منیب پاکیزہ وقت پر نہ لائے تو یہی دھمکی کافی ہوتی ہے کہ منیب مجھے پاکیزہ لا دو ورنہ رات کے کھانے کا مجھ سے مت پوچھنا (ارے بھئی ایسا غضب نہ کیا کریں اگر دکان بند ہوئی تو بیچارہ بھوکا ہی سو جائے گا ہا ہا) شاباش نہت اصغر آپ نے بہت اچھا ادارہ لکھا۔ (بہت شکریہ) باقی سب کچھ بہت اچھا ہے۔“

✉ ہمینہ عباسی، بہاول پور۔ آپ کی کہانیاں قابل اشاعت ہیں۔ اپنی باری کا انتظار کیجیے۔

کچھ روانہ انور، اسلام آباد سے۔ ”میں بار، بار یہی کہوں گی کہ آپ لوگ بہت نیکی کما رہے ہیں۔ آگاہی اور شعور بٹانا بہت بڑا کام ہے۔ آپ کی محفل کے ذریعے بہت لوگوں کے مسائل حل ہوتے ہیں۔ شہناز جن کو بریٹ کینسر تشخیص ہوا

ہاں لے لیے عرض ہے کہ فوری علاج کروائیں۔ زیادہ دیر مت کریں انشاء اللہ ٹھیک ہو جائیں گی معمولی سرجری ہوگی، ایمان نہ ہوں۔ اپنی سوچ کو ثبت رکھیں بس مسکرائیں اور میں بحیثیت ایک ڈاکٹر یہ ضرور کہوں گی کہ خواتین اپنی صحت کا خود خیال رکھا کریں اپنی جانب سے غفلت مت برتیں کیونکہ آپ کی صحت پر ہی سارے گھر کا کارخانہ چلتا ہے۔ سیاحت عام آپ بچے کے درد سے پریشان نہ ہوں سرجری کے علاوہ بھی اس کا علاج ممکن ہے چکنائی، چاول اور بادی اشیا سے پرہیز کریں۔ میڈم افتخار شوق کے لیے بطور خاص عرض ہے کہ ہومیوپیتھک کی آرکینکائیڈ سے ماش کریں آپ کے درد میں ضرور آرام آئے گا۔ اس دفعہ بھی ساری کہانیاں بہت عمدہ تھیں۔ کارنرز بڑی محنت سے تیار کیے گئے۔“ (رومانہ علاج اور نسخے بتانے کا شکر یہ آپ بھی تو نیکی کماری ہیں جزاک اللہ!)

بھ صفیہ بیگم، لالہ موسیٰ سے۔ ”آپنی عذرا سے بات کر کے بہت خوشی ہوتی ہے پاکیزہ تو میرے بچپن کا ساتھی ہے۔ شادی کے بعد بھی پاکیزہ نہیں چھوٹا بلکہ اباجی نے بطور خاص میرے شوہر سے پاکیزہ کے متعلق کہا کہ صفیہ کو رسالہ پڑھنے سے نہیں روکنا۔ میرے شوہر میرے پھوپھی زاد ہیں۔ ماموں کا آرڈر سن کر وہ خاموش ہو گئے اور کبھی رسالہ پڑھنے سے نہیں روکا۔ ایک دفعہ تو حد ہو گئی میں بہت بیمار پڑ گئی کہ ہلا جلا نہیں جا رہا تھا مگر پھر بھی رسالہ نہیں چھوڑا۔ میرے ایک رشتے دار مجھے دیکھنے آئے تو حیران رہ گئے کہ اس بیماری کے عالم میں بھی پاکیزہ پڑھنا نہ چھوڑا میں نے تو یہ تک کہہ دیا ہے کہ رسالے بھی میرے ساتھ ہی دفن کر دینا اجازت ملے پڑھ لیا کروں گی۔ ویسے میری آخری بات پر کوئی اعتراض بھی کر سکتا ہے مگر میرا مقصد تو رسالے سے وابستگی بتانا ہے۔“ (اچھا ہوا صفیہ آپ نے اپنی بات کی صفائی خود دے دی ورنہ تو خطوط کی بھر مار ہو جاتی۔ رسالے کی اتنی پسندیدگی پر خوشی ہوئی۔ آپ لوگوں کا تعاون ہے جو آپ کی پسند کی چیزیں ہم شامل کرتے ہیں) بھ ثریا فرخ، کراچی سے۔ ”اتنا اچھا رسالہ اس تسلسل سے نکالنے پر عذرا رسول اور آپ سب بہت مبارک کے مستحق ہیں۔ اگست کے رسالے میں من جاں بازم کی آخری قسط پڑھی بہت زبردست ناولٹ ہے۔ میں پاکیزہ کی ایک بہت پرانی قاری ہوں، کئی عشروں پر محیط میرا اور پاکیزہ کا ساتھ محبت اور عادت میں بدل چکا ہے۔ امرت حسب معمول شیئیں خرید بازی لے گئیں۔ ہر قسط زبردست، گوشہ ظرافت بہت اچھا اضافہ ہے۔“ (آپ کی کچنی کھی کہانیاں بہت عمدہ ہیں۔ مختصر تبصرے کا شکر یہ... گوشہ ظرافت آپ سب کی فرمائش پر شروع کیا ہے)

بھ شامکدہ عبدالصلا، عمان سے۔ ”پاکیزہ بہت اچھا لگتا ہے۔ من جاں بازم ہارٹ فیورٹ ہے۔ رفعت آبی کا تو جہاں کہیں آتا ہے تو ضرور پڑھتی ہوں۔ ٹین اتج سے پڑھ رہی ہوں۔ ہاجرہ ریحان کا جیب بھی افسانہ آتا ہے اچھا لگتا ہے۔ شوق سے پڑھتی ہوں۔ بہنوں کی محفل میں جیسے آپ بھتی ہیں ویسے ہی بات بھی کرتی ہیں۔ یہاں پاکستان سوشل کلب میں نے جوان کیا ہے۔ ہم سب خواتین مل کر پڑھتی ہیں۔ انڈین اردو پڑھنے اور سمجھنے اور بولنے والے پاکیزہ شوق سے پڑھتے ہیں۔ کافی ریڈر شپ بڑھی ہے۔ یہاں بک ریڈنگ پر زور ہے۔ ہماری رائٹرز بہت شعور دے رہی ہیں۔ یہ ایڈیٹرز کی بھی خوبی ہے کہ اچھا میٹر چنتی ہیں۔ پاکستان کے تقریباً تمام ڈائجسٹ، رسالے، اخبار یہاں پڑھے جاتے ہیں۔ اللہ آپ کو اس کا اجر دے کہ نوجوان لڑکیاں اور شادی شدہ خواتین آپ کے رسالوں کے ذریعے رہنمائی حاصل کر رہی ہیں۔“ (شامکدہ بہت خوشی ہوئی آپ سے جان کر کہ وہاں پاکیزہ پڑھنے والوں کی ایک بڑی تعداد ہے، ہم صلاہ میں بھی اس کی ترسیل آسان بنائیں گے اور اس کے لیے سالانہ خریداری کے اشتہار سے معلومات آپ کو رسالے سے ہی مل جائیں گی رائٹرز تک آپ کا پیغام سلام پہنچا رہے ہیں۔ آپ لوگوں کا یہی تعاون ہے کہ پاکیزہ پڑھیں اور تعمیری اصلاحی تنقید ضرور دیں)

بھ حرافر حبیبی، ملتان سے۔ ”جب میں فانیو یا سکس گرڈ میں تھی کسی رسالے کو اٹھا کر دیکھتی نہ دیکھتی پاکیزہ کو ضرور اٹھا کر دیکھتی اس کے رنگین صفحات کی وجہ سے پاکیزہ جیسے نایاب جریبے سے تعلق ہونے کے باوجود اس کی بزم میں یہ میری پہلی شرکت ہے۔ آج قلم نے شور مچایا تو قرطاس کے سینے پر کئی باتیں رقم کرنے کو کھل اٹھا امید ہے پاکیزہ کے صریر خانہ میں شرکت یا رجحانی ملے گی ہوگی (جی بالکل)۔ اس میں شک نہیں کہ عزیز یزبت امیر کا اس ماہ کا ادارہ پاک سرزمین سے محبت کا دلکش غماز تھا۔ دین کی باتیں تو ایک سحر انگیز وجدانیت کا بحر معلوم ہوتی ہیں کہ جس کے آب سے جس قدر نقشہ کبی دور کی جائے

کم ہے۔ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کا دیدار خیر کریں تو فرشتہ صفت لوگوں کا خیال آتا ہے جن کے چراغ نور کی روشنی سے ہر ذی روح کا مستفید ہونا بے حد ضروری ہوتا ہے۔ (جی ہاں) رفعت سراج کی بات ہو اور معیار نہ ہو ارے میاں کیسی باتیں کرتے ہیں۔ یہ کہاں نکپس کہ دل..... بلاشبہ اعلیٰ درجے کی معیاری تحریر ہے جسے قلم کار کا قلم خوش اسلوبی سے منزل مقصود تک پہنچا رہا ہے۔ ناہید سطلانہ اختر کا ڈاکٹر موٹو کی چٹا سنا متضرا افسانہ بر جستگی و روانی کا اعلیٰ نمونہ تھا۔ آہا سحر ساجد کے قلم کی تو بات ہی نرالی ہے کہ جو بھی لکھتی ہیں ہوتا وہ بڑا مثالی ہے۔ سن جاں باز م کا بہترین طریقے سے اختتام اس بات کی بخوبی گواہی دیتا ہے ہاجرہ جی کے پہلے بھی افسانے پڑھے ہیں اس بار بی بی می ان کے قلم کا حق ادا کرتا دکھائی دیا۔ رب سوہنا ہریشی کا بخت نیک کرے اور انی خصوصی رحمت کی حیاؤں میں رکھے۔ آمین..... غزالہ جی کے ناول کا پہلا اور آخری حصہ دونوں اچھے رہے۔ پیاری قرۃ العین سکندر کے معاشرتی موضوعات پر لکھے افسانے ان کی قابلیت کا ثبوت ہیں۔ محبت میں رنج بھی اچھا رہا۔ شیریں حیدر کی تحریر توجہ طلب ہے۔ زندگی تو بے غلیل کا افسانہ بے حد پسند آیا۔ زوجہ دکاندار اور ٹائٹل ٹرولر کے محاذ پر تحریر میں کئی رنگ بھر دیے۔ (خوش ہو جاؤ اب پیاری لڑکی) فرحین انظہار نے مختصری تحریر میں محبت کے اچھوتے رنگ سے آگاہی بخشی۔ میں عورت ہوں کمال کا ناول تھا۔ گولڈن اشار کے توسط ایک رخ نکلتے پر سے طیبہ عسرنے پردہ اٹھایا۔ بڑھتی بے راہ روگی اور آزادی کی بنا پر استاد اور شاگرد میں محدود فاصلے کا تعین بے حد ضروری ہے۔ قلم اس کے کہ پانی سر سے گز جائے۔ کوہ گراں بہت خوب صورت نام تحریر کی طرح..... ناہید اور عذر دار رسول کی محبت پر بے اختیار پیار آیا۔ سلامت رہیں..... اب تو کوئی خضر ملے ٹپ ٹپ پڑتی ہوں دلوں کی مانند پھر سے کسی نے ایک بار حب الوطنی کی برسات میں نہلا دیا۔ سر سید ہال کی سیڑھیوں پر کھڑے اب بھی جانے کتنے کسی جناح کی راہ تک رہے ہیں..... اس دور میں ایسی تحریریں لکھنے پڑھنے اور شائع کرنے والے بھی شاید خطی ہیں سو بالاصل میں بھی تو ایک خطی ہو، غیبت پر تم اختر شجاعت کا مضمون بہترین رب سوہنا اس بدھل سے ہر فرد کو محفوظ رکھے۔ پھولوں سی مہک والی عذر آفتاب سے ملاقات ہوئی کہ آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی ہے۔ جشن آزادی سے متعلق سروے میں سب کے جوابات جان کر حزرہ آیا۔ موسم گرما پر کرن کا آرٹیکل خوب تھا۔ باتیں بہار و خزاں کی..... جیسں اور مطالہ دونوں کے جوابات عمدہ تھے۔ ہماریک نے خواتین کے کردار پر اچھی طرح روشنی ڈالی۔ صبا کی سوگوار عید نے پل بھر کو سوگوار کیا۔ کچھ شہ ظرافت حسب معمول پر لطف تھا۔ بہنوں کی محفل میں جس بے لوث محبت اور احترام سے بہنوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے اس کا الفاظ میں احاطہ کرنا مشکل ہے اور اس کا کریڈٹ پاکیزہ کی ہونہار ٹیم کو جاتا ہے۔ پاکیزہ ڈائری ہو، میں اکثر شکستاتی ہوں، بزم پاکیزہ، حسن نکھارے، غزلیات یا خوش ذائقہ ہر سلسلہ ایک سے بڑھ کر ایک ہے۔ اگر میں کہوں یوم آزادی کا یہ شمار ہر لحاظ سے قابلِ تحریف تھا تو غلط نہ ہوگا۔“ (حزب بہت مفصل تبصرے کا شکر ہے..... ہماری سب ہی رائزنز سن دینی سے قارئین تک مثبت سوچ پہنچانے میں کوشاں ہیں اور آپ سب کی شرکت ہی رسالے کو پر لطف بناتی ہے)

کھ کی زہری، اوستہ محمد، بلوچستان سے۔ ”اگست کی ماؤں جلتے دیے کے ساتھ بڑی خوب صورت لگی۔ یوں جیسے دیے کو دیکھ کر پروانہ ارد گرد منڈلا رہا ہو۔ یہ کہاں نہیں کہ دل بے رفعت آئی کا ناول اب سمجھ آ رہا ہے۔ زبردست موڈ لیا ہے ناول نے۔ (چلو تمہیں جلدی سمجھ آ گیا جی تمہرہ بھی کر رہی ہو۔ شاہاں) لیڈی صوفیہ کسی قسم بھی قلم کی اپنے عشق کی داستان بیان کرنا نہیں جھوٹیں۔ (یہی تو اس کا تقسیم ہے) شیریں حیدر جی کا امرت من پسند ناول ہے۔ اس ناول میں ایک خاندان کی کہانی ہے جہاں کچھ فیصلے بڑے وقت سے پہلے کرتے ہیں تو ضروری نہیں کہ بچے ان فیصلوں کو مانیں اور یہیں پر آکر خاندان ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ دلوں میں کدورتیں بڑھ جاتی ہیں اور مرتے دم تک ایک دوسرے کے چہرے نہ دیکھنے کا فیصلہ کیا جاتا ہے یہ تو پھر گرہر، ہر خاندان کی کہانی ہے۔ (رائٹر کی نظر گہری ہوتی ہے بھی تو بہترین تخلیق وجود میں آتی ہے) ہم کو عبث بدلتے کیا، سیمار ضار دا خوب جارہا ہے آہستہ آہستہ مدھی کے ماضی سے پردے ہٹتے جارہے ہیں۔ مہر انسا اور زوار شاہ کا کچھ کشن ہے محبت اللہ کی انٹری ناول میں نیا موڈ لے آئی ہے۔ (جی ہاں گل) ربیال کا کردار زبردست سے سحر ساجد کا سن جاں باز..... میرا فائبرٹ ناول کا حصار ساجد کی خاصیت یہ رہی ہے کہ تحریر کے حصار سے نکلے نہیں دیا۔ کیا کسی کے ہاتھ میں اتنا جادو ہو سکتا ہے وہ مجھے جہاں کہیں ملیں تو ان کے ہاتھ چوم لوں۔ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ میں ان کی تعریف کر سکوں آخر کار مومنہ عجیب عالم کا حصار ٹوٹ گیا ویلڈن، سہرب (سحر ساجد شکر یہ ہوتی ہیں) بہت خوب ادارے

میں ہر پاکستانی کے لیے ایک پیغام نظر آیا دین کی باتیں اور ڈاکٹر ذکیہ کے قلم سے لکھے موتی پڑھ کر دل و جان کو سکون سا ملا۔ جانوروں کا تذکرہ پڑھا کہ اللہ نے انسانوں کو نافرمان کرنے پر کیسا، کیسا بنا دیا جانوروں کی شکل دی۔ جانوروں کی مثالیں دے کر ہدایت کی ہے اللہ تعالیٰ ہماری خطاؤں کو معاف فرمائے آمین۔ ایک بات پوچھنی ہے جون کے شمارے میں اکٹر سنگتانی ہوں میں ایک شعر تھا۔ جیلہ بلوچ کا بیچا ہوا۔ مجھے ان سے پوچھتا ہے۔ جیلہ بلوچ کیا آپ منصورہ سندھ سے ہیں کیا اگر آپ وہی ہیں تو میں آپ کی اسٹوڈنٹ عظمیٰ زہری ہوں ہں جیلہ بلوچ اور فرح بھٹو کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ آپ کہاں سے ہو؟ پلیز میرا پیغام ان تک پہنچا گئے۔ (بھی جیلہ بلوچ اور فرح بھٹو اگر پڑھ رہی ہوں تو پاکیزہ کے ذریعے عظمیٰ زہری سے رابطہ کر لیں) میں عورت ہوں اب تو خضر لے، ضرورت پاکستان بہت پیاری کہانیاں تھیں سبق آموز اور دل موہ لینے والی خون میں جوش سا بھر گیا ان کہانیوں کو پڑھ کر گولڈن اسٹار طیبہ عصر مغل کی کہانی پڑھ کر لرز ہی گئی۔ ویری ناکس طیبہ جی ہمارے صبیروں کو چگانے کے لیے، ہاں یہ سچ ہے ہم مائیں آج کل موبائل، ٹی وی، کمپیوٹر بچوں کو تھما کر خود کو آزاد کر لیتی ہیں بچے تو بچے ہیں انہیں جس سانچے میں ڈھالو وہ ویسے بنیں گے یہ ہم والدین کی ذمہ داری ہے ان کی کیسی تربیت کرتے ہیں۔ آپ نے ماں کی گود کو پہلی درس گاہ یوں ہی تو نہیں کہا ناں۔ اولاد کی تربیت کی بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ آنکھیں کھولنے کے لیے بہت، بہت شکر یہ طیبہ جی“ (مفصل تبصرے کا شکریہ..... پاکیزہ مصنفات ایسے ہی سوشل ایڈیٹرز قلم اٹھاتی ہیں)

کچھ فریڈہ مفضل، ڈالاس امریکا سے۔ ”میں آپ کے چاروں رسالوں کی برسوں سے خاموش قاری ہوں جن میں پاکیزہ میرا مومسٹ فکورٹ ہے۔ اس میں تقریباً سبھی بہترین لکھنے والے ہیں۔ جی چاہتا ہے پاکستان جا کر ان سے ملوں اور کہوں کہ مجھے بھی لکھنا سکھا دیں۔ (جی ضرور آئیں) لیکن ہم ہندوستانوں کو بڑے کا مسئلہ ہے۔ خیر کوشش کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا۔ میں خود بھی شارٹ اسٹوری لکھتی ہوں۔ اگر بھجوں تو آپ شائع کریں گے۔ خط مختصر اس لیے لکھ رہی ہوں کہ آپ اسے ردی کی ٹوکری کی زندہ کر دیں۔“ (خوش آمدید، آکر دیکھ لیجیے کا خطوط کے لیے کوئی ردی کی ٹوکری نہیں ہے۔ رسالوں کی پسندیدگی کا شکریہ..... آپ ضرور کہانی بھیجیں پڑھ کر فیصلہ کیا جائے گا۔ اگلی مرتبہ کہانیوں پر تبصرہ بھی ضرور لکھیے)

☆☆☆

پیاری بہنو! محفل کا وقت تمام ہوا مگر اب بھی کئی خطوط منتظر ہیں تو انہیں آئندہ شمارے میں ضرور جگہ ملے گی۔ آپ سب کی صحت و سلامتی کی دعاؤں کے ساتھ اجازت طلب کرتے ہیں۔ سانس کی ڈور پونہ بنی بندھی رہی تو اگلے ماہ مزید جوش و خروش سے محفل سچائیں گے۔ دفتر کا مکمل پتا اور رابطہ نمبر ذرا س منھے پر بھی ہیں اور محفل کے آغاز میں بھی..... پوسٹ بکس نمبر وائی میل ایڈریس درج ہے۔

آخر میں رب کائنات اللہ جل شانہ کے حضور سب مل کر دعا کریں کہ اے ہمارے رب! ہمیں بخش دے۔ اے معبود برحق! ہمیں اپنی اس نظرِ کرم سے بہرہ مند فرما جس سے ہماری بھی خیتیاں، آلام ٹل جائیں۔ یا ارحم الراحمین ہم پر موت کے وقت رحم فرما اور موت کے بعد عذابِ قبر، فشا، قبر سے محفوظ رکھنا اور قیامت کے روز ہمارا نامہ اعمال ہمارے داہنے ہاتھ میں دینا بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔

آپ کی خیریت کی طالب
نزہت اصغر

پاکیزہ میں خط لکھنے کا پتا

مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ۔ c. 63 فیئر III ایکسٹینشن، ڈیننس۔ مین کورنگی روڈ۔ کراچی۔ پوسٹ کوڈ 75500
فون نمبر 021-35804200 , 021-35386783, 021-35802552 EXT 107, 118



پاکستان کے نئے ڈائری

عظمتی مساق سعید

حمدیہ کلام

پرندے بولتے ہیں
جو صدائیں
جونوائیں
کون ہے؟
جس نے انہیں
تائید بخشی
نطق کی جاگیر بخشی
صبح دم
سب کو جگائیں
کون ان میں
بولتا ہے؟
ہے ازل سے
تا ابد
اور ابد کے
بعد بھی
بس اسی کو پکارو
جو ہوا تیرا خدا، میرا خدا
ہے وہی حاجت روا

کلام: یاسمین کنول، پسرور

نعت

یا مصطفیٰ! یا مصطفیٰ!
ہم کو بھی اپنے در بلا
بن جائے جنت میں جگہ
طیبہ کا وہ رستہ دکھا
روشن چراغ دل کروں
ہو دور میری ہر بلا
ہر سانس ان پہ واردوں

اپنی ہے اب تو یہ صدا
ہم نہ کر و نظر کرم
ہے زندگانی بے مزا
دامن مرا جب جل اٹھے
سر پر ہو رحمت کی گھٹا
ان کے مگر جا کر مروں
ساگر کرے رب سے دعا

شاعر: محمد ایوب ساگر

انتخاب: محمودہ نیل احمد، اڈاکاڑہ

عمدہ حج کرنے پر مغفرت

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ ”جس شخص نے اس طرح حج کیا کہ اس میں نہ تو کسی شہوت، فحش بات کا ارتکاب کیا اور نہ کوئی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی تو وہ گناہوں سے ایسا پاک، صاف ہو کر واپس ہوگا جیسا اس دن تھا جس دن اس کی ماں نے اسے جنتا تھا“ مسلم شریف

انتخاب: ہمیشہ محمد لطیف، فوجیوں والا

حضرت علی کا فرمان

اپنوں کو ہمیشہ اپنے ہونے کا احساس دلاؤ۔۔۔ ورنہ وقت تمہارے اپنوں کو تمہارے بٹا جینا سکھا دے گا۔
مرسلہ: زرتیس زیر کوٹھاری، کراچی

دعا

بیاری بیٹی ہنزہ کے لیے
تجھ سے دعا ہے یہ میری اے رب ذوالجلال
علی اور ہنزہ رہیں ہمیشہ خوشیوں سے نہال
والہ و شیدا رہے ہمیشہ دھیال، نہ خیال اور سسرال
علی اور ہنزہ رہیں ہمیشہ سب کی محبتوں سے مالا مال

ہر کامیابی ہو ہمیشہ بے مثال، ہر ہنر ہو با کمال
سعد ہو ہمیشہ ہر ساعت، ہر دن، ہر ماہ و سال
علیٰ اور ہنرہ کی زندگی میں نہ آئے کبھی کوئی ملال
ان کی کامیابیوں اور خوشیوں کو نہ آئے کبھی کوئی زوال
ایک ماں کے قلم سے صبا آصف
گلشنِ حدید، کراچی

بے دریغ

کرتی تھی بے دریغ انہیں خرچ اس لیے
لائی تھی اپنے ساتھ وہ جوتے جہیز میں
از: سسیہ شاہ، چکوال

تخلص

مولانا شوکت علی جن خوبیوں کی وجہ سے ملک بھر
کے نوجوانوں کے محبوب تھے اس میں ان کی بے پناہ
ظرافت کو بہت دخل تھا۔ ان کی ہر بات اور ہر حرکت
میں ہنسنے مسکرانے کا سامان موجود ہوتا تھا۔
ایک مرتبہ کسی نے پوچھا کہ آپ کے بڑے بھائی
ذوالفقار علی کا تخلص گوہر ہے اور محمد علی کا جوہر ہے۔ آپ
کا تخلص کیا ہے؟
مولانا شوکت علی نے بے تکلف جواب
دیا۔ ”شوہر.....“

بیت خوب

الہ آباد کے مشاعرے میں ایک بزرگ شاعر نے
تیغ الہ آبادی (مصطفیٰ زیدی مرحوم) سے پوچھا۔ کیوں
میاں تیغ! کیا تمہاری شادی ہو چکی ہے؟
تیغ کے جواب دینے سے پہلے شمیم کرمانی نے
کہا۔ اجی جناب! کون باپ ایسا ہوگا جو اپنی بیٹی کو خود
اپنے ہی ہاتھوں پر تیغ کر دے۔
مرسلہ: گلشا ندزیر، اسلام آباد

شوہر بیچارہ

شادی نہ کرنا یارو
میں تم سے کہہ رہا ہوں

آفت گلے پڑی ہے
اس کو بھار ہا ہوں
صبح کے نوبت بچے ہیں
میری بیوی سو رہی ہے
بچوں کے پاس بیٹھا
پراٹھے پکا رہا ہوں
آفت گلے پڑی ہے

اس کو بھار ہا ہوں
(اچانک بیوی جاگ جاتی ہے)
شادی ہی کرنا پیارو
میں تم سے کہہ رہا ہوں
رانی گلے لگی ہے

اس کو بھار ہا ہوں
میری بیوی سب سے اچھی
میری بیوی سب سے پیاری
میری ساس، میری ماں ہے
میری سالی ہے زانی
میری بیوی غم سے رہی ہے
میرا دل لگا رہی ہے
میرے ساتھ اب تو وہ
شاہنگ پہ جا رہی ہے

مرسلہ: تنسیم ریاض، جہلم

بیٹیاں

جو پیدائش سے پرانی ہوتی ہیں۔ جس آنگن
میں کھیلتی ہیں، ایک دن وہی آنگن سونا کر کے چلی جاتی
ہیں اور جب دوبارہ اس آنگن میں قدم رکھتی ہیں تو
ڈرتی ہیں۔

وہ جس آشیانے میں پل کر بڑی ہوتی ہیں پھر
اسی آشیانے پر کھاتے ہوئے شرم محسوس کرتی ہیں۔ وہ
جس گھر میں مرضی سے چیزوں کو ادھر ادھر رکھتی ہیں،
اسی گھر کی چیزوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے جھجک محسوس کرتی
ہیں کیونکہ وہ بیٹیاں ہوتی ہیں جن کا حق کہیں نہیں ہوتا۔

مرسلہ: صائمہ قصیر، راول پنڈی

میرا پیا

میرا شام سلوٹا شاہ پیا
تیری شکل بصارت آنکھوں کی
تیرا کس ریاضت سانسوں کی
تیرا نام لبوں کی عادت ہے
میری اک، اک سانس گواہ پیا
میرا شام سلوٹا شاہ پیا
ہمیں بھاگتی تیری چاہ پیا

کلام: فرحت عباس شاہ
پسند: شاہینہ، لاہور

وفاداری

نواب سراج الدولہ کی قسمت کا سورج زوال
پڑا تھا۔ وہ بے یار و مددگار ہو چکا تھا۔ اس عالم میں
صرف اس کی بیوی لطف النساء اس کے ساتھ تھی۔ وہ
قدم، قدم پر شوہر کا حوصلہ بڑھاتی تھی لیکن غداروں نے
اس کے شوہر سے اسے جدا کر دیا اور جدائی کے زمانے
میں یہ اندوہ ناک خبر سنی کہ اس کا شوہر فوت ہو گیا ہے۔
اسے ڈھاکا بھیج دیا گیا۔ اس کی صرف ایک خواہش تھی
کہ اسے اپنے شوہر کی قبر پر رہنے کی اجازت دی
جائے۔ اس نے اس سلسلے میں ایک درخواست دی جو
منظور ہو گئی اور لطف النساء نے اپنی ساری زندگی شوہر کی
قبر پر گزار دی۔

صبح وہ اپنے ہاتھوں سے قبر صاف کرتی اور شام کو
اس پر پھول چڑھاتی۔ اس کے نازک ہاتھوں نے کبھی
یہ کام نہیں کیے تھے لیکن مرحوم شوہر کی محبت اس سے
قربانی کی طالب تھی۔ وہ سیاہ لباس میں ہر وقت شوہر کی
قبر پر موجود رہتی تھی۔ آخر میں اتنی کمزور ہو گئی کہ اٹھ کر
کھڑی نہیں ہو سکتی تھی۔

از: نیلوفر خان، بہارہ کھو

جیون ساتھی

میرے جیون ساتھی
جیون سے ناتا توڑ کر

مجھ کو اکیلا چھوڑ کر
ڈٹے داری کی بھاری گھنری
لاڈل میرے کاندھوں پر
تم چل دیے عدم کی راہوں پر
دور بھی منزل کڑی بھی دھوپ
اجڑ گیا میرا رنگ و روپ
چھوڑ دیا میرا اپنوں نے ساتھ
میرے رب نے تھا میرا ہاتھ
ہر مشکل پھر ہوئی آسان
کیونکہ ہے وہی رحمن
اب رحمن کی مدد سے میں نے
اپنی ہر ذمہ داری نبھادی ہے
میں نے آج اپنی
آخری بیٹی پیاہ دی ہے

کاوش: یاسمین اقبال، لاہور

مثالی شوہر

اس کو جادو کرانیں گے
چھلتی میں جو پانی لائے
جب بھی گولا کھانا کھائے
پانی کی مقدار بڑھائے
اس کو نیند کہاں آتی ہے
چمچ جس کو راگ سنائے
راشدہ ہے مثالی شوہر
بیوی کا جو ہاتھ بٹائے

شاعر: ممتاز راشد

انتخاب: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

کتنے جتن

”محبت ایسے نہیں کی جاتی..... اس کے لیے بڑی
محنت کرنی پڑتی ہے..... راتوں کی نیند، دن کا چین،
سکون برباد کرنا پڑتا ہے، رسوا ہونا پڑتا ہے۔“ ایک
دوست آسمان کو تکتا ہوا محبت کے بارے میں اپنے نادر
خیالات کا اظہار کر رہا تھا جیسے اس نے پی ایچ ڈی کر
رکھی ہو..... ”اور گھر میں جگہ عظیم لڑنی پڑتی

غزل

محبت کو کسی صورت امر کرنا نہیں آیا
کسی سنان بستی میں بسر کرنا نہیں آیا
کسی صحرا کی بستی میں بہت مدت سے رہتی ہوں
تمہارے ساتھ بھی ہم سفر کرنا نہیں آیا
ہماری جھیل سی گہری یہ آنکھیں رقص کرتی ہیں
تمہیں تو اس طرف کو بھی نظر کرنا نہیں آیا
یہ مانا کہ محبت کے ہی مجرم تو ہیں لیکن
مری غلطی کو پھر بھی درگزر کرنا نہیں آیا
محبت میں تمہیں ہم نے مری جاں کس طرح چاہا
تمہیں تو اس طرح دل میں بھی گھر کرنا نہیں آیا

کلام: فریدہ جاوید فری، لاہور

بارش اور شادی

ایسی بارش ہم نے صرف مسوری میں اپنی شادی
کے دن دیکھی تھی کہ پلاؤ کی دیگوں میں بیٹھ کر دہن
والے آ جا رہے تھے۔ خود ہمیں ایک کفلیہ پر بٹھا کر قاضی
کے سامنے پیش کیا گیا پھر نہ ہم نے ایسی حرکت کی نہ
بادل ایسا ٹوٹ کر برسا۔ عجیب سماں تھا جدھر دیکھو پانی
ہی پانی۔ اس دن سوائے دہن کی آنکھ کے کوئی چیز خشک
نظر نہ آئی۔ ہم نے ٹھوکا دیا کہ رخصتی کے وقت دہن کا
روتا رسومات میں داخل ہے۔ انہوں نے بہت آنکھیں
پٹپٹائیں مگر ایک آنسو نہ نکلا پھر کار میں سوار کراتے
وقت ہم نے سہرا اپنے چہرے سے ہٹایا تو خوب
پھوٹ، پھوٹ کر روئیں۔

مشاق احمد یوسفی کی کتاب زرگزشت سے اقتباس
مرسلہ: گل شہزادی، ماسکو

گزارش

غم کے سانچے میں ڈھل سکو تو چلو
تم مرے ساتھ چل سکو تو چلو
دور تک تیرگی میں چلنا ہے
صورتِ شمع جل سکو تو چلو

شاعر: حبیب جالب

انتخاب: عرشہ جنید، کراچی

ہے..... اور ماں کے جوتے کھانے پڑتے ہیں اور ابو
کے طعنے تناول کرنے ہوتے ہیں جو بڑے پیار سے
کہتے ہیں ناخلف بدتمیز..... کام کا نہ کاج کا بڑا آیا
محبوب بشت حوا کا.....

اور دادا کی چٹری کھانی پڑتی ہے جو کمر پر پڑتی
ہے..... اور ساتھ میں ارشاد ہوتا ہے نکلے، الو کے.....
پہلے الف ب تو پڑھنا سیکھو پھر محبت کرنا.....

”کیا تمہارے باپ دادا آج تک پچھتا رہے ہیں محبت کر
کے۔“ دوسرے نے پھجڑی چھوڑتے ہوئے کہا۔

از: راحیلہ بنت مہر علی شاہ گاؤں آماخیل ضلع ٹانک

بیوی کی نظر میں

☆ دنیا کا سب سے بہترین اور مکمل آدمی.....

اس کا باپ۔

☆ دنیا کا سب سے دیکھی خاوند..... اس کا بھائی۔

☆ دنیا کا سب سے خوب صورت مرد..... اس کا بیٹا۔

☆ دنیا کا سب سے خوش نصیب آدمی..... اس

کی بہن کا شوہر۔

☆ اور دنیا کا سب سے کٹھن، خود غرض اور بیکار

فحش..... یہ بھی بتانا پڑے گا کیا؟ آپ خود تجربہ کار ہیں۔

از: کائنات عبداللہ، میرپور خاص

اصل جوہر

☆ ہمیشہ احساس وہ انسان کرتا ہے جو خود غرض

نہیں ہوتا..... کیونکہ احساس ہی وہ جو ہر ہے جس پر

رشتوں کی بنیاد ہوتی ہے۔

☆ انسانیت کا رشتہ بہت بڑا خزانہ ہے اسے

لباس میں نہیں انسان میں تلاش کرو۔

☆ اگر دل میں نفرت اور غصہ بنائے رکھو گے تو

زندگی میں خوشیوں کے لیے جگہ نہیں بنے گی۔

☆ دعا جب ایڑیاں رگڑنے لگے تو قبولیت کا

زم، زم جاری ہو ہی جاتا ہے۔

☆ رب جب ناراض ہوتا ہے تو کچھ نہیں چھینتا

بس سجدے کی توفیق چھین لیتا ہے۔

از: حیدر ممتاز خان، اسلام آباد



☆ صاحبزادہ..... دینی
نماز پڑھ کے تراغم گلے لگا لوں گا
اکیلے عید منانا مری سرشت نہیں
☆ ناعمرہ تحریم..... کراچی
شام غم لیکن خبر دیتی ہے صبح عید کی
ظلمت شب میں نظر آئی گرن امید کی
☆ فیسو آصف..... ملتان
ہر چہرے کے ساتھ مسکرا کے
رہیں گے ہم بھرم عید کا
☆ فرح طاہر..... ملتان
اس سے ملنا تو اسے عید مبارک کہنا
یہ بھی کہنا کہ میری عید مبارک کروے
☆ مریم بنت کاشف..... حیدرآباد
میرے مالک نے مرے حق میں یہ احسان کیا
خاک ناچیز تھا میں سو مجھے انسان کیا
☆ زرتاب..... کمالیہ
دوسے پیار کے لیے آخر
بے کلی اپنی رنگ لائی ہے
آپ میں ہم میں رنج ہی کب تھا
آپ آئے ہیں عید آئی ہے
☆ صانور..... لیہ
اب کے تو درد ہے ایسا کہ بچا کچھ بھی نہیں
راستہ خاک میں ملنے کے سوا کچھ بھی نہیں
تو بھی دیوار سے ہنس، ہنس کے مجھے دیکھتی ہے
میری تنہائی مجھے تجھ سے گلہ کچھ بھی نہیں
☆ پروین افضل شاہین..... بہاول نگر
آئینہ دیکھ کے خوش ہوتی ہیں آنکھیں میری
میرے چہرے میں شابت جو میری ماں کی ہے

منتخب غزلیں



ماہِ ستمبر اردو زبان کے قادر الکلام استاد شاعر میر تقی میر کا ماہِ وفات ہے اسی حوالے سے میر کا نادر و خوب صورت کلام آپ کے ذوق کی نذر....

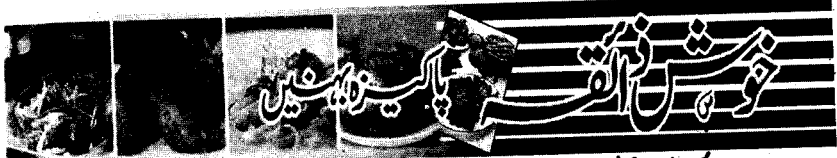


کون کہتا ہے نہ غیروں پہ تم امداد کرو
ہم فراموش ہوؤں کو بھی کبھو یاد کرو
ہیں کہاں مجھ سے وفا پیشہ نہ بیدار کرو
نہ کرو ایسا کہ پھر میرے تئیں یاد کرو
ایسے ہم پیشہ کہاں ہوتے ہیں اے غم زدگاں
مرگِ مجنوں پہ کڑھو ماتمِ فرہاد کرو
اے اسیرانِ نہ دام نہ ترپو اتنا
تا نہ بدنام کہیں کچنگل صیاد کرو
گو کہ حیرانی دیدار ہے اے آہ و سرشک
کوئی روشن کرو آنکھیں کوئی دل شاد کرو
کیا ہوا ہے ابھی تو ہستی ہی کو بھولے ہو
آخر کار محبت کو تکِ اک یاد کرو
اولِ مشق ہی میں میر جی تم رونے لگے
خاک ابھی منہ کو ملو نالہ و فریاد کرو

عاشق ہوئے تو گو غم بسیار کیوں نہ ہو
ناسورِ چشم ہو مژہِ خوں بار کیوں نہ ہو
کال ہو اشتیاق تو اتنا نہیں ہے دور
حشرِ دگر پہ وعدہ دیدار کیوں نہ ہو
گلِ گوشت کا بھی لطفِ دلِ خوش سے ہے لیم
پیشِ نظرِ دگر نہ چمن زار کیوں نہ ہو
مخصوصِ دل ہے کیا مرضِ عشق جاں گداز
اے کاش اس کو اور کچھ آزار کیوں نہ ہو
آوے جو کوئی آئینہ بازارِ دہر میں
بارے متاعِ دل کا خریدار کیوں نہ ہو
مقصودِ دردِ دل ہے نہ اسلام ہے نہ کفر
پھر ہر گلے میں سجد و زنا کیوں نہ ہو
شاید کہ آوے پرشِ احوال کو کبھو
عاشق بھلاہما ہووے تو بیمار کیوں نہ ہو
تکوار کے تلے بھی ہیں آنکھیں تری ادھر
تو اس ستم کا تیر سزاوار کیوں نہ ہو

کلام: میر تقی میر

فروری 1725ء تا 21 ستمبر 1810ء



بھنی کلیجی

اشیاء بکرے، کی بچی، آدھا کلو۔ کارن فلاور، دو کھانے کے چمچ۔ سویا ساس، دو کھانے کے چمچ۔ پانی، آدھا کپ۔ سرکہ، ایک کھانے کا چمچ۔ تیل، آدھا کپ۔ چینی، آدھا چائے کا چمچ۔ ہری پیاز، بارہ عدد۔ (لمبی، لمبی کاٹ لیں) نمک، سیاہ مرچ، حسب پسند۔

ترکیب: کلیجی کو دھو کر پانی خشک کر کے باریک باریک لمبائی کے رخ اسٹرپس کاٹ لیں۔ اس پر کارن فلاور آدھی سے کم پیالی پانی میں گھول کر سرکہ، سویا ساس اور چینی لگا کر آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ کڑا ہی میں تیل گرم کر کے کلیجی کو فرائی کریں لمبائی کے رخ کوئی ہری پیاز بھی شامل کر دیں۔ چند منٹ پکا لیں۔ نمک اور کالی مرچ آخر میں چھڑک کر اتار لیں اور گرم، گرم پیش کریں۔

مرسلہ: نیمزہ فیم، راول پنڈی

آسان ران روست

اشیاء: بکرے کی ران یا دھڑی (اضافی چربی صاف کر لیں) نمک، حسب ذائقہ۔ پیاز، (دو درمیانی باریک کاٹ لیں) گرم سالاد، ایک چائے کا چمچ۔ سرکہ، ایک پیالی دہی، ایک پیالی لہسن، اورک کا پیسٹ، ایک کھانے کا چمچ۔ ترکیب: بکران کو دھو کر صاف کر کے خشک کریں اور پھر سر کے میں ڈبو کر دو سے تین گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ پیاز گولڈن کر کے چورا کریں اور دہی، نمک، گرم سالاد، لہسن، اورک کے پیسٹ کے ساتھ خوب پیس لیں۔ ران کو سر کے سے نکال کر خشک کریں اور اس پر یہ آمیزہ اچھی طرح لپ دیں بلکہ کانٹے کی مدد سے گود دیں۔ دو گھنٹے کے بعد اوون میں بیک کریں یا ایک بڑے دھبے میں اسٹینڈ پر ران رکھ کر اور پتیلے میں دو گپ پانی ڈال کر ڈھکن بند کر کے درمیانی آگ پر رکھ دیں۔ ایک گھنٹا پکانیں اور چیک کریں کہ گوشت گل گیا ہو تو اتار لیں۔ مزیدار روست تیار ہے۔

مرسلہ: نیلو فرخان، بہارہ کھو

کڑھی

اشیاء: لکسی (جھاچ)، ایک لیٹر۔ (دہی بھی استعمال کر سکتے ہیں) لہسن، آدھا کلو۔ (پاؤ رکھ لیں پکڑوں کے لیے) زیرہ، ثابت، ایک چمچ۔ مرچ، نمک، حسب ذائقہ۔ ہلدی، دو چائے کے چمچ۔ دھنیا، پسا ہوا ایک چمچ۔ سبز دھنیا، آدھی پیالی۔ سبز مرچیں، چار عدد۔ لیموں، دو عدد۔ پانی حسب ضرورت۔ انار دانہ، دو چمچ (صاف کر لیں) تیل، ایک پیالی، ڈھانکی پیالی الگ پکڑے تلنے کے لیے۔ پیاز، ایک عدد۔ لہسن، پانچ جوئے۔ آلو، چار عدد۔ درمیانے۔

ترکیب: سب سے پہلے ایک پیالی تیل میں سے آدھی پیالی دھنیا میں ڈال کر آدھی پیاز کاٹ کر براؤن کر لیں پھر ایک لیٹر لکسی میں ایک پاؤ لہسن ڈال کر اچھی طرح کس کر لیں۔ جب پیاز براؤن ہو جائے تو لہسن ملی لکسی دھنیا میں ڈال کر کچھ ہلاتی رہیں، خیال رہے ابلے نہیں۔ اسے اتار پکانے میں لہسن ملے مارنے لگے۔ آدھا چمچ پیاز، پانچ جوئے لہسن، ایک چمچ انار دانہ، لیموں، مرچ، دو عدد۔ سبز مرچیں، آدھا خشک دھنیا، آدھا ثابت۔ زیرہ، نمک اور سبز دھنیا کاٹ کر اسی دھنیا میں ڈال دیں اور کچھ دیر پکانیں پھر چھوٹے سے نیچے اتار لیں اور چھوٹے ہلا کر ڈھکن بند کر دیں۔ اب آلو باریک چھوٹے، چھوٹے کاٹ لیں اس میں بانی کا دھنیا، زیرہ، میٹھا سوڈا، انار دانہ، سبز مرچیں، نمک، مرچیں اور آدھا پاؤ لہسن ڈال کر پکڑے کا آمیزہ بنالیں۔ اور پکڑے تل لیں۔ تلنے کے بعد ڈراسی دیر پانی میں بجھائیں پھر ہلکے ہاتھ سے دبا کر کڑھی میں شامل کریں۔ آخر میں پیاز، رانی، کھوئی، کڑھی پتا، سبز مرچ اور لہسن کا بگھار لگا لیں۔ مزیدار کڑھی ابلے سفید چاولوں کے ساتھ تناول فرمائیں۔

مرسلہ: سنبھل ملک اعوان، شاہدہ لاہور

بجاری ملائی تکہ بوٹی

اشیاء: گائے کی بوتی، آدھا کلو۔ نمک، حسب

ذائقہ۔ لال مرچ (مٹی ہوئی)، ایک چائے کا چمچ۔ کباب، چینی اور چیری، آدھا چائے کا چمچ (پیس لیں)۔ وہی، ایک کپ۔ خشخاش، ایک چائے کا چمچ۔ سفید زیرہ، (بھنا ہوا کٹا ہوا) آدھا چائے کا چمچ۔ ثابت و دھنیا، ایک چائے کا چمچ۔ (کوٹ لیں) فریش کریم، چار کھانے کے چمچ۔ کوئلہ، ایک عدد۔ پساکرم مسالا، آدھا چمچ۔ ہری مرچ، چھ عدد (باریک پیس لیں)۔ پپٹا، ایک چائے کا چمچ۔ لہسن، ادراک، ایک ایک چائے کا چمچ۔ تیل، چار، پانچ کھانے کے چمچ۔ پیاز، دو عدد۔ (چھوٹی) پانی، آدھی پیالی۔

ترکیب: کچھ تمام اجزا بوٹیوں میں ڈال کر مکس کر لیں۔ کریم کے علاوہ اور دو گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ وہی بھی اس میں ڈال دیں۔ دہی میں تیل گرم کر کے پیاز ڈالیں اور ہلکا گرم کر لیں براؤن نہیں کریں۔ پھر میرینٹ گوشت ڈال دیں۔ پانی بھی ڈال دیں۔ بجلی آج پر پکینے دیں۔ گوشت گل جائے تو آخر میں کریم ڈال کر بھون لیں ہلکا سا کبابیں پھر کوئلے کا دم دیں۔

گوئلے کا دم دینے کے لیے کوئلہ چوٹھے پر دھکا میں پھر روٹی کے ٹکڑے یا پیاز کی برت پر رکھ کر دہی کے اندر رکھیں اور اس پر کچی پنکا کر ڈھکن کو فوراً بند کر دیں۔

مرسلہ: نفیسہ آرا۔ راس النیمہ

باربی کیو بریانی

اشیا: گوشت، مرغ یا بکرا، آدھا کلو۔ دھنیا کٹا ہوا، ایک چائے کا چمچ۔ ادراک، لہسن، ایک چائے کا چمچ۔ نمک، حسب ذائقہ۔ لال مرچ، ایک چائے کا چمچ۔ گرم مسالا، آدھا چائے کا چمچ۔ وہی، ایک چوتھائی کپ۔ زرد رنگ، چٹکی بھر۔ نمک مسالا، دو کھانے کے چمچ۔ ادراک، لہسن ایک چائے کا چمچ۔ ہلدی، ایک چوتھائی چائے کا چمچ۔ چاول بریانی کے، آدھا کلو ایک کٹی ابال لیں۔ ہرا دھنیا، آدھی گڈی۔ نمٹار، دو عدد۔ وہی، ایک چوتھائی کپ۔ ادراک کٹی ہوئی، ایک کھانے کا چمچ۔ گرم مسالا، ایک چوتھائی چائے کا چمچ۔ پیاز، تلی ہوئی، ایک چوتھائی کپ۔ ہری مرچ، تین سے چار عدد۔ لال مرچ، آدھا چائے کا چمچ۔ نمک، حسب ضرورت۔ کیوڑا، آدھا چائے کا چمچ۔

ترکیب: گوشت میں دھنیا، ادراک، لہسن، نمک،

لال مرچ، گرم مسالا، وہی، زرد رنگ، نمک مسالا اور ہلدی ڈال کر ایک گھنٹا میرینٹ کریں اور پھر ادون میں بیک کریں یا کوئلے پر سینک لیں۔ چیک کر لیں، گوشت گل گیا ہو۔ اب تیل گرم کر کے اس میں ہرا دھنیا، نمٹار، وہی، ادراک، گرم مسالا، پیاز، ہری مرچ، لال مرچ، نمک ڈال کر مسالا تیار کر لیں۔ جب مسالا اچھی طرح بھن جائے تو اس میں کٹی ہوئی ادراک اور ہرا مسالا شامل کر لیں۔ پھر ابلے ہوئے چاول، کیوڑا، زردے کا رنگ شامل کریں اور دس سے پندرہ منٹ کے لیے دم پر رکھ دیں اور ڈش میں چاول نکالنے کے بعد اوپر چکن کے پیس پھر چاول رکھ کر سرور کریں۔

مرسلہ: نگہت آصف، اسلام آباد

بیساری بوٹی

اشیا: گوشت، (بغیر ہڈی کا) ایک کلو۔ کچا پپٹا، ایک چوتھائی کپ۔ ادراک، لہسن کا پیسٹ، دو چائے کے چمچ۔ نمک، حسب ضرورت۔ سرخ مرچ پاؤڈر، دو چائے کے چمچ۔ گرم مسالا پاؤڈر، ایک چائے کا چمچ۔

ترکیب: گوشت کے ٹکڑوں میں تمام مسالے لگا کر تین سے چار گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ اسے بغیر تیل کے کڑا ہی میں ڈال کر خوب بھون لیں۔ جب پانی خشک ہو جائے تو ایک چوتھائی کپ تیل ڈال کر بھونیں اور پیاز کے ٹکڑوں، ہری چٹنی اور پرائیوٹوں کے ساتھ پیش کریں۔

مرسلہ: عرشہ جینیہ، کراچی

آئس چاکلیٹ ٹرائفل وڈنٹس

اشیا: دودھ آدھا کلو۔ کارن فلور یا کسٹروڈ (کسی بھی فلیور کا)، چار کھانے کے چمچ۔ شکر، دو کپ۔ ٹمس فروٹ، آدھا کپ۔ فریش کریم (بیٹ کر لیں)، ایک کپ۔ چاکلیٹ آئس کریم، ڈیڑھ کپ۔ خشک میوہ، چار سے پانچ کھانے کے چمچ۔ چاکلیٹ سٹک، چار سے پانچ عدد۔ کوئی سی بھی جیلی، آدھا کپ۔ چاکلیٹ اسپرنگل، سو گرام۔

(ترکیب) کسٹروڈ بنا کر ٹھنڈا کر لیں جب ٹھنڈا ہو جائے تو فریش کریم، چاکلیٹ اور آئس کریم ملائیں اور پھر میوہ فروٹ جیلی ملا کر فریزر میں رکھ دیں۔ سرور کرتے وقت ٹھنڈی کی ہوئی کریم اور چاکلیٹ اسپرنگل سے گارلش کریں۔

مرسلہ: ایلینا شیراز، لاہور

پاکیزہ بہنیں



سوال: نادان کی دوستی جی کا خیال کب بنتی ہے؟

جواب: ہر وقت ہی۔

☆ ساجدہ ظفر، کمالیہ

سوال: وہ ہیں خاص میں ہوں عام..... پھر کیا ہو کلام؟

جواب: وہی کلام جو ہوسر عام تاکہ نہ ہوں بدنام۔

سوال: دلدار کی دلداریاں اگر حد سے بڑھ جائیں تو؟

جواب: دلدار کی پیوی کو بتا دو۔

☆ فلک ناز، عت عبدالندیم، حیدر آباد

سوال: پیار پھرے دوشر میلے نین بھلا کس کے؟

جواب: 1950ء کی دہائیوں کے۔

سوال: محبت اندھی ہوتی ہے لیکن پڑوسی؟

جواب: دور بین رکھتا ہے۔

سوال: دنیا کی عزت حال سے اور آخرت کی عزت؟

جواب: آخرت کی عزت بھی حال کے

کارناموں سے ہی۔

☆ تحسینی قدیل، کمالیہ

سوال: عید کے دن بیویوں کے چہرے رکھلے،

رکھلے اور شوہروں کے چہرے مرجھائے، مرجھائے

کیوں ہوتے ہیں؟

جواب: بیوی کا پرس بھرا ہوا اور شوہر کی جیب

خالی، خالی جو ہوتی ہے تو بیچارہ کیا کرے۔

سوال: عید کے تحفے اور ساگرہ کے تحفے میں کیا

فرق ہونا چاہیے؟

جواب: ساگرہ پر تو یک طرفہ ہوتا ہے جبکہ عیدی

تو دونوں طرف سے آتی اور جاتی ہے۔

پہلا انعام یافتہ سوال

☆ ارم کمال، فیصل آباد

سوال: دلوں کو زیر کرنے کا آسان سانسہ بتائیں؟

جواب: خلوص بھرے میٹھے بول اور ان پر عمل

بھی۔

دوسرا انعام یافتہ سوال

☆ نسرین شمیم، حیدر آباد

سوال: شوہر کی چٹنی بنانے کا طریقہ بتادیں؟

جواب: ویسے آج تک کسی شیف نے تو بتایا نہیں تو

ہم بھی کیا بتائیں، تم آس پاس خود ہی نظر ڈال لو۔

☆ پروین افضل شاہین..... بہاول نگر

سوال: آپ کی بھینس کتنا دودھ دیتی ہے اور

آپ کتنا دودھ فروخت کرتی ہیں؟

جواب: یہ سوال تم نے غلط جگہ بھیج دیا ہے۔

سوال: سیاستدان ملک کو دونوں ہاتھوں سے ہی

کیوں لوٹتے ہیں؟

جواب: تیسرا ہاتھ بھی ہوتا تو یقیناً اسے بھی کام

میں لاتے۔

سوال: خدانے عورت کو اتنی محدود عقل کیوں دی ہے؟

جواب: عقل تو مرد، عورت دونوں کو ایک جیسی

دی ہے عورت استعمال کم کرتی ہے، اس کی باقی عقل تو

اس کا شوہر استعمال کرتا ہے ناں۔

☆ امامہ مجمل..... کراچی

سوال: ڈیسٹ اور تاریخ میں کیا فرق ہے؟

جواب: ڈسٹری اور لغت بھی کبھی پڑھ لیا کرو۔

☆ سوال: واپڈا کے الیکٹرک اور محکمہ گیس کی

کارکردگی میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: وہی جو ہر دردمند پاکستانی کی ہے۔

۱۶:۱۸ رانی، ٹوپہ فیک سنگھ

سوال: کتاب، خواب میں نظر آجائے تو آنکھ کھل جاتی ہے، کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

جواب: چلو اٹھو اور امتحان کی تیاری کرو۔

☆ نرس نسیم، صابہ موہڑہ

سوال: اس بار تو میں نے لے کے ہی جانا ہے

بھلا کیا؟

جواب: انعام اور کیا..... ویسے تم کیا توقع کر رہی تھیں۔

سوال: شادی سے پہلے سب کہتے ہیں صرف

لڑکی چاہیے اور شادی کے بعد؟

جواب: یہ جملے..... ارے وہ آپ لوگوں نے

جہیز کی چیزیں تو بھجوائی نہیں، ہم نے تو پڑوس کے گھر

بھی خالی کر والیے تھے۔

☆ ماہ رخ، حیدر آباد

سوال: ذرا جلدی سے ساس پر سوسا ساس بننے کا

طریقہ تو بتا دیجیے؟

جواب: ابھی ہمارے ہاں تو ساس کی خدمت

گزاری کا ہی سبق دیا جاتا ہے۔

سوال: غصے کا آنا کنوارے لڑکے کی نشانی ہے اور

غصے کو پی جانا کس کی نشانی ہے؟

جواب: شادی شدہ لڑکی کی نشانی ہے، کیوں

ٹھیک ہے ناں۔

سوال: میرے شوہر گرجتے تو بہت ہیں پر رستے نہیں؟

جواب: تمننا مت کر بیٹھنا برسنے کی پھر برسات

تھمتے گی نہیں۔

☆ عظمیٰ زہری اور ستہ محمد، صوبہ بلوچستان

سوال: وہ آنکھوں سے کیوں بولتے ہیں؟

جواب: تم نے ان کے منہ پر ٹیپ جو لگا رکھی ہے۔

سوال: وہ موچھوں کو تادے کر کیا بولے؟

جواب: مجھ میں تے کج نہیں۔

سوال: چڑیلیں رات کو ہی کیوں نظر آتی ہیں؟

جواب: تم رات کو باہر کیا کر رہی تھیں۔

سوال: ہم آپ کے ہیں کون..... جلدی سے بتائیں؟

جواب: پیاری سی پاکیزہ قاری

☆ ناعمہ تحریم، بلیر ہاٹ

سوال: نفرت شیطان کا حصہ ہے، معافی انسان

کا وصف ہے اور موجب؟

جواب: شریک حیات کا حق۔

سوال: کسی کی دل آزاری سے کیسے بچا جائے؟

جواب: کسی کو آزار مت دو جوابا پاؤ گی بھی نہیں۔

سوال: آزمائے ہوئے کو بار بار کیوں آزمایا

جاتا ہے؟

جواب: ہر کوئی اپنا تجربہ خود ہی کرنا چاہتا ہے۔

☆ شازیہ ہاشم، کھڈیاں خاص قصور

سوال: مسرت کا ہرہ اور کرب گناہ تو سنگم کیسا ہوگا؟

جواب: بہت خوب صورت..... تیز دھوپ میں

رم جم۔

☆ توقیر ہاشمی، منڈی بہاؤ الدین

سوال: دیکھیں ذرا صحیح، صحیح بتائیں کہ مجھے وہ اس

سا لگرہ پر کیا دیں گے؟

جواب: ارے ابھی ہم نے ان کے دماغ میں سی

سی کیمرہ تھوڑی فٹ کیا ہوا ہے۔

سوال: سوچیں اور بھی ہیں مگر.....؟

جواب: ارے تو اور سوچوں کو سوچ لوں

ناں..... ختنے کے بارے میں ہی کیوں سوچ رہی ہو۔

☆ نسیم یاسین، حیدر آباد۔

سوال: بارات والے دن گھوڑا اتار پڑجوش کیوں

ہوتا ہے؟

جواب: انسانی گھوڑا ایسا کبھی کا گھوڑا.....؟

سوال: وقت واقعی پر لگا کر اڑتا ہے؟

جواب: جی ہاں..... دیکھو تو کتنی عمر ہو گئی تمہاری

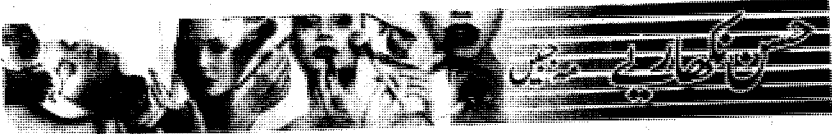
پتا بھی نہیں چلا۔

سوال: عورت شادی سے پہلے سہنوں کی رانی

ہوتی ہے اور بعد میں؟

جواب: گھرا گھل کی رانی۔

☆☆☆



حسن نگہداشت

دھونے سے بال گرنا بند ہو جاتے ہیں اور ملائم بھی ہو جاتے ہیں۔

☆ اگر سر میں خشکی ہو جائے تو بیٹے میں دو بار لیموں کا عرق پانی میں ڈال کر سر دھوئیں خشکی صاف ہو جائے گی۔

☆ جہاں تک بالوں میں خشکی کا تعلق ہے تو اس کے لیے ناریل کے تیل میں لیموں کا عرق ملا کر لگائیں اور تقریباً ایک گھنٹے بعد سر دھوئیں۔

☆ تیل میں لیموں کا رس ڈال کر بالوں میں لگانے سے بال چمک اٹھیں گے۔

☆ ہیملوگلوین کی کمی آئرن سے دور ہوتی ہے اور بال بھی اس کی کمی سے خراب ہوتے ہیں۔ جس کے لیے گائے یا بکری کا گوشت، مکیلی، لوبیا، دالیں، مٹر، ڈرائی فروٹ، براؤن شوگر، گنے کا رس، ساگ، پالک وغیرہ استعمال کریں۔

☆ خشک بال اگر ہیں تو بھندی لگائیں تو اس میں تیل اور انڈے کی زردی ضرور ڈالیں 30 منٹ بعد دھولیں کنڈ خشک ہو جائے گی۔

☆ تیل خشک، روکھے اور چکنے دونوں بالوں کے لیے ضروری ہے زیتون کا تیل بہت اچھا ہے اگر سوٹ کر جائے۔ اسے نیم گرم کر کے لگائیں۔

☆ اپنا ہیر برش، کنگھا اور تولیا ہمیشہ الگ رکھیں۔ رات سونے سے پہلے بالوں میں پندرہ منٹ تک کنگھا کریں اور بالوں کو چوٹی کی شکل میں باندھ کر سوئیں۔ اپنے سر کی صفائی کا خصوصی خیال رکھیں۔ اپنی نماز کی چادر، اسکارف اور عایا کا دوپٹا باقاعدگی سے دھویا کریں۔

☆☆☆

حسین اور خوب صورت بہنو! سلامت رہیں اور بچی سنورتی رہیں۔ اس مرتبہ کافی بہنوں نے بال گرنے سے بچاؤ کے بارے میں پوچھا ہے۔ دراصل ہر سر کی جلد اور بالوں کی قسم اور ساخت الگ ہوتی ہے مگر مجموعی طور پر ہم ایسے نسخے بتاتے ہیں جو سب کو ہی بھاجاتے ہیں اور نقصان نہیں ہوتا۔

جہاں تک بالوں کے گرنے کی بات ہے تو موسم کی تبدیلی بالوں اور جلد پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ اب خزاں کا موسم قریب ہے۔ لہذا بالوں کی دیکھ بھال پہلے سے بڑھ کر کریں۔ کڑوے بادام کا تیل اگر مل جائے تو بالوں میں لگائیں۔ زیادہ حساس جلد والوں کو ہو سکتا ہے کچھ جلن محسوس ہو تو بس تھوڑا سا لگا کر انگلیوں سے خوب مساج کریں۔ اس کے علاوہ کالے ماش رات بھر کر جھگو کر صبح سل پرپیں لیں میٹھی داندہ اور اور سیکا کاٹی بھی رات بھر بھگو کر ہم وزن لے کر یہ چٹنی کی طرح پیں لیں اور اس سے سر دھولیں بال گرنا بند ہو جائیں گے اور پُر رونق بھی ہو جائیں گے۔ کم از کم ایک ماہ تو ضرور کریں و بے مدت تین ماہ ہے۔ ایک دفعہ کے لیے ایک، ایک، ایک چمچ کافی ہے۔

☆ سر دھو کر آخر میں ایک ڈونگا پانی میں چند قطرے ڈیٹول ڈال کر اس سے بالوں کو دھوئیں۔

☆ نہانے سے پہلے روٹی کی مدد سے سر میں ڈیٹول لگائیں اور کچھ دیر بعد سر دھولیں۔

☆ اپنی غذا پر دھیان دیں..... سبزیاں، پھل اور اناج یعنی بینز، چنا، جو وغیرہ کو غذا کا حصہ بنائیں۔

☆ لیموں کا رس ہلکے گرم پانی میں ڈال کر سر

میں والدین کے بڑھاپے کی حالت کو پہنچنے کے وقت چند تاکیدیں احکام دیے گئے ہیں۔

ان کواف بھی نہ کہے، لفظ اف سے مراد ہر ایسا کلمہ ہے جس سے اپنی ناگواری کا اظہار ہو۔ یہاں تک کہ ان کی بات سن کر اس طرح لمبی سانس لینا جس سے ان پر ناگواری کا اظہار ہو وہ بھی اس کلمہ اف میں داخل ہے۔

ایک حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں بروایت حضرت علی کرم اللہ وجہہ، رسول کا ارشاد ہے۔ ”ایذا رسانی میں اف کہنے سے بھی کم کوئی درجہ ہوتا تو یقیناً وہ بھی ذکر کیا جاتا۔“

مطلب..... کہ جس چیز سے ماں، باپ کو کم سے کم بھی اذیت پہنچے وہ بھی ممنوع ہے۔

والدین کی پوری راحت رسانی تو انسان کے بس کی بات نہیں، اپنی مقدور پھر راحت رسانی فکر کے ساتھ ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے بھی دعا کرتا رہے کہ وہ اپنی رحمت سے ان کی سب مشکلات کو آسمان اور تکلیفوں کو دور فرمائے۔ یہ آخری حکم ایسا وسیع اور عام ہے کہ والدین کی وفات کے بعد بھی جاری ہے۔ جس کے ذریعے اولاد ہمیشہ والدین کی خدمت کر سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اور ہماری آل اولاد کو فرما کر بابر دار اور ہمارے لیے صدقہ جاریہ بنائے، آمین۔

شوہر کا رویہ بہتر ہو جائے

☆ ایک حاجت مند حیدر آباد سے ہستی ہیں۔

سوال: میری بیٹی کے شوہر کا رویہ اس کے ساتھ ٹھیک

نہیں ہے۔ وہ اپنی بیٹیوں کی طرف بھی دھیان نہیں دیتا۔

جواب: سب سے پہلے تو گھر کیلئے ماحول کو ہر اعتبار سے صاف ستھرا اور پرسکون رکھیں، بلاوجہ کے بحث و مباحثے سے بچیں۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ درود پاک پڑھنے والے کے لیے مخلوق کے دل میں اس کی محبت پیدا کرتا ہے۔ لہذا ہر نماز کے بعد سو مرتبہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خصوصاً فجر و عشاء کے بعد پانچ سو بیچین مرتبہ یارجم پڑھ کر تصور میں وہ اپنے شوہر پر دم کر دیا کریں۔ انشاء اللہ ان کے دل میں آپ کی بیٹی کی محبت و قدر پیدا ہو جائے گی۔

☆☆☆

والدین کے لیے یا والد کے لیے مانگی ہیں۔ ہم بھی ان دعاؤں کو مانگ کر اپنے والدین کے لیے اللہ کی رحمت کو متوجہ کر سکتے ہیں اور اپنی اولاد کو یہ دعائیں سکھا کر اپنے معصوم بچوں اور بچیوں کی زبانی اپنے لیے بھی دعائیں کر سکتے ہیں۔ مثلاً

رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ

ترجمہ: اے ہمارے رب! مجھ کو بخش دے اور میرے ماں، باپ کو بخش اور سب ایمان والوں کو اس دن جب کہ حساب ہو۔

(یہ مبارک دعا اپنے لیے اور والدین کے لیے گناہوں کی معافی کی دعا ہے۔) اے اللہ! ہم سب کی مغفرت فرما، اپنی اولاد کو اسے، نواسیوں، پوتے، پوتیوں سب کو وصیت کر جائیں کہ ہر نماز کے بعد یہ دعائیں مرتبہ ضرور مانگ لیا کریں۔ یہ جناب ابراہیم علیہ السلام کی دعا ہے۔

رَبِّ اَرْحَمْهُمْ كَمَا رَبَّيْنِي صَغِيرًا

ترجمہ: اے رب! ان پر (والدین) رحم فرما جیسا

پالا انہوں نے مجھ کو چھوٹا سا۔

یہ مبارک دعا والدین کے لیے رحمت کی دعا ہے،

اولاد اللہ تعالیٰ سے یہ مانگے کہ اے اللہ! جیسے والدین نے بچپن میں مجھ پر رحم کیا ویسے تو ان پر رحم فرما۔

بڑھاپے کے آخری دور میں جب عقل و فہم بھی

جواب دینے لگتے ہیں تو والدین کی خواہشات و مطالبات

کچھ ایسے بھی ہو جاتے ہیں جن کا پورا کرنا اولاد کے لیے

مشکل ہوتا ہے۔ قرآن حکیم نے ان حالات میں والدین

کی دلجوئی اور راحت رسانی کے احکام دینے کے ساتھ

انسان کو اس کا زمانہ طفولیت یاد دلایا کہ کسی وقت تم بھی

اپنے والدین کے اس سے زیادہ محتاج تھے، جس قدر آج

وہ تمہارے محتاج ہیں تو اس طرح انہوں نے اپنی راحت و

خواہشات کو اس وقت تم پر قربان کیا اور تمہاری بے عقلی کی

باتوں کو پیار کے ساتھ برداشت کیا اب جبکہ ان پر محتاجی کا

یہ وقت آیا ہے تو عقل و شرافت کا تقاضا ہے کہ ان کے اس

سابق احسان کا بدلہ ادا کرو..... آیت میں (کما رہینی

مغیرا) سے اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور آیات مذکورہ

درد اور پیشاب کی زیادتی

مسز شاہنواز..... راولپنڈی

بیماری نمبر 1۔ پیشاب بار بار آنے کی شکایت ہے۔ کھانسی اور چھینک کی صورت میں نکل جاتا ہے۔ پانی پینے کے فوراً بعد حاجت ہوتی ہے، برداشت نہیں کر سکتی نکل جاتا ہے۔ اکثر پیشاب کے بعد قطرے آتے ہیں۔ سردیوں میں بار بار پیشاب کی حاجت ہوتی ہے گرمیوں میں غسل کے بعد بار بار جاتی ہوں۔

بیماری نمبر 2۔ کچھ مہینے سے بے انتہا کمزوری محسوس کر رہی ہوں، تھک جاتی ہوں۔ پہلے رات میں گوشت ایسا محسوس ہوا کہ موٹا موٹا ہے اور اس میں درد بھی تھا، پھر بائیں ہاتھ میں کہنی کے اوپر جو گوشت ہوتا ہے وہاں بھی موٹا، موٹا محسوس ہوا اور درد بھی ہے۔ کوئی چیز پکڑ تو درد ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ گردن کے پٹھے، گھٹنوں میں جھج جھج کی آوازیں نکلتی ہیں، زین پر سے اٹھنا محال ہوتا ہے، کندھے درد کرتے ہیں حتیٰ کہ کھینک کر دو تھکدھوں میں درد ہونے لگتا ہے، کمر میں درد ہوتا ہے، اسکول سے آنے کے بعد اتنی تھکن ہوتی ہے کہ کیا بتاؤں، چہرے سے ہی تھکن ظاہر ہوتی ہے۔ آنکھیں سوج جاتی ہیں اور زبان کٹی سی محسوس ہوتی ہے، جلن ہوتی ہے، بال بہت گرتے ہیں، پانی پینے کو دل نہیں چاہتا،

جواب:- آپ نے اپنی رپورٹس منسلک نہیں کیں۔ کیفیات کے حوالے سے Urine D/R اور HbA1c کا ٹیسٹ ضرور کروائیں۔ آپ کے اندر وٹامنز کی کمی بھی لگ رہی ہے۔ فروٹ اور سبزیوں کا استعمال بڑھائیں، دہی اور پنیر بھی لیں، چکن اور انڈا بالکل بند کر دیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Rhustox Pentarkan Ptk 73 کے دس قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر دن میں چار مرتبہ لیں اور

سخت ہو جاتی ہے جلن بھی ہوتی ہے، دانے وہیں سوکھ جاتے ہیں، جلد اکڑ جاتی ہے اور پھر دوبارہ دانے بن جاتے ہیں۔ ساری گرمیاں اس کے ہاتھوں کا بھی حال رہتا ہے اور اس کے پورے جسم پر بھی، کبھی سرخ دانے بنتے ہیں جن میں درد ہوتا ہے اور مواد بہت نکلتا ہے۔ ان دانوں کا کوئی موسم نہیں ہے یعنی سردیوں میں بھی نکل آتے ہیں اور گرمیوں میں بھی۔ کوئی اچھی سی دوا تجویز کریں اللہ پاک آپ کو اجر دے گا۔

جواب:- باہر کی پینلنگ والی چیزیں استعمال نہ کریں یا جن میں Preservatives ہوتا ہے، سادہ متوازن غذا کھائیں اور ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Sulphur 1 M کی ایک خوراک لیں اس کے دو دن بعد Anagallis 30 کے 7 قطرے ایک گھنٹہ پانی میں دن میں 3 مرتبہ لیں۔ ایک ماہ بعد حال بتائیں۔

ایگزیمیا

ظفر احمد سیال..... سرگودھا

گزشتہ 20 سال سے میری کمر پر ایگزیمیا ہے۔ سارے جسم پر خارش ہوتی ہے، کمر کی جلد کھردری اور خشک ہے۔ جسم پر دانے اور کبھی پھوڑے نکلتے ہیں خون میں الرجی ہے، جسم پر Dermil کریم لگانے سے آرام آتا ہے اور الرجی کی گولی صبح وشام کھانا پڑتی ہے۔ بڑا گوشت یا انڈا کھانے سے الرجی بڑھ جاتی ہے۔ مہربانی فرما کر ایسی دوائی تجویز کریں جس سے خون صاف ہو جائے، الرجی اور خارش ختم ہو جائے اور ایگزیمیا مکمل طور پر ختم ہو جائے ساتھ ہی ساتھ کمر اور جسم کی خشکی بھی دور ہو جائے۔

جواب:- محترم ظفر صاحب، ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Graphites' Pentarkan Ptk 50 ایک ایک گولی دن میں تین مرتبہ لیں اور ایک ماہ بعد اپنی کیفیت سے آگاہ کریں۔



ساتھ Rhustox میں
Pentarkan Ptk 73 کے 7
قطرے ایک گھونٹ پانی میں دن
میں تین مرتبہ استعمال
کریں۔ ایک ماہ بعد آگاہ کریں۔

پرانانزلہ

سنیچہ سعید..... کراچی

میں بچپن سے شوگر کی مریضہ ہوں۔ میرے ساتھ
مسئلہ یہ ہے کہ مجھے بہت پرانانزلہ ہے جو اب بہت بڑھ گیا
ہے۔ بے تحاشا چھینکیں آتی ہیں، سر میں شدید درد ہوتا
ہے، ناک بھی بند رہتی ہے، گلے اور کان میں بھی درد
ہے، میں کوئی بھی ٹھنڈی یا کھٹی چیز نہیں کھا سکتی یہاں تک
کہ دودھ بھی برواشت نہیں ہوتا بخار چڑھ جاتا ہے اور بہت
چکر آتے ہیں۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ ناک کے دونوں طرف کا
گوشت بڑھا ہوا ہے اور ریشہ حلق میں اور حلق سے معدے
میں جا رہا ہے جس کی وجہ سے معدے کی تیز ابیت بھی بہت
بڑھ گئی ہے۔ معدے میں بہت درد اور جلن ہوتی ہے، میں
کوئی کام نہیں کر سکتی، سانس بہت پھول جاتی ہے، کوئی گرم
چیز بھی نہیں کھا سکتی، مرغی بھی نہیں، مکمل پرہیزی کھانا کھاری
ہوں۔ تقریباً ڈیڑھ سال سے میرے پورے منہ میں
چھالے لگی بہت ہو جاتے ہیں کہ ٹوٹھ پیٹ تک سے جلن
ہوتی ہے۔ معدے کی دوائی کھاری ہوں مگر تیز ابیت کم نہیں
ہوتی۔ مجھے پیشاب کی بھی تکلیف ہو گئی ہے یعنی انفیکشن
ہو گیا ہے۔

جواب:- فردت اور سبزیوں کا استعمال بڑھا دیں،
گائے، بکرے کا گوشت بھی استعمال کریں، کھلی فضا
میں چہل قدمی کریں، کراچی میں کلینک پر مل سکتی ہیں۔
خود کے اندر صحت و حوصلہ پیدا کریں۔ ڈاکٹر و لمار شوا بے
جرمنی کی Cinnabaris Pentarkan Ptk 31
ایک گولی دن میں تین مرتبہ کھالیا کریں اور ساتھ
میں Borax 30 Merc.sol کے 5،5 قطرے
آدھا کپ پانی میں دن میں تین مرتبہ استعمال کریں۔

ساتھ میں 30 Calc.Carb 30
Merrec.sol کے 7،7 قطرے آدھا کپ پانی میں
ڈاکٹر دن میں تین مرتبہ لیں۔ ایک ماہ بعد اپنی کیفیت
سے مطلع کریں۔

شوگر اور بلڈ پریشر

شمینہ شمیم..... لاہور

تقریباً دس سال سے مجھے گردن میں پتھری تھی۔
میں برس و لکیرس پتی تھی اور چھپا کی یعنی پتی اچھلنا کا بھی
مرض تھا اس کی میں Ptk 86 دوائی پتی تھی۔ اللہ کا خاص
کرم ہے کہ دونوں مرض ختم ہو گئے ہیں۔ اب تقریباً ایک
سال سے 140 تک شوگر اور بلڈ پریشر 140/100 تک
ہو جاتا ہے۔

اس کے علاوہ میری گردن کے دائیں طرف
تقریباً 5 انچ بڑا گھڑ ہے۔ یہ گھڑ کسی طرح بھی کم نہیں
ہوتا۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اس کا آپریشن کرواؤں۔ اس کو
تقریباً 12 سال ہو گئے ہیں لیکن اس میں کوئی درد وغیرہ
نہیں ہوتا۔ جب میں صبح اٹھتی ہوں تو اس میں سے ہلکا سا
خون اور ریشہ نکلتا ہے۔

میں کھڑے ہو کر نماز نہیں پڑھ سکتی اور نہ ہی ٹانگیں
دوہری کر سکتی ہوں، زیادہ چل پھر نہیں سکتی نہ ہی واک
کرنے کی ہمت ہوتی ہے۔ گردن اور مونڈھے کے پٹھے
اور ہاتھوں عیروں میں شدید اکڑاؤ ہو جاتا ہے پھر ایسا لگتا
ہے کہ جیسے میں پتھر کی ہو گئی ہوں۔ برائے مہربانی کوئی
اچھی دوائی تجویز فرمادیں۔

جواب:- سب سے پہلے اللہ سے اچھی امید
لگائیں، دعا کریں اور اس پر چھوڑ دیں یعنی ڈپریشن
آؤٹ۔ متوازن غذا لیں۔ جتنا ممکن ہو سکے چلیں پھریں
اور ڈاکٹر و لمار شوا بے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات
استعمال کریں۔

Viscum Pentarkan Ptk 89 کے 10
نظرے ایک گھونٹ پانی میں دن میں تین مرتبہ لیں اور

ایک ماہ بعد اپنی کیفیت سے آگاہ کریں۔

+++ سے کیا مراد ہے؟

نظام نظامی لاہور

مجھے یہ معلوم کرنا ہے کہ پیشاب کی رپورٹ میں ایک پلس +، دو پلس ++، یا تین پلس +++ سے کیا مراد ہوتی ہے؟ شکریہ، والسلام!

جواب: +، ++، +++ شدت کو ظاہر کرتا ہے۔

پیچیدہ مسئلہ

نمرہ امین ساہیوال

محترم ڈاکٹر صاحب! میں پاکیزہ بہت شوق سے پڑھتی ہوں اور خاص کر شواہے ہومیوپیتھک بہت شوق سے پڑھتی ہوں جس میں آپ ہر قسم کی بیماری کی تشخیص کر کے لوگوں کی رہنمائی اور مدد کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کاوش میں کامیاب کرے، آمین! محترم ڈاکٹر صاحب! میرا مسئلہ بہت پیچیدہ ہے اور میں بہت زیادہ پریشان ہوں۔ کبھی تو دل کرتا ہے کہ خودکشی کر لوں مگر پھر اس خیال سے رک جاتی ہوں کہ خودکشی حرام ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ خدا کے لیے مجھے اس مشکل سے نجات دلائیں۔ میرے بریست بہت چھوٹے ہیں اس کے علاوہ مجھے ماہواری بھی نہیں آتی بلکہ ایک مرتبہ بھی نہیں آتی۔

جواب: والدین کو اپنے بچوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ ان پر گہری نظر رکھنی چاہیے تاکہ وہ غلط کاروں سے بچیں۔ ساتھ بچوں کو چاہیے کہ وہ بھی ہر بات بغیر کسی شرم کے اپنے بزرگوں کو بتائیں تاکہ صحت، عزت، وین اور دنیا خراب نہ ہو۔ نادانی میں جو کچھ ہوا اس کو بھول جائیں۔ اللہ سے استغفار کریں اور اس سے مدد مانگیں۔

سادہ لیکن متوازن غذا کا استعمال کریں۔ صبح وشام چھل قدمی کیا کریں۔ ڈاکٹر ولمار شواہے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ Calc. Iodum-30 Pulsatilla-30، carb-30 کے 5-5 قطرے آدھا گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ استعمال کریں۔ 2 ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

بواسیر

عاصم وقار چکوال

میری والدہ صاحبہ کو عمر 5 ماہ سے بواسیر (خونی) کی تکلیف ہے جو کہ اس وقت شدید صورت اختیار کر چکی ہے۔ انہوں نے مختلف دیکسی دوائیاں استعمال کی ہیں لیکن افادہ نہیں ہو رہا۔ دائمی قبض، تین سے چار سے اور خون کے آنے سے مرض شدت اختیار کر چکا ہے اور درد بھی بہت شدید ہے جس کی وجہ سے چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا حتیٰ کہ چار پائی پر لیٹنا بھی دشوار ہو چکا ہے۔ آپ سے بہت عاجزی کے ساتھ درخواست ہے کہ مندرجہ بالا موذی مرض کا مناسب علاج تجویز فرمائیں۔ BP کنٹرول کرنے والی گولیاں، خون پتلا کرنے والی دوائی اور سانس کے لیے اے ہیملر (Inhalor) استعمال کر رہی ہیں۔ آپ سے گزارش ہے کہ ایسی دوا تجویز کریں جو دل پر گہرا اثر نہ رکھتی ہو۔

جواب: پانی کا استعمال بڑھائیں۔ لہن، باوام، اخروٹ کھائیں۔ چھل قدمی کیا کریں۔ قبض نہ ہونے دیں۔ خون پتلا کرنے والی دوائی فوراً بند کریں اس کی جگہ ڈاکٹر ولمار شواہے جرمنی کی Arnica-200 ایک خوراک 5 قطرے آدھا کپ پانی میں دن میں 1 مرتبہ لیا کریں۔ Aesculus-30، Nux vomica-30 Hamamelis-30 کے 5-5 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ استعمال کریں۔



Dr. Willmar Schwabe Germany

Available at All Medical & Homoeopathic Stores

شواہے سنگل ریمیڈیز گھر بھر کی صحت کے لیے کلاسیکل ہومیوپیتھی